ماہنامہ

ذوقِ نظر

حیدرآباد

سلام


ARMY
ہر گھر کی زینت اور ضرورت
وقت بچائیے
ایندھن کا خرچ کم کیجئے
کم وقت میں دو تین قسم کی لذیذ ڈشس تیار کر لیجئے
آرمی پریشر کوکرز
۵ سال گیارنٹی کے ساتھ
مضبوط و پائیدار
خوبصورت اور خطرات سے محفوظ
سول ڈسٹری بیوٹرس: سپریم ایجنسیز
IS 2347
IST
اسٹاکسٹ
مظہر برادرس
عثمانیہ بازار
حیدر آباد (اے پی)

ماہنامہ ذوقِ نظر حیدرآباد

شمارہ (۱-۲)
فون نمبر (525117)
جلد (۳)

سالِ نو مبارک

جنوری ۱۹۸۷ء

مدیرِ اعلیٰ : محمد بشیر الدین بشیر وارثی

مدیرِ انتظامی : خورشید جنیدی — مدیرِ اعزازی : ڈاکٹر یعقوب عمر

ناظم نشر و اشاعت : عابد قادری — مشیرِ قانونی : محمد شمیم ایڈوکیٹ

مجلسِ مشاورت :

ڈاکٹر عبدالستار خاں — ڈاکٹر وحید اشرف

مبشر احمد — علی احمد جلیلی — ڈاکٹر عقیل ہاشمی

زرِ تعاون

سالانہ پچاس روپے — فی شمارہ پانچ روپے

عرب ممالک سے — فی شمارہ ۵ ریال

ایڈیٹر پرنٹر اینڈ پبلشر محمد بشیر الدین بشیر وارثی — مقامِ طباعت : دائرہ الیکٹرک پریس چھتہ بازار
مقامِ اشاعت : دفتر ماہنامہ ذوقِ نظر ۲۳-۱-۲۲-۸-۲۲ چھتہ بازار حیدرآباد-۲

اِس شمارے میں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

الحمد للہ

اے علیمِ مطلق ! اے حکیمِ برحق ! اے قلمروِ علم کے واحد شہنشاہ

اے اقلیم حقائق کے یکتا فرمانروا ! خزانۂ علوم کے حقیقی مالک ! تو نے اپنے بندوں کو علّمَ بالقلم کی دولت سے مالا مال کر دیا، اور ان کے قلوب کو مالم یعلم کے انکشافات سے مطلع انوار بنا دیا۔ الٰہی ! اپنے فضل و کرم سے اب دل دے جو بحرِ نکات کا غواص ہو اور وہ نظر عطا فرما جو غوامض کے آسمان تک پہنچ سکے۔ وہ بصیرت عنایت فرما جس کے آگے لاعلمی کی تاریکی کشف کا نور بن جائے۔

الٰہی ! تیری غیبی تائید سے "ذوقِ نظر" اپنی اشاعت کے تیسرے سال میں داخل ہو چکا ہے اب تیرے لطفِ بیکراں کے بھروسے پر تیسرے سال کا آغاز ہو رہا ہے۔ پس اے میرے کارساز ! میرے مولا ! اے بندہ نواز ! "ذوقِ نظر" کو اس سال کی بھی تکمیل کرنے کی سہولت عطا فرما اور اس رسالے کو جاری رکھنے کیلئے عمر، صحت و فراغ حالی کے ساتھ وہ عزم دے جو کبھی متزلزل نہ ہو، وہ ہمت دے جو پست نہ ہونے پائے، وہ دستِ قوت دے جو کوتاہ ہونے کا نام نہ لے۔ وہ پائے ثبات دے جو پیچھے ہٹنے کا عادی نہ ہو۔ غرض ہر وہ چیز دے جو اس مہم کے سرانجام دینے میں میرے لئے ممد و معاون ہو اور اسکو تو ہی بہتر جانتا ہے۔

اے دعاؤں کے سننے والے مولا ! بوسیلۂ محمد مصطفےٰ میری دعا کو قبول فرما۔ (آمین ثم آمین)

بشیر وارثی

حرفِ آغاز

لفظ مساوات کیلئے ہر دور میں الگ الگ تعبیرات وضع کی جاتی رہی ہیں۔ اصل میں مساوات کا صحیح مفہوم آج تک معلوم نہیں ہو سکا۔ عملاً تو اس پر بہت سی حاشیہ آرائیاں ہوتی رہیں مگر عملاً دنیوی معاشرے میں یہ چیز شاذ و نادر ہی نظر آئی۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس نے تاریخ کے ہر دور میں اس اصول کو بے حد نقصان پہنچایا۔ طاقتوروں نے کمزوروں پر ہمیشہ ظلم ڈھائے اور آج کی کہانی بھی کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔

اصل میں عورتوں اور مردوں کے حقوق میں مساوات کا ذکر ہو یا مزدوروں اور آقاؤں کے درمیان ہمیشہ یہ بحث افراط و تفریط کا شکار ہوتی رہی چنانچہ بیسویں صدی میں انقلاب روس کی بنا پر مزدوروں کو مساوات کے نام پر جو حقوق دیئے گئے ہیں اس کا مزدوروں اور آقاؤں دونوں نے غلط استعمال کیا اور آج تک بھی مساوات کے صحیح خدوخال واضح نہیں۔

خصوصاً ہمارے ملک میں ہڑتالوں نے لوگوں کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی ہے کہ مساوات کے اصولوں کا منظم مزدور طبقہ شدت سے استحصال کر رہا ہے تو دوسری جانب آقاؤں نے بھی ایسے داؤ پیچ ایجاد کر لیے ہیں کہ محنت کش طبقے کو پیس کر رکھ دیا جائے۔ بات گھوم پھر کر قیادت پر ہی آتی ہے۔ کہ گمراہ اور بے جہت قیادت خواہ وہ مزدوروں میں ہو یا آقاؤں میں ملک و قوم کو نقصان ہی پہنچائیگی۔

اقوام متحدہ برسہا برس سے اس بات کیلئے کوشاں ہے کہ دنیا میں مساوات کا جذبہ ترقی کرے مگر ہم دیکھ رہے ہیں کہ بڑی طاقتوں کے قول و فعل میں کتنا زبردست تضاد ہے۔ سب مساوات کا زبانی نعرہ تو بلند کرتے ہیں مگر دل سے کوئی اس کا قائل نہیں ہر شخص چاہتا ہے کہ موقع ملتے ہی دوسرے کا استحصال کرے لیکن زبان سے وہ مساوات کی تعریف ہی کرتا رہے گا۔

ان تمام حقائق کے پیش نظر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس دنیا کے نظام میں حقیقی مساوات ممکن ہی نہیں۔ فطری اختلافات جغرافیائی اختلافات اور قوم و نسل کا باہم مختلف ہونا یہ تمام چیزیں ظاہر کرتی ہے کہ خود فطرت انسانی بھی مساوات کو مکمل طور پر کبھی قبول نہیں کر سکتی ہاں اس میں کچھ رعایت ضرور ہو سکتی ہے۔ انسان کے بنائے ہوئے قوانین کتنی آسانی سے ٹوٹتے ہیں۔ اس سے بھی واقف ہیں چنانچہ اس دور میں حقیقی مساوات کا ذکر کرنا کتنا غیر حقیقی معلوم ہوتا ہے۔

مختلف مذاہب میں حقیقی مساوات ناپید ہے کیونکہ یہ انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ ہاں مختلف طبقات کو اس سلسلے میں تحفظات اور رعایات کا مستحق گردانا گیا ہے ان کے دل میں خوف خدا پیدا کر کے انہیں اسکی ترغیب دیجاتی رہی ہے کہ تا بحد امکان ان طبقات کو ان مراعات سے استفادہ کرنے دیں مگر یہ دیکھا گیا ہے کہ جب تک [illegible] حقوق سے بیدار رہی یا جب تک لوگوں کے دل میں خوف خدا کا جذبہ باقی رہا۔ کم و بیش مساوات کے ضمن میں دی گئی مراعات سے مختلف طبقات بحسن و خوبی استفادہ [illegible] ہے۔ مگر دنیاوی قوانین کی تاریخ گواہ ہے کہ کسی دور میں بھی لوگوں کو اس بات پر مائل نہ کر سکے کہ وہ بیجا ظلم و ستم اور استحصال سے باز آجائیں۔ ان حقائق [illegible] معلوم ہوتا ہے کہ معاشرے کی تربیت میں ان اصولوں کو پیش نظر رکھا جائے جن سے لوگوں کے دل میں خوف خدا پیدا ہو اور یہی وہ جذبہ [illegible] میں ہم آہنگی اور امن و امان کی فضا پیدا کر سکتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ

حمد

خدایا اوّل و آخر بھی تو ہے — خدایا باطن و ظاہر بھی تو ہے
وہ اوّل تو کہ ہے آخر سے آخر — وہ آخر تو کہ ہے اوّل سے فاخر
ہے تو باطن میں ظاہر بلکہ اظہر — بظاہر بن گیا تو عین مظہر
کھلا جتنا ہوا اتنا ہے مستور — چھپا جتنا رہا کھلتا بدستور
ازل سے تا ابد ہے ایک ہی شان — ترا طغرا ہے الآن کما کان
نہ پایا ہے نہ پائے گا کبھی تو — کہ ہے معروف و عارف آپ ہی تو
تصور قرب کا دوری ہے تجھ سے — خیالِ بعد مہجوری ہے تجھ سے
نہ دوری ہے نہ نزدیکی نہ ما بین — عبارت منقطع لا غیرِ لا عین

حضرت اسمٰعیل رحمۃ اللہ علیہ

ہم اپنے صارفین اور احباب کی خدمت میں
نئے سال کی پر خلوص مبارکباد پیش کرتے ہیں.
(منجانب منیجمنٹ)

اقبال اینڈ کمپنی جیولرس

[illegible] ذوق [illegible] کا اپنا پسندیدہ [illegible] شوروم

دیدہ زیب، دلکش و پائیدار طلائی، جڑاوی اور نقرئی

زیورات کا واحد مرکز

آرڈر پر زیورات کی حسب دلخواہ تیاری کیلئے
ہماری خدمات نہ بھولئے.

اقبال اینڈ کمپنی جیولرس

مصطفےٰ بازار
گلزار حوض
حیدرآباد

فون ریزیڈنس ۲۲۴۷۶۹۰
فون نمبر شاپ ۵۲۱۳۵۲۱

قطعات نعت رحمۃ للعلمین صلی اللہ علیہ وسلم

○

بندے کی کیا مجال کہ ہو محوِ گفتگو
خود عرش بھی ہے فرشِ محمدؐ کے روبرو
تسنیم نعت لکھنے کو لکھتا تو ہوں مگر
لا یمکن الثناء کما کان حقہ

○

مجھ کو عشقِ رسولؐ ہو جائے
التجا یہ قبول ہو جائے
دے وہ دیوانگی مجھے یا رب
خار چھو لوں تو پھول ہو جائے

○

مری دنیا مری عقبیٰ یہی ہے
مرا قبلہ مرا کعبہ یہی ہے
ٹھہر جا بس یہیں میرے تصور
یہی ہے گنبدِ خضرا یہی ہے

○

سمندروں سے اُدھر کیا دکھائی دیتا ہے
حریمِ سبز کا جلوا دکھائی دیتا ہے
کبھی کبھی تو کچھ اس طرح ڈوب جاتا ہوں
یہیں سے گنبدِ خضرا دکھائی دیتا ہے

○

وہ بحرِ نور کا زینہ دکھائی دیتا ہے
وہیں پہ اپنا سفینہ دکھائی دیتا ہے
ذرا سی دیر کو آنکھیں تو بند کر لیجئے
وہ دیکھئے وہ مدینہ دکھائی دیتا ہے

تسنیم فاروقی

حضرت بیدار وارثی

رباعیات

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری اب تک
گلشن میں وہی ہے کیف طاری اب تک
انساں کی نبوت تو ہوئی ختم مگر
فطرت کی پیمبری ہے جاری اب تک

معمور ہے امید سے سینہ اب تک
مغلوب نہیں کوئی قرینہ اب تک
طوفاں کو ہے اس بے جگری پہ حیرت
منجدھار پہ ٹھہرا ہے سفینہ اب تک

پیمانۂ زندگی میں غم ہی دے دے
آبِ حیواں نہیں تو سم ہی دے دے
تشنہ ہے حیات روح پیاسی ساقی!
سیراب نہ ہو سکوں تو کم ہی دے دے

بے واسطہ رہتے ہیں حقیقت والے
بیدار! جدا سب ہیں الفت والے
ساحل میں ہر سے اور نہ منجدھار کے
اک حال میں ہیں تیری محبت والے

ڈاکٹر حکیم سید عبدالرحیم قادری رحیم
میڈیکل آفیسر [illegible]
ضلع کڑپہ

علم کا اسلامی تصور

فرمایا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
علم حاصل کرو" اس لئے کہ وہ شخص متقی ہوتا ہے
جو اللہ و رسول کے لئے علم حاصل کرتا ہے اور اس بابت
وہ جو کچھ کہتا ہے وہ اللہ اس کے رسول کی تعریف میں
ہوتا ہے جو دوسروں کو اس کی تعلیم دیتا ہے وہ صدقہ
ادا کرتا ہے اور جو اس کو مقاصد اسلامی کے لئے
استعمال کرتا ہے۔ وہ ریاضت کرتا ہے۔ علم اس بات
کی تمیز پیدا کرتا ہے کہ پروردگار نے کن باتوں سے روکا
ہے اور کن باتوں پر عمل کا حکم فرمایا ہے۔ علم جنت کی
روشنی ہے جو صحرا میں دوست اور ساتھی ہے خلوت میں
جلوت ہے گویا علم تنہائی کا ساتھی ہے جو خوشی کی راہ ہے
اور تکالیف میں سہارا ہے دوستوں میں بہترین زیور ہے
دشمنوں کے واسطے سپر ڈھال ہے علم سے اللہ کا بندہ
نیکیوں کی بلندی پر پہنچ کر اعلیٰ مرتبہ کا حقدار بن جاتا ہے
جو دنیا میں حکمرانوں کی محبت میں رہتا ہے اور آخرت کی خوشی پاتا ہے۔ (حدیث شریف)

حضور رسالت پناہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جو سب سے پہلے وحی نازل ہوئی وہ "اقراء" کی تھی جو "پڑھنے" کے حکم سے شروع ہوئی بعد کی آیت میں قلم کا بھی ذکر فرمایا ہے۔ جس سے علم اور تعلیم کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ کلام مجید میں سیاہی قلم اور کاغذ کی اہمیت واضح کی گئی ہے۔ جو حصول علم اور اس کی اشاعت کے جز لاینفک ہیں جس کی بنیاد پر علم کا حاصل کرنا اللہ و رسول کی طرف سے ایک فریضہ مذہبی قرار دیا گیا جس پر عمل پیرا ہو کر پیروان اسلام نے علم و فن کو عزت و عظمت کے بلند مقام پر پہنچا دیا اور اپنے [illegible] شہ پاروں کا ایسا انمول اضافہ کیا کہ جس سے حکمت و علم و فن کے چشمے ابل پڑے جس کی وجہ سے علم و فن و تہذیب کی دنیا پر [illegible] ہو گئی۔ اسلام کی تعلیمات اقوام عالم کے لئے یکساں اہمیت کی حامل ہیں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علم کو اللہ رب العلیم کی نگاہ میں محبوب(?) فرمایا ہے اسی لئے تو آپ نے

بلا تخصیص مرد و زن "علم کا حاصل کرنا سب کے لئے فرض قرار دیا ہے"۔ تاریخ شاہد ہے کہ خواتین اسلام نے اپنے علم و فضل سے مالا مال کر دیا اور ہر میدان میں اپنے علم و ادب کا قابل عمل ان مٹ نقش چھوڑا جو کائنات کی ہر عورت کے لئے قابل فخر کارنامہ ہے۔ ظہور اسلام کے بعد تعلیم کی مخصوص اجارہ داری ختم ہو گئی۔ اور علمی خاندانی غرور کی بنیاد پر دوسروں کو حقارت سے دیکھنے کے متکبرانہ طلسم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گیا۔ اسلام کی رو سے حصول تعلیم ہر عام شخص کا پیدائشی حق بن گیا خواہ وہ امیر ہو یا غریب عورت ہو یا مرد جس کی بنا پر ہر ایک کاندھے سے کاندھا ملا کر بلا امتیاز مذہب، قوم و ملت و رنگ و نسل و جنس علم کے حصول میں سرگرداں نظر آنے لگا۔ اس فراخدلی کی وجہ سے تاریخ کے ہر دور میں علم میں منتقلی ترجمہ تالیف تصنیف وغیرہ کی کاوشوں کو بے حد بڑھاوا ملا جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔

"مہد سے لحد تک علم حاصل کرو" حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان مبارک نے علمی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔ جس کی روشنی میں علم کا حصول ماں کی گود سے شروع ہوتا ہے، پھر مکتب، مدرسہ، جامعہ، مسجد، خانقاہیں اور علمی گھریلو ماحول مشاہدے کتب خانے علمی مجالس، وعظ، بیان، حصول علم کے اصلی ذرائع ہیں انسانی زندگی کو سنوارنے میں آسمانی صحیفوں نے بہت بڑا انقلابی کارنامہ انجام دیا ہے خصوصاً قرآن حکیم، ابتدائی نزول وحی سے ہی انسانیت کی پہلی درسگاہ رہا ہے۔ جس سے اپنوں یا پرایوں نے بہت کچھ مثبت فیض حاصل کیا ہے۔ جو تمام علوم کا منبع رہا ہے۔ علم کا حصول ہمیشہ ذہنی ارتقاء اور مخفی صلاحیتوں کے عروج کا آئینہ دار رہا ہے۔ جو زندگی کی بیداری اور موت کے بعد کی زندگی کے سکون کا باعث ہے۔ اس لئے مذہبی علمی تعلیم ہمیشہ عملی بنیادوں پر استوار کی گئی ہیں۔ جس کی وجہ مادی منفعت ثانوی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ کیوں کہ تعلیمات اسلامی کا مقصد انسان کو اپنے رب کے ساتھ مادی روحانی، قلبی و عملی طور پر رابطہ جوڑتا ہے۔

"علم حاصل کرو خواہ چین میں کیوں نہ ہو" (حدیث شریف)

رسالت مآب حضور مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس فرمان مبارک سے علم کی محدود سرحدوں کو لامحدود کیا جس کی روشنی میں احساس کیا جاتا ہے۔ اور علم الہی ادراک کے لئے کتنا قیمتی اور ضروری ہے۔ جس سے عقل انسانی سکون پاتی ہے۔ اور دل و دماغ راحت بخش ہوتے ہیں۔ علم و علوم اسلام کی ترقی ترویج و اشاعت بشمول نفوس قدسیہ کی درسگاہوں کے ذریعہ ہوا کرتی ہے۔ جس سے ذہن و قلب انسانی ہمیشہ تازہ دم ہوا کرتے یا جن کے فیضان کا سلسلہ آج بھی جاری و ساری ہے اور قیامت تک انشاء اللہ تعالیٰ باقی رہے گا۔ جو مملکتیں کے طرح قانونی سرحدی حدود کا پابند نہیں یعنی علم کی سرحدیں لامحدود ہیں۔ جس کی وجہ علم اپنے پورے حدود شعور کے ساتھ کاوش و لگن کے ذریعہ دور دور پھیلایا گیا۔ اور سیکھا گیا اور سکھایا گیا۔

"علم حاصل کرنے والے کا جنت میں فرشتے استقبال کریں گے" (حدیث شریف) حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان مبارک سے علم کی افادیت اور اس کے حاصل کرنے والے کا وقار معلوم ہوتا ہے اور اہمیت سمجھ میں آتی ہے۔

طالب علم کا درجہ کتنا بلند ہے۔ عالم علم سے رب العزت کا قرب رکھتا ہے۔ اور عالم کے انتقال پر فرشتے اس کا استقبال جنت میں کرتے ہیں۔ چنانچہ تذکرۃ العلماء میں حضرت مولانا ثناء اللہ خاں کے حوالے سے تحریر کیا گیا ہے کہ برصغیر کے جید عالم اور بزرگ شیخ عیسیٰ دہلوی نے اپنی وصیت میں تحریر فرمایا کہ "میرے مرنے کے بعد مجھے ایسی جگہ دفن کیا جائے جہاں میرے مدرسہ کے طلباء جوتے اتارتے ہیں" اس وصیت سے حدیث کا رخ روشن نکھر کر سامنے آتا ہے۔ اس عالم اور طالب علم کی کتنی قدر و منزلت ہے۔ جس کے لئے فرشتے چشم براہ رہتے ہیں۔ جس کے لئے رحمت الٰہی ہمیشہ جوش پر رہتی ہے جس کے وجود بابرکت سے آفات و بلایات کا نزول نہیں ہوتا۔ ہمیشہ رزق کی برکت رہتی ہے۔ اور نعمت الٰہی کی بارش ہوا کرتی ہے۔

" جو شخص علم اور علماء سے محبت کرتا ہے گویا وہ میری عزت کرتا ہے "۔ (حدیث شریف)

معلم اخلاق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پیاری حدیث نے دولت مندوں کو علم اور علماء کے قابل عمل قدر دانی پر اکسایا چنانچہ علم اور علماء کی اہل ثروت کی طرف سے عزت و شرف کا ناقابل فراموش مظاہرہ مدرسہ جامعات کتب کتب خانوں کے قیام کے سلسلے میں دنیا کے ہر خطہ ارضی پر اپنا بھرپور دلچسپی کے ساتھ کیا گیا۔ اور وقت وقت کے احوال کا جائزہ لیتے ہوئے اس کے لئے زمینیں، باغات، مکانیں، جائدادیں وقف کی جانے لگیں۔ تاکہ علم، تعلیم و تعلم کو تقویت بلند ہوتی رہے۔ اور دولت کی کمی حال کبھی محسوس نہ کی جا سکے اور طالبان علم و فن اپنی علمی پیاس بجھا سکیں وہیں ہر جگہ مقیم اور غیر مقیم طلباء کے لئے اقامت گھر یا ہاسٹل قائم کئے جاتے ہیں۔ جہاں کھانے پینے کا معقول انتظام کیا جاتا ہے۔ اور نادار و غریب طلباء کی تعلیم کا مفت بندوبست بھی کیا جاتا ہے۔ جس کا تمام تر دار و مدار دولت مند حضرات کی اعانت پر ہوتا ہے۔ یہ سارا نظام بلا تخصیص مقام سارے عالم میں رائج ہے۔

" علم کی روشنائی شہید کے خون سے افضل ہے "۔ (حدیث شریف)

چونکہ عالم اللہ اور رسول کی اطاعت کی کے راستے پر بذات خود چلتے ہوئے دوسروں کی رہبری کرتا ہے۔ اور احکامات الٰہیہ کی روشنی میں مایوس دلوں کو تسکین بخشتا ہے۔ اس لئے حضور سرور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے علم کی روشنائی کو شہید کے خون سے زیادہ افضل ترین قرار دیا۔ اگر عالم سیدھا ہے تو قوم سیدھی رہتی ہے۔ اگر عالم اپنے علم کے ساتھ بھٹک جائے تو قوم کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ برخلاف اس کے مجاہد شہید صرف اسلام کی جنگ لڑ کر اس کی حفاظت میں شہید ہو کر اپنی آخرت سنوار لیتا ہے اور تا ابد زندہ جاوید ہو جاتا ہے اور اللہ کے حکم جہاد پر ذاتی عمل کر کے سرخرو ہوتا ہے۔ یہ عمل جاری نہیں رہتا بلکہ [illegible] بن جاتا ہے لیکن عالم کا علم اس کی روشنائی سے لکھے جانے والے احکامات ہمیشہ جاری و ساری رہتے ہوئے دلوں پر حکمرانی کرتے ہیں اور قوم بلا اختلاف تابع رہنا اپنا فرض سمجھتی ہے۔ عالم کا علم زمان و مکان سے آزاد ہوتا ہے اور تابع احکامات الٰہیہ ہوتا ہے جس کا خالق نظام اچھے علم و فضل کا حامل ہوتا ہے۔

حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد گرامی ہے کہ ..... "علم انسان کا سب سے بڑا زیور ہے" جس سے وہ سارے عالم کو جگمگاتا ہے۔ عالم سارے عالم کا رہبر ہے۔ عالم کی زندگی عالم کی زندگی۔ عالم کی موت عالم کی موت ہے۔ علم سے انسان جانا پہچانا جاتا ہے۔ علم نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ جس میں علم نہیں وہ جانور سے بدتر ہے۔ علم انسان کو اخلاق سکھاتا ہے۔ بےعلم اخلاق سے عاری ہوتا ہے۔ نیز حضرت مولا علی کا ارشاد پاک ہے کہ "عالم کا احترام اللہ کا احترام ہے۔ عالم کی شہرت اللہ کا بڑا اعزاز و اکرام ہے" نیز آپؓ نے فرمایا کہ "علم حیات ہے علم دولت ہے" تاریخ عالم اس بات کی گواہ ہے کہ عالم کے بغیر نظام عالم درہم برہم ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور عالم کی دوراندیش رہبری سارے عالم کو امن محبت اتحاد سلامتی رحمت راحت لطافت سے مالامال رکھتی ہے۔ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ "جو علم حاصل کرتا ہے اسے موت نہیں آتی" یعنی علم زندہ تو عالم زندہ جو مدرسوں جامعات تالیفات اور اپنے پاکیزہ عمل سے جانا پہچانا جاتا ہے جس کا اثر و رسوخ زندگی کے ہر شعبہ پر چھایا رہتا ہے۔ کیوں کہ ہر نفس اس سے ۲۴ چوبیس گھنٹے رجوع رہتا ہے۔ جو فیضان تسکین روح سمجھتا ہے۔ معلم اخلاق حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پاک ہے کہ "بہت سارا خیرات کرنے سے افضل و برتر اولاد کی تعلیم ہے" نیز آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ "بچوں کی بہترین تعلیم سے بڑھ کر والدین کا کوئی دوسرا انعام یا تحفہ نہیں ہو سکتا" نیز آپؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ "طالب علم رب العزت سے بلند مقام پاتا ہے جو اعلیٰ میں ہے اور اس کا ہر قدم مبارک و مسعود ہوتا نیز جو وہ حاصل کرتا ہے اس کا انعام ملے گا" نیز ... آپؐ کی مشہور زمانہ حدیث پاک ہے کہ "علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان عورت اور ہر مسلمان مرد پر فرض ہے" اس پیاری حدیث مبارک کی روشنی میں علم اپنی پوری ضیا پاشیوں کے ساتھ مسلک حنفی شافعی حنبلی اور مالکی کے سلسلہ سرگرم عمل رہتے ہوئے قادریہ چشتیہ سہروردیہ نقشبندیہ سلسلوں کے ذریعہ روحانی مادی قلبی دماغی تسکین کی پذیرائی کر رہا ہے جس کا انسانیت کا بڑا احسان و کرم ہے جس کو کوئی نفس بھلا نہیں سکتا" جس کی تعلیمات عالیہ کے حصول سے ہر شخص نہایت مطمئن رہتے ہوئے قرب الٰہی حاصل کرتا ہے۔

دعا ہے کہ اللہ ہر شخص کو بزرگوں کی محبت کے ساتھ علم حاصل کرنے کی نیک توفیق عطا فرمائے۔

آمین

عزیز وارثی

غزل

حرم سمجھئے کبھی مرکزِ بتاں کہیئے
دیارِ یار کو تسکینِ جاوِداں کہیئے

جبینِ شوق جہاں بھی ادب سے جھک جائے
اُسی کو مُرشدِ برحق کا آستاں کہیئے

جو ایک پل کیلئے بھی نہ ہو تمہارا کرم
تمام عمر کی محنت کو رائیگاں کہیئے

رہے نہ کوئی بھی جس کے حضور تشنہ دہن
عنایتوں کا اُسے بحرِ بیکراں کہیئے

شعورِ عشق بھی عشقِ بُتاں سے ہوتا ہے
مگر یہ بات جہاں بُت نہ ہوں وہاں کہیئے

قلم سے لکھیئے تو لکھیئے حبیبِ جاں اُن کو
زباں سے کہیئے تو محبوبِ عاشقاں کہیئے

عزیزؔ کعبے میں، بُت خانے میں، کلیسا میں
حکایتِ غمِ جاناں کہاں کہاں کہیئے

غزل

خواجہ شوقؔ

وقت غفلت کی بڑی سخت سزا دیتا ہے زندگی کو بھی اک الزام بنا دیتا ہے

ظلم اس طرح بھی ظالم کو سزا دیتا ہے بے حس انسان کو حساس بنا دیتا ہے

روح نکلی تو نہیں جسم کا مصرف کوئی جاتے جاتے یہ مکیں گھر کو ہی ڈھا دیتا ہے

سر دپڑ جاتی ہیں جب دار و رسن کی رسمیں وقت منصور مزاجوں کو صدا دیتا ہے

زہر حالات یہ غم دل سے بہت تلخ سہی بعض اوقات یہی زہر مزہ دیتا ہے

حوصلے دوریٔ منزل سے کہاں تھکتے ہیں صرف راحت کا تصور ہی تھکا دیتا ہے

سانس لیتے ہوئے لمحوں کا سفر ہے جینا ہر نیا لمحہ ہمیں ذہن نیا دیتا ہے

اپنی پہچان بھی تنہائی نے مشکل کر دی دُور ہونا ترا ربط اور بڑھا دیتا ہے

ہم پہ کرتے رہو احسان ستم بھی اکثر مستقل لطف تو جذبات بجھا دیتا ہے

زندگی کاٹ رہا ہوں میں سزاؤں کی طرح اور زمانہ ہے کہ جینے کی دعا دیتا ہے

شوقؔ ہم کو ہے زمانے کا تعارف اتنا زخم بھی صورت انعام و وفا دیتا ہے

ریت کی دیوار

ڈاکٹر اطہر الحسن
شعبہ جغرافیہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔

شریف انسان بزدل ہوتا ہے۔ وہ اپنے حقوق کے لیئے بھی سرد جنگ لڑتا ہے اور گرم جنگ کے مقابلہ میں سرد جنگ کی شکست ہوتی ہے اور یہی شکست اس کی تقدیر بن جاتی ہے۔ میں بھی ایک شریف انسان ہوں۔ اور آپ میری تقدیر کے بارے میں خوب جانتے ہیں۔

بچپن سے ہی میرے لاشعور میں یہ بات جم گئی تھی کہ میں کسی ایسی عورت سے شادی کروں گا جو زمانے کی ٹھکرائی مطلوم عورت ہو اور زندگی بھر سچے پیار کو ترستی رہی ہو۔ میرا خیال تھا کہ ایسی عورت اپنے سچے پیار کو ٹوٹ کر چاہے گی۔ اور میرے نام نیکی لکھی جائے گی۔ راہ سے بھٹکے ہوئے کو راہ پر لانا نیکی نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ خواہش کیوں پیدا ہوئی کب پیدا ہوئی مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔ کچھ خواہشیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو خود رو پودوں کی طرح جنم لیتی ہیں اور خود ہی دم توڑ دیتی مگر جس طرح کچھ خود رو پودے وقت کی دھوپ چھاؤں اور گرم اور سرد ہواؤں کا مقابلہ کرتے ہوئے تناور درخت بن جاتے ہیں اسی طرح میری خواہش کا پودا بھی وقت کے ساتھ ساتھ تناور ہوتا جا رہا تھا۔

اس زمانے میں اور خاص طور پر ہمارے خاندان میں لڑکے لڑکیوں کی شادیاں کم عمری میں کرنے کا رواج ہے لڑکے کی مسیں بھیگنے اور لڑکی سر سے ڈوپٹہ اوڑھنے کا انتظار کیا جاتا ہے۔ جہاں دونوں اس سیڑھی پر پہنچے اور شادی کر دی جاتی تھی۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔

ہماری خاندان کا ماحول ابھی پرانی ڈگر پر چل رہا تھا، شادیاں خاندان کے اندر ہی ہوتی ہیں۔ اور گھر کا بزرگ سردار کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کی ہر بات حکم کا درجہ رکھتی تھی۔ مختصر یہ ہے کہ خاندان کی ایک لڑکی سے میری تقدیر کا دھاگہ باندھ دیا گیا اور ناصرہ میری دلہن بن کر آگئی۔

ناصرہ گھریلو ماحول میں پرورش پانے والی ان پڑھ اور گھریلو قسم کی لڑکی تھی۔ والدین نے اس کو اپنے معیار کا پاکر پسند کر لیا اور میں نے بھی بلا چوں و چرا قبول کر لیا اور زندگی کی گاڑی شاہراہ عام پر رینگنے لگی مگر میرے دل میں پنپنے والی خواہش کے چراغ پر اس باد مخالف کا کوئی اثر نہ ہوا اور وہ چراغ برابر جلتا رہا۔ دن ہفتے سال ہواؤں کے دوش پر اڑتے رہے لعد میں دو بچوں کا باپ بن گیا۔

دوسرا بچہ جنم دینے کے بعد ناصرہ موذی مرض میں مبتلا ہو گئی۔ اس کی صحت دن بدن گرنے لگی۔ دو بچوں کی پرورش، گھر کے کام کاج کی ذمہ داری اور بیماری نے ناصرہ کو بہت جلد کھوکھلا کر دیا۔ اور وہ میرے بچوں کی صرف ماں بن کر رہ گئی۔ شوہر بیوی کا رشتہ برسات کے سورج کی طرح ہو کر رہ گیا۔

انسان فطرتاً نفس پرست ہوتا ہے۔ جب اس کی نفس کو پیٹ بھر کھانا نہیں ملتا تو بغاوت جنم لیتی ہے اور یہ باغی نفس ہر طاقت سے ٹکرا جاتا ہے۔ فتح و شکست کی پرواہ کئے بغیر یہ جنگ جو سپاہی میدان میں کود پڑتا ہے جب ناصرہ اس مدھم پڑ گئی تو میری دیرانیہ خواب کے چراغ کی لو تیز ہونے لگی۔ اور اسی تیز روشنی میں اپنا آئیڈیل تلاش کرنے لگا۔ آخر کار ایک دن میرا آئیڈیل مجھ سے ٹکرا گیا۔

فرحت نے کہاں جنم لیا تھا۔ اس کا باپ کون تھا اس کو کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ اسے یاد تھا تو بس اتنا کہ جب اس نے ہوش سنبھالا تو اس کے کانوں نے طبلے کی تھاپ، پائل کی جھنکار اور ہارمونیم کی پکار سنی تھی جسموں کی خرید فروخت کے بازار میں اس نے پرورش پائی تھی۔ کمسنی کا زمانہ بھی ٹریننگ میں گذرا اور جب اس نے شباب کی زندگی میں پہلا قدم رکھا تو پیچھے دیکھ کر چلنے والوں کی نگاہیں اوپر اٹھیں اور اس کے سراپے کو ناپنے لگیں۔ جوانی اور شباب نے اس کے کانوں میں سرگوشی کی۔ اور دل کے دروازے پر خوشی نے دستک دی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ جاگی۔ ادھر قدردانوں کی حیثیت نے ان کو مچلا دیا۔ ایک دوسرے پر سبقت لینے کیلئے بولیاں بڑھائی گئیں اور کسی پان والی نے منہ مانگے داموں پر سودا کر دیا۔ اور پھولوں کی خوشبو گاہکوں کے دامن کو معطر کرنے لگی۔

ہر بازار کا قانون ہے کہ نئے مال کی مانگ اور قدر زیادہ ہوتی ہے۔ اور پرانے مال کی عمر کے ساتھ ساتھ قیمت کم ہوتی رہتی ہے جسموں کے بازار میں یہ زیر و بم زیادہ ہی ہوتا ہے۔ پرانے ڈھولک کی جگہ طبلہ لے لیتا ہے۔ اور ہارمونیم کی مقام پر گٹار کو زیادہ ترجیح دی جاتی ہے۔

جب میری ملاقات فرحت سے ہوئی تو وہ عمر کی اس سیڑھی پر تھی جہاں شباب کے صرف نقوش باقی رہ جاتے ہیں۔ اور طبیعت میں ٹھہراؤ پیدا ہو جاتا ہے۔

اس سے ملنے پر معلوم ہوا کہ اسے ان بازاروں کی گھناؤنی زندگی سے نفرت ہو گئی ہے۔ اور وہ اس بدنامی اور ذلالت کی دلدل سے نکل کر پاکیزگی کی زندگی بسر کرنے کی خواہش مند ہے۔ یوں بھی کوئی بھی آدمی گناہ کی زندگی گذارتے گذارتے اوب جاتا ہے۔ گناہ اور ثواب میں فرق بھی یہی ہے کہ گناہ اپنی ذات اپنے وجود سے نفرت سکھاتا ہے۔ اور ثواب اپنی ذات سے محبت کرنے کا سبق دیتا ہے۔

پہلی ملاقات کے بعد میں نے ایک دوست کی حیثیت سے فرحت کے گھر آنا جانا شروع کر دیا تھا۔ اور اس کی ذات میں اپنا آئیڈیل تلاش کرنا چاہتا تھا۔ کچھ ہی روز میں اس کے رویے سے مجھے یہ بات معلوم ہو گئی کہ وہ فرحت ایک مکمل عورت ہے اور

اور فرحت گویا بیوی بن کر بقیہ زندگی بسر کرنے کی خواہش مند ہے۔

ایک روز میں نے اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے کہا فرحت میں تمہیں اپنی بیوی بنانا چاہتا ہوں' تم میری آئیڈیل ہو

خدارا۔ ایسے خواب مت دکھائیے جس کی تعبیر کبھی سچ نہ ہو سکے یہ جملہ میں نے زندگی میں ہزاروں بار سنا ہے کہ اس کی سچائی سے میرا ایمان اٹھ چکا ہے۔ میں کانپ جاتی ہوں ایسی باتیں سن کر۔

تم میرے دل میں پرورش پانے والی خواہش کا پہلا پھل ہو۔ فرحت انکار نہ کرنا۔ ورنہ میری برسوں کی تلاش کا دم ٹوٹ جائے گا۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ میں جو کچھ بظاہر نظر آتا ہوں' وہ نہیں ہوں بلکہ ایک ٹوٹا ہوا اور بکھرا ہوا انسان ہوں اللہ نے مجھے عزت' دولت' شہرت' اولاد سب ہی کچھ دیا ہے۔ کمی ہے تو دل کے سکون کی وہ تمہارے دامن کے ہوا میں معروف ہے۔ اور پھر میں نے اپنی پوری کہانی فرحت کو سنا دی۔

مجھے سوچنے کا موقع دیجئے میں آپ کی تجویز پر غور کروں گی۔ اس کے بعد فرحت سے ملاقاتیں ہوتی رہیں وہ میرے اندر اپنا اعتماد تلاش کرتی رہی اور میں اس کی ذات میں وفاداری کی پرچھائیاں ڈھونڈنے لگا۔

اس دوران ایسے موقعے بھی آئے کہ میں فرحت کو آسانی حاصل کر سکتا تھا مگر میں تو حرام چیز کو حلال بنا کر استعمال کرنا چاہتا تھا اس لئے وقت کا انتظار کرتا رہا۔ فرحت نے کچھ اپنی شرائط بھی پیش کیں جو میں نے منظور کر لیں جن میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ وہ علاحدہ مکان میں رہے گی اور وہ مکان بھی اس کی ملکیت ہوگا۔ اس کا خیال ہے کہ اگر میں زندگی کے کسی موڑ پہ بے وفائی کروں تو وہ اس مکان کے کرایہ سے اپنی ضروریات زندگی کی تشنگی دور کر سکے بہرحال میں نے یہ بات بھی منظور کر لی تھی۔ ایک روز میں نے اپنی مرضی ظاہر کر دی اور وہ میرے ساتھ زندگی گذارنے کو تیار تھی

ایک مورچہ تو میں نے فتح کر لیا تھا۔ دوسرا مورچہ مجھے فتح کرنا ابھی باقی تھا۔ ابھی تک نامرہ سے میں نے فرحت کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ کیوں کہ قبل از وقت بات کرنا بیکار تھی۔ اب وقت آگیا تھا نامرہ کا مشورہ یا اس کی اجازت کے بارے میں معلوم کیا جائے کیوں کہ کوئی بھی بات ہمیشہ مخفی نہیں رکھی جاتی ایک دن تو ہر راز کو افشاں ہونا پڑتا ہے۔

ایک دن میں نے نامرہ کو فرحت کی پوری تفصیل بتا دی۔

نامرہ ساکت سمندر کی طرح خاموش رہی۔ اس کی حالت ان مچھیروں جیسی ہو گئی جن کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سمندر میں ایک نہ ایک دن طوفان ضرور آئے گا۔ اور وہ ان طوفانی لہروں کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔

اس نے کچھ توقف کے بعد کہا

یہ تو مجھے معلوم تھا کہ آپ دوسری شادی ضرور کریں گے اور کرنا بھی چاہیے۔ میں تو خود آپ کو مشورہ دینا چاہتی تھی۔ مگر کوئی بھی عورت اپنی سوکن کو خوشی سے برداشت نہیں کرتی یہ بھی حقیقت ہے کہ مرد جو کام کرنا چاہتا ہے تو کر لیتا ہے خدا کے سوا

دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ جب آپ نے فیصلہ ہی کر لیا ہے۔ تو میری طرف سے بھی اجازت ہے۔ مگر ایک درخواست یہ ہے کہ اس کو آپ اس گھر سے علاحدہ رکھیے یوں کہ میں بھی آپ کی بیوی ہوں۔ ہر بات برداشت کر سکتی ہوں۔ دوسرے اس کو برداشت نہیں کر سکیں گے۔ ہماری اولاد کے مستقبل پر بھی اس کا برا اثر پڑ سکتا ہے اولاد اور باپ کا تصادم نہ آپ کر سکیں گے نہ میں۔

جس معصومیت اور بے بسی کے عالم میں ناصرہ بول رہی تھی وہ بڑا موثر انداز تھا۔ اور ایک مرتبہ تو میں نے اپنا ارادہ رد کر دینے تک کی نوبت پر آ گیا تھا مگر پھر فرحت کے گزرے ہوئے دن سے یاد آئے اور میں نظریں جھکائے گھر سے باہر نکل گیا۔

کئی ہفتے اس کشمکش و پنج میں گزر گئے اور میں اپنے فیصلہ پر نئے سرے سے غور کرنے لگا۔ ایک روز جو فرحت کے پاس گیا تو ایک اجنبی بوڑھی عورت دکھائی دی۔ اس کا حلیہ، شکل و صورت دیکھ کر بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ یہ اسی گندی نالی کی پرانی پاپی ناگن کے علاوہ اور کوئی شے نہیں ہو سکتی۔ فرحت سے کچھ راز و نیاز کی گفتگو ہو رہی تھی جو میری موجودگی میں رک گئی تھی۔ اس بڑھیا نے مجھے ایسی خون خوار نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو یہی وہ شخص ہے جو فرحت کو ہماری برادری سے نکالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ہو سکتا ہے میرے آنے سے پہلے میرے بارے میں ہی بات چیت ہو رہی ہو۔

"یہ میری منہ بولی اماں ہیں، لکھنؤ سے آئی ہیں،" فرحت نے مختصر تعارف کراتے ہوئے کہا اور میں دوسرے کمرے میں جا کر بیٹھ گیا۔

فرحت کچھ دیر کے بعد آئی۔ اور مجھ سے معذرت کر کے چلی گئی۔ فرحت کے اس رویہ سے مجھے کافی کوفت ہوئی اور ایک بار پھر خیال آیا کہ آئندہ کبھی اس چوکھٹ پر نہ آؤں گا۔

چار روز تک میں فرحت سے ملنے نہیں گیا۔ پانچویں دن جب میں پہنچا تو اس کا چہرا اترا ہوا تھا۔

"آپ میری ذرا سی بات کا برا مان گئے اور چار دن تک غائب ہو گئے۔ اگر شادی کے بعد مجھ سے ناراض ہو جاؤ گے تو شاید میری شکل سے بھی نفرت کرنے لگو گے۔ یہی سب باتیں سوچ کر میرے قدم ڈگمگانے لگتے ہیں۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ مصروفیت کی وجہ سے نہ آ سکا۔" اس کے بعد فرحت کی پیار بھری باتوں کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا۔ اور میں پکا ارادہ کر کے اٹھا کہ اتوار کو نکاح کا جوڑا وغیرہ تیار کرا لوں گا۔ اور پیر کو نکاح کرا لوں گا۔ فرحت کی رضامندی بھی اسی پروگرام میں شامل تھی۔

سنیچر کی رات کو جب کچھ ضروری رائے لینے کے لیے فرحت کے گھر پہنچا تو میرے قدم دروازے پر رک گئے۔ اور میرے کانوں میں ایک اجنبی شخص کی آواز نے پگھلا ہوا سیسہ انڈیلنا شروع کر دیا۔

"فرد پاگل نہ بنو یہ بال دھوپ میں سفید نہیں ہوئے ہیں۔ یہ دانت یوں ہی نہیں گرے ہیں۔ زندگی میں قدم قدم پر تجربے کیے ہیں۔ مردوں کو پرکھنے میں ہی

جوانی گنوائی ہے ۔ یہ مرد قوم کسی ایک کی ہو کر کبھی رہا ہے اری جو اپنی بال بچوں اور بیوی کا نہ ہوا ہو وہ تجھے کیسے گلے سے
ہار بنا کر رکھے گا ۔ میں نے کواڑ کی دراز سے دیکھا ۔ یہ وہی بڑھیا بول رہی تھی ۔ جس کو فرحت نے منہ بولی ماں بنایا تھا ۔
ارے ان شریف بننے والوں کی اصلیت ہم سے پوچھو ۔ ایسے ہی شریف زادوں کو ہم روز کو ٹھے دکھاتے
ہیں ۔ ان کے پاس بہت سے چہرے روز ہوتے ہیں ۔ جنہیں یہ موقع محل کی مناسبت سے بدلتے رہتے ہیں ۔ آج بھی
تمہاری بازار میں مانگ ہے ۔ اور کتنے سیٹھ تھیلیوں کا منہ کھولے تمہارا انتظار کر رہے ہیں ۔ تم ایک آزاد ہرن کی ۔
طرح زندگی گزارنا پسند کرو گی ۔ یا کھونٹے سے بندھی گائے کی ۔ جو بھوکی رہ کر بھی اسی سے بندھی رہتی ہے
میں نے تو کل ہی سنا تم قید ہونے جا رہی ہو تو بس مجھ سے رہا نہ گیا ۔ فوراً چل پڑا ۔ بھئی سمجھانا اپنا کام ہے
مانو یا نہ مانو یہ تمہاری مرضی ۔

میں نے دیکھا یہ ایک دلال کی شکل کا شخص تھا جو فرحت کو ورغلا رہا تھا ۔

مگر میں تو وعدہ کر چکی ہوں اب اس سے انکار کس طرح کروں گی ۔ یہ فرحت تھی ۔ انکار کرنے ...
کہاں آئے گی ۔ صبح ہوتے ہی ہم لوگ روانہ ۔ کسے معلوم کہاں گئے ۔

اور تم یہ تو سوچو کہ یہ ادھیڑ عمر کا مرد جو اپنی جوانی کی آخری سیڑھی پر لڑکھڑا رہا ہے ۔ اس سے آگے کیا سلوک
کرے گا ۔ اس کی جوانی کا چراغ بجھتے ہی تمہاری جوان دنیا میں تاریکی پھیل جائے گی ۔ اور تم روشنی کی ایک ایک کرن کو
ترس جاؤ گی ۔ ہوش کی دوا کرو اور بڑھاپا سنبھالو ۔

فرحت خاموش تھی وہ شخص اپنی جگہ سے اٹھا شاید باہر جانے کے لئے اور میں تیز قدموں سے واپس چلا آیا ۔

صبح جب میں فرحت کے مکان پر پہنچا تو دروازے پر تالا پڑا تھا ۔ منڈیر پر بیٹھی فاختہ اڑ چکی تھی اب وہ کونسی
دیوار پر بیٹھے گی شاید اس کو بھی معلوم نہ تھا ۔

غزلیں

جنید احمد جلیل

ان آنکھوں میں نہیں اب طاقت دیدارِ میخانہ ٭ مجھے کافی ہے ساقی سایۂ دیوارِ میخانہ!
یہاں کی بوتلوں میں بند ہے راتوں کی تنہائی ٭ کھلیں گے کھلتے کھلتے دوستو اسرارِ میخانہ
نجانے بات کیا ہے کیوں قیامت آ نہیں جاتی ٭ حرم کے پاس ہی پائے گئے آثارِ میخانہ
درِ پیرِ مغاں کا واسطہ دیتے تو ہو لیکن ٭ کہاں آوارۂ منزل کہاں گلزارِ میخانہ
جنید آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہتا ہوں ساقی سے
بصد سامانِ رسوائی سرِ بازارِ میخانہ

قیصر قلندر

آج پھر رات کی تحویل میں دن جائے گا
چاند تنہائی کی یادوں میں اُتر آئے گا
جب میرے ساتھ نہ ہوگا کوئی آشفتہ خیال
موسمِ شوق میں کیا خاک مزا آئے گا
خشک پھولوں میں سمٹ جائے گا خوشبو کا لہو
موسمِ رنگ سرِ عام تو گھبرائے گا
کچھ دھڑکتے ہوئے لمحوں کا سنو تو سرگرم
دلِ مغموم کو ہر حال میں برمائے گا
جان کا جام چھلک جائے گا جونہی قیصر
آرزو دیس پہ پھر حسن نکھر آئے گا

داؤد حسین الطاف

بدل دیں ہم اپنا جو طرزِ سخن
جلا پائیں گے اور بھی فکر و فن
نکھرتا ہے اُس وقت رنگِ سخن
برابر میں بیٹھے ہوں جب اہلِ فن
وہاں تک پہنچتا ہے ذہنِ رسا
جہاں تک پہنچتی نہیں اِک کرن
شجر کا بھی سایہ ہے روٹھا ہوا
رہیں اب کہاں پر غریب الوطن
جوانی کا عالم اسے کیا کہوں
نمایاں ہیں سارے خطوطِ بدن
وہ الطاف جب سے جدا ہو گئے
ہرا ہو گیا اور زخموں کا ذہن

غزلیں

ڈاکٹر حقیر آستانی

تمنائے وفا کرتے رہیں گے ٭ خطا گر ہیں خطا کرتے رہیں گے
گزر کر جان و دل کی منزلوں سے ٭ کسی کا حق ادا کرتے رہیں گے
ہمیں بھی ساتھ لے لو رہگذار و ٭ کہ ہم منزل پہ کیا کرتے رہیں گے
مسیحائی ادھر بکنے لگی ہے ٭ یہ چرچا جا بجا کرتے رہیں گے

حقیر اب آ گئے ہیں تیرے اپنے
تری مشکل کشا کرتے رہیں گے

مومن خاں شوق

خزاں کا خوف کچھ کم ہو گیا ہے
نئی کونپل پہ جب غنچہ کھلا ہے
ہراسانی سے کیا ملتا ہے لوگو
خطا کے شہر میں سب کچھ روا ہے
کئی موسم یہاں آئے گئے بھی
مگر اک شخص سنّاٹا بنا ہے
فنا کے دشت میں کیا جانے کب سے
کوئی سایہ میرے پیچھے چلا ہے
کوئی جاگے کہ سوئے کون دیکھے
سمے تو شوق بھاگا جا رہا ہے

جگجیون پرشاد جیون

چلو ساتھ میرے چلوں میں جہاں تک
نئے راستوں سے نئے آستاں تک
نہ ہو کربِ غربت نہ فخرِ امارت
نہ رہ جائے انساں سود و زیاں تک
مصیبت کی آخر کوئی حد ہے یا رب
تمنا کا خوں ہم بہائیں کہاں تک
جلاؤ چراغ محبت جلاؤ!
اُجالا سا کر دو یہاں سے وہاں تک
جفاؤں سے اُن کی نہ گھبراؤ جیون
رکھو دل کو مضبوط ہر امتحاں تک

محمد نور الدین خان

حضرت صفی اورنگ آبادی کا ایک نایاب قصیدہ

جناب ابوالنصر محمد خالدی صاحب ریڈر تاریخ اسلام جامعہ عثمانیہ (موظف) کے دولت کدے پھنڈی بیٹم میں جناب شمس الدین تاباں، جناب عبدالحفیظ محفوظ، جناب رؤف رحیم فرزند تاباں اور یہ راقم حاضر تھے۔ جناب خالدی کی شخصیت علمی، ادبی اور مذہبی حیثیت سے ایک اونچا مقام رکھتی ہے۔ موصوف کی ذاتِ گرامی باقیات الصالحات میں ہے جنھیں حضرت صفی سے مخلصانہ ربط ان کے ابتدائی دور سے رہا ہے۔ جس کشش نے ہمیں ان کے دروازے تک پہنچایا وہ حضرت صفی کے انھیں حالاتِ زندگی اور مہاتِ شعری کے کھوج کا جذبہ تھا۔

ذکرِ صفی سے محفل گرم اور رنگ پہ آئی ہوئی تھی۔ یک بارگی جناب خالدی نے کچھ سوچا اور تھوڑی دیر یادِ ماضی میں گم رہنے کے بعد کاغذ پر ڈیڑھ شعر مرتسم فرمایا:

بات غالب کی جو تھی ساتھ گئی غالب کے
"زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے"
گنجلک کہنے ہی میں ہے جو کوئی استادی

فرمایا کہ غالب نے "چکنی ڈلی" پر تیرہ شعر فی البدیہہ کہے تھے لیکن صفی مرحوم نے ثمر یافعی کے چھوٹے بھائی کی شادی کے موقع پر اسی ردیف و قافیہ میں تقریباً چالیس شعر کہے تھے اور سنایا تھا۔ موصوف نے خواہش کا اظہار کیا کہ اس نایاب قصیدہ کو ہم

ڈھونڈھ نکالیں۔ اتفاق کہیے یا خوش قسمتی کہ جناب عمر یافعی مرحوم کے بھانجوں استاد محمد بن عیسیٰ صاحب اور حسین یافعی صاحب سے میرے مراسم اچھے خاصے مخلصانہ ہیں۔ جب میں نے اپنا مدعائے دلی بیان کیا تو ان دو صاحبوں نے مخلص تعاون کا وعدہ کیا۔

حضرت صفی کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ دیوانوں یا انتخابِ کلام یا کسی تذکرہ میں یہ قصیدہ موجود نہیں ہے نہ کسی نے اس کا ذکر کیا۔ البتہ حضرت صفی کے ایک قدیم شاگرد سید غوث یقین نے حضرت صفی کا کلام دیوان کی صورت میں "فردوسِ صفی" کے نام سے پاکستان سے شائع کیا تو تعارفی مضمون "آپ سے ملئے" میں اسی قصیدہ کی نشاندہی کی احمد حید تک کی ــــــ اسی طرح ایک اور قصیدہ حضرت غالب کی چکنی ڈلی والے قطعہ پر اپنے ایک بے تکلف دوست کی شادی کے موقع پر کہا تھا۔ (جس کا صرف آخری شعر ہمیں یاد ہے) لیکن جس بات کا اظہار کرنا چاہیے تھا اسے نہایت حسن کے ساتھ تضمیناً اس طرح کہہ دیا: بات غالب کی جو تھی ساتھ گئی غالب کے

زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے

اس دوران میں میں نے بہت کوشش کی کہ قصیدہ یا کچھ اشعار شاگردانِ صفی یا واقف کار لوگوں سے حاصل کروں لیکن کسی نے سنائے ایک دو شعر سے زیادہ کسی نے کچھ نہیں سنایا بلکہ قصیدہ کی شانِ ترقیم کے بارے میں عجیب عجیب مختلف روایتیں سننے کو ملیں آخرکار جوئندہ یابندہ کے مصداق کئی مہینوں کی جد و جہد اور امید و بیم کے درمیان یہ گنجِ شائیگان میرے ہاتھ لگا جسے حسین یافعی صاحب نے بہت تلاش بسیار اپنے اثاث البیت سے ڈھونڈھ نکالا اور از راہِ مہربانی و علم دوستی میرے حوالے کیا۔

اس قصیدہ کا تاریخی پس منظر یہ ہے کہ جناب محمد بن عمر صلاح صاحب مرحوم (جن کا کتب خانہ حیدرآباد میں بہت مشہور تھا) کے چھوٹے بھائی محمد بن صلاح کی شادی بروز یکشنبہ ۳ر شعبان ۱۳۴۵ھ ہوئی۔ محفلِ عقد میں حیدرآباد کے ایک اچھے شاعر جناب قادر حسین قادر نے جو استادِ داغ کے شاگرد تھے اور درجہ استادی کا رکھتے تھے سولہ ۱۶ اشعار کا "سہرا" لکھ کر سنایا تھا اور قطعہ تاریخ عقد یوں کہا تھا:

بنا ہے بنا جو محمد صلاح! خوشی کیوں نہ ہو اس کی احباب کو

جو تھی فکر تاریخِ دل نے کہا خجستہ ہو عقد محمد ــــ کہو

۱۳ ھ ۴۵۔

یہ شادی محلہ بیگم بازار بلدہ حیدرآباد میں ہوئی لیکن ولیمہ دوسرے دن عمر یافعی صاحب مرحوم کے آبائی مکان میں ہوا جو اس وقت "بیگم کی مسجد" (رو بروئے مکہ مسجد) کے متصل واقع تھا۔ اسی گھر میں بروزِ ولیمہ حضرت صفی نے قصیدہ سنایا تھا۔ اس وقت ان کی عمر صرف پینتیس ۳۵ سال تھی۔ (ازروئے تاریخ پیدائش ۱۳۱۰ھ)

مرزا غالب جب کلکتہ گئے تھے تو ایک مجلس میں ان کے دوست کرم حسین نے چکنی ڈلی پیش کرکے ان سے خواہش کی کہ اس چکنی ڈلی کی کچھ تشبیہات نظم کریں۔ چناں چہ غالب نے وہیں بیٹھے بیٹھے فی البدیہہ یہ تیرہ شعر کا قطعہ لکھ کر اپنے دوست کے حوالے کیا۔ مختصر سا یہ قطعہ تشبیہ، استعارہ اور تلمیح کا ایک دلکش مرقع ہے لیکن اس کے ساتھ اس پر غالب کی مشکل پسندی اور فارسی تراکیب کا ملمع چڑھا ہوا ہے۔ حضرت صفی نے غالب کا اعترافِ کمال کرتے ہوئے کہ " بات غالب کی جو تھی ساتھ گئی غالب کے "، اٹھاون شعر کا قصیدہ غالب کے تتبع میں لکھا۔ اگرچہ یہ فی البدیہہ نہیں لیکن سچ تو یہ ہے اور یہ ماننا پڑے گا کہ اردو شاعری کا دامن غالب کے اس قطعہ کے بعد کسی اور تقلیدی نمونہ سے خالی ہے۔ تمام قصیدہ، تشبیہات، استعارات اور تلمیحات و محاورات کی خوبیوں سے مرصع ہے۔ طرفہ یہ کہ طبیعت کی روانی چڑھتے دریا کی طرح بڑی سادگی اور پُرکاری کے ساتھ از اول تا آخر رواں دواں ہے۔ الحاصل یہ قصیدہ حضرت صفی کے سحر آفریں حسنِ کلام، قدرتِ زبان اور ان کے خاص شگفتہ اور دلکش اندازِ بیان کا آئینہ دار ہے۔ یہ طویل قصیدہ تمام تر بہ انتخاب ہے۔

در تہنیت شادی میمنت آبادی مجتبیٰ محمد بن صلاح بن داؤد صاحب زاد اللہ لطفہٗ

ہے عجب طرفہ تماشا جسے دنیا کہیے　　　بس میں سچ کی مرن ہے تو بھلا کیا کہیے
بزمِ شادی اسے کہیے تو یہ ہے سچی بات　　　شاعری ہے جو اسے اس سے سوا کہیے
بزمِ انجم اسے ٹھہرائیے تو ہے تشبیہ　　　سب کہیں گے کہ طریقہ ہے پرانا کہیے
خوانِ نعمت ہے کہیں خوان کو تو پس خوردہ　　　لوگ سچ سمجھیں اگر کہیے تو ایسا کہیے
گنبدِ دود کو جو رشکِ شبِ خور تو پھر　　　شاہ کا سر ہے کو نہ کیوں گنبدِ خضرا کہیے

کہیئے پانی کے کٹورے کو جو حوضِ کوثر　　کیوں نہ بریانی کو رشکِ منّ و سلویٰ کہیئے
تارِ مسند کو بنا دیجئے شعاعِ خورشید　　اور مسند کو تو خورشید سے اچھا کہیئے

یہ کوئی کہتے میں کہنا ہے الٰہی توبہ
ایسے کہنے کو تو چھوٹوں کا مربہ کہیئے

یعنی تحقیر کسی شے کی اگر ہو منظور　　یدِ بیضا کو ہتیلی کا پھپھولا کہیئے
ہو بڑھانا ہی کسی چیز کا گر مدِ نظر　　بالا خانہ کو تو پھر عالمِ بالا کہیئے
دلنشیں ہو جو پری رویوں کی تعریف تو پھر　　ایسی صحبت کو تو اندر کا اکھاڑہ کہیئے
باغ میں مُردہ دلی دور اگر ہو جائے　　نکہتِ گُل کو بہار دمِ عیسیٰ کہیئے
گوش شنوا ہوں تو پھر گُل کو بھی کہیئے بہرا　　چشمِ بینا ہے تو آئینے کو اندھا کہیئے
دہن و عارض و گیسو کی ہو تعریف اگر　　اسے شیریں، اسے عذرا، اسے لیلا کہیئے
زرِ گُل، نکہتِ گُل، جلوۂ گُل کی تشبیہ　　حسنِ یوسف، دمِ عیسیٰ، یدِ بیضا کہیئے
کیجے پابندیٔ الفاظ سے انصاف کا خون　　ہو فرنگی کوئی کالا بھی تو گورا کہیئے
ہاں مگر اپنی طرف سے تو نہ کہیئے کچھ بھی　　یعنی جیسا جسے کہتی ہے یہ دنیا کہیئے
یہ عنایت ہے کسی بد کو اگر گنیے نیک　　یہ شرافت ہے بُرے کو بھی جو اچھا کہیئے

اس نئی مدح شنی میں اس قدر اندھیر صفیؔ
دوسرا ہو تو اسے کہیئے، اُنہیں کیا کہیئے

ہو جو تاثیرِ سخن میں اسے جادو کہیئے　　طبع آجائے روانی پہ تو دریا کہیئے
کیوں گُل داغِ جگر کو مہِ کنعاں لکھیے　　بختِ خوابیدہ کو کیوں خوابِ زلیخا کہیئے
فائدہ کیا ہے جو شوقِ دلِ جاہلاں لکھیے　　واسطہ کیا ہے جو وصفِ رُخِ لیلا کہیئے
گنجلک کہنے ہی میں ہے جو کوئی استادی　　نہ قصیدہ نہ غزل صرف معمّا کہیئے
بات غالبؔ کی جو تھی ساتھ گئی غالبؔ کے　　زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیئے
اب میں کہتا ہوں لکھ لیجے مرا کہنا سُنئے　　یہ نہیں عرض کسی سے مرا کہنا کہیئے

بات کہنے میں مگر وقت گزر جاتا ہے　　آپ ہی سوچ کے کہیئے کہ بھلا کیا کہیئے
یہ محمد کی ہے شادی کہ جو ہے ابنِ صلاح　　اور دعوت یہ وہ ہے جس کو ولیمہ کہیئے

مجھ سے نوشاہ نے نوشاہ کے بھائی نے کہا	جس قدر آپ سمجھ لیں اسے جتنا کہیے
مجھ سے ان دونوں نے کوئی بھی نہ کی فرمائش	ہاں مگر تھا یہ بعضوں کا تقاضا کہیے
اور تاکید پہ تاکید تھی ہر دم جاری	زور دے کر یہ کہ کہیے بہت اچھا کہیے

اب سے یہ مگر بھلا اپنی کروں کیا تعریف	کوئی کہہ دے جو مری شادی کا سہرا کہیے
دوستا نے ہی کو دیدیتا ہوں میں استعفا	اب مجھے آپ برا کہیے کہ اچھا کہیے
کار و افکار کا یہ رنگ کہ گو ہم مشغول	مشق بالکل نہیں اس پہ مجھے بچہ کہیے
یہ تو اک شغل ہوا اور نہ گو ہم مشکل	آپ سے طالبِ انصاف ہے بندہ کہیے
نہ ہو تحریر کی فرصت تو بھلا کیا لکھئے	نہ ہو تقریر کی طاقت تو بھلا کیا کہیے

ہاں مگر حسن کی عنایت سے مری افسردہ دلی
اس کے کہنے کو حریفِ دمِ عیسیٰ کہیے

اب ہوئی سوچ کہ سنگ آمد و سخت آمد ہے	دل میں جو بات ہے آخر اسے کیا کیا کہیے
کبھی فرصت کا اشارہ کوئی سہرا لکھئے	کبھی غیرت کا تقاضا کہ قصیدہ کہیے
کبھی تفتیش کہ لکھے بھی تو کیا کیا لکھئے	کبھی تشویش کہ کہیے بھی تو کیا کیا کہیے
کبھی یہ فکر کہ تزئینِ سخن کی خاطر	خوب جی کھول کے نوشاہ کا سراپا کہیے

بال کو کہیے دبالِ دلِ حورانِ بہشت	رشکِ ظلمات و حریفِ شبِ یلدا کہیے
زلف کو حبلِ متین سنبل و عقرب لکھئے	کافر و طرۂ طرار و چلیپا کہیے
سرِ نوشاہ کی تشبیہ ہو منظور اگر	آسمان اور اسے خیمۂ لیلا کہیے
مانگ کو لکھئے کہ ہے جادۂ ظلمات	اور پھر کاہکشانِ شبِ یلدا کہیے
آنکھ کو مانیے صد غیرتِ چشمِ آہو	چشمِ آہو نہ سہی نرگسِ شہلا کہیے
کہیے رخسار کو گلنار و گلِ لالہ ہے	اور آئینہ سمجھ کفِ موسیٰ کہیے
خال کو مشتری و زنگی و ہندو لکھئے	نقطۂ کورِ نگاہ و پرِ زاغ بنفشہ کہیے
لب کو لکھئے کہ ہے یاقوت و عقیق و مرجاں	اور پھر اس سے سوا معجزِ عیسیٰ کہیے
تنگ کیجے جو دہن کو تو سمجھئے معدوم	کبھی ذرّہ کبھی گوہر دو خاتم و غنچہ کہیے

سلک الماس سے دانتوں کو جو دیجیئے تشبیہ　　کیوں انھیں اور بہ معاکر نہ ثریا کہیئے
سیب کہئے جو زنخداں کو تو غبغب کو ہلال　　رہی گردن تو اسے گردن مینا کہیئے

چہ نہالے ہیں چبائے ہوئے سب لوگوں کے　　گر گریبان سلف کا اسے جھوٹا کہیئے
یوں نباتات جمادات سے دیجیے تشبیہ　　کہیئے ایسا کہ کہیں لوگ، دوبارا کہیئے
آدمی اشرف مخلوق ہے مسجود ملک　　اس کی عزت ہے اگر خاک کا پتلا کہیئے

آج کی بزم ہے تقریب ولیمہ کی بزم　　جس کی خاطر ہے یہ ہے بس اسے دولہا کہیئے
اسے پہلی ہے وہ نعمت جو ملی آدم کو　　دوسرے لفظوں میں یا پسلی کا جھگڑا کہیئے

انتظامات اگر بزم کے آ جائیں پسند　　تو اسے حضرت داعی کا سلیقہ کہیئے

اور میں نے جو کہا یہ تو ہے مجذوب کی بڑ
تہنیت اس کو سمجھیئے نہ قصیدا کہیئے

فقط: حکیم بہبود علی صفی اورنگ آبادی

غزل

علی بن ایاز

اِدھر شورش ہے صرصر کی اُدھر ہے زورِ طوفاں کا
مگر اللہ والی ہے چراغِ زیرِ داماں کا

اسیرانِ بلا پر کیا گزرتی ہے، وہ کیا جانیں
نظارہ کر رہے ہیں لوگ جو ساحل سے طوفاں کا

گلوں نے ہنس کے خود ہی راز اپنے کر دیئے افشاء
کلی لب بستگی سے لے رہی تھی کام درباں کا

یہاں کیونکر نہ تڑپائیں بہاریں اس کی یاد آکر
کبھی میں بھی تو تھا اے دوست بلبل اس گلستاں کا

ردائے استطاعت اس قدر ہے مختصر اپنی
اِدھر ہیں پاؤں کھل جاتے اُدھر سر کو اگر ڈھانکا

مری تر دامنی پر انگلیاں اٹھتی تو ہیں لیکن
سمجھتا راز کوئی کاش میرے چاکِ داماں کا

مراتب عشق کے ہیں کس قدر اونچے، کوئی سمجھے
نگاہِ ناز دیتی ہے دہانِ زخم کو ٹانکا

کسی کا نام لیوا ہوں بڑی سرکار ہے میری
یہاں آتے ہوا جاتا ہے زہرہ آبِ شیطاں کا

جو کچھ بھی ہے یہاں میں اعتبار اپنی نظر کا ہے
ہے نقشہ ایک ہی ورنہ نیستاں کا بیاباں کا

ایازِ لاابالی نے ہے پایا کچھ مزاج ایسا
کہ یہ مردِ خدا، اے دوستو یاں کا نہ ہے واں کا

سایونارا

خورشید ملک
تارن تلکی شاہجہانپوری

میں برسات اور سخت سردی کے ایام کو چھوڑ کر کھلے آنگن میں سونا پسند کرتا ہوں۔ مگر ٹوکیو جیسے شہر میں کھلا آنگن کہاں میسر؟ میں اپنی کمپنی کی طرف سے تین ماہ کے لیئے جاپان گیا ہوا تھا۔ ٹوکیو مجھے خواب و خیال سے بھی حسین لگا۔ اس کے گلی کوچوں میں بھی اتنی صفائی ہے کہ اپنے ملک کا سمو پولیٹن شہروں کے چوراہوں پر بھی نہیں ملتی ہے۔

میرا قیام یہاں کے اوسط درجہ کے ہوٹل میں ہے بہت سستا ہونے کے باوجود یہ اپنے یہاں کے فائیو سٹار ہوٹلوں سے زیادہ اچھا ہے۔ میں چند روز میں ہی بند کمرے میں سونے سے اوب گیا چنانچہ ایک دن میں نے فیصلہ کیا کہ ہوٹل میں غسل کرنے کی بجائے کسی پبلک حمام میں غسل کروں تاکہ اسی بہانے کھلے آسمان کے نیچے چہل قدمی ہو جائے ایک شاہراہ الگ بھگ آدھا کیلومیٹر پیدل چلنے کے بعد مجھے ایک پبلک حمام نظر آیا جہاں اسٹیم باتھ اہتمام تھا۔ میں اندر داخل ہوا۔ مگر اندر کی بھیڑ دیکھ کر مجھے اپنے یہاں کے ٹرے ریلوے اسٹیشن کے سکنڈ کلاس کے حمام یاد آگئے۔

فرق صرف اتنا تھا کہ یہاں مرد اور عورتیں ایک ساتھ غسل کر رہے تھے اپنے یہاں تو غیر مردوں کے سامنے غسل کر ہی نہیں سکتیں۔ اور مرد بھی عورتوں کے سامنے غسل کرنے میں جھجک محسوس کرتے ہیں۔ مجھے اسٹیم باتھ لیتے ہوئے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ برابر میں اسٹیم باتھ لیتی ہوئی ایک جاپانی لڑکی نے مجھے مخاطب کر کے پوچھا "کیا آپ ہندوستانی ہیں" میں نے یہاں ہندوستانی اور پاکستانیوں کے علاوہ کسی جاپانی کو ہندوستانی بولتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہ پہلی جاپانی لڑکی تھی جس کو میں نے شستہ ہندوستانی میں بات کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا "جی ہاں! بندہ خالص ہندوستانی ہے۔ اس نے درخواست کیا مہربانی فرما کر میری پیٹھ مل دیجئے" میں بوکھلا گیا اور ہونقانہ انداز میں اس طرف دیکھنے لگا مجھے تذبذب میں دیکھ کر وہ جھنجھلا گئی اور بولی جلدی کیجئے۔ میرا وقت ختم ہو رہا ہے" میں نے گھبرا کر جلدی سے اس کی صاف و شفاف پیٹھ ملنا شروع کر دی اور چند لمحات -

اِدھر اُدھر دیکھا۔ یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ اس حمام میں بہت سے مرد اور عورت ایک دوسرے کی پیٹھ مل رہے ہیں۔ اس کی خوبصورت پیٹھ۔ سے ذرا بھی میل نہیں نکلا۔ اپنی پیٹھ ملوانے کے بعد وہ بولی" لائیے اب میں آپ کی پیٹھ مل دوں۔ قبل اس کے کہ میں منع کرتا اُس نے میری پیٹھ ملنا شروع کر دی۔ ہم ہندوستانیوں کو بہت میل نکلتا ہے۔ خواہ دن میں دو مرتبہ غسل کریں۔ وہ بولی" چھی۔ کتنا میل نکل رہا ہے"

میں شرم سے پانی پانی ہو گیا۔

اس اثنا میں اس نے میرے بارے میں بہت کچھ دریافت کر لیا۔ حتیٰ کہ ہوٹل کا پتہ بھی معلوم کر لیا۔ ہم دونوں حمام سے ساتھ ہی باہر نکلے۔ میں اس کے بارے میں جاننے کے لئے بے چین ہو رہا تھا۔ میں نے اسے کافی پینے کی دعوت دی۔ یکلخت اس کا موڈ بگڑ گیا اور ترش لہجہ میں بولی "پیٹھ ملوانا دوستی کا اظہار کرنے کی دلیل نہیں ہے۔ آئندہ بھول کر بھی اس طرح کسی لڑکی کو کافی پینے کی دعوت ہرگز نہ دیجئے گا۔ ویسے میں خود آپ سے تفصیلی بات کرنا چاہتی ہوں۔ مگر اس وقت میرے پاس وقت نہیں ہے۔ یہ رہا میرا کارڈ" وہ کارڈ میرے ہاتھ میں تھما کر شہلاؤ کی بھیڑ میں گم ہو گئی۔ مگر میں اس کے نام کی لذت میں کھو گیا۔ اماشو کتنا خوبصورت اور رسیلا نام ہے۔ سٹی واچ کمپنی میں ملازمت کرتی ہے اس کے نام میں بھی وہی انداز وہی شوخی اور وہی بانکپن تھا۔ جو خود اس کے سراپا میں تھا۔ واقعی وہ جاپانی حسن کا جیتا جاگتا شاہکار تھی۔ سفیدی مائل جلد، گول کبوتر جیسی آنکھیں جن میں غضب کا خمار تھا۔ قدرے چپٹی ناک، گولائی لئے ہوئے ہونٹ، بیضاوی چہرہ اور سنہرے بال۔ غسل کے مختصر لباس میں تو اس کا مجسم پیکر غضب ڈھا رہا تھا۔

دو دن تک میں اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ تیسرے دن مجھ سے برداشت نہ ہوا۔ لہٰذا میں نے اسے فون کیا۔ چند منٹ بعد اس کی آواز آئی مگر اس نے کہا "میرے کام کا وقت ہے سوری" اور فون رکھ دیا۔ میں فون کو دیکھتا ہی رہ گیا۔

اتوار کی صبح کو میں بستر پر ہی تھا کہ ہوٹل کی ریسپشنسٹ نے مجھے فون کر کے بتلایا کہ ایک لڑکی میری منتظر ہے۔ میں خوشی کے مارے اچھل پڑا۔ یقیناً وہ اماشو ہی ہو گی۔ کیونکہ کہ اس کے علاوہ میری کسی اور لڑکی سے شناسائی ہی نہ تھی۔ میں نے اس کو کمرے میں بھیج دینے کے لئے کہا لیکن ریسپشنسٹ نے انکار کر دیا۔ کیونکہ ہوٹلوں کے ضابطوں کے مطابق کوئی لڑکی کسی تنہا مرد کے کمرے میں نہیں جا سکتی ہے۔ مجھے جاپان جیسے ترقی یافتہ ملک کی یہ قدامت پسندی دیکھ کر حیرت ہوئی۔ پھر میں نے سوچا کہ جاپان بھی ایک ایشیائی ملک ہے لہٰذا وہ مشرق کی رواداری سے انحراف کیوں کر کر سکتا ہے۔؟ بہرحال میں نے ریسپشنسٹ سے کہا کہ "آپ یہ کیوں بھول رہے ہیں کہ اس وقت رات نہیں بلکہ دن ہے"۔ یہ بمشکل تمام وہ اماشو کو کمرے میں بھیجنے پر رضامند ہوئی۔ میں نے فوراً ڈبل ناشتے کا آرڈر دیا۔ اور اماشو کا استقبال کرنے کی تیاری کرنے لگا۔ چند منٹ بعد وہ دستک دے کر اندر داخل ہوئی۔ میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ ساڑی میں ملبوس تھی۔ حسین لڑکی ہر لباس میں حسین نظر آتی ہے۔ مگر ساڑی میں وہ غضب

ڈھار ہی تھی۔ ویسے بھی مجھے عورتوں کو گھٹنوں کے نیچے عریاں رکھنے والے لباس قطعی پسند نہیں ہے۔ اس نے مجھے خالص لکھنوی انداز میں قدرے جھک کر آداب کیا اور اس دن فون پر بے رخی سے پیش آنے کی معافی مانگی۔ اس نے بتایا کہ جاپانی پورا ہفتہ بہت مشغول رہتے ہیں۔ چھٹی یا اتوار کے دن بالکل فرصت میں رہتے ہیں۔

ناشتے کے دوران میں نے پوچھا "اب تم اپنے بارے میں کچھ بتاؤ۔ تم نے اتنی شائستہ ہندوستانی کہاں سیکھی ہے"

وہ بولی "میرے والد ہندوستان کے جاپانی سفارت خانہ میں پندرہ برس پریس اتاشی رہے ہیں۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا اپنے آپ کو ہندوستان میں پایا۔ اندر پرستھ کالج دہلی سے گریجویشن کرنے کے بعد میں نے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے ویمنس پالی ٹیکنک سے الیکٹرونک میں ڈپلوما کیا اور ساتھ ہی اردو بھی پڑھی۔ مجھے ہندوستان سے بے پناہ عقیدت ہے"

ناشتہ ختم ہو چکا تھا۔ میں بولا "تمہاری ہندوستان سے بے پناہ عقیدت کی وجہ بعد میں پوچھوں گا۔ یہ بتاؤ کہ تم میرے ساتھ اوساکا چل سکتی ہو؟" وہ راضی ہو گئی۔ ہم جلدی سے تیار ہو کر ریلوے اسٹیشن پہنچے۔ ہم دونوں دنیا کی سب سے تیز رفتار گاڑی بلٹ میں بیٹھ کر اوساکا چل دیئے۔ عجیب و غریب ساخت کی اس گاڑی کے اندر بیٹھ کر اس کی برق رفتاری کا اندازہ ہی نہیں ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ پانی سے بھرا ہوا گلاس ذرا سا بھی چھلک جائے۔ ملک کے برعکس اپنے یہاں کی گاڑی مسافر کے پورے وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہیں اور ہمیں گاڑیوں کی رفتار اتنی سست ہوتی ہے کہ مسافر کو احساس ہونے لگتا ہے کہ وہ گاڑی میں قیام کئے ہوئے ہیں۔ ان کے تاخیر سے چلنے کا تذکرہ کرنا ہی فضول ہے۔

میں نے اماشو سے پوچھا "ہاں۔ اب تم وجہ بتاؤ"

اس نے کہا "مجھے علیگڑھ کی روایتی تہذیب نے بے حد متاثر کیا ہے۔ حالاں کہ اب وہاں بہت کچھ تبدیلی آگئی ہے۔ میرے مذہب کے بانی گوتم بدھ ہندوستانی تھے۔ اس کے علاوہ نانک، چشتی، گاندھی، اقبال، ٹیگور اور اندرا گاندھی جیسی عظیم ہستیوں نے وہیں جنم لیا۔ اس ملک نے عشق و محبت کے کئی لافانی مثالیں دنیا کے سامنے پیش کی ہیں۔ تاج محل جیسی لاثانی عمارت وہیں ہے۔ ایسے ملک سے عقیدت ہونا قدرتی بات ہے۔ اس کے علاوہ میں نے اپنی زندگی کے بہترین ایام وہاں گزارے ہیں۔

"کوئی برائی بھی نظر نہیں آئی؟" میں نے دریافت کیا۔

"بہت برائیاں ہیں" اس نے اپنی سنہری زلفوں کو جھٹکتے ہوئے کہا "ہندوستانی وقت کی بالکل قدر نہیں کرتے وہ ہوٹلوں میں بیٹھ کر گھنٹوں فضول کی باتیں کرتے ہیں۔ وہ اپنا وقت تعمیری اور تخلیقی کام کے لئے قطعی صرف نہیں کرتے۔ وہ اپنے لا محدود وسائل کو صحیح ڈھنگ سے استعمال کرنے کی کوشش نہیں کرتے ہیں۔ ان کے اندر قومیت کے جذبے کی بے حد کمی اور ذاتی مفاد کی بے حد زیادتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں بے روزگاری بہت ہے اور بھیک مانگنے والوں کی کثیر تعداد ہے"

میں نے کھڑکی کے شیشے

جاپان کے دیہی علاقے بھی مجھے اپنے یہاں کے بڑے شہروں سے زیادہ ترقی یافتہ نظر آئے۔ لہلہاتے کھیت اس حقیقت کی غمازی کر رہے تھے۔ زراعت کے میدان میں بھی جاپان ہم سے بہت آگے ہے۔ میں نے اماشو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کچھ جاپان کے بارے میں اظہارِ خیال کرو۔" میری اس فرمائش پر اس کا چہرہ دمکنے لگا۔ اور مجھے جوش سے بولی۔ جاپانی وقت کی بہت قدر کرتے ہیں۔ آپ کبھی کسی جاپانی کو فضول وقت خراب کرتے ہوئے نہیں پائیں گے۔ ہم کسی چیز کو بے کار سمجھ کر ضائع نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ اس سے کوئی نہ کوئی کارآمد شے ضرور بنا لیتے ہیں۔ مجھے یاد آیا کہ ایک بار میں کلکتہ جا رہا تھا۔ میرے ساتھ دو جاپانی ٹورسٹ بھی بیٹھے تھے۔ ایک اسٹیشن پر ہم تینوں نے ایک ایک گنا خریدا۔ میں نے اپنے دانتوں کی مضبوطی کا مظاہرہ کرنے کے لئے اپنا گنا جلدی جلدی چوس کر ختم کر دیا۔ مگر ان جاپانیوں نے پہلے چاقو کی مدد سے گنے کو چھیلا اور پھر قرینے سے گنڈیاں بنا کر چوسیں۔ بعد میں ان چھلکوں کی ایک نہایت دیدہ زیب چھوٹی سی ٹوکری بنا لی۔ ہوڑہ کے پلیٹ فارم پر انہوں نے اس ٹوکری کو تین روپئے میں فروخت کر دیا جب کہ ایک گنے کی قیمت صرف پچاس پیسے تھی۔ اماشو برابر بولے جا رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ دوسری جنگ عظیم میں بری طرح تباہ ہو جانے کے باوجود ہم نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ ہمارے کھلونے دنیا بھر میں مشہور ہو گئے۔ ہم نے اتنی تیزی سے ترقی کی کہ امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں صنعت کی بے حد مانگ ہو گئی۔ اور ہمارے سکے نے ان کے ڈالر کی قیمت کم کر دی۔"

میں نے اس کی حسین غزالی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا "کوئی کمی بھی ہے؟"

"بہت کمیاں ہیں،" وہ بولی، "ہمارا ادب کی طرف رجحان بہت کم ہے۔ یعنی شاعری ناول اور افسانے سے بہت کم لگاؤ ہے۔ ہم عشق و محبت کے جھمیلوں میں بہت کم پڑتے ہیں۔ ان سب کی خاص وجہ ہے کہ ہمارے پاس وقت ہی نہیں ہے۔ آگے بڑھنے کی دھن میں ہم اپنے آپ کو بھول گئے ہیں۔ اور قدرت کی لطافتوں کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں سلیم انارکلی، ہیر رانجھا، شاہجہاں ممتاز جیسے رومانی جوڑے آج تک نہیں پیدا ہو سکے۔"

باتوں میں وقت کا پتہ ہی نہ چل سکا۔ اور ہم اوساکا پہنچ گئے۔ وہ بولی "ہم کو جلدی جلدی یہاں کے مقامات دیکھنا پڑے گا۔ ورنہ واپسی کی گاڑی نہ مل سکے گی۔ ویسے بھی ٹوکیو پہنچتے رات ہو جائے گی۔" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا کیا مجھ سے تم کو کوئی خطرہ محسوس ہو رہا ہے؟ اس کی پلکیں حیا کے بوجھ سے جھک گئیں اور چہرہ گلنار ہو گیا۔ عورت کرۂ ارض کے کسی خطہ کی ہو اس کے شرمانے کا انداز یکساں ہی ہوتا ہے۔

اوساکا جاپان کے بڑے شہروں میں شمار ہوتا ہے۔ وہاں میں نے عجیب و غریب چیزیں دیکھیں۔ گھومتے گھومتے جب تھک گئے تو ہم دونوں ایک ریستوران میں کافی پینے بیٹھ گئے۔ میں نے اماشو کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا بہت ہی قلیل وقت میں ہم۔

ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب آگئے۔ کیوں ہے نا؟
اس نے بمشکل تمام اپنی بوجھل پلکیں اٹھائیں اور ایک لمحے کے لئے میری طرف دیکھا اور فوراً ہی گردن جھکا کر ساڑی کے پلو کو اپنی حنائی انگلیوں میں لپیٹنے لگی۔ اقرار کرنے کا اس سے بہتر اور موثر طریقہ کوئی حسینہ کیوں کر اپنا سکتی ہے؟ واپسی کا سفر بھی باتوں میں بڑی آسانی سے کٹ گیا۔ وہ کئی اتوار کو ملنے کا وعدہ کر کے چلی گئی۔ میں نے غور کیا کہ یہاں اسٹیم انجن کا بالکل استعمال نہیں ہوتا۔ جب کہ اپنے یہاں کی کافی ضرورت انہیں سے پوری ہوتی ہے۔

اماشو کے ساتھ جاپان میں میرا وقت اچھا گزرا ہم دونوں ناگاساکی اور ہیروشیما بھی گئے۔ وہاں جنگ کی ہولناکیاں دیکھ کر میں لرز گیا۔ کاش انسانیت سوز حرکت کی بجائے کوئی اور طریقہ اپنا کر جاپانیوں کی پیش قدمی [illegible] جاتی۔ اماشو نے میرے ساتھ کئی راتیں بسر کیں مگر ہم دونوں گنگا اور جمنا کی طرح سنگم کے بعد بھی پاکیزگی کا دامن پکڑے رہے۔ جو کیف و سرور ہم دونوں نے محض قربت سے حاصل کیا وہ وصل عارضی لذت سے زیادہ کیف آگیں اور مسرور کن تھا۔ جب میرے واپس لوٹنے میں چند دن رہ گئے تو میں نے اماشو سے کہا، "میری زندگی تمہارے بغیر ادھوری ہے۔ کیا زندگی بھر ساتھ دینے کے لئے تم میرے ساتھ ہندوستان چل سکتی ہو؟" اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ میرے کشادہ سینے میں سر چھپا کر بولی، "آپ کو پا کر میں سمجھتی تھی کہ مجھے اپنی زندگی کا مقصد حیات حاصل ہو گیا ہے۔ مگر افسوس میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکتی۔" "کیوں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ وہ بولی، "مذہب، سماج اور تہذیب مختلف ہونے کی وجہ سے ہماری ازدواجی زندگی میں بے پناہ الجھنیں آئیں گی۔ اس کے علاوہ اپنے ملک کو چھوڑ کر اس خدمت سے اس کو محروم نہیں کر سکتی جس کی وہ ہوں۔ میں اپنے پرکھوں کے ملک کو کیسے چھوڑ دوں جاپان اور ہندوستان نے لگ بھگ ایک ساتھ ہی اپنی نئی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ مگر جاپان بہت آگے نکل گیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جاپان زیادہ بہتر ملک ہے لہٰذا اس ملک کی عظمت پر اپنی محبت کو قربان کر دینے میں مجھے کوئی عار نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے،" میں نے مایوسی سے کہا، "میں بھی اپنے کو ادھورا ہی رکھوں گا۔"

"آپ ایسا ہرگز نہ کیجئے گا۔" اس نے جلدی سے کہا "اگر آپ نے شادی نہ کی تو گوتم بدھ کی بیوی کی طرح میں بھی زندگی بھر آپ کو معاف نہیں کروں گی۔ انہوں نے عرفان حاصل کرنے کے لئے اپنی بیوی کی زندگی برباد کر دی جس کا ان کے پاس کوئی جواز نہ تھا۔ ہاں، آپ میری کہانی ضرور لکھئے گا۔ میں اس کا جاپانی میں ترجمہ کراؤں گی۔ ممکن ہے کہ میری کہانی سے جاپانیوں میں عشق و محبت کا شعور بیدار ہو جائے۔"

ایئر انڈیا کا جمبو جیٹ پالم ایئرپورٹ کے اوپر چکر لگا رہا ہے۔ اور لینڈنگ کے سگنل کا منتظر ہے۔ میں اپنے وطن پہنچ کر بہت خوش ہوں مگر میرے ساتھ غم کا اذیت ناک بوجھ بھی ہے۔ میں اماشو کی کہانی ضرور لکھوں گا۔ ہو سکتا ہے کہ اس کہانی کو پڑھنے پر وہ اپنا نظریہ تبدیل کر لے۔ میں اس کی یادوں کو سینے

[illegible] —— اپنے وطن عزیز کی سرزمین پر اترنے کی تیاری کر رہا ہوں مگر میرے کانوں میں اماسو [illegible] ہونٹوں سے ادا ہونے والا آخری لفظ رس گھول رہا ہے: جمبو جیٹ کی مہیب گرج بھی اس میں مانع نہیں ہو پا رہی ہے۔ [illegible] آنسوؤں کے امنڈتے ہوئے سیلاب پر کسی نہ کسی طرح قابو کرتے ہوئے اماشو نے ٹوکیو ایرپورٹ پر ہاتھ [illegible] ہلاتے ہوئے مجھے وداع کیا تھا اور کہا تھا۔ سایونارا۔

سچ ہے کہ جب انسان پر بہت سخت وقت پڑتا ہے تو اس کی زبان سے مادری زبان ہی کا کوئی لفظ ادا ہوتا ہے۔

غزل

(سرپٹ حیدرآبادی)

پریشان عاشقی ہے حسن کا کردار زخمی ہے
کبھی اقرار زخمی ہے، کبھی انکار زخمی ہے

دلوں میں زخم ہے سب کے، دلوں کا ساز زخمی ہے
جہاں تک دیکھتا ہوں، سارا کاروبار زخمی ہے

تھی کل تک جامہ زیبی شاعری کی دید کے قابل،
مگر اب تو لباسِ شعر کا ہر تار، زخمی ہے

اسی میخانۂ ہستی میں کل تک رنگ رلیاں تھیں
اسی میخانہ میں کیوں آج ہر مے خوار زخمی ہے

غریبی کے مصائب سے ہیں دل زخمی غریبوں کے
لئے دل میں محبت زر کی، ہر زردار زخمی ہے

عقیدہ آج ہے ڈس مس عقیدت مند ہیں ڈل مل
کہیں تسبیح ہے زخمی، کہیں زنار زخمی ہے

یہ ہر شئے بے مزہ کیوں ہے، ملاوٹ کیوں ہے ہر شئے میں
یہ آخر کس لئے بھنڈار کا بھنڈار زخمی ہے

حسین کوئی نہیں آیا لب بام ایک مدت سے
نظر کس کی لگی، کیوں جلوہ گاہِ یار زخمی ہے

گئی فصلِ جوانی، آیا موسم بڑھاپے کا
میرے جذبات کی اب گرمیٔ بازار زخمی ہے

خدا معلوم کب ڈھ جائے بوسیدہ ہے کہنہ ہے
میں اب جس گھر میں ہوں اس گھر کی ہر دیوار زخمی ہے

جو مریل ٹٹوؤں کے ساتھ دوڑے دوڑ کیا اس کی
اسی سے آجکل سرپٹ کی یہی رفتار زخمی ہے

نصیب کی شاعری

سید علی برتر

جناب داؤد نصیب کو میں اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ رزیڈنسی میڈل اسکول کے طالب علم تھے جو اب سلطان بازار ہائی اسکول بن چکا ہے۔ میں بھی اس زمانہ میں اس اسکول میں پڑھتا تھا۔ یہ زمانہ اندازاً ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۹ء تک کا ہوگا۔ داؤد نصیب ایک خاموش صفت طالب علم تھے ان کا تعلق ایک غریب خاندان سے تھا۔ اور اسی سبب سے وہ مڈل اسکول کے بعد اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ اسکول کے بعد ان سے ملنے کا بہت کم موقع ملا۔ البتہ جب کبھی میری ملاقات اپنے عزیز دوست جناب حبیب احمد علی صاحب سے ہوتی تو ان کی بابت گفتگو ہوتی۔ انہیں کچھ عرصہ پہلے معلوم ہوا کہ داؤد نصیب کی شعری تخلیق "نقیب" شائع ہو چکی ہے۔ چنانچہ مجھے اس کتاب کے پڑھنے کا موقع ملا اور یہ چند سطور ان کی شاعری سے متعلق پیش کر رہا ہوں۔

نصیب کا "نقیب" بعض حقیقتوں کا بیانگ دہل اعلان کر رہا ہے۔ سب سے پہلی حقیقت یہ ہے کہ خداداد صلاحیت کو ابھرنے کیلئے کسی مدد کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے۔ داؤد نصیب کو مڈل اسکول سے زیادہ تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اس کے باوجود ان کی کتاب پڑھنے والا محسوس کرتا ہے کہ داؤد نصیب میں شعری صلاحیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ اور وہ اشعار اس سلیقہ سے کہتے ہیں کہ ان کی کہنہ مشقی کا لوہا ماننا پڑتا ہے۔ پھر زبان و بیان کی صحت ایسی ہے کہ معلوم ہو شعر کہنے والا اردو زبان کا پوسٹ گریجویٹ ضرور ہوگا۔ عقل حیران ہوتی ہے جب اس حقیقت سے واقف ہوتے ہیں کہ انھوں نے باضابطہ کسی بڑے شاعر کے سامنے بھی اپنا زانوئے ادب تہہ نہیں کیا۔ چونکہ ان کو بعد میں حضرت فصاحت جنگ جلیل کے خاندان کے حلقۂ شعر و ادب میں جانے کا موقع ملا۔ انہوں نے نہایت ایمانداری سے اپنی اس وابستگی کا اظہار کیا ہے چنانچہ کہتے ہیں

جلیلی میکدہ کا رند ہوں میں مجھے اک جام مینائی بہت ہے

ایک دوسری حقیقت نقیب کے سلسلہ میں یہ ہے کہ یہ داؤد نصیب کی پہلی تخلیق ہے لیکن یہاں ایک بات قابلِ غور ہے۔ ایک نوجوان شاعر جسے شعر کہتے ہوئے دو چار سال ہوتے ہیں اپنی پہلی تخلیق پیش کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں بہت سی باتیں قابل اصلاح ہوتی ہیں۔ فن و زبان کی پختگی کا فقدان ہوتا ہے اور شاعر جیسے جیسے تجربہ حاصل کرتا جاتا ہے اس کی دوسری تخلیقات اچھی سے اچھی بنتی جاتی ہیں۔ لیکن داؤد نصیب کی یہ پہلی تخلیق ایسی پہلی تخلیق نہیں ہے یہ کئی سال کی محنت کا تحفہ ہے بلکہ ایک زندگی کا سرمایہ ہے اس پر مشہور لاطینی ادیب ہوریس کے نو سال تو کیا کئی نو سال گذر چکے ہیں اس لئے یہ داؤد نصیب کی بہترین تخلیق ہے۔ جس کو ایک قادر الکلام شاعر کی شاندار تخلیق ہونے کا فخر حاصل ہے۔ اس میں شاعری کی صلاحیت کا بدرجۂ اتم اظہار ہے۔ اس میں سلاستِ زبان۔ خوبیاں۔ نازک خیالی۔ حسنِ تعلیل۔ سوز و گداز۔ استحصال ناجائز کے خلاف جنگ۔ الفاظ و محاورات کی خوبصورت تراکیب سب ہی پائی جاتی ہیں۔ شعر سے دلچسپی رکھنے والا ناظر نقیب کو شروع کرنے کے بعد شاید ختم کر کے ہی چھوڑ سکے۔

نصیب نے اپنی اس تخلیق میں حمد و نعت، سلام اور منقبت کے بعد تمام غزلیں ہی پیش کی ہیں۔ اس لئے ان کا جائزہ ایک غزل گو شاعر کی حیثیت ہی سے لینا پڑے گا۔

شاعری جذبات و احساسات کو نازک انداز میں پیش کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اردو شاعری میں غزل کو ایک خاص مقام حاصل ہے کیونکہ اس سے واردات قلبی اور جذبات لطیف کا عمدگی کے ساتھ اظہار ہوتا ہے ابتداء میں غزل کے ذریعہ شاعر جذبات عشق و محبت کا اظہار کرتے رہے لیکن آج غزل کا دامن وسیع سے وسیع تر ہو گیا ہے اور اس میں ہر قسم کے خیالات پیش ہو رہے ہیں۔ پھر بھی غزل کا جو اصلی مزاج ہے اس کو باقی رکھا گیا ہے فلسفیانہ معاملات کے ساتھ تغزل کے اشعار بھی غزل کی خوب صورتی کو اور نکھارتے ہیں نصیب کی غزل میں بھی اظہارِ محبت ۔

محبوب کی تعریف۔ محبوب کی دید۔ محبوب کے نقشِ پا کے علاوہ کئی دوسرے مضامین ملتے ہیں مثلاً غم و احساس درد کے مضامین۔ جنون اور خرد کا نفسیاتی مقابلہ دورِ حاضر کی بے راہ روی۔ محنت کشوں سے بے اعتنائی کی مذمت شاعر کے عزم و حوصلے اور خودداری کے مضامین وغیرہ۔ پھر بات ایک ہی ہوتی ہے اس کے طریقے بائے مختلف ہوتے ہیں۔ شاعر نے ان مضامین کو نہایت خوب صورت الفاظ و تراکیب اور طریقوں سے ادا کیا ہے۔

اس سے پہلے کہ ہم داؤد نصیب کے اشعار کے ذریعہ ان کی فکر اور معنوی عمق کو پیش کریں۔ شاعر نے متعلق خود ان کے خیالات پیش کر دیتے ہیں تاکہ حاضرین محسوس کریں کہ وہ اپنے کلام کو اپنے معیار پر کہاں تک لاسکے ہیں۔ وہ نقیب میں یوں رقم طراز ہیں۔

" عام طور پر لوگ رسمی مضامین کو موزوں کر کے غزل گوئی کا حق ادا کرتے ہیں لیکن میں اپنی حد تک یہ سمجھتا ہوں کہ جب تک شعر میں کوئی نئی بات داخل نہ کی جائے یا کوئی نیا خیال پیش کیا جائے۔ اس وقت تک شعر شعر نہیں ہوتا۔ پھر یہ کہ دورِ جدید کا یہ تقاضہ بھی ہے کہ اسلوب کو بھی کچھ نئے موڑ دئے جائیں اور غزل کی لفظیات میں بھی کچھ نئے اضافے کئے جائیں میری غزل گوئی کا یہی مسلک ہے "

اس کے علاوہ نصیب کے ایک شعر سے بھی شاعری کے متعلق ان کے خیالات واضح ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں

ہے نصیب شاعری کیا یہی دل کی ترجمانی ‌ ‌ ‌ ‌ مگر اتنا یاد رکھنا کہ فن و زباں سمجھ کر

اب ہم بعض مستقل عنوانات کے ذریعہ نصیب کی شاعری کا جائزہ لیں گے سب سے پہلے یہ دیکھیں گے کہ نصیب نے عشق و محبت کے میدان میں کیا مضامین باندھے ہیں۔ نصیب کے پاس محبوب کی ذات ہی اصل حقیقت ہے۔ اس خیال کو پیش کرنے کیلئے انھوں نے بعض بہت اچھے اشعار پیش کئے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے۔

زندگی بھی ملی میکدہ بھی ملا اور کعبہ ملا بتکدہ بھی ملا ‌ ‌ ‌ ‌ اک حقیقت کی منزل اسی کیلئے رابطہ رکھنا پڑا کتنے اوہام سے

اس شعر پر بھی غور کیجئے:۔

خدا تجھے بھی محبت سے آشنا کر دے ‌ ‌ ‌ ‌ کہ زندگی کی حقیقت کو تو بھی پہچانے

محبوب کا جلوہ مختلف انداز سے ظاہر ہے۔ دیکھنے والے سمجھ نہیں پاتے

کہیں بجلی ہے کہیں پھول کہیں شمع کی لو ‌ ‌ ‌ ‌ تیرے جلوے کئی عنوان سے چمک جاتے ہیں

عشق کا منتہا دیدارِ یار سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے۔ نصیب کہتے ہیں

اس کے چہرہ پہ سب کی نظر رک گئی ‌ ‌ ‌ ‌ آکے منزل پہ ہر رہگذر رک گئی

نقشِ قدم شاعروں کے لئے بڑا پیارا عنوان ہے۔ اس پر نصیب کے کچھ اشعار سنیئے۔

کہتا ہے زمانہ کہ ترے نقشِ قدم ہیں ‌ ‌ ‌ ‌ میں سوچ رہا ہوں کہ ضیا کیوں نہیں دیتے

چراغِ رہگذر جب حادثوں نے پھونک ڈالے ہیں ‌ ‌ ‌ ‌ مسلسل روشنی دی ہے ترے نقشِ کفِ پا نے

وہ وقت بھی کیا عجیب ہوگا وہ نقشِ پا جب نصیب ہوگا ‌ ‌ ‌ ‌ کبھی جبیں ہوگی اس پہ قرباں کبھی نظر لوٹتی رہے گی

اب تک ہے خیالوں میں مرے روشنی اس کی ‌ ‌ ‌ ‌ مٹ کر بھی ترا نقشِ قدم ساتھ رہا ہے

تقلید کی اہمیت پر کتنا اچھا شعر کہا ہے۔

ہم ترے نقشِ کفِ پا پہ نظر رکھتے ہیں ‌ ‌ ‌ ‌ جن کی قسمت میں بھٹکنا ہے بھٹک جاتے ہیں

نصیب عشق و محبت کی نازک کیفیات کو اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

نصیب اہلِ محبت کے سکوں کا راز مت پوچھو ‌ ‌ ‌ ‌ جو دل کو توڑ دیتا ہے اسی کی بات کرتے ہیں

بجھ جائے راہِ عشق میں ممکن نہیں نصیب ‌ ‌ ‌ ‌ دل ہے کوئی چراغِ سرِ رہگذر نہیں

دو گام پہ کچھ بھی اگر ہے تو ہیں کیا ‌ ‌ ‌ ‌ اب پاؤں ترے در سے اٹھایا نہیں جاتا

ہم نے اس کی طرف بڑھ کے دیکھا نہیں — راہ دیر و حرم چھنتی رہ گئی

کتنا اچھا شعر کہا ہے :

تڑپ کی یہ کونسی منزل میں لے آئے ہیں آپ — انجمن میں ہوں مگر تنہا سمجھ لیتے ہیں لوگ

شوق اور جستجو ملاحظہ کیجیے۔

اس جستجوئے دید کی معراج دیکھنا — آگے نکل گئے اُسے ہم ڈھونڈتے ہوئے

۔ جو شخص دنیاوی کاروبار میں جتنا زیادہ ملوث ہو جاتا ہے اتنا ہی اپنے محبوب سے دور اور اس کے دیدار سے محروم ہو جاتا ہے چنانچہ کہتے ہیں :۔

بہت بچ کر تمہیں دیکھا ہے لیکن — یہ دنیا سامنے آئی بہت ہے

محبت میں بعض آداب کی پابندی ضروری ہے۔ چنانچہ نصیب کہتے ہیں :

فراقِ یار گوارا ہے عمر بھر لیکن — تڑپ تڑپ کے تماشہ نہیں کیا جاتا

اور

محفلِ یار میں نصیبؔ اکثر — کام میرے مرا وقار آیا

دیدار یار کے ضمن میں نصیبؔ کے دو ہی شعر پیش کر کے عشق و محبت کے عنوان کو ختم کیا جاتا ہے

اسی کا نام شاید جلوہ گاہ طور ہے جس جا — دل اس کے بس میں ہو جائے نظر محروم ہو جائے

تیرے جلوہ کا اتنا اجالا ہوا — تجھ کو میری نظر ڈھونڈتی رہی

ان آنکھوں کے مقدر پر نہ کیوں رشک آئے دنیا کو — کہ جن کو آپ کے دیدار سے فرصت نہیں ملتی

زندگی میں غم کا مقام مستحکم ہے۔ چنانچہ مرزا غالبؔ نے کہا تھا :

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں — موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

داؤد نصیبؔ کے پاس غم کے مختلف پہلوؤں پر بڑے اچھے اشعار ملتے ہیں۔ غم ایک ہمہ گیر اور دیرپا جذبہ ہے اس لئے شاعر اس سے متاثر رہتا ہے۔

دل اُسی کا نام ہے جو دھڑکتا رہے نصیبؔ — وابستگی ہو جس کو غمِ ناتمام سے !!

عشق کی منزل میں اُس دم دل نظر آتا ہے دل — جب کسی درد کی تصویر بن جاتا ہے دل

جس سے لذت تھی زندگی میں نصیبؔ — وہ خلش اب وہ اضطراب کہاں

غم دوست کی دین ہے۔ اس لئے شاعر کو بہت عزیز ہے۔

نہ ہو جو شاملِ کرم تمہارا نہیں ہے کمال جو غم تمہارا — نہ بندگی بندگی رہے گی نہ زندگی زندگی رہے گی

وہ تو آپ کے غم نے روک ہی لیا ورنہ — کیا خبر نکل جاتی زندگی کہاں تنہا

غمِ حیات سلامت رہے سدا اے دل — اسی سے عمرِ دوروزہ کا نام روشن ہے

راہِ عشق میں غم کا ساتھ چھٹ نہیں سکتا — زندگی کا سایہ ہے ساتھ ساتھ چلتا ہے

شاعر مختصر اور ناپائیدار خوشی کے مقابل ہمیشہ ساتھ دینے والے غم کا طرفدار ہے اور اس کو اپنی زندگی کا ساتھی بنا لیتا ہے کبھی کبھی خوشی کا دور آتا ہے تو شاعر پریشان ہو جاتا ہے۔ نصیبؔ نے اس مضمون کو حسبِ ذیل اشعار میں بیان کیا ہے۔

نصیبؔ دھوپ سے خوشیوں کی ہم جھلس جاتے — خدا کا شکر کہ سائے تھے چھایا غم کے

قائم حیات اپنی رہی غم سے اے نصیبؔ — احساس ہو گیا جو خوشی کا تو مر گئے

مدتوں کے بعد آئی ہے ہنسی — مدتوں کے بعد پھر کیا ہوا

شاعر کے پاس غم کی اہمیت اس لئے ہے کہ غم انسان میں احساس ہمدردی پیدا کرتا ہے اور اس کی زندگی کو سنوار کر صحیح معنی میں زندگی بناتا ہے غم انسان کو وہ باتیں سکھاتا ہے جو غم سے نامانوس انسان سمجھ نہیں پاتا۔ نصیب نے اس مضمون کے کئی اشعار کہے ہیں۔

درد سے جن کا نہیں ہے کوئی رشتہ ہی نصیب — وہ کہاں گفتگوئے دیدۂ غم سمجھیں گے
ضبط کو چیخ، زباں رُخ کو، ہنسی کو فریاد — جن کو ہے جتنی قدر اندازۂ غم سمجھیں گے
اس کو عرفانِ درد کیا ہوگا — جس میں احساس کی کمی ہوگی
معتبر بن گئی حیات نصیب — غم میں دل مبتلا ہوا ہوگا

گریۂ غم اصلاً غم کا تحفہ ہے اور وہ انہیں لوگوں کو ملتا ہے جن کی قسمت میں غم لکھا ہے۔

سب کے دامن کا یکساں مقدر کہاں — جس کی قسمت میں ہونا تھا غم ہو گیا

انتہائی غم میں مبتلا ہونے کے بعد بھی شاعر ضبط سے کام لیتا ہے کیوں کہ یہ اداب محبت کے مطابق ہے۔

ایسا نہیں کہ دل پہ غموں کا اثر نہیں — یہ اور بات ہے کہ مری آنکھ تر نہیں
غم کو سیلابِ تبسم میں بہا دو ورنہ — لوگ ناواقفِ آدابِ ستم سمجھیں گے

پھر بھی

نہیں لباسِ تبسم میں غم یہ چھپنے کا — بس اتنا سوچ کے محفل میں مسکرا اُٹھیاں

غم اپنی حد سے آگے بڑھ کر ظاہری طور پر انسان میں جنون کی کیفیات پیدا کر دیتا ہے لیکن داخلی طور پر ایسا انسان جسے دنیا مجنون کے نام سے یاد کرتی ہے زیادہ سمجھدار ہوتا ہے نصیب نے جنون پر بھی اچھے شعر کہے ہیں۔

یہ سچ ہے اہلِ خرد بھی سمجھ نہیں سکتے — وفا میں کتنا جنوں کا مقام روشن ہے
کچھ جنوں سے ذرا بڑھ کے راہ دکھلائے — خردِ حیات کا رستہ بھٹک گئی ہے میاں
کوئی منزل سہی وہ زندگی کی — ہمارے لئے فرزانے گئے ہیں
ناشناسِ گردِ راہِ عشق ہیں اہلِ خرد — زیست کے ہر موڑ ہر منزل پہ دیوانے ملے

اس شعر میں "کبھی" کی معنویت اور اندازِ بیان پر غور کیجئے۔

کبھی ہم سے بھی کوئی زندگی کا مشورہ کیجئے — کبھی اہلِ جنوں بھی آگہی کی بات کرتے ہیں

غم کی حد جنون ہے لیکن جنون کی حد کیا ہے۔ شاید کوئی نہیں۔ نصیب اس سلسلہ میں کیا کہتے ہیں سنیئے۔

مآلِ لذتِ دیوانگی کیا ہو خدا جانے — نظر آتے ہیں پھر دار و رسن کی حد پہ دیوانے
ہر انتہا کے بعد بھی اک نقشِ پا ملا — کس منزلِ جنوں کو حدِ آخری کہیں
وہ جس کو حدِ آخر سمجھے تھے خرد والے — آگے تھا جنون میرا اس حدِ مقرر سے

عشق و محبت کی غم و یاس کی جنون و دیوانگی کی دنیا سے آگے بڑھ کر دیکھیں کہ داؤد نصیب نے زندگی کی دوسری قدروں اور منزلوں کے لئے بھی کچھ کہا ہے کہ نہیں دورِ حاضر کے کچھ نقشے ملاحظہ فرمائیے۔

یہ دن رسوائیوں کے دیکھنے پڑتے نہ تھے یارو — سمجھ لیتے اگر ہم وقت کے مبہم اشاروں کو
اجالوں کے مخالف روشنی کی بات کرتے ہیں — تبسم چھیننے والے ہنسی کی بات کرتے ہیں
ہر تشنہ لب تو آج بھی ہیں تشنگی لیئے — ساغر بدست ساقیٔ دوراں ہو اتو کیا
اجالے کو ترستی ہیں نگاہیں — یہ کیسا دور آیا روشنی کا

روشن کئے تھے ہم نے چراغِ حیاتِ نو　　اب یہ بھڑک کے آگ لگائیں تو کیا کریں

محنت کرنے والوں کو ہر دور میں محرومیت کا سامنا ہی کرنا پڑا اور دنیا ان کا ہمیشہ استحصال ہی کرتی ہے داؤد نصیب نے اس پر بھرپور طنز کیا ہے۔

جن کا خون صرف تعمیر میخانہ ہو وہ بھی دن کی دہکتی ہوئی آگ ہیں　　کیا ستم ہے وہی اب محروم ہیں میکدہ کی مہکتی ہوئی شام سے

افسوس آج ان کا کوئی تذکرہ نہیں　　جن کا لہو تمہارے چراغوں میں جل گیا

نصیب خون بہایا ہے جس نے بہرِ چمن　　اسی کو آج غمِ آشیاں نے لوٹ لیا

زندگی کے متعلق نصیب کے یہ دو شعر لاجواب ہیں۔

حسرت و یاس بھی نالہ و آہ بھی راحت و عیش بھی تیغ بھی جام بھی　　تو سلامت رہے اے مری زندگی تیرے کتنے عنوان ہیں

کہاں پہنچا دیا احساسِ خوش فہمی نے لوگوں کو　　سرِ مقتل کھڑے ہیں زندگی کی بات کرتے ہیں

شاعر کی حسن پسندی ملاحظہ ہو

گزرنا کیا قدم ان راستوں پر ہم نہیں رکھتے　　جو رستے رہگزر میں اپنی پیچ و خم نہیں رکھتے

عزم و حوصلہ دیکھئے

جب عزم جوان بڑھ جائے گا دو گام پہ ہوگی ہر منزل　　دو گام بھی ہوں گے دور بہت جب ہو سے کم ہو جائیں گے

راستے کے پیچ و خم منہ دیکھتے ہی رہ گئے　　جب ارادے بڑھ گئے مجھ کو رستے دکھلاتے رہے

یہ میرا ظرف مرا حوصلہ مری ہمت　　نگاہِ وقت سے آنکھیں ملا رہا ہوں میں

سچی لگن پہ یہ لاجواب شعر دیکھئے :۔

نصیب ایک تشنہ لب تک جام کیسا　　سنا ہے چل کے میخانے گئے ہیں

خودداری دیکھئے۔

نصیب آئینِ خودداری لیئے زندگانی ہے　　وہاں دنیا ملی تو کیا جہاں عزت نہیں ملتی

مرزا رفیع سودا نے خوشی کے مختصر وقت کا یوں ذکر کیا تھا :

ساقی ہے اک تبسمِ گل فرصتِ بہار　　ظالم بھرے ہے جام تو جلدی سے بھر کہیں

نصیب نے اپنے انداز میں خوشی کا یوں تعاون کیا ہے :

نصیب اپنا مقدر گویا پھولوں کا مقدر ہے　　تبسم فرحت اک لمحہ سے بڑھ کر نہیں پایا

ظاہرداری پر نصیب نے یوں ضرب لگائی ہے :

خلوص پیار کے جذبے کا شکریہ لیکن　　یہ آستینوں کے خنجر ذرا چھپاؤ میاں

تبسم کی نمائش لب پہ خنجر آستینوں میں　　نظر میں دشمنی ہے دوستی کی بات کرتے ہیں

نصیب نے اپنے کلام میں بعض نئی اور خوب صورت تمثیلیں بھی پیش کی ہیں :

اس طرح دل گرا ہے نظر کے مقام سے　　جیسے شراب اچھلتی نہیں گر کے جام سے

یہ عمر دولت سے بہنے کی خواہش ہے　　نقشِ قدم اٹھانے کی کوشش نہ کیجئے

جیسے بچھڑا ہوا ایک نقشِ قدم　　ان سے اب اتنی وابستگی رہ گئی

اور اس کا تو کوئی جواب نہیں

یاد گذری ہوئی زندہ رہ گئی
شمع گل ہو گئی روشنی رہ گئی

اس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ نصیب نے اپنے معیار کے مطابق کئی اچھے الفاظ اور ترکیبیں شائع کی ہیں بعض اشعار ان کی خوش اسلوب زبان اور مناسب الفاظ و تراکیب پر سنیئے۔

سطحِ بدہ سے اگر آپ گذر کر دیکھیں
خاک اڑتی نظر آئے گی گلستانوں میں

خیال آگیا جب کبھی قفس نصیبوں کا
چمن کے موڑ سے اکثر پلٹ گئے ہم لوگ۔

گذر جاتا ہے تو جس راہ سے اے حسنِ صد پردہ
ترا جلوہ تو جلوہ رہگذر دیکھی نہیں جاتی

سنتے نہیں کسی کی وہ ایسا نہیں نصیب
ہے اپنی اپنی خوبیٔ عرض و بیاں کی بات

جس سمت اس نے دیکھ لیا شب ہو گئی
کیفیت نگاہِ فسوں ساز دیکھنا

نشیمن کی بناء پر ان کی نظریں برق پر اپنی
وہ آغاز آشنا ٹھہرے ہم انجام آشنا ٹھہرے

دینے والے نے دے دیا سب کچھ
شکوۂ تنگ دامنی دے کر

اور

کسی کو گریۂ بے اشک کی خبر کیا ہو
ہمارے لب تو فقط وقف ہیں ہنسی کے لئے

محترم حاضرین کے سامنے اب چند ایسے الفاظ پیش کئے جاتے ہیں جن میں خیال کا نیا پن یا نزاکت موجود ہے اس کے ساتھ ہی یہ مضمون ختم کیا جاتا ہے۔

کل جا چکا ہے زلفِ مسلسل کو دیکھ کر
اک نا تمام سلسلہ تیرگی کہیں

دل کی تسکین کا سامان جسے کہئے ہو نصیب
کبھی اس یاد کے شعلے میں بھڑک جاتے ہیں

چراغوں کی تپش میں حوصلہ کیا اس ہوگا
صفت جلنے کی ہاں وہ بدر میں خود رکھتے ہیں پروانے

بے چین کر نہ دے انہیں خاموش گفتگو
فرصت سے سن رہے ہیں کسی بے زباں کی بات

جلوہ گر ہو کے چھین لیں نظریں
دل کو مارا ہمہ دگی دے کر

رسوائی ضبطِ غم کی بہرحال ہو گئی
کی ہنس کے گفتگو بھی تو لہجہ بدل گیا

جب سے احساسِ توہینِ غم ہو گیا
میرا رونا تبسم میں ضم ہو گیا

نقشِ پائے یار کہتے ہیں جسے
اک مسلسل روشنی کا نام ہے

وہ روبرو تھے اور نظر تھی جھکی ہوئی
جلوہ گراں نہ ہو کے بھی ارزاں نہ ہو سکا

اللہ رے یہ بے خودیٔ عشق کا عالم
یہ نقشِ قدم ہیں کہ قدم سوچ رہے ہیں

تیری محتاط خرامی کے ہیں قرباں لیکن
نقشِ پا کس کے ہیں خود نقشِ قدم بولیں گے

تشنہ کامی کا بھی ساقی کا بھرم بھی رہ جائے
اس سلیقہ سے مجھے گر کے سنبھلنا ہوگا

اور

اس نے نیچی نگاہوں سے ساغر دیئے
تشنگی کی وہی تشنگی رہ گئی

ان اشعار کو سننے کے بعد ہم رائے محبوب نارائن کے جملہ کو دہرائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کہتے ہیں:

"انداز بیاں کے قربان جائیے اور بس۔"

غزل

پروفیسر ولی الحق انصاری

دہر ہے وہ انجمن جس میں ہے مذہب چراغ
اور بڑھے نور اگر مل کے جلیں سب چراغ

چھڑ تا رہا سازِ غم انجمنِ زیست میں
جلتے رہے رات بھر خون سے لبالب چراغ

زد پہ ہواؤں کی ہیں آج دیئے آس کے
دیکھیں تھمے گی کب ہوا دیکھیں جلیں کب چراغ

قیمتِ دل کیا ہے، یہ تجھ سے بتاؤں میں کیا
تیرے لئے ہے خوف میرے لئے شب چراغ

ہے نہ ہوا ہے ولی انجمنِ لکھنؤ ❊ کوئی نہیں اور اگر تم ہی بنو اب چراغ


FAROOKY
TOOTH POWDER

ڈیوڈ الطاف

پربھا

پربھا کا تعلق سنتا بیش گڑھ ضلع کے اُڈوسی طبقے سے تھا اس کی چوڑی ناک. تھی چمکدار رنگت اور بڑی روشن آنکھیں جو متحرک اور جاندار تھیں باوجود مشقت کے کاموں کے اس کے ہاتھ نرم اور نازک تھے. اس کی آواز میں نرمی اور نزاکت تھی اور اس کا برتاؤ بالکل قدرتی تھا۔ جس میں تصنع نام کو نہ تھا اس کے لباس میں سینے کا حصّہ بالکل عریاں تھا۔ اسی لئے ہولناک نظروں کو دعوتِ گناہ دیتا تھا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک تنہائی کا مارا دوسرے دیس کا رہنے والا اس عورت کی تیز نظروں کا شکار ہو گیا۔ لیکن پربھا بہت معصوم اور بھولی تھی۔ اسے میری اس بدلی ہوئی کیفیت کا اندازہ تک نہ ہو سکا وہ نہایت پاک صاف ذہن کی مالک تھی وہ اپنے بالوں کو خوبصورتی سے لپیٹ کر اس کا جوڑا بناتی اور اسے ایک ڈوری سے باندھ دیتی دیہاتی فیشن کی طرح اور اس کے پاس سبز موتیوں کی طرح ایک مالا تھی جس کو وہ گلے میں ڈالے رہتی جو اس کے سینے پر اِدھر اُدھر جھولتی رہتی جب وہ کام کاج میں مصروف رہتی۔

بہار کے ہولناک قحط کے زمانے میں شہر کے ایک دور دراز دیہات میں ایک دواخانے پر میری تعیناتی تھی اور یہاں پر پربھا میری مدد کے لئے بھیجی گئی تھی اپنے بچپن کے ابتدائی دور میں پربھا نے ایک کرسچن مشن میں اپنی زندگی گزاری تھی اس لئے ہندوستانی زبان سے وہ تھوڑی بہت واقف تھی. وہ چند انگریزی الفاظ بھی وہ جانتی تھی وہ میری مددگار اور مترجم تھی دیہاتی ٹرائبل باشندوں اور میرے درمیان کیوں کہ میں ان کی زبان سے بالکل ناواقف تھا میرے یہاں آنے سے پہلے وہ روزآنہ کی مزدور کی حیثیت سے کام کرتی تھی۔ اس پر بھا وہ صاف ستھرے کام کو ترجیح دیتی تھی. اس لئے وہ میرے یہاں ۱۰ روپیہ ماہانہ کام کرنے تیار ہو گئی۔

اس کا باپ زرعی مزدور تھا۔ جو کھینچ تان کر بہ وقت تھوڑی بہت آمدنی پیدا کر لیتا تھا۔ جس سے خاندان کی گزر بسر ہوتی تھی۔ لیکن اب قحط کے زمانے میں وہ بالکل بیکار ہو گیا تھا. اس کے باوجود "سوکھا" کاہل آدمی نہ تھا موہے کے جھاڑ ان دنوں پھولوں اور پتوں سے ڈھکے ہوئے تھے ان کی وجہ سے وہ بیکار نہ رہا بلکہ تمام دن جنگل میں گھوم کر موہے کے پھول جمع کرتا ان میں کا ایک حصّہ بطور غذا استعمال میں لاتا بقیہ حصّے سے جو کی شراب تیار کرتا تھا. اور اس کو لکڑی کے ایک سنڈے میں بھر لیتا تھا. اسی لئے وہ طاقت اور قوت میں ایک ہاتھی کو بھی زیر کر لیتا تھا۔

سوکھا بھی ایک ماہر شکاری تھا اپنے تیر و کمان سے دور تک پیچھا کر کے وہ ایک جنگلی بھینسے کو بھی مار گراتا تھا۔

اسی لئے وہ حکومت کے ممانعتی احکام جنگل میں شکار کو سمجھ دھوکا حالانکہ جنگلی جانوروں کے تحفظ کے لئے یہ قانون نافذ کیا گیا تھا۔ کیوں کہ قحط سالی کی سب سے بڑی وجہ پانی کی کمیابی تھی اور صرف دو ایک مقامات پر ہی پانی دستیاب ہو سکتا تھا۔ اسی لئے ان مقامات پر جنگل کے سارے جانور جمع رہتے تھے اور بہ آسانی ان کا شکار کیا جا سکتا تھا۔ اس کا فائدہ اس قحط کے زمانے میں یہ ہوتا تھا کہ جب کبھی کسی بڑے جانور کا شکار ہوتا تھا۔ وہ تمام دیہات میں تقسیم ہوتا تھا۔ اور اس دن سب کے لئے غذا مہیا ہو جاتی تھی اور اب قحط سالی کی وجہ سے اور پانی کی کمیابی کی بدولت سارے جانور ایسے نالوں اور کنٹوں میں جمع ہو جاتے اپنی پیاس بجھانے کے لئے اس لئے بہ آسانی ان کا شکار کر لیا جا سکتا تھا۔ ایسے موقع پر شکار کی ممانعت سوکھا جیسے آدمی کے لئے بڑی ہی تکلیف دہ بات تھی کیوں کہ شکار کرنے پر اس کو جرمانا ادا کرنا پڑتا تھا

میں اسوقت ایم بی بی ایس کے آخری سال میں لکھنو میڈیکل کالج میں زیر تعلیم تھا جبکہ ہم کو بہار کے قحط زدہ علاقے میں طلب کیا گیا ہم کچھ ڈاکٹر بہار روانہ ہوئے مجھ جیسے کالج کے نوجوان کے لئے پرما کی موجودگی ایک اہم بن گئی تھی۔ اور اس کی نیم برہنگی ایک چیلنج بن گئی ہے خطرناک چیلنج! عام حالت میں اس کو اپنے قریب رکھنا ہرگز قبول نہ کرتا۔ کیوں کہ میری پرورش ایک قدیم دقیانوسی ماحول میں ہوئی تھی۔ جہاں سماجی اور سوشیل قوانین اور اصولوں کو سختی سے پابندی کی جاتی تھی۔ مگر موجودہ حالات میں مجھے اس کی مدد لینے پر مجبور ہونا پڑا۔ میرے ان خیالات اِن حالات کا جس کا ذکر میں نے کیا ہے۔ اس کو ہوا لگ سکی ورنہ اب وہ اس کا معصوم دل جس کو سن کر مجروح ہو جاتا۔ ٹریبل

فطرت کے لئے اخلاق کی قدریں قدرتی حالات کی تابع ہوتی ہیں۔ پرما بھی ایک قدرت کا عطیہ تھی اس لئے وہ بھولی بھالی اور معصوم فطرت تھی اس لئے وہ ہمیشہ خوش رہتی اور ذرا ذرا سی بات پر بے پایاں مسرت اور شادمانی کا اظہار کرتی تھی۔ مسلسل دو سال تک ملک کے اس حصے میں کافی بارش نہیں ہوئی۔ زمین جھلسی ہوئی اور جگہ جگہ سے پھٹی پھٹی نظر آتی تھی۔ باؤلیاں ندی نالے کنٹے اور تالاب سب خشک ہو گئے تھے۔ ایک آدمی کو اپنی پیاس بجھانے کے لئے کئی میل کا سفر کرنا پڑتا تھا۔ کھیتوں میں نہ صرف ڈنٹھل بلکہ گھانس تک نظر نہ آتی تھی۔ جنگلی اور پالتو جانور غذا کی تلاش میں اِدھر اُدھر پھرتے تھے آخر وہ سب ایک میدان میں جمع ہو کر موت کا انتظار کرنے لگے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قدرت نے بغاوت کر رکھی ہے۔ کوے گدھ گیدڑ اور بھیڑیئے گویا وہ سب کے سب میدانِ جنگ میں آ گئے ہیں۔ اسی لئے مرنے سے پہلے وہ اپنے شکار پر ضرور حملہ کرتے خوبصورت ہرا بھرا جنگل ایک خوفناک ریگستان نظر آ رہا تھا۔ بے رحم سورج دن بھر اپنی تپش سے ہر شئے کو جھلساتا رہتا اور بھیڑیئے تمام رات اپنی منحوس آواز سے چیختے رہتے۔

انسانوں کی حالت ان سے کچھ بہتر نہیں تھی۔ دیہات پر دیہات اجاڑ اور بے رونق ہو رہے تھے۔ اگر کہیں چند ذی نفس نظر بھی آتے تو ان کے چہرے اترے ہوئے آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی اور گال پچکے ہوئے اور لاغر سوکھے ہوئے جسم ہی نظر آتے تھے بچے خالی مٹی کے برتن ہاتھ میں لئے مارے مارے پھرا کرتے ان کو کھانے کی چیز میسر ہی نہ تھی۔ سوائے پیروں کے اور درختوں کی جڑ کے۔ گاؤں کے اطراف

جانوروں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں جن کی بدبو ناقابل برداشت تھی۔ علاوہ ان میتوں کے کالرا اور بخار کے سینکڑوں مریض بڑی کسمپرسی کی حالت میں سسک رہے تھے اور موت کا شکار ہو رہے تھے۔ حکومت کی طرف سے اور چند سوشیل اداروں کی طرف سے لنگر خانے کھولے گئے تھے غذا اور پانی کی سپلائی کے انتظامات کئے گئے تھے لیکن اس کی مثال دریا میں قطرے کے مماثل تھی ہمارا عملہ بھی رات دن کاموں میں مصروف تھا۔ پربھا بھی رات دن بغیر آرام کئے کام میں مصروف رہتی اس پر بھی کبھی اس کے لب پر شکایت کا حرف تک نہ آیا۔

ایک دن جب کہ میں اس کا تیار کیا ہوا ناشتہ کر رہا تھا پربھا میرے پاس آئی اور اپنی ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی زبان میں اس نے کہا "ڈاکٹر بابو کیا آپ اس کے لئے کچھ کر سکتے ہیں یہ مجھے بہت تکلیف دے رہا ہے" اس نے اپنا بایاں پستان مجھکو دکھایا۔ اس کے نیچے باریک پھنسیاں تھیں اور ایک بڑا زخم نظر آ رہا تھا۔ شاید کسی کیڑے نے کاٹ لیا ہو اور اس نے ناخن سے کھجا کر زخم پیدا کر لیا تھا۔ میں نے اسے ٹھہرنے کو کہا اور اٹھ کر الماری سے آیوڈین کی شیشی نکال کر زخم پر اچھی طرح لگا دیا پھر اس پر گندھک کا پاؤڈر چھڑک کر جب میں پٹی باندھنا چاہا تو وہ ہنستی ہوئی وہاں سے بھاگ گئی۔ اس عمل سے معلوم ہوتا ہے وہ بہت محظوظ ہوئی اس کے بعد علاج کے لیئے پھر وہ میرے پاس نہیں آئی مگر آیوڈین وہ خود ہی لگا لیا کرتی تھی۔

اس واقعہ کے تیسرے دن وہ پھر میرے پاس آئی اور پھر دونوں ہاتھوں سے چھاتی پکڑ کر مجھکو دکھایا اور بڑے مسرت بھرے لہجے میں کہا "دیکھو پھنسیاں غائب ہو گئیں اور زخم مندمل ہو گیا" پربھا بڑی معصوم اور بھولی لڑکی تھی اس نے یہ سب کچھ نہایت سادگی سے کیا تھا۔ لیکن میں جوان تھا ..... اپنے آپ پر قابو نہ پا سکا۔ اور ان ترغیبات کے جذبات کی رو میں بہہ گئے.....

اس واقعہ کے ایک ماہ بعد ایک شام کو وہ مجھے کھینچتی ہوئی ایک چھوٹے سے مندر میں لے گئی۔ جو ایک بڑے املی کے درخت کے نیچے تھا اور مجھے ہاتھ جوڑ کر وہاں کھڑے رہنے کو کہا اس کے بعد دو ناریل اپنی تھیلی سے نکال کر ان کو پتھر پر توڑ کر ناریل کا تھوڑا پانی مجھے پینے کو دیا اور خود بھی ناریل کا تھوڑا پانی پیا اور بقیہ پانی مورتی پر ڈال دیا۔ تین ماہ میں نے اس دیہات میں گذارے آخر کار بارش شروع ہوئی اور اتنی بارش ہوئی کہ ندی نالے اور خلیج پانی سے لبریز ہو گئے کھیتوں میں بھی پانی ہی پانی نظر آنے لگا۔ اور تھوڑے ہی دن بعد سبزہ چاروں طرف اگنے لگا اور درختوں پر نئی شاخیں پھوٹنے لگی اور درختوں کی ٹہنیوں پر پھول بھی نظر آنے لگے۔ گیت گانے والے پرندوں نے نئی زندگی پائی بلبل مینا اور قمری کی آوازیں چاروں طرف گونج اٹھیں نیم جاں بچے ہوئے جانوروں کو بھی نئی زندگیاں ملیں۔ ہر طرف اگا ہوا سبزہ ان کی آنکھوں میں ایک طراوٹ پیدا کر رہا تھا اور وہ بے تحاشا اگی ہوئی سبز گھانس پر منہ مار رہے تھے۔ جس کا ذائقہ تک وہ اس عرصے میں بھول چکے تھے۔ غمزدہ لوگ بھی اپنی درانتیاں کھرپے وغیرہ لے کر کھیتوں کے لئے روانہ ہو چکے تھے۔ تاکہ محنت کر کے اس کو پھر قابل کاشت بنائیں۔ پربھا سے میری رخصتی بہت آسان سے ہوئی نہ تو نفرت کا اظہار کیا گیا

نہ آنسو بہائے گئے اور نہ الزام تراشی کی گئی اور پربھا کی طرف سے بلیک میل کی دھمکی دی گئی اس نے جذبات کا مظاہرہ صرف اتنا کیا کہ جب میں جیب میں بیٹھ گیا تو میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے سے چمٹا لیا تب میں نے بھی ایسے یقین دلایا کہ میں ضرور واپس آؤں گا لیکن وہ بھی جانتی تھی میں یہ صرف اس کو خوش کرنے کے لئے کہہ رہا ہوں۔

ایم بی بی ایس کی تکمیل کے بعد یوپی کے ایک شہر میں بہ حیثیت اسسٹنٹ سرجن میری تعیناتی عمل میں آئی تھی ایک دن بہار کے محلے سے دو سال بعد جب میں مریضوں کی ایک لمبی قطار میں سے یکے بعد دیگرے مریضوں کا معائنہ کر رہا تھا میری نظر دفعتاً ایک عورت پر پڑی جو زمین پر بیٹھی تھی اور اس کے پاس ہی ایک بچہ کھیل رہا تھا۔ اس کی صورت غور کرنے سے آشنا معلوم ہوئی۔ یہ پربھا تھی وہ بالکل بدلی نہ تھی اس میں کوئی تغیر نہیں ہوا تھا۔ اس کا وہی مسکراتا ہوا چہرہ تھا اس کو دیکھ کر میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا وہ بچے کو گود میں اٹھا کر میرے پاس آئی اور کہا "میں اس کو یہاں لائی ہوں میں چاہتی ہوں کہ وہ بھی آپ کی طرح ڈاکٹر بابو بنے"

میں نے کہا "اور تم کیا کرو گی تمہارا کیا ہوگا" اس نے جواب دیا "میں اپنے گاؤں میں واپس چلے جاؤں گی" الخ۔

دراصل لکھنؤ کی ایک لیڈی ڈاکٹر کے ساتھ میری نسبت ہو چکی تھی اور ہم نے پلان بنایا تھا کہ شادی کے بعد ایک دواخانہ کھول کر دونوں اس میں کام کریں گے اس لئے پہلے میرے دل میں یہ خیال آیا کہ اپنے دواخانہ میں پربھا کو بہ حیثیت کمپاؤنڈر یا نرس کے رکھ لوں بعد میں میں نے سوچا کہ اس کو اپنے سے قریب رکھنے میں میں اپنے آپ پر قابو نہ پا سکوں گا اگر قابو پا بھی لیا تو اس کی نظروں سے میں بچ نہ سکوں گا اور ایک بیوی سے اس بات کا پوشیدہ رکھنا ممکن نہ ہوگا کیوں کہ اس معاملہ میں عورتوں خصوصاً بیویوں کی نظریں بہت تیز ہوتی ہیں اور یہ سچ بھی ہے اسی لئے میں غمزدہ دل کے ساتھ پربھا کو دواخانہ کے اندرونی کمرے میں بلا کر لے گیا اور نہایت ہی بے بسی اور دل گرفتہ آواز میں اس سے کہا "میں بچے کو اپنے پاس نہیں رکھ سکتا"

"لیکن یہ آپ کی اولاد ہے آپ کا لڑکا ہے" اس نے روتے ہوئے کہا شرم اور غم سے میری گردن جھک گئی۔ وہ بڑا خوبصورت صحت مند لڑکا تھا۔ آخر ہکلاتے ہوئے میں نے کہا "میں ہر ماہ اس کے لئے پابندی کے ساتھ روپیہ بھیجوں گا تاکہ اس کی معقول تعلیم ہو سکے"

وہ بھڑک اٹھی اور نفرت بھرے لہجے میں بولی۔

"تم اپنا روپیہ اپنے پاس رکھو"

دوسرے لمحے اس نے لڑکے کو اپنی گود میں اٹھا لیا اور حقارت بھری نظریں مجھ پر ڈال کر وہاں سے روانہ ہو گئی

جیسا کہ پلاننگ کی گئی تھی دواخانہ چل رہا ہے اور نہایت کامیابی کے ساتھ ترقی کر رہا ہے اور میری بیوی لیڈی ڈاکٹر لوگوں میں مقبول بھی ہو چکی ہیں لیکن افسوس کہ ہم اولاد سے محروم ہیں۔

غزل

حسام الدین سلیم

وہ ستم کرکے جتاتے رہے احسان بہت
ہم ستم سہہ کے بھی ہوتے رہے انجان بہت

ڈھونڈھتی ہی رہی نظریں کہیں انساں نہ ملا
لوگ کہتے ہیں کہ دنیا میں ہیں انسان بہت

ایک لمحے کی اجازت بھی نہ دی محسن نے
مسکرانے کے تھے غنچوں کو بھی ارمان بہت

کوئی بادل بھی برسا گئے موسم سارے
ورنہ ہر رُت میں برسنے کے تھے امکان بہت

راہرو پھر بھی ترستے رہے سایہ کے لئے
راہ میں پیڑ بہ ہر گام تھے گنجان بہت

شکر ہم سے نہ ہوا تیرا ادا اے خالق !
بے غرض کرتا رہا ہم پہ تو احسان بہت

ایک ہنگامہ تھا ہر شعر پہ محفل میں سلیم!
داد و تحسین کی مشکل ہوئی احسان بہت

قاری جمال محمد طاہر

آہ! حضرت سرور مرزائیؒ علیہ الرحمۃ

محترم صوفی عین اللہ چشتی سرور مرزائیؒ ایک پہلودار شخصیت کے حامل تھے علمیت، معرفت و حقیقت سے کامل آگہی۔ شعر و سخن پر حاصل کمال اور زباندانی کی خداداد صلاحیتوں کے باوجود اپنے آپ پر سادگی کا پردہ ڈال لیا تھا اور مزاحیہ انداز اختیار کرکے اپنے آپ کو چھپائے رکھا۔

۱۹۲۲ء میں چیچولی کے موضع ضلع بیدر میں پیدا ہوئے۔ تعلیم اور ملازمت کے سلسلہ میں بیدر، وغیرہ میں خدمت انجام دی پھر گلبرگہ شریف کو وطن بنالیا۔ نثر و نظم ہر دو میں کمال اور ید طولیٰ رکھتے تھے۔ نثر کے الفاظ نہایت فصیح و بلیغ جس پر فارسی کی گہری چھاپ تھی۔

شعر گوئی میں اپنی مثال آپ ۔۔۔ فنِ عروض کے جاننے والوں میں ایک خاص مقام کے حامل۔ لمعات و ظلمات کے مطالعہ کے بعد ہی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مرحوم کو فنِ شاعری سے کس درجہ لگاؤ اور مطالعہ کتنا عمیق تھا۔ سرکاری ملازمت کے علاوہ، خانگی امیدواروں کیلئے بھی تادمِ آخر تعلیم و تفہیم کا سلسلہ جاری رکھا۔

جناب احسان اللہ قادری کو جو سرف ہندی جانتے تھے اور حیات و تعلیمات بندہ نوازؒ گیسو دراز پر ڈاکٹریٹ مرہٹواڑہ یونی ورسٹی اورنگ آباد سے کر رہے تھے۔ حضرت سرور مرزائی مرحوم نے دکنی اردو، فارسی میں تعلیمات بندہ نوازؒ سے متعلق عرفانی مسائل کی اردو اور انگریزی میں تفہیم کے ساتھ ہندی میں اصطلاحی

مترادفات کے ساتھ مواد فراہم کیا۔ چنانچہ سید احسان اللہ صاحب نے مقالہ پیش کیا اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ مسرت اس بات کی ہے کہ ہندی ؒ پہلی بار توحید حقیقی سے متعلق صحیح مستند مواد جمع و پیش کیا گیا۔

رہروانِ سلوک کے لیے (۱۲۱) سو ابیات پر مشتمل فارسی منظوم مثنوی "حسنِ نظر" موسوم بہ سجادنامہ (صاحبزادہ محمد مخدوم عرف سجاد پاشاہ ؒ خاص طالبِ حق) جس کا مطالعہ اہلِ نظر کے لیے سرمۂ بصر اور اہلِ بصیرت کے لیے ... مرحوم کے اس شعر کے مصداق ہے۔

پیدا جو شعور و توفیقِ شکرانۂ نعمت ہو جائے
کیا ذکر تغافل، لغزش بھی محسوبِ عبادت ہو جائے

موجودہ دور کے چند باکمال حضرات کی قیمتی رائے کے اقتباسات کے مطالعہ سے آپ بخوبی اندازہ قائم کرسکتے ہیں کہ موصوف کس مقام کے حامل تھے۔

معرفت پناہ حضرت مولانا سید محمد معز الدین قادری الملتانی مدظلہٗ رقم طراز ہیں "سردر مرزائی نام ہے ایک منفرد اور انوکھی قابلیتِ ذات کی تجلی کا۔ جو بلحاظ ظاہر ہر ہمہ صفت موصوف ہے اور پھر بلحاظ باطن ذات سے ہمہ دبے جگری کی احدیت میں گم ہے۔"

حقیقت دستگاہ مولانا محمد عبدالستار خاں مدظلہٗ صدر شعبۂ عربی جامعہ عثمانیہ (موظف) نے ان الفاظ میں تحسین و تعریف فرمائی۔ "یہ مثنوی روانی۔ سلاست اور ادب و فن کا میری ناقص رائے میں ایک شاہکار ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اولیاءاللہ کے واسطے سے سرچشمۂ نبوت سے مستفیض ہیں۔

سجادہ نشین بارگاہ سلطانِ دکن حضرت بندہ نواز ؒ نے ان الفاظ میں دعا فرمائی کہ "خدائے تبارک و تعالیٰ اس کو قبولیتِ عام عطا کرے۔ خانقاہی تعلیم میں ممد و معاون ثابت ہو۔"

محترمہ ڈاکٹر شریف النساء بیگم انصاریہ۔ صدر شعبۂ فارسی جامعہ عثمانیہ تحریر فرماتی ہیں۔

"واقعتاً یہ تخلیق سردر صاحب کے محاسن باطنی کی تجلی کا پرتو ہے جس میں حقائق و معارف کے دشوار گذار مسائل کو صاحبِ نظر قارئین کے لیے پیش کرنے کی مساعی

جمیلہ نہایت ہی بلیغ انداز میں پیش کی گئی ہیں۔

حضرت سرور مرزائی کا خاص موضوع "مقام محمدیؐ" کی تفہیم تھا اس کے لیے انھوں نے اپنی پوری صلاحیت صرف کی اور تادمِ آخر یہی کام کیا۔ حال ہی میں "شیدنِ احمدی" کے عنوان سے حمد، نعت و منقبت پر مشتمل ایک حسین گلدستہ شائع ہو چکا ہے، جس کا مطالعہ قلب و نظر کی تسکین کا موجب ہے۔

اس کے علاوہ "فریاد وارشاد" نامی کتاب کی طباعت کا کام نہایت تیزی سے جاری تھا "ہر رنگ" کے عنوان پر ایک سو سے زائد فرضی شعراء کے ناموں سے جو اشعار موزوں کئے ہیں خدا کرے کہ اس کی اشاعت کا بھی انتظام ہو جائے اور آئندہ نسلیں اس سے استفادہ کریں۔

موت یقینی اور اس کا یقین جزوِ ایمان۔ بالآخر ۹ اگست ۱۹۸۶ء کی شب کلیانی کے موضع راجیشور میں خُدان پیا کی تہنیت میں منعقدہ مشاعرہ میں شریک رہے اور رات دیر گئے تک سامعین کو محظوظ کیا اور ایمان و عرفان کے موتی نچھاور کرتے رہے۔

آنکھ آرام کے لئے بند کی اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ مدینہ میں آنکھ کھولی۔

میت گلبرگہ شریف لائی گئی اور ۱۰ اگست ۱۹۸۶ء کو ۱۱ بجے دن مسجد مقبرہ درگاہ روڈ قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ تدفین کے موقع پر مقامی و بیرونی شعراء، قائدین، اہلِ سلسلہ، مریدین و معتقدین کی کثیر تعداد شریک تھی۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ ایک لڑکا اور دو لڑکیاں ہیں۔ سجادہ نشین بارگاہ بندہ نوازؒ حضرت سید شاہ محمد محمد الحسینیؒ نے اپنے گہرے رنج و ملال کا اظہار کرتے ہوئے دعائے مغفرت فرمائی۔ حیدرآباد و گلبرگہ اردو فرنٹ کی جانب سے جلسۂ تعزیت منعقد کیا گیا۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں مقامِ اعلیٰ عطا فرمائے اور متعلقین کو صبرِ جمیل کی توفیق دے اور پسماندگان کو مرحوم کے علمی و عرفانی کارہائے نمایاں کی اشاعت و تبلیغ کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین بحق طٰہٰ و یٰسین۔

جہد کن تو تا رسی در عہدِ خویش
ورنہ باشی خستہ اندر لحدِ خویش

(مولانا روم)

❁ ❁ ❁ ❁

تبصرہ — تجلیاتِ حرمین

از: رُخسانہ نکہت اُمِّ ہانی

تعدادِ صفحات ۳۲ دیدہ زیب سرورق، سفید کاغذ، آفسٹ کی طباعت، قیمت تین روپے

ناشر: ادارہ رفیق عظیم آباد کالونی پوسٹ مہندرو پٹنہ ۸۰۰۰۰۶

اُمِّ ہانی کا نام ادبی دنیا میں نیا ضرور ہے لیکن اس نام نے اپنی پہچان بنانے کی جو سعی کی ہے وہ قابلِ توجہ ہے ان کے کئی مضمون اور منظوم تحریریں نظر سے گزری ہیں اور انہوں نے اردو حلقہ کو متوجہ کیا ہے۔ گو کہ یہ تحریریں زیادہ تر مذہبی نوعیت کی ہوتی ہیں لیکن ان کی ادب سے دل چسپی اور گہرا خلوص انہیں اثر انگیز بنا دیتا ہے۔

زیرِ نظر مجموعہ "تجلیاتِ حرمین" اُمِّ ہانی کے پانچ مختصر مضامین پانچ نظموں ایک غزل اور تین نعت پر مشتمل ہے۔۔۔ یہ مضامین ایک ہی زمانہ میں یا یوں کہئیے کہ ایک مختصر وقفہ میں یکے بعد دیگرے لکھے گئے ہیں۔ اور عنوانات الگ الگ ہونے کے باوجود بھی سلسلہ وار سے محسوس ہوتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہی ہے کہ ہر مضمون میں اس سفر کے تجربات بیان کئے گئے ہیں جو فریضۂ حج کے لئے اُمِّ ہانی نے کیا۔ مقامات کا مشاہدہ اور پھر انہیں بیان کرنے کا انداز کہیں کہیں ان مضامین میں خدا کا سا تاثر پیدا ہو گیا ہے۔

اُمِّ ہانی کی تحریریں ان کی مذہب کے ساتھ گہری دل چسپی کی مظہر تو ہیں ہی ساتھ ہی زبان و ادب سے ان کی وابستگی کو بھی واضح کرتی ہیں۔ ان مضامین میں دین و ایمان سے عقیدت والوں کے لئے وہ گہرائی، سوز اور خلوص کی آنچ ہے۔ جو دلوں کو پگھلا دے جو انہیں اپنے دل کے نہاں خانوں میں جھانکنے پر مجبور کر دے۔ اپنے ہی دوست ہونے کا احساس کرلا دے اور انہیں ابدی سکون کا راستہ ڈھونڈنے کے لئے اکسائے۔

یہاں یہ بات خاص توجہ کی ہے کہ ہانی نے جس زبان کا استعمال کیا ہے وہی ان کی اثر انگیزی کی ایک خاص وجہ بن گیا ہے۔ تجلیاتِ حرمین میں شامل مضامین ایک ہی موضوع کا اظہار کرتے ہیں۔ اور اس موضوع کے لئے جس زبان و بیان کی ضرورت تھی اُمِّ ہانی نے اس پر خاص توجہ کی ہے۔ بیان میں دعائیہ انداز میں جو اس موضوع کی ضرورت تھی اور اس انداز نے تحریر کو اور زیادہ گہرائی دی ہے لیکن ساتھ ہی کہیں کہیں نثر شاعری کے بہت قریب ہو گئی ہے۔ کہیں کہیں شاعرانہ زبان کا طلسم قاری کو اصل موضوع سے دور کر سکتا ہے۔ ام ہانی بنیادی طور پر شاعرہ ہیں اور شاعری میں گہری دلچسپی رکھتی ہیں۔ مجموعہ میں شامل انکی نظمیں اور نعت و سلام وغیرہ بھی انکی پہچان ایک حساس شاعرہ کی حیثیت سے کراتے ہیں۔ انکی مسلسل کاوش ضرور انہیں شاعروں کی صف میں ایک قابلِ قدر مقام دلائے گی۔

(عائشہ صدیقی لکچرر آف ایجوکیشن بالیکا ودیالیہ کالج، لکھنؤ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"سہانے خواب"

از: جنید احمد جنید

قیمت پندرہ روپے

بشیر وارثی پبلی کیشنز
22 - 8 - 613
چھتہ بازار ــ حیدرآباد - ۲

تبصرہ ــ سہانے خواب

مبصر: رؤف خیر

جنید صاحب کے مجموعے "سہانے خواب" کے ٹائٹل کور ہی سے پتہ چل جاتا ہے کہ ان کی شعری روایت کا سلسلہ جلیل، امیر، اسیر سے مصحفی کا ملا ہوا ہے۔ ٹائٹل کور پر پہلا شعر مصحفی کا ہے ؎

حسرت پہ اس مسافرِ بےکس کی روئیے ∴ جو تھک گیا ہوں بیٹھ کے منزل کے سامنے

اس کے نیچے اسیر کا شعر درج ہے ؎

خدا جانے یہ کس کی جلوہ گاہِ ناز ہے دنیا ∴ ہزاروں اٹھ گئے باقی وہی رونق ہے محفل کی

درمیان میں خوش خط "سہانے خواب" ہے جس کے نیچے جلی حروف میں شاعر جنید احمد جنید کا نام نامی لکھا ہوا ہے۔ اس کے بعد امیر کا شعر درج ہے۔

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر ∴ سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

اس شعر کے نیچے جلیل کا شعر ہے کہ ؎

جب میں چلوں تو سایہ بھی اپنا نہ ساتھ دے ∴ جب تم چلو زمین چلے آسماں چلے

ٹائٹل کور کے آخر میں صاحبِ کتاب کا شعر لکھا ہوا ہے کہ ؎

آؤ یہ میری شاخِ نشیمن ہے دوستو ∴ اس گوشۂ چمن میں بہار و خزاں نہیں۔

واضح ہو کہ ابھی کتاب کھولی نہیں گئی ہے۔ ابھی تو ہم صرف ٹائٹل کور ہی سے لطف اندوز ہو رہے ہیں ٹائٹل کور کی آخری صورت میں جو شاخِ نشیمن ہے اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شاخ کس تناور درخت کا ہے اور یہ درخت کس گوشۂ چمن میں اپنی جڑیں پھیلایا ہوا کھڑا ہے۔ بہار و خزاں سے بے نیاز ــ (آئیے اب کتاب کھول کر بھی دیکھ لیں) اب جو کتاب کھولئے تو پہلے ہی صفحہ پر کتاب در شاعر کے نام کے علاوہ تین متفرق شعر اور پڑھنے کو مل جاتے ہیں۔ مگر اتفاق سے یہ تینوں ہی شعر جنید صاحب کے ہیں۔ بہر حال جنید صاحب از اول تا آخر جیتے جاگتے نسخے (دانے، درمے دیکھنے کے عنوان پر) اپنے قاری کو متاثر کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ پروفیسر رفیعہ سلطانہ صاحبہ کا پیش لفظ "فہرست کے حساب سے "سہانے خواب" کے عنوان سے اور اشفاق حسین مرحوم کا مقدمہ [illegible] صاحب کی شخصیت اور غزل کی مقبولیت پر روشنی ڈالتا ہے

جنیدؔ صاحب چوں کہ "پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ" کی تفسیر ہیں اس لیئے اس شعری روایت نے انہیں — برگِ آوارہ ہونے سے بچا لیا۔ بعض اشعار میں زبان و بیان کی چاشنی اوج پر ہے۔ سیدھے سادھے، بامحاورہ اور مرصع اشعار یہاں مل جائیں گے۔ جیسے سے

غم زدوں کی خوشی ہو گئی ٭ چلیئے ان کی خوشی ہو گئی
صبر ٹوٹے ہوئے دلوں کا نہ لے ٭ دیکھ ظالم بھری جوانی میں
ان بتوں کو سلام کرنا ہے ٭ مجھ کو پتھر کی جان ہونا ہے
آج ہموار کر رہا ہوں فضا ٭ کل ادھر سے مجھے گذرنا ہے
ان کی خوشبو جنیدؔ پھر آئی ٭ دیکھ باہر کہیں صبا تو نہیں
تنگ آگئی محفل، احترامِ محفل سے ٭ بات کر نہیں سکتے مسکرا نہیں سکتے

اس سے زیادہ تیز قدم اور کیا چلوں
اے یار پاؤں تھک گئے اور شام ہو گئی

بسترِ مرگ سے منہ پھیر لو اپنا تم بھی　　آخری وقت کا منظر نہیں دیکھا جاتا

ایک ایک غزل دو دو بار بھی شائع ہوئی ہے مثلاً ص۱۲۲ اور ص۱۳۹ پر ص۱۴۸ اور ص۱۵۹ پر شائع شدہ غزلیں۔
غزلوں کے علاوہ جنیدؔ صاحب نے نظمیں بھی کہی ہیں۔ سب ہی پابند نظمیں ہیں اور وہی زبان کی چاشنی سے بھری ہوئی ہے "فردیات" کے عنوان کے تحت بھی خاصے اشعار جمع کر دیئے ہیں۔
کتاب کی اشاعتی تفصیلات تو درج ہیں مگر کہیں بھی "حیدرآباد" لکھا ہوا نہیں ہے۔ پتہ ہی نہیں چلتا کہ کتاب آخر کس مقام سے شائع ہوئی ہے۔ اس کی اشاعت پر اس قدر شرمندگی کی ضرورت تو بہرحال نہ تھی کہ شاعر اپنا اتا پتہ ہی نہ دے یا پھر "محکمہ پتے سے خلق کو بے خبر رکھئیے" کا معاملہ ہے؟

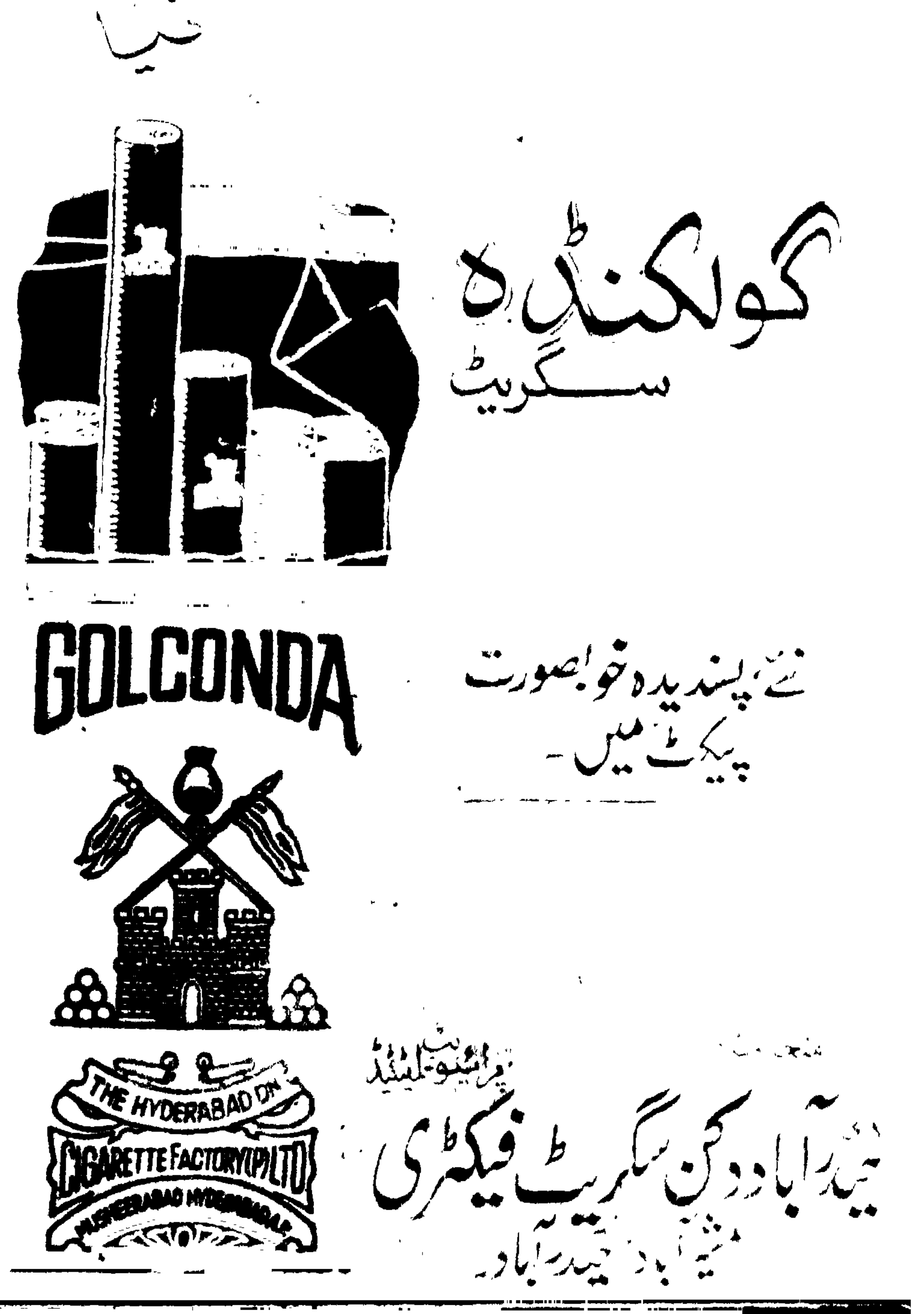
رؤف خیر　　　فقط

غزل

صفیہ المجید

آپ کا ذکر آپ کی باتیں　　حاصلِ زیست ہے عبادت ہے
ہم نے چاہا ہے ہم نے پوجا ہے　　پھر بھی اُنہیں دل اُنہیں شکایت ہے
آگ اور برف کا یہ ساتھ اپنا　　زندگی کی حسیں شرارت ہے
غمِ دوراں ہو یا غمِ جاناں　　ہنس کے سہنے کی ہم کو عادت ہے
آدمی آدمی کے کام آئے　　یہی نیکی، یہی شرافت ہے

لاکھ ہوں تلخ تجرباتِ حیات
زندگی پھر بھی خوبصورت ہے



قانونی انتباہ: [redacted]

بزمِ خیال

(اس عنوان کے تحت دو علمی اور ادبی سوالوں کے جواب دیئے جاتے ہیں۔)

س۔ چوبِ کلیمؑ کسے کہتے ہیں۔؟

ج ۔ چوبِ کلیمؑ دراصل حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وہ عصا ہے جس سے بحکم الٰہی حضرت موسیٰ بہت سے معجزات دکھایا کرتے تھے۔ جب وہ اپنا عصا زمین پر ڈال دیتے تھے تو وہ ایک خوفناک اژدھا بن جاتا تھا اور جیسے ہی وہ اُسے ہاتھ میں لیتے وہ واپس عصا بن جاتا تھا۔ فرعون نے اس معجزے کو دیکھ کر مصر کے تمام جادوگروں کو جمع کر لیا تھا اور انھیں اس کام پر متعین کیا تھا کہ وہ جادو کے ذریعہ موسیٰ علیہ السلام کے عصا کا معجزاتی اثر توڑ دیں مگر عصائے موسوی نے جادوگروں کے تمام شعبدوں کو نیست و نابود کر دیا۔ جب موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو لے کر مصر سے روانہ ہوگئے تو فرعون اور اس کے لشکر نے ان کا تعاقب کیا اور ایک ایسا مقام آگیا کہ آگے سمندر اور پیچھے فرعون کی فوج تھی۔ حضرت موسیٰ نے اپنا عصا سمندر پر دے مارا اور سمندر میں راستہ پیدا ہوگیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب بھی کشتی کی ضرورت ہوتی تو یہی عصا سمندر میں حضرت موسیٰ اور قوم موسیٰ کے لیئے کشتی کا کام دیتا تھا۔ جب فارہ کے لیے آب و گیاہ میدان میں حضرت موسیٰ کی قوم پر تشنگی کا غلبہ ہوا تھا تو اسی عصا کو حضرت موسیٰ نے ایک چٹان پر دے مارا جس سے بنی اسرائیل کے بارہ قبائل کے لیئے بارہ چشمے پھوٹ پڑے جنھیں "عیون موسیٰ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ علامہ اقبالؔ لکھتے ہیں کہ ؎

دفعۃً جس سے بدل جاتی ہے تقدیرِ اُمم ؎ ہے وہ قوت کہ حریف اس کی نہیں عقلِ حکیم
ہر زمانے میں دگرگوں ہے طبیعت اس کی ؎ کبھی شمشیرِ محمدؐ ہے کبھی چوبِ کلیمؑ

س۔ خواجۂ سگ پرست سے کیا مراد ہے؟

ج ۔ خواجۂ سگ پرست ایسے آدمی کو کہتے ہیں جو شرفاء کے مقابلے میں کمینوں کو اہمیت دے اپنے خدمتگاروں کو اپنے رشتہ داروں سے اونچا سمجھے۔

مشہور ہے کہ نیشاپور میں ایک تاجر تھا جس نے اپنے کتے کے گلے میں ایک سونے کی زنجیر ڈال رکھی تھی ۔ اور اس زنجیر میں نہایت گراں بہا سات لعل پیوست تھے۔ وہ کتا کھانا بھی سونے کے برتن میں کھاتا تھا۔ کتے کے کھانے کے بعد جو کھانا بچ رہتا تھا وہ تاجر اپنے دو حقیقی بھائیوں کو کھلاتا تھا۔ جنھیں اس نے قید خانے میں بند رکھا تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ ان دو حقیقی بھائیوں نے کئی مرتبہ تاجر کی جان لینے کی کوشش کی تھی اور وہ محض اس کتے کی وفاداری کی بنا پر بچ گیا تھا چنانچہ وہ کتے کو نہایت تزک و احتشام کے ساتھ رکھتا تھا جبکہ بھائیوں کو اس نے قید میں ڈال رکھا تھا اسی واقعے کی بنا پر اس تاجر کا نام "خواجۂ سگ پرست" مشہور ہوگیا تھا ۔

ماہنامہ

ذوقِ نظر

حیدرآباد

جِلد (۳) فون نمبر (525117) 170 ... شمارہ (۲)

فروری سنہ ۱۹۸۷ء

مدیرِ اعلیٰ : محمد بشیر الدین بشیر وارثی

مدیرِ انتظامی : خورشید جنیدی

ناظم نشر و اشاعت : عابد قادری ○ مشیرِ قانونی : محمد شمیم ایڈوکیٹ

مجلسِ مشاورت

زرِ تعاون

سالانہ پچاس روپے فی شمارہ پانچ روپے

عرب ممالک سے فی شمارہ ۵ ریال

ایڈیٹر پرنٹر اینڈ پبلیشر : محمد بشیر الدین بشیر وارثی ○ مقام طباعت : دائرہ الیکٹرک پریس چھتہ بازار ۔

مقام اشاعت : دفتر ماہنامہ ذوقِ نظر ۳-۶۱۲-۸-۲۲ چھتہ بازار حیدرآباد ۲۰

اِس شمارے میں

آندھرا پردیش اردو اکیڈمی کے لیل و نہار

(سال ۸۶-۱۹۸۵ء)

تشکیل جدید	۱۲/ اگست ۱۹۸۵ء
مطبوعات پر انعامات	سال ۸۶-۱۹۸۵ء میں ریاست کی (۴۵) بہترین تصانیف نظم و نثر مطبوعہ ۸۲ء، ۸۳ء، ۸۴ء کو انعامات دیئے گئے۔
طلبہ و طالبات کو میرٹ اسکالرشپ۔	سال ۸۶-۱۹۸۵ء میں ریاست کے ساتویں جماعت سے ایم اے تک کے سرکاری امتحان میں کامیاب (۱۵۹) طلبہ و طالبات کو اردو مضمون میں میرٹ کی بنیاد پر اسکالرشپ دیئے گئے۔
سمینار سمپوزیم اور مشاعروں کے انعقاد کے لئے اداروں کو امداد	سال ۸۶-۱۹۸۵ء میں ریاست کے (۸) اداروں کو سمینار، سمپوزیم اور مشاعروں کے لئے امداد دی گئی۔
شاعروں، ادیبوں، صحافیوں وغیرہ کو علاج و معالجہ کیلئے امداد	سال ۸۶-۱۹۸۵ء میں اردو کے (۵) ممتاز شاعروں، صحافیوں، فن کاروں، ادیبوں اور دانشوروں کو علاج معالجہ کے سلسلہ میں امداد دی گئی۔
لائبریریوں کو امداد	سال ۸۶-۱۹۸۵ء میں ریاست کے (۴۶) عوامی کتب خانوں اور لائبریریوں کو بہ شکل کتب امداد دی گئی۔
رسایل اور جرائد کو امداد	سال ۸۶-۱۹۸۵ء میں ریاست کے (۷) علمی، ادبی رسایل اور جرائد کو امداد دی گئی۔
اشاعتی پروگرام	سال ۸۶-۱۹۸۵ء تلگو اور اردو زبان و ادب کے مابین باہمی ارتباط کے اہم مقصد کے پیشِ نظر تلگو کے ایک مشہور ناول کے اردو ترجمہ "روشن سائے" کی اشاعت کا کام شروع کیا گیا۔
شعراء کی عزت افزائی اور مشاعرہ	سال ۸۶-۱۹۸۵ء میں یکم نومبر، یوم تاسیس آندھرا پردیش کی سرکاری تقاریب کے ساتھ، زیرِ اہتمام اردو اکیڈمی، حکومت کی طرف سے ایک مشاعرہ کا انعقاد عمل میں آیا، اس موقع پر ریاست کے (۲۶) شعراء کی عزت افزائی کی گئی۔ گورنر آندھرا پردیش ڈاکٹر شنکر دیال شرما اور چیف منسٹر مسٹر این ٹی راما راؤ نے شرکت کی۔
مہمان شعراء اور دانشوروں کا خیر مقدم	ایک پُر اثر تقریب میں روس، پاکستان اور ملک کے مہمان شعراء اور دانشوروں کا اردو اکیڈمی کے دفتر میں خیر مقدم کیا گیا۔ اس موقع پر ایک محفل شعر بھی منعقد کی گئی۔

محمد خلیل الرحمٰن
ڈائرکٹر / سکریٹری

11-4-637 اے سی گارڈز
حیدرآباد 500004 (اے پی)

حرفِ آغاز

کسی قوم کا اثاثہ اس کی تہذیب اور زبان ہے۔ اگر تہذیب اور زبان ہی ختم ہو جائے تو پھر وہ قوم مردہ قوموں میں شمار کیجاتی ہے۔
یہی کچھ حال آج کل اُردو کے پرستاروں کا ہے۔ وہ زبان کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن عمل کی حد میں زبان سے بےگانگی کا اظہار کرتے ہیں۔ آج کتنے ایسے اُردو پرست ہیں جو اپنی زبان کی بقا کیلئے خلوصِ دل سے کوشاں ہیں۔ مادری زبان کو چھوڑ کر بدیسی زبان کو ذریعہ اظہار بنانا خود اپنی زبان سے غداری کرنے کے مترادف ہے۔ کتنے ایسے اُردو پرست ہیں جو اُردو کے حق کے لئے جان دینے تیار ہیں لیکن در پردہ رہے ہے۔ بچوں کو بدیسی زبان کے مدرسوں میں شریک کرواکر فخر محسوس کرتے۔ اگر یہی حال رہا تو وہ دن دور نہیں جب ہماری آنے والی نسل، اُردو سے بالکل نابلد ہو جائے گی جس کا لازماً نتیجہ یہ ہوگا کہ آئندہ اُردو کو پڑھنے والا کوئی نہیں رہے گا۔ اور اردو کی کتابیں، مقدس کتابوں کی طرح الماریوں کی زینت ہو جائیں گی۔

اِن حالات میں ہمارا پہلا فرض ہے کہ ہم اُن اُردو گریز ذہنوں کو بےنقاب کریں اور ان کے خلاف جدوجہد کریں تاکہ اُردو ہماری آنے والی نسلوں سے نابود نہ ہونے پائے۔

ہم غلط سلط بدیسی زبان کو ذریعہ اظہار بنانے کی بجائے خود اپنی زبان سے ربط کو مضبوط تر کریں۔ ہماری زبان باقی رہے گی تو اس کے عطا کی ہوئی تہذیبی اور معاشرتی نفاستیں کبھی مٹنے نہ پائیں گی۔

ہم اُردو پرستوں کو چاہیئے کہ اُردو کی تعلیم اور ترویج کو اپنا نصب العین بنائیں اور اس کی اشاعت میں ممکنہ سعی فرمائیں۔

اے اہلِ نظر! ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شئے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

(ڈاکٹر محمد اقبالؔ)

حمدِ باری تعالیٰ

سیّد غوث الدین علی خان ذاکرؔ قادری

خدائے پاک خلاقِ جہاں ہے
زمیں اس کی، اسی کا آسماں ہے

بظاہر وہ نگاہوں سے نہاں ہے
حقیقت میں ہر اک شئے سے عیاں ہے

اسی کو علم ہے سود و زیاں کا
اسی کے ہاتھ میں نبضِ جہاں ہے

اسی سے ہے بہارِ باغِ ہستی
وہی ہر بزم میں روحِ رواں ہے

ہمیں حاجت نہیں ہے پاسباں کی
خدا خود ہی ہمارا پاسباں ہے

اسی کے فضل سے سب جی رہے ہیں
وہ ہر چھوٹے بڑے پر مہرباں ہے

نہ کیوں راضی رہیں اس کی رضا پر
بجز اس کے کوئی چارہ کہاں ہے

کرم جانو! خدا کا عیش کو تم
مصیبت کو سمجھ لو، امتحاں ہے

خلوصِ دِل ہے زاہدؔ! شرطِ اوّل

حضرت صابرؔ شاہ آبادی

نعتِ شریف

یقیں کرلے تو پھر ہر رہگذر سرکار کا گھر ہے
بشر کے حق میں معراجِ نظر سرکار کا گھر ہے

جنوں کامل ہو تو پیشِ نظر سرکار کا گھر ہے
متاعِ رہبری پوچھو اگر سرکار کا گھر ہے

نبی سے خواہشِ بخشش کا یہ موقع نہیں مؤذن
اگر عاشق ہے تو دیدار کر سرکار کا گھر ہے

مذاقِ سجدہ ہے اظہارِ جسمانی عبادت ہے
یہاں سجدہ نہ کر سر پیش کر سرکار کا گھر ہے

ملے گی جنّتِ مشروط، وہ بھی بعدِ محشر کے
جو چاہو آج ہی جنت اگر سرکار کا گھر ہے

یہاں آنکھوں کو نظریں اور نظر کو دید ملتی ہے
نہ کر فریاد اپنی مختصر سرکار کا گھر ہے

گنہ جتنے سہی لیکن نہ ہو مایوس اس در سے
نہیں یہ محض پیغمبر کا گھر سرکار کا گھر ہے

خدا جبار بھی ہے اور محمدؐ سربسر رحمت
گنہگاروں کو سب سے معتبر سرکار کا گھر ہے

خدا کا گھر کبھی بیت المقدس اور کبھی کعبہ
نہیں ہٹتا جو مرکز سے وہ گھر سرکار کا گھر ہے

حرم کہتا ہے صابرؔ، گردشِ دوراں سے بالاتر
کوئی گھر ہے تو وہ المختصر سرکار کا گھر ہے

امام شافعیؒ کا ایک سفر

خود ان کی زبانی

"جب میں نے مکہ چھوڑا تو میری عمر (۱۴) سال تھی اور ابھی سبزے کا آغاز بھی نہ ہوا تھا۔ میں وادی بطحیٰ سے "ذی طویٰ" روانہ ہوا۔ اس وقت میرے بدن پر صرف دو چادریں تھیں۔ راستہ میں ایک قافلہ دیکھا۔ میں نے لوگوں کو سلام کیا؛ انہوں نے میرے سلام کا جواب دیا۔ پھر ایک بزرگ شخص جو ان میں تھا میری طرف متوجہ ہوا اور اس نے کہا۔ "جو شخص ہمیں سلام کرتا ہے وہ ہمارے ساتھ کھانا ضرور کھاتا ہے"۔ اور مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ کھانا کھا رہے ہیں۔ میں نے کہا "بہتر" میں نے دیکھا کہ وہ لوگ دیہاتی ہیں۔ پانچوں انگلیوں سے کھانا اٹھاتے ہیں اور ہاتھ جھٹکتے ہیں۔ میں بھی انہیں کی طرح عمل کرنے لگا کہ میرے کھانے کے طریقہ سے کہیں وہ برا نہ مانیں۔ وہ بزرگ شخص مجھے بار بار دیکھتا رہا۔ پھر میں نے پانی کا برتن اٹھایا اور غٹاغٹ پی گیا۔ میں نے الحمدللہ پڑھا اور اللہ کی ثنا کی۔ یہ دیکھ کر شیخ قافلہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ اس نے پوچھا۔

"کیا تم مکہ کے رہنے والے ہو"؟

"میں :۔ "جی ہاں !"

"شیخ :۔ "کیا تم قریشی ہو"؟

میں :۔ "جی ہاں قریشی ہوں"۔

اس پر میں شیخ کی طرف متوجہ ہوا اور کہا۔ "چچا جان! آپ نے میرے متعلق یہ باتیں کس طرح جانیں"۔؟

شیخ :۔ کھانا کھانے کے بعد اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرنا۔ اور سلام کرنے میں پہل، یہ قریشیوں کی خصوصیت ہے۔

پھر میں نے پوچھا۔ "آپ کہاں سے تشریف لا رہے ہیں۔

شیخ :۔ "یثرب، مدینۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے"

میں :۔ وہاں کا عالم کون ہے، جو کتاب اللہ کا درس بھی دیتا ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا بھی ماہر ہو"!

شیخ :۔ "حضرت مالکؒ بن انس رضی اللہ عنہ"۔"

میں :۔ "کاش! مالکؒ سے میری ملاقات ہو"۔

شیخ :۔ اللہ تمہارے شوق کو پورا کرے۔ تم وہ مٹیالے رنگ کا اونٹ دیکھتے ہو؟

میں۔ "ہاں"

شیخ :۔ "یہ ہمارا بہترین اونٹ ہے اور سب سے زیادہ نرم رو۔ ہم آٹھ آدمی ہیں۔ تم ہمارے ساتھ چلو۔ ہم

تمہیں مالکؓ کے پاس پہونچا دیں گے۔

میں :- "آپ کس وقت روانہ ہوں گے۔"؟

شیخ :- "ہم ابھی چل رہے ہیں۔"

تھوڑی دیر میں ہم روانہ ہو گئے۔ اور انہوں نے مجھے اونٹ پر سوار کر دیا۔ جس کی پیش کش کی تھی۔ میں اونٹ پر بیٹھ گیا۔ اور سب لوگ بھی چلنے لگے۔ آٹھویں روز ہم مدینہ منورہ میں داخل ہو گئے۔ میں روضۂ رسولؐ کے پاس پہونچا اور درود و سلام کرنے لگا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت مالکؓ بن انس چادر اوڑھے بیٹھے ہیں اور یہ کہہ رہے ہیں :

"مجھ سے بیان کیا۔ نافعؓ نے۔ انہوں نے روایت کی ابن عمرؓ سے اور انہوں نے اس صاحبِ مزار سے" اور یہ کہہ کر حضرت مالکؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کو چھوا۔ جب میں نے یہ دیکھا تو میرے دل میں ہیبت پیدا ہوئی۔ اور میں اس وقت تک بیٹھا رہا جب تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ میں نے زمین سے ایک تنکا اٹھایا اور حضرت مالکؓ جو حدیث بیان کرتے اس تنکے سے اپنے ہاتھ پر لکھتا رہا۔ حضرت مالکؓ کبھی کبھی مجھے دیکھ لیتے۔ جب یہ مجلسِ درسِ حدیث ختم ہو گئی اور حضرت مالکؓ مغرب کی نماز کے انتظار میں بیٹھ گئے تو میں ان کی نظر بچا کر اٹھنے لگا۔ اس پر انہوں نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے اپنی طرف بلایا۔ میں قریب گیا۔ کچھ دیر مجھے دیکھتے رہے، پھر فرمایا :-

"تم مکے کے رہنے والے ہو۔"؟

میں :- جی ہاں! اور میں قریشی ہوں۔

حضرت مالکؓ :- "تم خاصے بڑے ہو گئے لیکن آدابِ درس سے واقف نہ ہوئے"

میں :- "آپ نے مجھ میں کیا سوءِ ادب دیکھا"؟

مالکؓ :- میں نے دیکھا کہ جب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات بیان کر رہا تھا۔ اس وقت تم اپنے ہاتھ پر تنکے سے کھیل رہے تھے۔"

میں - "کاغذ نہیں تھا۔ اس لئے آپ جو کچھ فرماتے جاتے، میں ہاتھ پر لکھتا جاتا تھا۔"

حضرت مالکؓ نے میرا ہاتھ پکڑا اور ہتھیلی کو دیکھ کر فرمایا۔ "اس پر تو کچھ بھی لکھا ہوا نظر نہیں آتا۔"

میں : "لکھا ہوا ہاتھ پر قائم نہیں رہتا لیکن میں نے وہ سب کچھ لوحِ دماغ پر نقش کر لیا ہے۔ جو آپ فرماتے گئے شروع سے آخر تک"

حضرت مالکؓ : تم ایک حدیث ہی دہرا کر سناؤ۔"

میں : "مجھ سے بیان کیا مالکؓ نے، ان سے نافعؓ نے، ان سے ابنِ عمرؓ نے اور ان سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے" اور میں نے حضرت مالکؓ کی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مزارِ مبارک کی طرف اشارہ کیا۔ اور اسی طرح وہ ۲۵ پچیس حدیثیں سنا دیں جو حضرت مالکؓ نے عصر کی نماز سے لے کر غروبِ آفتاب تک اپنی مجلس میں سنائی تھیں۔

حضرت مالکؓ نے مغرب کی نماز پڑھی پھر اپنے غلام کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا۔ "ان صاحبزادے کو ہمراہ لو" اور مجھ سے فرمایا۔ "ان کے ساتھ جاؤ" میں اٹھا اور خوش خوش چل دیا۔ جب مکان آیا تو غلام نے مجھے نشست گاہ میں داخل کیا اور کہا کہ "قبلہ کا رخ یہ ہے، یہ پانی کا برتن ہے (اشارہ کر کے) وہ بیت الخلاء ہے۔"

حضرت مالکؒ تھوڑی دیر بعد تشریف لائے ان کے ہمراہ ان کا غلام تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک سلفچی تھی، جو اس نے زمین پر رکھ دی۔ حضرت مالکؒ نے مجھے سلام کیا، پھر غلام کو حکم دیا کہ ہمارے ہاتھ دھلاؤ غلام نے پانی کا لوٹا اٹھایا اور پہلے میرے ہاتھ دھلانے چاہے۔ حضرت مالکؒ نے پکار کر کہا۔ "کھانے سے پہلے گھر والے کے ہاتھ دھلائے جاتے ہیں اور کھانے کے بعد مہمان کے" حضرت موصوف کی یہ بات مجھے پسند آئی اور میں نے ان سے اس کی وجہ پوچھی۔ حضرت نے فرمایا "چونکہ میزبان کھانے کے لئے بلاتا ہے تو اس کو ہاتھ دھونے میں ابتداء کرنی چاہئے۔ اور کھانے کے بعد اسے انتظار کرنا چاہئے کہ اور کون آتا ہے جو اس کے ساتھ کھانا کھائے"۔

حضرت مالکؒ نے طباق پر سے کپڑا اٹھایا تو اس میں دو برتن تھے۔ ایک میں دودھ اور ایک میں کھجوریں۔ پھر انہوں نے بسم اللہ پڑھی اور میں نے بھی پڑھی اور سب کچھ چٹ کر گئے۔

حضرت مالکؒ نے محسوس کیا کہ کھانا ناکافی تھا۔ اور کہا۔ "اے عبداللہ! کھانا کم رہا۔ مگر میں ایک غریب آدمی ہوں"۔

میں :۔ "احسان کرنے میں معذرت خواہی کی ضرورت نہیں۔ معذرت تو برائی میں کی جاتی ہے"۔

پھر حضرت مالکؒ مجھ سے اہل مکہ کے حالات پوچھتے رہے۔ پھر فرمایا "مسافر کے لئے لازم ہے کہ آرام کرے"۔

حضرت تشریف لے گئے اور میں سو گیا۔ رات کا آخری حصہ ہوا تو حضرتؒ نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

میں نے دروازہ کھولا تو انہوں نے کہا۔ "نماز کا وقت ہو گیا، اللہ تم پر رحم کرے"

میں نے دیکھا کہ وہ پانی کا برتن اٹھائے ہوئے تھے۔ تاکہ مجھ کو وضو کرائیں۔ مجھ سے فرمایا۔ "تکلف کی ضرورت نہیں، مہمان کی خدمت فرض ہے"۔ میں نے تیاری کی اور فجر کی نماز حضرت مالکؒ بن انسؒ کے پیچھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں پڑھی۔ اس وقت اندھیرا اتنا تھا کہ نمازی ایک دوسرے کو پہچان نہیں سکتے تھے۔ نماز کے بعد حضرت مالکؒ کل کی طرح اپنی جگہ پر بیٹھ گئے اور اپنی کتاب "معطا" مجھے دی اور فرمایا "اسے پڑھو"۔ میں کتاب پڑھنے لگا۔ لوگ لکھتے جاتے تھے۔

میں نے پوری کتاب اول سے آخر تک پڑھ کر یاد کرلی۔ میں حضرتؒ کے یہاں آٹھ مہینے ٹھہرا رہا۔ اور کسی کو پتہ نہ چلا کہ ہم میں سے کون مہمان ہے اور کون میزبان۔

پھر کچھ مصری حج کے بعد زیارت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے آئے۔ اور "معطا" سننے کی خواہش کی۔ میں نے ان کے سامنے زبانی (حافظہ کی مدد سے) "معطا" پڑھی۔ ان میں عبداللہ بن حکمؒ، اشہبؒ اور ابن قاسم تھے۔ اس کے بعد اہل عراق کا قافلہ آیا۔ اس میں ایک نوجوان حسین و جمیل، خوش لباس، عمدہ طریق پر نماز پڑھنے والا پایا۔ میرے پوچھنے پر اس نے اپنا وطن کوفہ بتایا (عراق کا ایک شہر)

میں نے اس سے دریافت کیا کہ وہاں سب سے بڑا عالم اور کتاب اللہ کا جاننے والا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے مطابق مسئلہ بتانے والا کون ہے"؟

وہ :۔ محمد بن حسنؒ اور ابو یوسفؒ جو امام ابو حنیفہؒ

کے شاگرد ہیں۔"

میں :۔ آپ لوگ کب واپس جا رہے ہیں ؟

وہ :۔ پرسوں صبح سویرے۔

یہ سن کر میں حضرت مالک رضؓ کے پاس آیا اور عرض کیا۔" میں مکۂ معظمہ سے اپنی ماں کی اجازت کے بغیر حصولِ علم کے لئے نکل کھڑا ہوا تو اب واپس جاؤں کہ اور آگے بڑھوں"

حضرت رضؓ نے فرمایا۔ کیا تم نہیں جانتے کہ فرشتے طالبِ علم کے ہر قدم کے لئے اپنے پر بچھاتے ہیں۔ اس پر میں نے سفر کا ارادہ کیا تو حضرت رضؓ نے زادِ راہ کے لئے ایک صاع پنیر، ایک صاع جو، ایک صاع کھجور اور پانی کا ایک مشکیزہ عنایت فرمایا۔ جب صبح کا وقت ہوا اور روانگی کا وقت آیا تو حضرت مالک رضؓ یہ سب چیزیں اٹھائے ہوئے میرے ساتھ بقیع تک گئے اور بلند آواز سے کہنے لگے۔ "کوفہ تک سواری کا کیا کرایہ ہے ؟" میں نے کہا "آپ کرایہ کیوں پوچھتے ہیں جبکہ رقم نہ آپ کے پاس ہے نہ میرے پاس"

حضرت رضؓ نے جواب دیا۔ جب میں رات کو تمہارے پاس سے اٹھا تھا اور عشاء پڑھ چکا تھا تو ایک شخص نے آکر دروازہ کھٹکھٹایا۔ باہر نکلا تو میں نے دیکھا کہ ابن القاسم ہیں۔ انہوں نے مجھ سے ایک ہدیہ قبول کرنے کو کہا۔ میں نے قبول کر لیا۔ انہوں نے مجھے ایک تھیلی دی۔ جس میں سو روپئے تھے۔ آدھے تمہارے لئے لے آیا ہوں۔ اور آدھے میں نے گھر والوں کے لیے رکھ چھوڑے۔ یہ کہہ کر انہوں نے اونٹ والے کو کرایہ دیدیا۔ باقی رقم مجھے دی ... الوداع کہا اور تشریف لے گئے۔

(ماخوذ سعدی ڈائجسٹ ۸۶ء)

حضرت امجد حیدرآبادیؒ

رباعی

سرکار پہ جبر کون کرسکتا ہے

مختار پہ جبر کون کرسکتا ہے

بخشے تو کرم ہے ورنہ اُس کی مرضی

جبار پہ جبر کون کرسکتا ہے

حیات وارثی
بلدۂ انوار لکھنؤ ۳۱

★

حضرت بیدمؒ وارثی

آئینۂ فن میں

عہدِ قدیم سے تعلّی اور انا کا اظہار شعراء کا شعار رہا ہے۔ تمام شعراء اپنے صاحبِ کمال اور اپنی شخصیت کے بینظیر ہونے کا اعلان بیکراں اشعار میں کرتے رہے ہیں۔ کسی کا فرمایا ہوا مستند ہے۔ کسی کے لیے شاعری ذریعۂ عزت نہیں ہے۔ اپنی لسانی فوقیت اور فصاحت و بلاغت پر نازاں ہے لیکن اردو کا ایک صاحبِ طرز شاعر ایسا بھی ہے جسکو اپنی بے کمالی پر فخر ہے۔ جس نے اپنے مرشدِ کامل سید حاجی حافظ وارث علی شاہؒ کی محبت اور عقیدت میں محو ہو کر عرفانِ ذاتِ کائنات حاصل کیا۔

اس صاحبِ کمال شاعر نے اپنے کلام کی ابتدا اس رباعی سے کی ہے۔

عشق آیا ہے رفعتِ خیالی لے کر
حسن آیا ہے شوکتِ جمالی لے کر
ہر اہلِ کمال کے لیے آیا ہے کمال
بیدمؔ آیا ہے بے کمالی لے کر

یہ فقیر منش، صاحبِ دل، عشق آگاہ شاعر ۱۲۹۲ھ میں اٹاوہ میں پیدا ہوا۔ بزمِ شعر و ادب اور دنیائے تصوف میں اسے بیدمؔ وارثیؒ کے نام سے پکارا گیا۔

بیدم شاہ وارثیؒ نے عربی، فارسی اور اردو کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ فنِ شعرگوئی میں ان کا سلسلہ خواجہ حیدر علی آتشؔ تک پہنچتا ہے۔ انھوں نے اپنے کلام پر مولانا نثار اکبر آبادی سے اصلاح لی اور اپنی خداداد صلاحیت اور ذہانت سے جلد ہی صفِ شعراء میں منفرد مقام حاصل کر لیا۔

مصورِ فطرت خواجہ حسن نظامی دہلوی نے بیدم وارثی کے کلام پر تبصرہ فرماتے ہوئے کہا ہے کہ

حضرت بیدم وارثیؒ کے کلام کو اردو زبان اور ہندی میں وہی فوقیت حاصل ہے جو

فروری ۱۹۸۰ء

• ذوقِ نظر حیدرآباد

دورِ آخر میں حضرت مولانا حاجی وارث علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے عصر کے فقرا
و مشائخ میں حاصل تھی۔ اردو زبان بحیثیت زبان جس قدر ترقی کرے گی
کلامِ بیدمؔ کی روحانیت اس میں جان پیدا کرتی رہے گی۔"

بیدم وارثی چونکہ سید حاجی وارث علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ سے روحانی عقیدت رکھتے تھے اس لیے ان کے کلام میں انسانیت، عشق و محبت، اسرار طریقت و حقیقت کی ترجمانی فطری ہے۔ آپ کے کلام کی نمایاں خصوصیت سوز و گداز ہے۔ پروفیسر علامہ بیخود موہانی نے آپ کی قادر الکلامی خوش بیانی کا تذکرہ یوں کیا ہے کہ

"آپ ہر رنگ پر قادر ہیں آپ کی مضمون آفرینی، نکتہ سرائی، خوش گوئی
کا اعتراف ان دقیقہ سنجوں کو ہے جن کی نکتہ رسی پر ایمان لانے بنتی ہے"

اس کی حریمِ ناز میں عقل و خرد کو دخل کیا
جس کی گلی کی خاک کا ذرہ جہانِ راز ہو

• مولانا بیدم شاہ وارثیؒ نے تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور ہندی میں بھی شعر کہے ہیں لیکن ان کی شہرت کا سبب انکی عاشقانہ غزلیں ہیں۔ بیدم وارثیؒ کا عہد اردو شاعری کا زریں عہد ہے کیونکہ ان کے ہمعصروں میں جگر، فانی، حسرت، اصغر، اقبال، جوش، اقبال سہیل، نوح ناروی، آسی، سعد اور صاحبانِ فکر و نظر شامل ہیں۔ لیکن بیدم وارثیؒ نے ان سب سے الگ اور منفرد راہ اختیار کی ہے۔ ان کی شہرت اور مقبولیت میں نہ دنیاوی جاہ و جلال شامل ہے نہ اثر و رسوخ بلکہ حقیقی جذبات نگاری اور فطری شعری خوبیوں نے ان کا دائرہ شہرت وسیع کیا ہے۔

کلامِ بیدمؔ تنقید کی کسوٹی پر کسنے کے بعد کھرا سونا پایا گیا ہے۔ ناقدینِ شعر و سخن نے اپنے غیر جانبدار تبصروں سے ان کے کلام کی اہمیت اور حیثیت کو واضح کیا ہے۔

بیدم وارثی کے دو انتخابِ کلام "ارمغانِ بیدم" اور "مصحفِ بیدم" ان کی حیات میں شائع ہوئے تھے ان دونوں مجموعوں کا استقبال ادبی حلقوں میں جس شاندار طریقے پر کیا گیا تھا وہ قابلِ مثال ہے۔

بیدم وارثیؒ نے مشاعروں میں شریک ہو کر اپنا کلام سنایا ہے اور باذوق سامعین سے بے پناہ داد و ستائش حاصل کی ہے۔ بیدم وارثی اپنے عہد کے کامیاب ترین شعراء میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کی غزلیں اور نعتیہ کلام قوال اور مغنی گاتے رہے ہیں اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے، شہرت اور مقبولیت کے اعتبار سے بھی بیدم وارثی خوش نصیب شعراء میں شمار کیے جاتے ہیں۔

بیدم وارثیؒ نے اپنی آپ بیتی کو جگ بیتی کا روپ دیا ہے۔ ان کے طرزِ بیان میں جدت اور اندازِ سخن میں ندرت ہے جسے سوز و گداز کی نرم آنچ نے کندن بنا دیا ہے۔ حقیقت و معرفت اور وارداتِ قلبی کی ترجمانی تغزل کے اہتمام اور عشق کے احترام نے ان کے خوابوں کو ایسی تعبیریں بخشی ہیں کہ کلام خود کلیم کی تصویر بن گیا ہے۔

حضرت علامہ حکیم ابوالعلا ناطق کسوتی نے فرمایا ہے کہ

"حضرت بیدم شاہ وارثیؔ حقائق و معارف کے جسقدر آشنائے راز ہیں نہ جاننے والے بھی جانتے ہیں مگر اظہارِ معارف و حقائق پر انکی جیسی اور جتنی قدرت ہے اس حقیقت کا عرفان بہت کم لوگوں کو ہے۔"

حضرت بیدم شاہ وارثی، حاجی وارث علی شاہ کے احرام پوش فقیروں میں امتیازی حیثیت کے حامل تھے۔ آپ کو بارگاہِ وارثیہ پاک میں وہی مرتبہ اور مقام حاصل تھا جو دربارِ حضرت نظام اولیاء میں حضرت امیر خسروؔ کو۔

بیدم شاہ وارثی کا زیادہ وقت دیوہ شریف (ضلع بارہ بنکی) میں گذرتا تھا۔ اردو شعر و ادب کا یہ اکبر گلِ صوفیائے بے ریا کا عطیہ اور فیضانِ کرم ہے۔ بیدم وارثی نے اردو کے علاوہ فارسی میں بھی مشقِ سخن کی ہے آپ کا فارسی کلام بھی فصاحت و بلاغت اور فکر و فن کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

حضرت بیدم وارثی کے مطبوعہ مجموعوں پر ملک کے ممتاز و مشاہیر شعراء نے قطعات تاریخ لکھے ہیں جس سے بیدم وارثی کی ادبی اہمیت اور شاعرانہ عظمت کا اظہار ہوتا ہے۔ چند قطعات لکھ رہا ہوں تاکہ دعویٰ بے دلیل نہ رہ جائے۔

نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل مانکپوری جانشین حضرت امیر مینائیؒ

دیوانِ پر بہار کے ہر تازہ شعر میں — معنیٔ آبدار کی اک کائنات ہے
اس جانفزا کلام کی تاریخ لکھ جلیل — بیدم کا یہ سخن نہیں آبِ حیات ہے

۱۳۵۴ ھ

ناصرِ سخن حضرت نوح ناروی جانشین حضرت داغ دہلوی۔

نوح دیوان شاہ بیدم کا — آنے والا ہے جلوہ پیشِ نگاہ
سال ترتیب عیسوی میں لکھو! — شاہکارِ داغ بیدم شاہ

۱۹۳۴ ء

۸ رمضان المبارک ۱۳۵۵ھ مطابق ۱۹۳۵ء کو اردو، فارسی اور ہندی کا یہ باکمال شاعر، عالمِ باعمل، عاشقِ صادق، حقیقت آگاہ صوفی اس عالمِ فانی سے عالمِ جاودانی کی جانب روانہ ہوگئے۔ آپ نے اپنی یادگار میں دو صاحبزادے میاں وارث حسین بیدار وارثی اور میاں ایاز وارثی چھوڑے ہیں۔
آپ کی تدفین شاہ روشن کے تکیئے دیوہ شریف ضلع بارہ بنکی میں کی گئی۔ بعد وصال بھی دیارِ مرشد حاصل ہوا۔ ؎

پھر تو بیدم منزلِ مقصود تک پہنچیں گے ہم ؛ بن گئے جب مٹ کے گردِ کاروانِ وارثی

نعتِ پاک

حضرت بیدم وارثی

آئی نسیم کوئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم — کھنچنے لگا دل سوئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم
کعبہ ہمارا کوئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم — مصحفِ ایماں روئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم
لے کے مرادِ دل آئیں گے [illegible] — نہیں تو ہم تا کوئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم
طوبیٰ کی جانب دیکھنے والو آنکھیں تم لو خوش ہو لو — دیکھو قدِ دلجوئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم
نام اسی کا بابِ کرم ہے دیکھو یہی محرابِ حرم ہے — دیکھو خمِ ابروئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم

بھینی بھینی خوشبو مہکی، بیدم دل کی دنیا مہکی
کھل گئے جب گیسوئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم

★

نذرِ مرشد

(حضرت اقدس حاجی وارث علیشاہ ؒ)

حضرت بیدم وارثی

فدا ہے جان تو دل مبتلائے وارث ؒ ہے — غرض کہ مجھ میں ہے جو کچھ برائے وارث ؒ ہے
وہ دل ہے جو ہے آئینہ دارِ حسن و جمال — وہی ہے آنکھ جو محوِ لقائے وارث ؒ ہے
زمینِ دیوہ کے آنکھوں سے ذرے چنتا ہوں — کہ دردِ دل کی دوا خاکِ پائے وارث ؒ ہے
اسی لیے ہے سرِ شوق اپنا وقفِ سجود! — کہ ذرہ ذرہ میں دولت سرائے وارث ؒ ہے

نہ اتقا نہ ریاضت نہ زہد ہے نہ ورع
متاعِ بیدمِ خستہ عطائے وارث ؒ ہے

حضرت سیّد ابوالنصر گیلانی ؒ

انسان پر جو کچھ دنیا میں گذرتی ہے وہ ایک داستان سے کم نہیں ہوتی ۔ تلخ و شیریں تجربات اور عینی مشاہدات کا ایک سلسلہ بندھا رہتا ہے، جس سے کوئی پل خالی نہیں ۔ اگر انسان ان کو ذہن میں محفوظ کر لے تو یقیناً دیوانہ ہو جائے گا۔ یہاں جینے میں یہی آسانی ہے کہ ہر لمحۂ حال دوسرے ہی لمحہ ماضی بن جاتا ہے ۔ اور گزرے ہوئے لمحے کی ہر اچھی بری کیفیت آنے والے لمحوں میں معدوم ہوتی چلی جاتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ابھی روتا ہوا انسان کچھ لمحوں بعد مسکراتا ہوا ملے گا۔ بس ہر فرحت میں ماضی کی یادوں کے دھندلے سائے ہی باقی رہ جاتے ہیں گے ۔ اس طرح اتنی تیز رفتاری سے ہر چیز کو آسانی سے بھلا دینے والی دنیا میں کچھ واقعات اور چند شخصیتیں ایسی بھی ملیں گی جن کو زمانہ باوجود کوشش کے بھلا نہیں پائے گا۔ صدیوں بعد کچھ نام آج بھی دنیا میں تابندہ و زندہ ہیں ۔ ایسی ہی نمائندہ شخصیتوں میں حضرت شیخ سید ابوالنصر علیہ الرحمہ کا شمار ہوتا ہے ۔ جن کا ۱۵ نومبر [illegible] بمقام کراچی پاکستان میں انتقال ہوا۔

موصوف حضرت محبوب سبحانی شیخ سید عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ (بغداد شریف) کے چوتھے فرزند حضرت شاہ سید عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد سے تھے ۔ آپ کی ولادت ۸ نومبر ۱۸۹۳ء بمقام حما شریف (ملک شام) میں ہوئی آپ کے والد ماجد کا نام سید احمد فضل اللہ الگیلانی ؒ اور والدۂ ماجدہ کا بی بی سیدہ قولہ ؒ ہے ۔ دونوں کی طرف سے آپ کا سلسلۂ نسب حضرت محبوب سبحانی ؒ سے ہوتا ہوا حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک جا ملتا ہے ۔ ابتدائی تعلیم اپنے آبائی وطن حما شریف میں اپنے چچا حضرت سید عبدالقادر جیلانی ؒ حضرت شیخ احمد تھابونی اور حضرت شیخ سید الناسفانی ؒ کے پاس ہوئی اس کے بعد تعلیم کا سلسلہ شہر بغداد میں مشہور زمانہ بزرگ النعمان الاعظمی ؒ کے ہاں جاری رہا ۔ پھر اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے عالم اسلام کی سب سے قدیم اور مشہور درسگاہ جامعۃ الازہر مصر بھیجے گئے ۔ یہاں سے گریجویشن اور علوم دینی کے حصول کے بعد آپ وطن تشریف لائے ۔ اور مشہور زمانہ بزرگ شیخ طریقت حضرت شیخ مرتضیٰ الگیلانی ؒ بن بہادر کے ہاتھ پر بیعت کی اور چیف آف آرمی اسٹاف الفورپاشاہ مرحوم کی حضرت قبلہ کی والدۂ محترمہ سے درخواست کرنے پر بطور افسر ترکی فوج میں داخل لیا ۔ اور پہلی جنگ عظیم سال ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء میں شریک رہے ۔ جنگ کے بعد آپ نے فوج کی ملازمت ترک کر دی اور ورثے میں ملی ہوئی راہ طریقت و رشد و ہدایت کو پوری طرح اپنا لیا، بلکہ اس کے لئے اپنی زندگی کو وقف کر دی ۔ جس دشوار کام کا بیڑا آپ نے اٹھایا تھا اسے بحسن و خوبی تمام عمر انجام دیتے رہے

علوم ظاہری و باطنی کی تحصیل عمر بھر میں کوتاہی نہیں کی۔ تقوی، کم گوئی، شب بیداری، پابندی صوم و صلوٰۃ، حق گوئی، علوم ظاہری و باطنی کی تحصیل
میں عمر بھر کوتاہی نہیں کی۔ آپ نے شادی نہیں کی۔ مدتوں میں راہِ طریقت
ہمیشہ آپ کے پیشِ نظر رہے۔ اپنی ذمہ داریوں کی تکمیل کے لئے، آپ نے شادی نہیں کی۔
اور تصوف میں کامل دست گاہ حاصل کرنے کے خیال سے آپ نے ترک وطن کیا پہلی مرتبہ سال سنہ ۱۹۲۲ء میں اپنے
ایک ہم عصر خاندانی بھائی محترم پیر ابراہیم صاحب کے ہمراہ ہندوستان آئے اور کچھ دن کے عارضی قیام کے بعد وطن
واپس چلے گئے۔ پھر دو چار سال بعد شمالی ہندوستان آگئے۔ اس طرح مختلف مقامات، خانقاہوں، درگاہوں پر قیام کرتے
ہوئے دکن میں حیدرآباد کے مقام شمس آباد کی پہاڑی جہاں پر حضرت بابا شہاب الدینؒ کا مزارِ مبارک واقع ہے سکونت
اختیار کی اور پہلی مرتبہ وہاں سے سنہ ۱۹۴۸ء میں گنبدِ شاہی حضرت ٹیپو سلطان شہیدؒ سے بڑی گہری عقیدت و محبت کی۔
آپ شہیدؒ کا ذکر بڑے احترام سے کرتے اور اکثر فرمایا کرتے کہ حضرت ٹیپو سلطان شہیدؒ راہِ تصوف کے ایک اہم
سنگِ میل ہیں، ان کا مقام سمجھنا سب کے بس کی بات نہیں۔ اِس کے بعد آپ کا یہ معمول رہا کہ موسمِ گرما میں شمس آباد
(حیدرآباد) سے گنبدِ شاہی (گنجِ عام) آجاتے اور قیام فرماتے، یہ سلسلہ پابندی سے سال سنہ ۱۹۵۹ء میں آپ کی کراچی پاکستان
کو روانگی تک برابر جاری رہا۔ جہاں آپ بیس سال گزارنے کے بعد یکم مئی سنہ ۱۹۷۹ء کو واپس ہندوستان آگئے اور مستقل طور
پر گنبدِ شاہی گنجِ عام میں سکونت پذیر ہو گئے۔ آپ نے یہ ارادہ کر لیا تھا کہ زندگی کے آخری دن یہیں گزاریں گے لیکن
مشیت الٰہی ملحوظ تھی۔ اس لئے آپ نے اپنا ارادہ بدل دیا اور ۲۷ رمضان المبارک ۱۴۰۱ ھ م۔ سال ۱۹۸۱ء میں واپس
کراچی روانہ ہوئے اور وہیں سے آپ نے خالقِ حقیقی کی طرف کوچ فرمایا۔ آمدم برسرِ مطلب کہ راقم الحروف نے کھیل کود کی
عمر غالباً ۱۵ سال کی عمر میں پہلی مرتبہ مشہورِ زمانہ صوفی بزرگ و عالم حضرت پیر سید جماعت علی شاہ نقشبندی علی پوری علیہ الرحمہ
(رحمۃ اللہ علیہ) کو اپنے شہر میسور میں دیکھا تھا، باوجود کم سنی کے ان کی بات چیت کا عالم میرے ذہن میں بے حد متاثر کر گیا تھا۔
آگے چل کر ایک عرصے کے بعد مجھے یہ پتہ چلا کہ موصوف کی شخصیت ہر زاویے سے یگانۂ عصر تھی۔ لیکن جب مجھے تھا
اتفاق ہوا تھا، مجھ پر یہ... کچھ سمجھنے کا سکت نہ تھا، اور اس کے بعد موصوف میسور بھی نہ آسکے۔ اور تقسیمِ ملک
کے بعد حالات ہی دیگر ہو گئے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد جب کہ میں ہائی اسکول میں زیرِ تعلیم تھا، سال سنہ ۱۹۴۵ء میں حضرت
شیخ سید ابوالنصر علیہ الرحمہ کا شہرہ سنا۔ اور میرے گھر والے ایک رشتہ دار لڑکی کو جو مرض (مرگی) کا علاج مرلیضہ تھی۔ لیکر
گنبدِ شاہی گئے۔ میں بھی ساتھ تھا اور پہلی مرتبہ آپ سے نیاز حاصل ہوا، تقریباً گھنٹے بھر کی انتظاری کے بعد حضرت اپنے
حجرے سے باہر تشریف لائے۔ پُر اثر رعب پُر نور و متانت والا چہرہ، لمبا ساقد تن و مند اور مضبوط جسم تھا باری باری سب
استفادہ کرنے والوں سے مصافحہ کرتے اور حال پوچھتے رہے، جب ہماری باری آئی تو ہم نے مریضہ کا احوال
مرض کے آثار و علامتیں انہیں تفصیل سے بتائیں، گوکہ آپ کی مادری اور تعلیمی زبان عربی تھی، اور ملکِ شام میں بولے
جانے والی فرانسیسی زبان کے سوا، دوسری کوئی زبان آتی نہیں تھی، ہاں ہندوستان میں ایک طویل قیام کے باعث

اردو بول لیتے تھے، لیکن انہوں نے تمام حال بغور سنا، اور کچھ تأمل کے بعد بڑے ہی دھیمے اور سنجیدہ لہجے میں یہ بتایا کہ یہ کوئی جھوت بلا کی بات نہیں ہے، بلکہ یہ ایک موذی مرض ہے، جسے مرگی یا صرع کہتے ہیں۔ جس کا علاج مشکل ہے۔ آپ نے مشورہ دیا کہ علاج پابندی سے جاری رکھیں۔ اور فرمایا کہ میں بھی اس کے لئے دل سے دعا کردوں گا۔ ایک اور بات کی ہم سب کو تاکید فرمائی کہ ایسے مریضوں کا خیال رکھنے اور تیمارداری کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ خاص اجر عطا کرتا ہے، لہٰذا اس کی طرف سے کبھی غافل نہ رہیں۔ مجھے ان کی یہ مختصر جامع اور صاف گوئی بیحد متاثر کر گئی۔ اور اس سے پہلے کئی ایک جھاڑ پھونک کرنے والے عاملوں نے توہمات اور بے سر و پا خوف و گمان کے سیاہ دائرے بنا رکھے تھے، وہ یکلخت ٹوٹ گئے۔ اس کے بعد بھی دو چار مرتبہ اپنے بزرگوں کی معیت میں شرف نیاز حاصل ہوا۔ اس کے بعد بنتے بگڑتے حالات نے مجھے دوبارہ ملنے کا موقع نہیں دیا۔ لیکن دل اور ذہن پر آپ کے چھوڑے ہوئے نقوش کسی حال میں بھی بھلا نہیں سکا۔ یہ میری اور تمام عقیدت مندوں کی خوش نصیبی تھی کہ آپ بیشتر سال تک قیام پاکستان کے بعد میسور تشریف لائے۔ اور اپنی عمر کے آخری دو ڈھائی سال یہیں گذارے، گو عرصہ مختصر تھا لیکن بہ نسبت ماضی کے اس مرتبہ بہت زیادہ فیض حاصل کیا۔ آپ کے تقویٰ، ریاضت و عبادت کا یہ عالم تھا کہ غذا بالکل مختصر صبح ۹ بجے اور شام ۴ بجے کھاتے ہیں۔ صبح نماز کے بعد پانچ، چھ میل پیدل چلنے کا معاملہ سال ۱۹۴۵ء میں جس طرح تھا آخری عمر میں بھی اسی طرح بحال تھا۔ جب کہ آپ کی عمر نوے سال سے زائد ہو چکی تھی۔ نماز عشاء کے بعد آپ حجرہ چھوڑ کر دور غیر آباد جگہوں پر چلے جاتے تھے اور رات کا زیادہ حصہ وہیں بسر ہوتا تھا۔ ہندو، مسلمان کا کوئی فرق آپ کے پاس نہ تھا۔ نہ ذہن میں کوئی اونچ نیچ، نہ مسلمانوں میں پائی جانے والی تفرقہ بازی، مگر عیسائیوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے شاید یہ پہلی جنگ عظیم سے آج تک عرب اور اسلامی ممالک میں عیسائی اور نصرانی ریشہ دوانیوں کا اثر تھا۔ گو تصوف، اور طریقت آپ کا شیوۂ حیات تھے، مگر کسی سے بیعت لینے کا کام شاذ و نادر ہی کرتے تھے۔ یہ بات اسی سے ظاہر ہے۔ آپ کا قیام حیدرآباد اور گنبدِ شاہی میں بہت زیادہ رہا، میرے ہم وطن محترم میجر نور اللہ شریف صاحب نے اپنی ملازمت کے دوران ہی حضرت سے نیاز حاصل کیا تھا اور حضرت کو بھی ان پر بڑا اعتماد تھا۔ موصوف بیعت فوج سے سبکدوش ہو جانے کے بعد جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں این۔ سی۔ سی کمانڈر رہے، مگر پورے بیس سال تک دیکھنے کے بعد کراچی میں سال سنہ ۱۳۹۷ھ میں سندِ خلافت اور خرقہ انہیں عطا ہوا۔ اس طرح آپ کے مریدوں کی تعداد کم رہی۔ جب کہ آپ کی عمر کا بڑا حصہ عرب سے ہندوستان تک مختلف ملکوں میں گزرا۔ صرف ملنے والوں کے لئے دعا کرتے اور بہتر کے لئے مشکل کشائی کی کیا ہے اور اس کے لئے کیا کرنا ہے، اگر کوئی کام آپ کی دعا سے ہونے والا ہے تو یہ فرماتے ہیں ان شاء اللہ یہ کام ضرور ہو جائے گا۔ اور آپ کے کہنے کے مطابق یہ کام پورا ہوتا۔ آپ ہمیشہ اس بات کی سختی سے تاکید کیا کرتے تھے کہ ایسے ہونے والے واقعات [illegible]

والوں کو میں اپنا دوست نہیں رکھوں گا۔ مجھے بھی آپ کی اس تاکید کا پاس ہے ورنہ میں آپ کے کشف و اسرار اور ان سے وجود میں آنے والے کئی ایک عینی واقعات کا ذکر یہاں ضرور کرتا، مگر اس سلسلے میں ایک بات ضرور بتا دوں گا۔ جس سے قارئین اندازہ کر سکیں گے کہ آپ کے کشف و اسرار کا کیا عالم تھا۔ میں نے یہ بات اوپر ہی بتا دی ہے کہ حضرت کو عربی، فرانسیسی اور شکستہ اردو کے سوا کوئی اور زبان آتی نہیں تھی۔ آپ کو بیرونی ممالک سے مختلف زبانوں میں شائع ہونے والے اخبارات اور رسالے بذریعہ ڈاک آتے ضرور تھے۔ مگر آپ کو یہ اخبارات یا رسائل یا اور کوئی کتاب پڑھتے ہوئے بھی کسی نے نہیں دیکھا۔ مگر دورانِ گفتگو کوئی بھی موضوع جنگ اور اس کے جدید اسلحہ جات، جدید طرز کے برقی آلے۔ جدید سائنس کے طریقۂ علاج کیمونزم، ہندومت، تصوف، سیاست اور حالاتِ حاضرہ، ماضی اور حال کی تاریخ کا کوئی بھی مسئلہ زیرِ بحث ہو تو آپ اس کے متعلق، اس طرح تفصیل سے بتاتے، جیسے اسی موضوع کے آپ ماہر ہوں، اور پوچھنے والا مطمئن ہو جاتا۔

مرحوم صدرِ جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں جب کہ ابھی وہ صدر نہیں تھے، ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقدہ میسور اپنے دو ہندو اسکالروں کے ساتھ شریک تھے۔ موصوف نے موقع پاکر حضرت سے ملاقات کی اجازت حاصل کی کیونکہ آپ سے کوئی بھی بغیر اجازت کے مل نہیں سکتا تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں اور ساتھی ہندو اسکالروں نے فلسفہ ہندو دھرم کے متعلق ایک عربی ترجمان کے ذریعہ کچھ سوالات کئے تو آپ نے اس کی تفصیل بتاتے ہوئے معقول جوابات دے کر ان اسکالروں کو مطمئن کر دیا۔ آخر میں ان اسکالروں نے یہ رائے دی کہ آپ ایک en cy c lopedia ہیں

کئی ایک ڈاکٹروں اور اسکالروں اور دیگر مشاہیر نے اپنی اپنی ضرورتوں پر حضرت سے خطوط کے ذریعہ مشورہ کیا تو آپ ان کے خطوط کے انگریزی میں دوسرے دن سے جواب لکھواتے، مگر انگریزی کی کئی ایک موزوں اصطلاحیں آپ خود بتاتے تھے جبکہ آپ کو انگریزی بالکل نہیں آتی تھی۔ نہ کبھی آپ نے ریڈیو سنا نہ اخبار بینی یا کتب کا مطالعہ آپکا شغل تھا مگر اسکے باوجود دنیا بھر کے واقعات کی خبر رہتی تھی، ہر موضوع پر کہنے کی سکت و فراوانی موجود تھی۔ بس یہی ایک کمال آپکی قوتِ کشف و اسرار کا واضح ثبوت ہے۔

بنگلور میں حضرت سیاہ پوش بابا جب حیات تھے تو حضرت قبلہ ان سے ملنے کے لئے یہ کہہ کر بنگلور گئے کہ موصوف میرے بھی خاندان سے ہیں اور میرے ہی قریبی رشتہ دار بھی۔ حضرت سیاہ پوش موصوف کا انتقال ہوا تو اتفاق سے آپ میسور میں تھے۔ خبر ملتے ہی کسی ارادت مند کی موٹر میں بنگلور گئے اور اپنے بھائی حضرت سیاہ پوش باباؒ کی نمازِ جنازہ پڑھائی اور تجہیز و تکفین میں شامل رہے۔ شہر میسور کے کئی ایک احباب کی خوش قسمتی تھی کہ حضرت ابوالنصرؒ قبلہ محترم الحاج عزیز سیٹھ صاحب وزیرِ صنعت اوقاف کرناٹک اور ان کے رفقا کی گذارش پر سال ۱۹۸۰ء میں شہر میسور تشریف لائے اور میگا دکہ پہلو میں نئی تعمیر شدہ مسجد بلال کا افتتاح فرمایا اور نمازِ عصر پڑھائی جس میں میں بھی شامل تھا۔ لوگوں سے ملنا جلنا بہت کم تھا۔ بغیر اجازت ملنے کی مجال نہیں تھی۔ مختصر گفتگو جامع جواب، دعوتوں سے پرہیز، آبادی یا شہر کی طرف بہت کم کر تشریف لاتے وہ بھی بہت اصرار کے بعد۔ آخر دنوں میں ایک مرتبہ آپ کی صحت زیادہ بگڑ گئی تھی تو ارادت مندوں نے

کے مشورہ پر مشن ہاسپٹل میسور میں تقریباً ایک ہفتہ ڈاکٹر امان صاحب کے کلنک میں دو چار ماہ زیر علاج رہے پھر یہیں سے اچانک پاکستان جانے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ اور فوری طور پر سفر پر نکل پڑے۔ ویسے آپ نے گنبد شاہی کے قرب و جوار میں اپنے لئے آرام گاہ منتخب کرلی تھی، اور کتبے پر کندہ کرانے کی عربی عبارت بھی لکھ کر دی تھی۔ مگر افسوس وہ سعادت ہمارے حصہ میں نہ آسکی۔ کیونکہ مشیت الٰہی کو کچھ اور منظور تھا۔ ان کے ان گنت اقوال زرین میں سے دو چار بطور نمونہ درج ذیل ہیں۔

(۱) جب تک انسان پر خواہشات نفسانی کا غلبہ ہے اس پر علوم ربانی کا دروازہ نہیں کھلتا۔

(۲) اللہ کی جانب سے مصائب تنبیہات ہیں، تاکہ انسان غفلت سے بیدار ہوجائے ورنہ امن و اطمینان کی زندگی بسا اوقات غفلت کا سبب بن جاتی ہے۔

(۳) انسان جس طرح کی غذا کھائے گا (حلال حرام) ویسے ہی خیالات پیدا ہوں گے۔ حلال لقمے سے حضوری پیدا ہوتی ہے۔ آنکھوں میں نور اور دل میں سرور پیدا ہوتا ہے۔

(۴) اہل اللہ کی صحبت سے صرف پاک سیرت انسان مستفیذ ہوسکتے ہیں۔

(۵) مال و جاہ کا لالچ انسان کو بے بصیرت کردیتا ہے۔

(۶) اہل اللہ لوگوں کی قلبی کیفیات سے واقف ہوجاتے ہیں۔ لیکن ظاہر نہیں کرتے۔ اور جو شخص اسرار سے واقف ہوجائے اس کے منہ پر قفل لگ جاتا ہے۔

میں نے گذشتہ ۴۲ سالوں میں کئی ایک عالموں، صوفیوں اور مجذوب بزرگوں کو دیکھا فردوس ہے لیکن ذہن و دل میں ہمیشہ کے لئے محفوظ رہنے والے تین نام ہیں، جن میں مشہور زمانہ صوفی بزرگ حضرت جماعت علی شاہ نقشبندی علیہ الرحمہ۔ (۲) حضرت شیخ ابوالنصرؒ الگیلانی علیہ الرحمہ اور (۳) حضرت علی پا علیہ الرحمہ جو بنگلور کے بڑا سکان میں مقیم تھے۔ اور وہیں آپ کی آخری آرام گاہ ہے۔

مولانا رومؒ اور علامہ اقبالؒ نے بھی یہ فرمایا ہے کہ قلندر۔ قطب اور دیدہ ور ایک مرحلے میں بڑی مشکل سے کہیں ایک پیدا ہوتا ہے، اس کے ہمعصر لاتوں میں یہ ضرور کہوں گا کہ حضرت شیخ سید ابوالنصرؒ علیہ الرحمہ عصر حاضر میں ایسے ہی یگانۂ وقت بزرگ قلندر و قطب تھے جن کی مثال کہیں دور دور تک نظر نہیں آتی۔ وہ علیہ لہ اللہ تعالیٰ ہمیں آپ کا بدل عطا کرے۔

ان تمام حالات جمع کرنے میں حضرت کے خلیفۂ محترم میجر محمد نور اللہ شریف صاحب دام اقبالہٗ نے میری بہت زیادہ مدد فرمائی ہے جس کے لئے میں سراپا سپاس ہوں۔

رزاق افسر

کبیر داس کے دوہے

حضرت نجم آفندی مرحوم

سات آٹھ برس کی بات ہے میں نے کبیر داس پر بڑی محنت اور کوشش سے ایک مضمون لکھا تھا جسے میرے ایک دوست لے کر پاکستان چلے گئے وہ مسودہ ہی تھا میرے پاس اس کی کوئی نقل بھی نہیں ہے۔ کچھ دن اس حادثہ پر افسوس رہا پھر اس کے بعد کی منزلِ صبر نے اُس کا خیال بھی بھلا دیا۔ اب تقریباً سال بھر سے وقار خلیل صاحب تقاضہ کر رہے ہیں کہ میں "سب رس" کے لیے کوئی مضمون لکھوں۔ کچھ نہیں تو اس زمانہ کے بعض مشاعروں کی کیفیت ہی قلمبند کروں۔ جب شاعروں کی فہرست بنائی جاتی تھی نہ غزل پڑھنے کے لئے تخت بچھایا جاتا تھا۔ خود بخود ترتیب قائم ہو جاتی تھی اور شمع کی گردش کے ساتھ ساتھ غزل خوانی ہوتی تھی۔

میرا حافظہ ابتدا ہی سے بہت کمزور ہے اور اب تو ستر برس کی عمر ہو چکی۔ کچھ تاریخیں اور واقعات ضبطِ تحریر میں تھے وہ ایک انقلاب کی نظر ہو گئے۔ "ارضِ تاج" میں (آگرہ کا یہ شاعرانہ نام مرحوم شاہ دلگیر یا سیماب مرحوم کی ندرتِ فکر کا نتیجہ ہے)۔ میرا مکان اب بھی ہے مگر سامان نہیں ہے۔ خیر اس کی تفصیل غیر ضروری ہوگی۔ اتنا کہہ دینے کو ضرور جی چاہتا ہے کہ ادبی سرمایہ بہت تھا۔ اپنا بھی دوسروں کا بھی۔ منشی منیر شکوہ آبادی کے خطوط جو میرے والدِ بزرگوار کے نام تھے۔ میرے نام اس دور کے ایک بڑے ادیب سلطان احمد مرحوم، نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی مرحوم اڈیٹر "نئی روشنی" الہ آباد، حضرت شہیر مچھلی شہری، حضرت حافظ پیلی بھیتی اور ایسے ہی دوسرے متعدد شعراء و ادبا کے خطوط تھے۔ مسلم گزٹ اور سیارہ لکھنؤ کے اخبارات، سیاست، زمیندار، الصباح، کسان لاہور کے اخبارات اور ریاست دہلی کے کٹنگ تھے۔ اپنی غزلوں نظموں اور مضامین کے بھی اور دوسروں کے بھی، مخزن لاہور اور زمانہ کانپور کے پرچے تھے۔ کہاں تک گنواؤں اس کے لیے ایک علیحدہ مضمون کی ضرورت ہوگی۔

اب اپنے حافظہ کی مدد سے کچھ لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں نہ تاریخیں یاد نہ ثبوت کے لیے اخبارات کی کٹنگ موجود۔ بعض واقعات بہت ہی دلچسپ ہیں۔ چاہتا ہوں کہ زمانہ مہلت دے تو ایک آدھ مضمون اپنی یادداشت کی مدد سے مرتب کر کے پیش کروں۔ خیر یہ تو بعد کی بات ہے۔ سردست کبیر داس جی کے متعلق جو کچھ حافظہ میں رہ گیا ہے وہی ضبطِ تحریر میں لاتا ہوں۔

پہلے یہ سن لیجئے کہ میں کوئی ہندی کا اسکالر نہیں ہوں نہ باقاعدہ ہندی پڑھی ہے۔ میرے ایک ہندو دوست بندرا بن نامی تھے۔ جو کسی [illegible] کے نہیں تھے۔ مگر ہندی زبان کے ماہر تھے بلکہ سنسکرت میں بھی انھیں دخل تھا۔ ان سے کچھ سبق لیا۔ تلسی داس جی کی رامائن کا ایک چھوٹا اڈیشن کچھ ان سے سنا کچھ پڑھا اور اب وہ بھی بھول بھال گیا۔ کچھ دن کے بعد ماحول [illegible]

پوری ہندی سے خاصہ لگاؤ پیدا ہو گیا اور کبیر داس جی، تلسی داس جی کے کلام سے بڑی دلچسپی ہو گئی۔ اُردو کا شاعر تو تھا ہی ہندی میں بھی کچھ ٹوٹا پھوٹا کہنے لگا۔ مگر حقیقت حال یہ ہے کہ اعلیٰ درجہ کی ہندی شاعری بعض اوقات سمجھ ہی نہیں سکتا۔ مگر پوربی ہندی اور اِس زبان میں جسے گاندھی جی نے ہندی ہندوستانی کا لقب دیا ہے۔ شعر کہہ لیتا ہوں۔ کبیر داس جی کے دوہوں سے پہلے اپنے دو ایک دوہے کیوں نہ سنادوں۔ اساتذہ کا کلام تو بعد میں ہوتا ہی ہے۔ پہلے ایک حسبِ حال دوہا سن لیجئے۔

پستک سے پستک بنے گھر سے کوئی نہ لائے
دیپک سے دیپک جلے ہم ہوں لیو جلائے

مطلب یہ ہے کہ کتاب سے کتاب بنتی ہے اور چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ ہم نے بھی اِسی طرح کچھ حاصل کر لیا ہے۔ دوسرا دوہا ملاحظہ ہو

اُردو ہندی میل ہے جیوں پھولوں میں باس
بس کو انگ لگائے کے کس کو دیں بن باس

اُردو اور ہندی میں پھول اور خوشبو کا سا تعلق ہے ایک کو گلے لگا کر دوسری کو جلا وطن نہیں کیا جا سکتا۔

میری ہندی نظموں اور دوہوں کی کتاب "پریم بھگتی" حصولِ آزادی سے بہت پہلے اُردو رسم الخط میں ۱۹۴۱ء میں لکھنؤ سے شائع ہو چکی ہے۔ میں نے اس دور کے اکثر سیاسی موضوعات پر ایک ایک دوہا لکھا ہے۔ دو ایک دوہے سنائے دیتا ہوں۔ میں ۱۹۲۰ء سے کانگریسی اور ہندو مسلم اتحاد کا حامی ہوں اور میری تمام تصانیف میں یہ جذبہ نمایاں ہے۔ "ہندو مسلم گنتی"۔

تھوڑے ہیں تھوڑے سہی گنتی کا ہے گنائیں
جا دن ہم تم مل گئے بہو گھنے ہوے جائیں

مطلب یہ ہے کہ ہم تعداد میں کم ہیں لیکن جس دن ہمارے تمہارے میں اتحاد ہو گیا بڑی تعداد ہو جائے گی، ایک دوہا مزدور اور سرمایہ دار کے متعلق ہے سے

دہن کے بن میں کھیلتے بہتے تھکن سے چور
مایا سیوک سو رہیں جاگت اب مزدور

اس کا مطلب ہے کہ سرمایہ داری کا زمانہ گیا اب مزدور چونک رہا ہے۔

میری ایک نظم "کربل نگری" اسی زمانہ کی ہے۔ جو اُردو ہندی دونوں رسم الخط میں بارہا چھپ چکی ہے۔ ہندی نظم میں تاریخ اسلام کا ایک مختصر حصہ "اسلام پوتھی" کے نام سے ابھی لکھنؤ میں چھپا ہے۔ یہ سب میں اس لیے کہہ رہا ہوں کو ہندی زبان سے اتنی دلچسپی کے باعث یہ ایک فطری بات تھی کہ ہندی کے ایک اپنے پسندیدہ شاعر کے متعلق کچھ کہنے کو میرا جی چاہا اور مجھے یہ حق حاصل ہے۔ خواہ میں اس حد تک اس کے کلام کی خوبیاں اجاگر نہ کر سکوں۔ جتنی حد سے لکھنے والوں نے جو مجھ سے پہلے لکھ چکے ہیں کی ہو نگی۔ قصہ مختصر اب اصل موضوع پر آتا ہوں۔ کبیر برج بھاشا کے شعرتے برج بھاشا کو یا پوربی بھاکا اگر دو بھی ...

دہلوی طرح عام ہوا اور ہندوستان بھر میں پھیلی ہوئی مگر اپنی قدر کی وجہ سے برج بھاشا کے نام سے سرفراز ہوئی۔ اودھ میں اور اس کے آگے بڑھ کر پوربی ہندی کہلائی۔ کبیر داس اس پر فخر کرتے ہیں۔

بولی ہماری پورب کی ہم کو لکھے نہ کوئے ہمری بولی وہ لکھے جو کھرا پوربیا ہوئے

سنسکرت برہمنوں اور ایسے ہی اونچی ذات والوں کے لیے مخصوص تھی مگر برج کی زبان نے بھی چند بردائی کے بعد سورداس، تلسی داس، کبیر داس، بہاری، رحیم، ملک محمد جائسی، امیر خسرو، میرابائی، میراں بائی جیسے مشہور و معروف شاعر پیدا کیے جن میں سورداس، تلسی داس، کبیر داس کے نام زیادہ نکلے ہوئے ہیں۔ سورداس کا مقام ان تینوں میں بہت بلند بتایا گیا ہے ایک ہندی کے شاعر نے تو ہندی شعرا کے متعلق بڑا پر لطف دوہا کہا ہے۔

سور سور تلسی ششی اڈگن کیشو داس اب کے کبی کھدیوت سم جہاں تہاں کرت پرکاش

بہرحال بچی کچی کہنے والے کبیر کا کلام مجھ جیسے ان پڑھ کی سمجھ میں زیادہ آتا ہے لہذا مجھے پسند ہے اور میں نے اس پر قلم اٹھانے کی جسارت کی ہے۔

سکندر لودھی کا زمانہ تھا جب کبیر ۱۳۹۸ء میں بنارس جیسے مقدس مقام پر دنیا میں آئے ان کے نسب کا مسئلہ پایہ تحقیق تک نہیں پہنچ سکا۔ دو مختلف روایتیں ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایک جولاہے نورا نامی کے بیٹے ہیں اور یہ روایت بھی ملتی ہے کہ پیدا ہونے کے بعد دریا کے کنارے ڈال دیئے گئے تھے اور وہاں سے ایک جولاہے نے اٹھا کر بیٹوں کی طرح پرورش کیا۔ ان کی زندگی اور طرز سخن کا انداز یہ بتاتا ہے کہ ہندو مسلم دونوں مذاہب سے کچھ کچھ متاثر ہیں اور نہ ہندو ہیں نہ مسلمان۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی موت کے بعد مسلمان دفن کرنا چاہتے تھے اور ہندو جلانا چاہتے تھے۔

کبیر داس جی راما نند کے چیلے تھے اور بڑی کوشش سے ان کے حلقۂ ارادت میں جگہ پائی تھی۔ راما نند چھوت چھات کے بڑے پابند تھے اور کبیر ظاہر ہے کہ جلاہے کے گھر کے ایک فرد تھے مگر ایسے چیلے نے کم چند ہی روز میں گرو کو بھی اپنے مسلک پر لے آئے۔ راما نند جی ذات پات کی بندشوں کو خیرباد کہہ کر مذہب و ملت قوم و قبیلے کے افراد سے الگ ہو کر ایشر بھکتی کا درس دینے لگے۔

کبیر داس جی مورتی پوجا کے بڑے مخالف تھے ایک دوہے میں کہتے ہیں۔

پاہن پوجے ہری ملیں تو میں پوجوں پہاڑ

یعنی بت پرستی سے خدا ملے تو میں پہاڑ کی پرستش کیوں نہ کروں لہذا ان کو ہندو نہیں کہا جا سکتا۔ روزہ نماز کا ان کی زندگی میں کہیں ذکر نہیں اس لحاظ سے مسلمان بھی نہیں تھے مگر اپنے کلام کے اعتبار سے سچے مومن ثابت ہوتے ہیں۔ ایک دوہا ملاحظہ ہو۔

جو یہہ ایک نہ جانیا تو بہو جانے کیا ہوئے　　ایکے تے سب ہوت ہیں سب سے ایک نہ ہوئے

اس میں توحید کا درس کس لطف سے دیا گیا ہے۔ عبادت کے متعلق کبیر کا نقطۂ نظر عجیب ہے۔ دل ہی دل میں اللہ کو یاد کرنے پر بڑا زور دیتے ہیں۔ مالا پھیرنے تسبیح پڑھنے پر جگہ جگہ اعتراض کیا ہے

مالا پھیرت جگ بھیا گیا نہ من کا پھیر　　کر کا منکا ڈار دے من کا منکا پھیر

فرماتے ہیں ایک زمانہ مالا پھیرتے ہو گیا دل کی کجی نہیں گئی ہاتھ کا مالا پھینک دے اور دل ہی دل میں یاد کر۔ قوت شاعری اس دوہے میں بہت کچھ ہے۔ مالا پھیرت من کا پھیر۔ من اور منکا۔ ان لفظوں نے بڑا لطف سماعت پیدا کیا ہے۔ کبیر داس کے کلام میں اخلاقی درس بہت زیادہ ہے عاشقانہ رنگ بہت کم ہے اور جو ہے وہ تصوف کے انداز میں ہے۔

مورتی پوجا کے ساتھ ساتھ اسلام کے طریقۂ عبادت پر بھی اعتراض کیے ہیں۔ کہتے ہیں ـــ

کنکر پتھر جوڑ کر مسجد لیا چنائے　　تا چڑھ ملا بانگ دے بہرا ہوا خدائے

اسی مضمون کو ایک اور دوہے میں بھی کہا ہے یہ کیسے سمجھ لیا جائے کہ یہ اذان کا مقصد نہیں سمجھتے تھے وہ نمازیوں کو بلانے اور جمع کرنے کے لیے ہے۔ پھر یہ اعتراض کہ "بہرا ہوا خدائے" کیا معنی رکھتا ہے؟ کیا یہ اعتراض محض شوخیٔ طبع ہے کہ اذاں کی آواز سے ایک مضمون ذہن میں آ گیا اور دوہا کہہ دیا۔ مگر دوہے کا لحن اور کبیر کا انداز بیان اس کی نفی کرتا ہے۔ اُس زمانے کے ایک بزرگ شیخ تقی کے متعلق یہہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کبیر داس کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ اکثر دوہوں میں کبیر نے ان کا نام لے کر مخاطب کیا ہے اگر ان دونوں حضرات کے تبادلۂ خیالات اور ان کی صحبتوں کے حالات کچھ معلوم ہو سکتے تو کبیر داس کی سوانح حیات پر بہت کچھ روشنی پڑ سکتی ہے اور اس سلسلے میں ایک بڑا مفید اور دلچسپ اضافہ ہو سکتا ہے۔

عبادت کے طریقوں پر اعتراض ان کا خاص موضوع ہے۔ ان کے دوہوں کے موضوعات کی ایک نامکمل فہرست یہ ہو سکتی ہے۔ توحید کی تبلیغ۔ شرک کی مذمت۔ جھوٹے ویراگ کی مخالفت۔ سنتوش کی تعلیم۔ بھیک مانگنے کی برائی۔ حلم اور تواضع کا درس۔ سچائی کی خوبیاں۔ غیبت، بدگوئی، عیب بینی کی مخالفت۔ زیادہ سونے زیادہ کھانے اور شراب نوشی کی برائیاں۔ پریم اور گیان دھیان کی تعریف وغیرہ وغیرہ۔ گرو کی خدمت اور اُس کی تقلید خاموش عبادت اور ایشر بھگتی پر بڑا زور دیا ہے قربانی کو بہت بُرا کہا ہے۔

ان کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرقہ بندی کے بڑے سخت مخالف تھے اور زمانہ کی ستم ظریفی یہ ہے کہ ان کے مرتے ہی خود ان کے نام سے ایک فرقہ "کبیر پنتھی" قائم ہو گیا جس کی

بہت بڑی تعداد آج بھی ہے۔

کبیر داس فارسی زبان اور فارسی شعراء سے بہت متاثر تھے۔ فارسی کے لفظ جو اُنھوں نے اپنے کلام میں استعمال کیے ہیں اُن کی ایک بہت بڑی فہرست تیار ہوسکتی ہے۔

کبیر داس کو ایک بہت بڑی خصوصیت یہ بھی حاصل ہے جو اُنھیں دوسرے ہندی شعرا سے ممتاز کرتی ہے کہ غزل کی بنیاد اُنھیں کے ہاتھ سے رکھی گئی اور یہ اردو کے پہلے غزل گو شاعر کہے جاسکتے ہیں غالباً بھجناولی میں ان کی ایک نظم جو بھجن کے نام سے درج کی گئی ہے میری نظر سے گذری جسے دیکھنے کے بعد یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ دانستہ یا نادانستہ غزل نے انھیں کے نتیجۂ فکر سے جنم لیا ہے۔

ظاہر ہے کہ غزل سب سے پہلے جس زبان میں کہی گئی وہ فارسی زبان ہو یا کوئی اور زبان غزل کے نام سے نہیں کہی گئی۔ غزل اس کا نام بعد میں رکھا گیا اس میں شک نہیں کہ اردو زبان میں غزل فارسی کا تتبع ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ غزل فارسی کے اتباع سے پہلے اُس دور کی اردو زبان میں موجود تھی اور کبیر داس کے اس بھجن کی موجودگی میں یہ کہہ سکتے ہیں اردو کی تعمیر اُس زمانے ہی سے شروع ہوگئی تھی۔

جس نظم کو بھجن کا نام دیا گیا ہے اس میں بھجن کی خصوصیات کے بدلے غزل کا تمام تر انداز پایا جاتا ہے اور اسے غزلِ مسلسل کہنے میں کسی کو تامل نہیں ہوسکتا۔

ہمیں ہے عشقِ مستانہ ہمیں کو ہوشیاری کیا
رہے آزاد یا جگ سے ہمیں دنیا سے یاری کیا

جو بچھڑے ہیں پیارے سے بھٹکتے دربدر پھرتے
ہمارا یار ہے ہم میں ہمیں کو انتظاری کیا

خلق سب نام اپنے کو بہت کر سر پٹکتی ہے
ہمیں گر نام سانچا ہے ہمیں دنیا سے یاری کیا

نہ پل بچھڑے پیا ہم سے نہ ہم بچھڑیں پیارے سے
اُنھیں سے نیہہ لاگا ہے ہمیں کو بیقراری کیا

کبیرا عشق کے ماتے دوئی کو دور کر دل سے
جو چلنا راہ نازک ہے ہمیں سر بوجھ بھاری کیا

کسی دور اور کسی زبان کی شاعری ایسے دیدہ دلیر شعرا سے محفوظ نہیں رہی جو اپنے یا گذشتہ زمانہ کے نامور شعراء کے کلام سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوں۔ چنانچہ کبیر داس جی کو بھی ایسے قطاع الطریق سے واسطہ پڑا ہے اور اُنھوں نے اس سلسلہ میں جو دوہا کہا ہے اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُنھیں کس قدر دکھ پہنچا ہوگا ایک جلے بھُنے دل کی آواز معلوم ہوتی ہے۔

ساکھی لائے بنائے کے اِت اُت اکشر کاٹ
کہیں کبیر کب لگ جئے جھوٹی پتل چاٹ

اس احتجاج میں مضمون ہی کا نہیں بلکہ الفاظ کی چوری کا بھی شکوہ کیا گیا ہے اور بڑے لطف کی بات کہی ہے کہ جھوٹی پتل چاٹ کر کب تک زندہ رہیں گے اور یہی ہوا کہ آج ان کا کوئی نام بھی نہیں

، جاتا اور کبیر اور ایسے ہی دوسرے باکمال شعراء کا ڈنکا بج رہا ہے۔ کلام پر تبصرے ہو رہے ہیں اور یاد تازہ کی جا رہی ہے۔

ہندی شاعری میں اردو فارسی کی طرح بہت سی اصنافِ سخن ہیں۔ بھجن۔ دوہے۔ چوپائیاں۔ گیت وغیرہ وغیرہ ان اصناف سخن میں دوہا سب سے زیادہ مختصر اور مفید صنف ہے۔ اردو شعر کی طرح دو مصرعوں سے مرکب ہوتا ہے اور اس کوزے میں ایک دریا سما سکتا ہے مگر یہ بات شاعر کی قادر الکلامی اور کمال فن پر موقوف ہے۔

دوہا ہر خاص و عام ہندو مسلم کی زبان پر آسانی سے آسکتا ہے اور حافظہ میں رہ جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ بہت سے جاہلوں کی زبان سے بھی دوہے سُننے اور پڑھے لکھے آدمیوں کی زبان سے بھی۔ دوہے میں ردیف نہیں ہوتی۔ صرف قافیہ کی پابندی ہے اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی قافیہ ایک ہی معنی و مفہوم میں دونوں مصرعوں میں استعمال کیا جاتا ہے جو اردو اور فارسی میں جائز نہیں۔

کبیر اپنے دوہوں میں بہت ہلکے پھلکے اور عام فہم الفاظ استعمال کرتے ہیں اسی لیے اُن کے دوہے تمام ہندی شعراء کے دوہوں سے زیادہ مقبول ہوتے اور پسند کیے گئے۔ ان کے دوہے زیادہ تر اخلاقی مسائل سے متعلق ہیں موقع موقع سے جن کے استعمال نے کبیر داس کو ہندوستان کے گوشے گوشے میں روشناس کرا دیا۔ عاشقانہ رنگ کے دوہے بھی ان کے کلام میں ملتے ہیں مگر کمی کے ساتھ میں کچھ دوہے سُنا کر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

شیریں زبانی سے کیا کام لیا جا سکتا ہے اور ایسے الفاظ کی کیا قیمت ہے کبیر کی زبان سے سُنئے۔

شبد برابر دھن نہیں جو کوئی جانے بول   ہیرا تو داموں ملے شبد کا مول نہ تول

اثنائے گفتگو اور بحث مباحثہ میں تکرار کی نوبت آنے پر فتنہ و فساد کو روکنے اور لڑائی کو ٹالنے کے لیے جس انداز سے مشورہ دیا ہے وہ اس دوہے میں دیکھئے:۔

اوتا گالی ایک ہے الٹت ہوئے انیک   کہیں کبیر نہ الٹیے وا ہی ایک کی ایک

کسی فارسی کے شاعر کا ایک قابلِ تعریف شعر ہے جس میں توکل کا بہترین مقام بتایا گیا ہے۔

سپردم بتو مایۂ خویش را   تو دانی حسابِ کم و بیش را

کبیر داس نے اس منزل میں جو دوہا کہا ہے وہ اس مقام سے بہت آگے ہے۔

میرا مجھ میں کچھ نہیں جو کچھ ہے سو تو   تیرا تجھکو سونپتے کیا لاگت ہے مو

کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے اور مانگنے کے اقدام کی مخالفت میں کبیر کا جو دوہا میں پیش کر رہا ہوں جس میں اُس نے بخیل آدمی یا مانگنے پر نہ دینے والے آدمی کے متعلق یہی رائے دی ہے کہ اس کی

مثال مجھے کہیں نظر نہیں آئی۔

جاگن گئے سو سو گئے مریں سو جاگن جائیں   تن سے پہلے وے مرے جو ہوت گرت ہیں ناہیں

غفلت اور بے عملی کے خلاف وقت اور کام کی اہمیت کے بارے میں ایک دوہا ہے جس کی شان ہی نرالی ہے بے عملی کو غفلت سے تشبیہ دے کر کیا بات کہی ہے ملاحظہ ہو

کبیر سونا کیا کرے جاگ جپن کرتار   ایک دن سونا ہوئے گا لمبے پاؤں پسار

وقت کی قیمت اور اہمیت کے سلسلہ میں ایک اور دوہا سنئے شاعر اس سے بہتر اظہار خیال نہیں ہو سکتا۔

کہتا ہوں کہہ جات ہوں کہاں بجاؤں ڈھول   سانسا خالی جات ہے تین لوک کا مول

ہنر اور اس کی قدردانی و ناقدردانی کے اسباب میں فرماتے ہیں۔

جب گن کا گاہک ملے تب گن لاکھ بکائے   +   جب گن کا گاہک نہیں کوڑی بدلے جائے

آخر میں عاشقانہ رنگ کے دوہے بھی سن لیجئے اور اس ستھرے پاکیزہ اور سنجیدہ تغزل کی داد دیجئے۔

کبیر من پربت ہتھا اب میں پایا جان   ٹانکی لاگی پریم کی نکلی کنچن کھان

محبت کے بلاوے نے بتایا کہ دل اک پہاڑ ہے جو سونے کی کان چھپی ہوئی ہے

ہاڑ جلے جس لاکڑی کیس جلے جس گھاس   دیکھ پیارے میں جلوں لگی تمہاری آس

جو شخص محبت سے ناآشنا ہو اس کو ایک جسد بے جان سے مثال دے کر کہتے ہیں

جا گھٹ پریم نہ سنچرے سو گھٹ جان مسان   جیسے کھال لوہار کی سانس لیت بن پران

لوہار کی کھال سے مراد وہ دھونکنی ہے جس سے لوہا گرم کرنے کے لیے آگ روشن کی جاتی ہے جس طرح دھونکنی بغیر زندگی کے سانس لیتی ہے ایسی ہی بغیر محبت کے انسان کی زندگی ہے۔

محبت میں انسان موت اور زندگی سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور اسے سوائے محبت کے کوئی دوسری فکر نہیں رہتی اس مضمون کو ذیل کے دوہے میں ادا کیا ہے۔

پریم پیالہ جو پئے سیس دکشنا دے   لوبھی سیس نہ دے سکے نام پریم کا لے

ایک آخری دوہا اور سن لیجئے جو معرفت میں کہا گیا ہے یہ محبت کا وہ مقام ہے کہ سننے والا بے چین ہو جاتا ہے اس دوہے میں محبت کے معیار کو دیکھئے فرماتے ہیں

مجھ میں اتنی شکتی کہاں گاؤں گلا پسار   بندے کو اتنی گھنی پڑا رہے دربار

جی تو یہ چاہتا ہے کہ سیکڑوں دوہے اٹھا کر اس مضمون میں رکھ دیئے جائیں لیکن وقت نہ گنجائش۔ دوہوں کی آسان زبان ان کی سلاست و روانی افادیت یہ سب چیزیں ایسی خوبیاں ہیں

جن پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں۔ تمام اردو اور ہندی جاننے والے صاحبِ ذوق حضرات ان کے مطالعہ سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ میں اردو کے شعراء کو رائے دوں گا کہ وہ ہندی شعراء کے کلام کا مطالعہ کر کے استفادہ کریں۔

کبیر داس بنارس میں پیدا ہوئے تھے مگر بنارس میں مرنا پسند نہیں کیا آخری عمر میں مگہر چلے گئے اس مسئلہ میں کبیر نے اپنے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ جیسا کہا جاتا ہے کہ بنارس میں مرنے والے کے لیے نجات سے ہمیشہ مکتی نصیب ہوتی ہے اگر یہ سچ ہے تو بنارس میں مرنے والے پر خدا کا کرم اور احسان ہی کیا ہوا لہذا میں بنارس میں مرنا نہیں چاہتا"۔

مگہر میں جہاں انھیں یا ان کی خاک کو دفن کیا گیا ہے اس مقام پر جو عمارت بنائی گئی ہے اس کے دو گنبد ہیں ایک مسجد نما ہے اور ایک جیسا مندر پر بنایا جاتا ہے۔ ان کے مرنے کے بعد ان کے مقبرہ کو بھی فرقہ وارانہ رنگ دیا گیا جس کے یہ انتہائی مخالف تھے۔ یہاں سالانہ ایک میلہ ہوتا ہے جس میں کبیر پنتھی فقراء ان کے بھجن، دوہے اور ساکھیاں گاتے اور سناتے ہیں اور ہزارہا آدمی جمع ہوتے ہیں ہندو بھی مسلمان بھی کہا جاتا ہے کہ کبیر پڑھنا لکھنا بالکل نہیں جانتے تھے مگر اپنی شاعری کا ایسا نقش چھوڑ گئے جو بہت سے پڑھے لکھے شاعروں کو نصیب نہیں ہوا —— ••

(۱۹۶۱ء)

غزل

علی احمد جلیلی

زمینِ شعر ہے تنگ آج پہنائی نہیں ملتی
فقط لفظوں کی آرائش سے گہرائی نہیں ملتی

مجھے اے بندگی تیرا تقدس بھی تو رکھنا ہے
وہاں جھکنا جہاں ہم کو جبیں سائی نہیں ملتی

یہاں تو بیچنی پڑتی ہے نقدِ آبرو ورنہ
یونہی بازار میں کچھ مفت رسوائی نہیں ملتی

خود اپنی ذات کے ہنگامے مجھ کو گھیر رکھتے ہیں
وہ عالم ہے کہ تنہائی میں تنہائی نہیں ملتی

علی رہتا ہوں اپنے شہر ہی میں اجنبی بن کر
کسی چہرے پہ تحریرِ شناسائی نہیں ملتی

آسان ترکیب

نسیم انجم

شکیل کو جب سے ملازمت ملی تھی' اماں بارہا اپنے بیٹے شکیل سے کہہ چکی تھیں کہ وہ اب جلد سے جلد شادی کرلے تاکہ اماں کے سر سے گھر گرہستی کا بوجھ اتر جائے اور وہ بھی تمام ذمہ داری سونپ کر آرام کریں۔

شکیل بہت دنوں تک تو ٹالتا رہا کہ میں فی الحال شادی کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں جب حالات بہتر ہوں گے تو آپ کی خواہش بھی پوری کردوں گا۔

کون سے حالات بہتر ہوں گے؟ اماں ہمیشہ کی طرح دیدے پھاڑ کر بولیں "گھر کے حالات اور کون سے۔ دیکھئے نا ہمارا ٹوٹا پھوٹا مکان" شکیل گھر پر ایک نظر ڈالتا ہوا دکھ سے جواب دیتا۔" اماں میں چاہتا ہوں پہلے گھر کی مرمت ہوجائے۔ فرش بن جائے۔ دیکھئے جگہ جگہ سے ٹوٹ پھوٹ گیا ہے۔ شکیل پیر میں پہنے ہوئے جوتے سے فرش کے گڑھوں پر ضرب لگا کر اماں کی توجہ مبذول کراتا۔ اور برسات میں چھتیں بھی رستی ہیں۔ انھیں بھی نئے سرے سے بنوانے کی ضرورت ہے۔ پیرٹرین میں فلش سسٹم بھی ضروری ہے۔ ورنہ دیہات اور شہر کے گھر میں کچھ فرق ہی معلوم نہ ہوگا۔ گھر سدھارنے کے بعد کم از کم ٹی۔وی اور فرج خریدنا بھی ضروری ہے۔ اماں جب یہ سب کچھ ہوجائے گا۔ تب آپ اپنے بیٹے کے سر پر سہرا باندھ کر اپنا ارمان ضرور پورا کرلیجئے گا۔

شکیل نے شادی نہیں کرنے کی وجہ بتا کر اس وقت بھی اماں کو مطمئن کرنا چاہا لیکن خود مطمئن نہ ہوسکا چونکہ ابھی اتنی رقم جمع نہ ہوسکی تھی کہ فرج اور ٹی وی خرید سکتا۔ اور اماں کا ارماں پورا کرتا۔

اپنی خواہشات کی تکمیل کیلئے اس نے صبح و شام محنت کی جس میں پارٹ ٹائم کی ملازمت اور ٹیوشن بھی شامل تھی مسلسل جدوجہد کا نتیجہ یہ ہوا کہ شکیل نے فرج اور ٹی وی خریدنے کیلئے کافی رقم جمع کرلی۔ چار پانچ ہزار اس کے پاس پہلے ہی سے جمع تھے جو اس نے مکان کو سدھارنے کے لئے اٹھا رکھے تھے۔ اگر حالات بدستور ایسے ہی رہتے تو شاید شکیل فرج اور ٹی وی خریدنے میں ضرور کامیاب ہوجاتا۔ لیکن ایسا نہ ہوسکا۔ اماں اچانک ہی شدید بیمار پڑ گئیں۔ بلڈ ٹیسٹ ایکسرے رپورٹ اور ڈاکٹروں کی فیس اور ٹیکسی کے کرایہ میں تقریباً دو ڈھائی تین ہزار کے قریب رقم خرچ ہوگئی تھی اماں کے پیٹ کی رسولی اب کافی بڑھ گئی تھی۔ آج سے پانچ سال قبل ڈاکٹروں نے آپریشن کے ذریعہ رسولی نکالنے کا مشورہ دیا تھا۔

لیکن اماں آپریشن کے لئے قطعی راضی نہ ہوئیں۔ اماں کو اندازہ تھا کہ آپریشن میں کم از کم پانچ ہزار کا خرچ ہوجائے گا۔

اماں نے اس رقم کو بچانے کیلئے حکیم کا علاج ہی مناسب سمجھا جس میں آپریشن کا خطرہ نہیں تھا۔ ہفتے دو ہفتے بعد دس پندرہ روپے کی دوا لے آئیں۔ اور جب ذرا تکلیف میں افاقہ ہوا تو وہ بھی چھوڑ دی اسی طرح اماں نے شکیل کی شادی کے وجہ سے جو انھوں نے گھر کے خرچے سے پس انداز کرکے رکھے تھے' بچالئے

دس ہزار کی کمیٹی بھی تو ان رکھی رہی۔

حکیم کے علاج سے کافی دن اچھی رہیں۔ معمولی تکلیف کی انھوں نے پرواہ بھی نہیں کی۔ اس طرح پانچ سال بیت گئے لیکن اچانک ہی ان کی تکلیف بڑھ گئی۔ بخار، متلی، پیٹ کے درد کی شدت نے اماں کو نڈھال کر دیا۔

شکیل نے اماں کو اچھے سے اچھے ڈاکٹر کو دکھایا۔ مختلف ٹیسٹ کے بعد ڈاکٹروں نے آپریشن کرنا ضروری قرار دیا۔ آپریشن نہ کرنے کی صورت میں اماں کی زندگی کو خطرہ لاحق تھا۔

شکیل کو فرج، ٹی وی سے زیادہ بلکہ کائنات کی ہر چیز سے زیادہ اپنی ماں عزیز تھیں اماں نے شکیل کو ماں ہی نہیں بلکہ باپ بن کر پالا تھا۔ شکیل ابھی کم سن ہی تھا کہ شکیل کے ابا انتقال کر گئے۔ اماں نے شوہر کے انتقال کے بعد محنت مشقت کر کے شکیل کی پرورش کی۔ تمام تعلیمی اخراجات پورے کئے اور اسے قابل بنا دیا کہ وہ برسرِ روزگار ہو گیا۔

اتنی پیاری اور چاہنے والی ہستی کے لئے سات آٹھ ہزار کی کیا وقعت تھی۔ شکیل کی جمع کی ہوئی رقم اماں کی بیماری میں لگ گئی۔ اماں صحت یاب ہو گئیں۔ شکیل کے لئے یہ بہت خوشی کی بات تھی۔

پیسے خرچ ہونے کے بعد شکیل نے ہمت نہیں ہاری بلکہ نئے سرے سے رقم جمع کرنا شروع کر دی تاکہ شادی سے پہلے ٹی وی اور فرج ضرور آ جائے اور وہ اپنی نئی نویلی دلہن کے سامنے برف خرید کر لانے سے بچ جائے۔ ٹی وی دیکھنے کے لئے اس کی بیوی کو پڑوس میں جانا نہ پڑے۔

شکیل کی محنت اک بار پھر رنگ لائی اور وہ پھر اس قابل ہو گیا کہ وہ اپنی مطلوبہ چیزیں خرید سکے۔

شکیل سوچ ہی رہا تھا کہ دو چار روز میں اپنے دوست نعیم سے بات کرے گا کہ وہ اپنی سوزوکی میں شکیل کا فرج اور ٹی وی الہ... کے گھر پہنچا دے اس طرح کرائے سو ڈیڑھ سو روپے بھی بچ جاتے جو شکیل کے پاس نہیں تھے۔

شکیل نے اماں کو بھی خوشخبری سنا دی تھی کہ وہ ایک دو روز میں فرج اور ٹی وی خریدنے والا ہے۔ اماں بھی بے حد خوش ہوئیں کہ وہ ہر روز بازار سے گوشت ترکاری لانے سے بچ جائیں گی۔ ایک ہفتے کا سودا سلف لا کر رکھ دیا کریں گی۔ اور پانی بھی ہر وقت ٹھنڈا ملا کرے گا۔ جس دن شکیل کو فرج لانا تھا۔ اسی دن اس کے دوست کی سوزوکی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ اس ایکسیڈنٹ میں انسانی خون تو ضائع ہونے سے بچ گیا۔

لیکن سوزوکی کافی ٹوٹ پھوٹ گئی۔ سوزوکی کی مرمت میں کم از کم دو ہفتے ضرور لگتے۔ شکیل کے پاس فالتو پیسے نہیں تھے کہ وہ کرائے کی سوزوکی کرتا۔

پھر انہی دنوں یہ ہوا کہ شکیل کے ماموں اپنی فیملی کے ساتھ اسلام آباد سے آ گئے۔ مہمانوں کو گھمانے پھرانے اور ان کی خاطر تواضع میں فرج اور ٹی وی کی قیمت میں سے تین ہزار روپے خرچ ہو گئے۔ جو پیسے باقی بچے ان پیسوں سے شکیل نے گھر کی مرمت کرا کے رنگ روغن کرا دیا۔ فرج اور ٹی وی خریدنے کے بارے میں اس نے سوچنا ہی ختم کر دیا کہ اس کی قسمت میں یہ چیزیں ہیں ہی نہیں۔ ورنہ شکیل نے تو یہ پلاننگ کی تھی کہ جب گھریلو چیزیں خرید لے گا۔ تب وہ کوئی پرانی دس پندرہ ہزار کی گاڑی بھی خرید لے گا لیکن وہ فرج اور ٹی وی ہی نہ خرید سکا تو گاڑی تو بہت دور کی بات تھی۔

گھر سنور جانے کے بعد اماں کو بس ایک ہی رٹ لگ گئی تھی۔ کہ شکیل جلد سے جلد اپنا گھر بسا لے۔ اماں کی ضد کے آگے شکیل نے بھی ہتھیار ڈال دئے تھے۔

اور ساتھ میں اس نے ایک شرط بھی لگا دی تھی کہ وہ اپنی ہونے والی بیوی کو ایک نظر ضرور دیکھے گا۔ اماں نے شکیل کی یہ خواہش

بھی پوری کر دی۔ ایک نہیں بہت سی لڑکیاں دکھائیں لیکن شکیل کو ایک لڑکی بھی پسند نہیں آئی۔ ہر لڑکی میں شکیل کوئی نہ کوئی نقص نکال دیتا۔ کسی کی ناک موٹی کسی کی آنکھیں چھوٹی، کوئی کالی اور کسی کی عمر زیادہ کہہ کر بات ختم کر دیتا۔

لیکن اماں بھی ہمت ہارنے والی نہیں تھیں۔ وہ ہر روز باقاعدگی سے گھر سے نکلتیں۔ سب ملنے جلنے والوں سے ذکر کرتیں اور جب وہ لوگ انھیں لڑکی دکھاتے تو وہ لڑکی کے گھر والوں سے کہتیں کہ اب زمانہ بہت بدل گیا ہے۔ آج کل لڑکے لڑکی ایک دوسرے کو بنا دیکھے شادی نہیں کرتے ہیں۔ میرا بیٹا بھی اس ہی زمانے کا ہے وہ لڑکی کے والدین کی رضامندی پر شکیل کو اپنے ساتھ لے جا کر لڑکی دکھا دیتیں نہ جانے کیوں شکیل کو خوبصورت سے خوبصورت لڑکی پسند نہ آتی۔

اماں نے ایک دن غصے سے شکیل سے پوچھا آخر تو ... جو اچھی بھی لڑکیاں اعلیٰ خاندان کے رشتے ٹھکرا دیتا ہے۔ تو مجھے صاف صاف بتا دے کہ شادی کرنی ہے یا نہیں۔ میں خواہ مخواہ باؤلے کتے کی طرح دن بھر ماری ماری پھرتی ہوں۔

اماں ... یہ ہے کہ ...! ... اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا

ہاں بیٹا بول ... شرما۔ اگر تجھے کوئی لڑکی پسند ہے تو بتا دے تو جہاں کہے گا میں تیری شادی کر دوں گی۔ اماں نے بیٹے کو جھجکتا دیکھ کر حوصلہ افزائی کی۔

اماں آپ کو ... سروری خالہ ... پچھلے ہفتے جو مکان چھوڑ کر ... نئے لوگ ... اس گھر میں ... ایک ... لڑکی تھی بلکہ ... تھی وہ ... والوں ... نہ ... اپنے ساتھ لے گئی تھیں ... نے ہی لڑکی دکھائی تھی۔ اماں بہت اچھے لوگ ہیں۔ وہ لوگ آپ میرا رشتہ اسی گھر میں ... شادی میں ... کر دوں گا۔

شکیل کے کہنے پر اماں دوسرے دن لڑکی دیکھنے چلی گئیں۔ تھوڑی ہی دیر نہ گذری تھی کہ اماں غصے سے پیر پٹختی ہوئی۔ واپس آگئیں اور بولیں تو نے لڑکی دیکھی ہے؟ جی اماں! شکیل نے سعادت مندی سے جواب دیا۔ اچھا تو وہ تجھے پسند آگئی اور میں نے تو تجھے ایک سے ایک اچھی لڑکی دکھا رہی تھی! وہ تجھے ایک آنکھ نہ بھائیں۔

جانتا ہے وہ تجھ سے عمر میں کہیں زیادہ ہے اور رنگت بھی توے کی طرح کالی ہے اور کالی ہی نہیں بلکہ چہرے پر چیچک کے داغ بھی ہیں۔ تیرا دماغ تو ٹھیک ہے جو تو نے ایسی بے جوڑ لڑکی پسند کی ہے۔ اماں غصے کی وجہ سے پاگل ہوئی جا رہی تھیں۔ اماں میرا دماغ بالکل ٹھیک ہے۔ آپ غصہ تھوک دیجئے اور خوشی خوشی میرا رشتہ لے جائیے۔ آپ کو نہیں معلوم میں اس کی ماں سے رضامندی کا اظہار بھی کر آیا تھا۔ شکیل ہولے سے بولا۔ اس کلوٹی سے میں تیری شادی ہرگز نہیں کروں گی۔

اماں نے سختی سے کہا۔

اماں آپ بات سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ بہو بیٹیاں گھر کی چار دیواری میں رہنے کے لئے ہوتی ہیں۔ شوکیس میں سجانے کے لئے نہیں۔ اس لئے ان کا خوبصورت ہونا ضروری نہیں ہے۔ وہ میری بیوی اور آپ کی بہو بنے گی۔ گھر سنبھالے گی۔ آپ کی خدمت کرے گی۔ بچے پیدا کرے گی۔ ان کی پرورش کرے گی۔ اور کیا چاہیے۔ اماں تعجب سے شکیل کی باتیں سن رہی تھیں۔ لیکن اس وقت اماں کا منہ حیرت سے پھٹا کا پھٹا رہ گیا۔ جب شکیل نے مزید انکشاف کیا کہ وہ لڑکی اپنے ساتھ ۴ لاکھ ... ہے۔ یوں سمجھے نقد جہیز کے علاوہ اماں جو یہ گھر خرید لیا ہے یا ... اس لڑکی کی ... ہے ایک بوڑھی ماں ہے، کوئی آگے نہ پیچھے۔ انھیں اپنی بیٹی کے لئے خوبصورت اور نیک سیرت داماد چاہیے تھا۔ اور اماں مجھے پیسہ چاہیے تھا۔ ... اور ... آرام کی زندگی۔ ... کما سکوں اس سے زیادہ آسان کوئی ... نہیں تھا۔

غزل

صاحبؔ حیدرآبادی

جورِ دوراں سے چلوں تا زِ بتاں تک دیکھوں
قلزمِ خوں ہی نظر آئے جہاں تک دیکھوں

لے گیا دور کوئی نور میری آنکھوں کا
گھر کے اِن بند دریچوں سے کہاں تک دیکھوں

یہ بھی قسمت نہیں میری کہ میرے گھر کی طرف
تیرے بڑھتے ہوئے قدموں کے نشاں تک دیکھوں

کچھ بھی حاصل نہیں جز حسرتِ ہم آغوشی
تیری تصویر میری جان کہاں تک دیکھوں

دیکھنا ہے کہ فلک اور دکھائے کیا کیا
نشترِ غم کا اثر تو رگِ جاں تک دیکھوں

کیا کہیں باعثِ تسکین ہوا بھی ہے سراب
تو ہی تو مجھکو نظر آئے جہاں تک دیکھوں

جلتے رہنے کی بھی آخر کوئی حد ہے صاحبؔ
آشیاں اپنا ہی زد پہ ہے جہاں تک دیکھوں

(نیویارک سے)

خالص گھی، اصلی کھوے سے تیار کی ہوئی تازہ اور لذت آگیں

مٹھائیوں کا قدیم اور نیک نام مرکز

دی سری کرشنا امرت بھنڈار

ذائقہ دار اور چٹ پٹا کھارا

خالص دودھ، اصلی گھی، دہی، بالائی اور تازہ کریم کے معتبر اور مشہور اسٹاکسٹ

سری کرشنا امرت بھنڈار

گلزار حوض حیدرآباد

SRI Krishna Amrith Bhandar

Char Kaman

... ABAD.

معین شاہد وارثی
بنیاد گنج گیا

پیش گوئی

سیٹھ ہیرا مل جی جب شام کو اپنے دس روزہ تجارتی دورے سے اپنی کوٹھی پر واپس آئے تو پرانے کاغذات کی چھان بین کے دوران اچانک ان کی نظر اپنی پرانی ڈائری پر پڑی جس میں آج کی تاریخ میں ایک جیوتشی کی پیش گوئی درج تھی ——

"آج رات میں بارہ ۱۲ بج کر پانچ منٹ پر ان کا دیہانت ہو جائے گا۔ اور ان کی موت ان کی اپنی کوٹھی میں اپنی بیٹی کی گود میں ہوگی۔"

جیسے ہی ان کی نظر اس تحریر پر پڑی ان کا گویا خون خشک ہوگیا۔ نبض تیز تیز چلنے لگی۔ سر چکرانے لگا۔ دم اور دھڑکی کا نشہ ہرن ہوگیا۔ اور ان کے سارے جسم میں بجلی سی دوڑ گئی۔ اب ان کی موت کو صرف چھ گھنٹے پانچ منٹ باقی رہ گئے تھے جیوتشی کی یہ پیش گوئی کبھی غلط نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہ جیوتشی نے آج سے دس سال قبل جو جو باتیں ان کے متعلق کہی تھیں، وہ سب کے سب حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئی تھیں۔ بلکہ قدرت کو اس پیش گوئی کے مطابق اپنے فیصلوں کو بدلنا پڑا تھا۔ وہ اس وقت ایک دیوالیہ مہاجن تھے۔ بینک اور بازار کے لاکھوں روپے ان کے ذمہ باقی تھے۔ ان کی ساری جائیداد گروی رکھی تھی۔ ان کے پاس صرف یہی ایک رہائشی کوٹھی تھی جسے ان کے باپ سیٹھ پنا لال نے ان کی بیوی شاردا دیوی کے نام رجسٹرڈ کر دی تھی۔ انھوں نے اپنے دیوالیہ پن کے بعد اپنے ایک رشتہ دار سیٹھ کروڑی مل کے یہاں ملازمت کرلی تھی۔ ان ہی دنوں جب وہ سیٹھ کروڑی مل کی گدی پر بیٹھے حساب کتاب کر رہے تھے کہ ایک جیوتشی اپنی گردن میں رودر آکش کی مالا ڈالے، سر پر بالوں کا جٹا بڑھائے، بدن پر گیروا بستر لپیٹے، پاؤں میں گھونٹی دار کھڑاؤن پہنے آیا اور اس نے پیش گوئی کی کہ بھگوان بہت جلد، چند ہی مہینوں میں انہیں بہت کچھ دینے والا ہے۔ وہ کھوئی ہوئی ساکھ بحال کرلیں گے۔ اور ہزاروں لاکھوں میں کھیلنے لگیں گے۔ وہ ہندوستان سے باہر کے ممالک میں تجارت کریں گے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے یہ پیش گوئی ان کی ڈائری میں لکھ ڈالی کہ دس سال کے بعد فلاں تاریخ کو بارہ بج کر ۵ منٹ پر ان کا دیہانت ہو جائے گا۔ گویا دس سال مزید ان کی عمر طبعی جیوتشی نے مقرر کردی تھی۔ انہیں اس وقت تو جیوتشی کی پیش گوئی پر یقین نہیں آیا۔ لیکن واقعی جب چند ہی مہینوں میں ان کی قسمت کا پانسہ پلٹ گیا تو جیوتشی پر ایمان لانا ہی پڑا۔ بھگوان نے آہستہ آہستہ سب کچھ انہیں دینا شروع کردیا جن کی پیش گوئی اس جیوتشی نے کی تھی۔ انہوں نے گروی رکھی تمام جائیدادوں کو صرف چھڑا ہی نہیں لیا بلکہ کئی نئی نئی بلڈنگیں بھی کھڑی کرلیں۔ وہ واقعی ہزاروں لاکھوں میں کھیلنے لگے۔ لیکن جیوتشی کی وہ پیش گوئی جو آئندہ دس سالوں کے بعد ان کی موت کی شکل میں سچ ثابت ہونے والی تھی، گھڑی کی ٹک ٹک کے ساتھ ان کے ذہن اور دماغ پر ہتھوڑے برساتی۔ پھر ایسا ہوا کہ وہ آہستہ آہستہ اس پیش گوئی کو بھول گئے۔ ان کی تجارتی مشغولیتیں بڑھ گئیں۔ ان کے آئے دن کے مشاغل نے انھیں اتنی فرصت ہی نہیں دی کہ وہ ایک معمولی سی جیوتشی کی پیش گوئی پر دھیان دیتے۔ ان کے

س ایکسپورٹ اور امپورٹ کا تجارتی لائسنس تھا۔ وہ تجارتی سامان
ر کے ملکوں میں ایکسپورٹ کیا کرتے۔ اور اس سلسلے میں انھیں
ل میں کئی بار باہر ملکوں میں جانا پڑتا۔ ان کی شب شب برات تھی
ر دن روزِ عید ——

وہ دن بھر اپنے تجارتی مشاغل میں مصروف رہتے اور رات
ہی آتی وہ کلب اور بار میں چلے جاتے۔ جہاں جام وسبو اور
رت کے سوا اور کچھ نہ ہوتا۔ وہ اپنے دن کی تھکن کو کلب اور
میں جاکر بھول جاتے۔ انھوں نے ویسے تو شادی شریمتی شاردا
ی سے کی تھی۔ لیکن ان کے حرم خانے میں نہ جانے کتنی کنیزیں اور
کی شبستان میں نہ جانے کتنی دوشیزائیں آباد تھیں۔ مہینوں ہوجاتے
یمتی شاردا دیوی سے ملاقات کئے۔ شریمتی شاردا دیوی بے اولاد
یں۔ ان کی گود میں ابھی کوئی چاند طلوع نہیں ہوا تھا۔ بسا اوقات
یمتی شاردا دیوی کو اپنے بانجھ پن اور اولاد نہ ہونے کا غم بری
رح ستاتا۔ ان کی شادی کو پندرہ سال ہوگئے تھے۔ لیکن سیٹھ
یرا لال جی کو اس کی قطعی فکر نہ تھی کہ ان کی اتنی بڑی جائیداد
ا وارث کون ہوگا۔؟ وہ تو اپنے دیوالیہ پن کا وہ منحوس دن
ی بھول گئے تھے جب وہ دانے دانے کے محتاج تھے۔ اور
ھوں روپیہ کے مقروض تھے۔ اب وہ اپنی زندگی رنگ رلیوں
ں گذار رہے تھے۔ اور یہ سب اس جیوتشی کی پیش گوئی کا نتیجہ
ا جو آج سے دس سال قبل سیٹھ کروڑی مل کی گدی پر ایک اوتار
طرح وارد ہوا تھا۔ اور جس کی پیش گوئی لفظ بہ لفظ سچ ثابت ہوئی
ا پچھلی ساعتوں کو بڑی تیزی کے ساتھ آج کی بے رحم ساعتوں
ے کھسک تنگ دنگی جاتے ہیں کہ ان کا کوئی ہلکا سایہ بھی باقی نہیں رہتا
لیکن دس سال قبل اس ساعت کا سایہ آج ایک حقیقت بن کر ان
ے پورے وجود پر مسلط ہوگیا۔ جب ان کی نظر دس سال پرانی

ڈائری کے اس ورق پر پڑی جس پر اس جیوتشی کی پیش گوئی
درج تھی تو ان کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ وہ تاریخ اور وہ گھڑی
اب سر پر آگئی تھی۔ یہ پیش گوئی کبھی بھی غلط نہیں ہوسکتی کیونکہ اس
کے تمام پیش گوئیاں سچ ثابت ہوگئی تھیں۔ یہ ایک پیش گوئی جو ان
کی موت سے متعلق تھی۔ کیسے غلط ثابت ہوسکتی ہے۔

وقت بڑی تیزی کے ساتھ گذر رہا تھا اور اب ان کی موت کی گھڑی کو آنے میں صرف چار گھنٹے بچ رہے۔ آٹھ بج کر پانچ منٹ ہوچکے تھے۔ وہ بدحواس اپنی مسہری پر گر گئے۔ شریمتی شاردا دیوی نے جب ان کا یہ حال دیکھا تو وہ گھبرا گئیں۔ ان کا سر اپنی گود میں لیکر سرہانے بیٹھے ہوئے بولیں۔

"ارے آپ کو اچانک یہ کیا ہوگیا؟ آپ ایک دم پیلے پڑتے جا رہے ہیں؟

"ہاں شاردا! اب میں چند گھنٹوں میں پرلوک سدھاروں گا۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ تو آج ہی دس روز کے بعد کلکتہ سے لوٹ رہے ہیں۔ ابھی ابھی آپ ایک دم اچھے تھے۔ یہ اچانک آپ کو کیا ہوگیا ہے پربھو!"

وہ روہانسی ہوکر بولیں۔ انہوں نے اپنے ملازم کو آواز دی۔

"ارے او نتھو رام! جلد ڈاکٹر کو بلا لاؤ مالک کی طبیعت خراب ہوگئی ہے"

ہیرا لال جی نے ہاتھ کے اشارے سے منع کرتے ہوئے کہا۔ "نہیں شاردا، ڈاکٹر کو مت بلواؤ، میرا علاج نہیں ہوسکتا۔ میں اب مرنے والا ہوں۔ بس چند گھنٹے کا مہمان ہوں۔ ۱۲ بج کر ۵ منٹ ......" وہ اتنا ہی کہنے پائے تھے کہ ان پر غشی طاری ہوگئی۔ ان کی بیوی نے ان کے منھ پر ٹھنڈے پانی کا چھڑکاؤ کیا۔ تب انہوں نے آنکھیں کھولیں اور بولے!

"تم میرا قصور معاف کردو۔ میں تمہیں سکھ نہیں پہونچا سکا۔"

شاردا دیوی نے سیٹھ جی کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "ارے ایسا نہ بولیئے۔ آپ ایسا کہہ کر مجھے نرک میں ڈھکیل رہے ہیں۔ میں بہت ہی سکھی ہوں۔"

میں نے تم کو ایک شوہر کا پیار نہیں دیا۔ تم زندگی بھر اس پیار کے لیئے ترستی رہیں۔ میں بڑا پاپی ہوں۔ میں شرابی ہوں۔ میں نے نجانے کتنی کنواریوں کی عصمتیں لوٹی ہیں۔ میں جب بھی باہر ملکوں میں گیا۔ میں نے ہزاروں روپے ہوٹلوں میں شراب، کباب اور عورتوں پر برباد کئے۔ مجھے تم معاف کردو شاردا۔"

"آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں تو آپ کے بارے میں کبھی ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔"

"میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، سچ کہہ رہا ہوں۔ اپنی جیون کی آخری گھڑی میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔ اپنے کئے ہوئے پاپ کا پرائشچت کیسے کروں؟ میرا تو اب دم نکلنے والا ہے۔

پھر انہوں نے بہت ہی ڈوبی ہوئی آواز میں ایک راز کا انکشاف کرتے ہوئے کہا۔ "تم نہیں جانتی کہ پڑوس میں رہنے والا لوہیا جوڑے کا گھر میں نے ہی اجاڑا ہے۔ روپا کہیں غائب نہیں ہوئی تھی۔ اسے تو میں نے ہی اپنی ہوس کا نشانہ بنایا تھا۔ اور اسے غنڈوں اور دلالوں کی مدد سے رنگون بھگا کر لے گیا تھا۔"

"تو روپا اب کہاں ہیں؟"

"میں تمہیں سب کچھ بتا دینا چاہتا ہوں۔ کیونکہ مجھے تو نہ اب پولس کا ڈر ہے۔ اور نہ اب قانون کا خوف۔ میں تو اب تھوڑی ہی دیر میں مرنے والا ہوں۔ اگر تم نے اس راز کا پولس پر انکشاف کر بھی دیا تو پولس کو میری سر دلاش ہی ہاتھ آسکتی ہے۔ روپا دو سال تک میری لونڈی بن کر رہی۔ اس کی جوانی سے میری راتیں رنگین اور جوان تھیں۔ میں نے اس پر بڑا ظلم کیا۔ آخر میں نے اسے کلکتہ کے اپنے ایک ساتھی کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اور جب میں یہاں لالہ کرایا تو جانتی ہو کہ میں نے ہی اس کے شوہر کو ہلاک کر ڈالا۔ یہ سب یہ سب دھندہ اس وقت میرے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا مجھے دوسروں کو اذیت پہونچانے اور مزر رسانی میں خوشی ہوتی تھی۔ میں درندگی اور حیوانیت کی اس منزل پر پہونچ گیا تھا جہاں سے انسانیت نام کی چیز دکھائی نہیں دیتی ہے۔"

سیٹھ ہیرالال جی نے اب آنکھیں موندلیں اور عالم خواب میں گویا بڑبڑائے۔ موت اب جب کہ میرے بہت ہی قریب ہے اور جب کہ میں اس کی آہٹ سن رہا ہوں، میرے تمام یہ کالے کرتوت سانپ بن کر مجھے ڈس رہے ہیں۔

شاردا دیوی سر سے پاؤں تک کانپ گئیں، وہ سہم گئی۔ ان کے سامنے اپنے شوہر کے لئے نرک کا دروازہ سامنے کھلا ہوا نظر آیا۔ جہاں ان کی آتما کو لینے یم دوت کھڑے ہوئے تھے۔ موت کا بڑا بھیانک نقشہ ان کی نظروں کے سامنے تھا۔

دفعتاً ہیرالال جی بولے۔ "میں نے گانجا، بھانگ، حشیش، چرس کے ناجائز دھندے میں لاکھوں روپے کمائے ہیں جسے تم نہیں جانتیں۔ یہ دنیا تو مجھے مہاپرش اور بڑا پوتر سمجھتی ہے۔ میں نے کئی مندر بھی بنوائے ہیں۔ ہر اتوار کو تم خود غریبوں کو بھوجن اور کپڑا دان کرتی ہو۔ لیکن یہ تمام پُن کے کام میری وہ مقررکردہ تاریخ اور وقت کو نہیں ٹال سکتے جس کے بارے میں جوتشی نے میری ڈائری میں پیش گوئی کی ہے۔ اور میری موت کے لئے جس وقت پر اس نے مہر ثبت کردی ہے۔"

شاردا بولیں۔ "آپ یہ سب غلط کہہ رہے ہیں۔ آپ کی طبیعت خراب ہے۔ آپ پر ہذیانی کیفیت طاری ہے۔ آپ کو دنیا جیسا سمجھتی ہے ویسا ہی آپ ہیں۔"

سیٹھ جی نے کہا: "اس یگ کا کیا بھروسہ۔ دنیا تو ہر چمکتی ہوئی چیز کو سونا سمجھتی ہے۔ میرے تعلق سے دنیا جو سمجھتی ہے وہ سب غلط ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔ اور سچ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میری موت اب قریب ہے۔ اب یہ موت مجھے سچ بولنے کی مہلت بھی نہیں دے گی۔ زندگی بھر تو میں جھوٹ، فریب اور دھوکے کے کاروبار کرتا رہا ہوں۔ اور مرنے کے وقت تو تم سے کم از کم سچ بات کہہ دوں کہ تم کو میری ذات اور میری حقیقت معلوم ہو جائے شاید اس سے کچھ پاپ کٹے۔"

دیوار گیر گھڑی نے بارہ بجا دیئے۔ اب ان کی موت کی گھڑی آنے میں صرف پانچ منٹ باقی تھے۔ پانچ منٹ کے بعد ان کی روح ان کے داغدار جسم کو چھوڑ دے گی اور یہ پانچ منزلہ عمارت، موٹر کاریں، نوکر چاکر، بینک بیلنس سب دھرا رہ جائے گا۔ سب کچھ ہوگا پر تو وہ نہیں ہوں گے۔ اب ان کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں۔ پسینے کے قطرے ان کی پیشانی پر تیزی سے چمکنے لگے۔ کبھی وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے اِرد گرد نوکر چاکر اور اپنی بیوی کو دیکھتے اور کبھی در و دیوار پر حسرت بھری نگاہ ڈالتے۔

پانچ منٹ میں صرف ایک منٹ باقی رہ گیا۔ انہوں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ موت کے کئی رنگ ان کے چہرے پر آنے جانے لگے۔ وہ کوئی منتر یا اشلوک اپنی زبان ہی زبان میں جپنے لگے۔ شاردا دیوی زور زور سے رونے لگیں اور چھاتی پیٹنے لگیں۔ گھر میں کہرام مچ گیا۔

گھڑی میں بارہ بج کر پانچ منٹ ہوگئے۔ سیٹھ ہیرا لال جی آنکھیں بند کئے پڑے رہے۔ اور موت کا وقت گذر گیا۔ سیٹھ ہیرا لال جی کی نبضیں چل رہی تھیں۔ اور ناک کے نتھنے پھولے ہوئے تھے جن سے سوں سوں کی آوازیں نکل رہی تھی۔ جب سیٹھ جی کو یقین ہوگیا کہ موت کا سائرن بج گیا اور موت نہیں آئی تو انھوں نے حیرت و استعجاب سے آنکھیں کھولیں اور بڑی حیرانی سے اپنے چاروں اُور دیکھنے لگے۔ جیسے وہ موت کی وادی سے سفر کرکے واپس آگئے ہوں۔ اور ان کو دوبارہ نئی زندگی مل گئی ہو۔ وہ حیرت سے چیخ اٹھے: "کیا میں زندہ ہوں۔ کیا جیوتشی کی پیش گوئی غلط ثابت ہوئی۔"

شاردا دیوی بولیں: "آپ زندہ ہیں۔ میرا سہاگ سلامت ہے۔ میں کہتی تھی ناکہ آپ نہیں مرسکتے۔"

لیکن اب سیٹھ ہیرا لال جی میں بیوی سے آنکھ ملانے کی ہمت نہیں تھی۔ انہوں نے اپنی زندگی کا سارا راز اور اپنے سارے گھناؤنے کالے کرتوت اپنی بیوی کے سامنے اُگل دیئے تھے۔ وہ ایک مجرم کی طرح اپنی بداعمالیوں کے کٹہرے میں اپنی بیوی کی عدالت کے سامنے کھڑے تھے۔ ان کا پورا وجود ننگا تھا۔ تار تار ہو چکا تھا۔ زندگی کی تمام سیاہیوں اور گندگیاں ان کے جسم و جان سے گیلے کپڑے کی طرح چپکی ہوئی تھیں۔ وہ اپنی بیوی کے سامنے ایک دم ننگے تھے۔ اور ان کا ضمیر انہیں کچوکے لگا رہا تھا۔

ایک روز جب اچھی پوری طرح آفتاب طلوع نہیں ہوا تھا۔ اور پو نہیں پھٹی تھی کہ اچانک کسی نے ان کے دروازے پر دستک دی۔ سیٹھ ہیرا لال جی نے ہی دروازہ کھولا۔ دروازہ پر وہی جیوتشی گلے میں رودراکش مالا پہنے سر پر بالوں کی جٹا بڑھائے، بدن پر گیروا لبادہ لپیٹے، پاؤں میں کھونٹی دار کھڑاؤں پہنے کھڑا تھا۔ سیٹھ جی نے جیسے ہی جیوتشی کو دیکھا ان کا ہارٹ فیل ہوگیا۔

دائرہ

ڈاکٹر حقیر آستانی

نہ تیرا کچھ مقام ہے
ہماری زندگانیاں!
ادھر ادھر کے سلسلے
یہ راستے یہ فاصلے
یہ دوڑ صبح و شام کی
جہاں سے ابتدا ہوئی
حقیقتاً تو ہیں وہی!
حدود ہیں خیال کی!
عروج کیا زوال کیا
کہ دائرے میں ہیں رواں
یہاں بھی عارضی قدم
ابھی اٹھے ابھی گرے
جو ہے فریب راہ میں
فریب تو نظر کا ہے
کہ دائرہ ہے دائرہ

نہ میرا کچھ مقام ہے
پہیلیاں کہانیاں!
جنوں بسر ہے قافلے
یہ منزلیں یہ مرحلے!
نہیں کسی بھی کام کی
وہیں تو انتہا ہوئی!
نشیب بھی فراز بھی
خدائی اور بندگی
تری میری مجال کیا
کبھی یہاں کبھی وہاں!
وہاں بھی عارضی قدم
مگر کبھی نہ رک سکے
فتور ہے نگاہ میں!
قصور تو بشر کا ہے
نہ ابتدا نہ انتہا

عبدالحفیظ خلش تسکین

ذہن سے نکلے نہیں اطلس و کمخواب ابھی
مجھ کو آئے نہیں افلاس کے آداب ابھی

اے شبِ غم تری ظلمت کی حقیقت کیا ہے
نور پھیلانے کو آ کر مرا مہتاب ابھی

جو بدل دیتے ہیں اے دوست حقیقت دل کی
تو نے شاید نہیں دیکھے وہ حسیں خواب ابھی

الغرض ترکِ تعلق کی نہ آئی نوبت
مجھ میں کچھ دیکھ رہے ہیں مرے احباب ابھی

سو کنارِ دل رکا سکوں رکھتا ہے عزم کا بل
میری کشتی سے بہت دور ہے گرداب ابھی

دورِ فرقت میں ہے اشکوں کی روانی توبہ
ایسا لگتا ہے کہ آجائے گا سیلاب ابھی

انقلابات کا باعث جو ہوا کرتی ہیں!
دور ان باتوں سے ہیں منبر و محراب ابھی

دیکھ کر جن کو خلش جھوم اٹھیں اہلِ نظر
[illegible] ابھی

افسانہ

طلوعِ صبح

مالتی جے کمار
ترجمہ: عزیز احمد جلیلی

مادھوپن ایک چھوٹا گاؤں تھا جو بہت ہی اینڈل میں واقع ہوا تھا تہذیب اور تمدّن کی دسترس سے بہت دور بیرونی دنیا سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔

جس طرح ایک حباب تھوڑی دور دریا کا سفر کرکے آخر کار پھوٹ کر پانی میں مل جاتا ہے اور جس کا کوئی اثر دریا پر نہیں پڑتا اسی طرح اس گاؤں کا ہر فرد اپنی زندگی گذار کر اپنی طبعی عمر کو پہنچکر ایک دن دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ مگر گاؤں پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا اور نہ کوئی تغیر یا فرق محسوس ہوتا

یہ کسانوں کا گاؤں تھا۔ کاشتکاروں کا جہاں کے ہر باشندے کو سخت محنت اور جفاکشی کے بعد جس میں صبر و شکر کا جذبہ شریک رہتا مٹھی بھر اناج مل جاتا عورتوں اور مردوں کے لئے یہ ایک مسلسل جد و جہد کی زندگی تھی اگر کسی سال کثرت سے غلہ پیدا ہوتا تو بعض لوگ شہر کی طرف رخ کرتے تجارت کی غرض سے یا لوگوں کی مدد حاصل کرنے کے لئے کہ کس طرح زائد غلہ اسٹور کیا جائے مگر ایسا بہت کم ہوتا۔

جب ایسا اتفاق ہو جاتا کہ اس گاؤں کا کوئی فرد شہر جاکر لوٹ آتا تو شام کو سارا گاؤں اس کے چبوترے کے اطراف جمع ہو جاتا اور وہ بڑی تفصیل کے ساتھ شہر کے واقعات سناتا کہ کس طرح تیز رفتار موٹریں عورتوں اور مردوں کو لئے ہوئے سڑکوں پر دوڑتی تھیں، ٹونٹی گھمانے سے کس طرح نل سے پانی بہتا اور بڑے سے بڑے گھڑے تھوڑی دیر میں بھر جاتے اور کیسے ایک بٹن دبانے سے ساری تاریکیاں دور ہو جاتیں اور ہر طرف روشنی پھیل جاتی اور دن جیسی روشنی میں لوگ اپنا ہر کام انجام دیتے اور عورتوں مردوں کی طرح لباس پہن کر مردوں کے ساتھ نہ صرف کام کرتیں بلکہ ان کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے سڑکوں پر گھومتیں وغیرہ وغیرہ پھر جلد ہی لوگ تھک کر اپنے اپنے گھروں کو سونے چلے جاتے اور ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی نئی بات ہوئی نہیں۔

انا کشی کاشتکاروں کے ایک بڑے خاندان میں پیدا ہوئی تھی۔ والدین کو توقع تھی کہ لڑکا پیدا ہوگا صحت مند اور مضبوط جو کھیتوں میں اپنے والد کے ساتھ، اپنے چچاؤں کے ہمراہ اور اپنے بھائیوں کے دوش بدوش کام کرے۔ اس نازک سی لڑکی کو دیکھ کر وہ مایوس ہوئے ان کی یہ مایوسی ان کے چہروں سے عیاں ہو گئی تھی۔

یہ مردوں کی دنیا تھی عورتوں کی جگہ صرف سیاہ درِ خانہ تھی یا ان کا کام خاندان کی تعداد میں اضافہ کرنا تھا بس صرف

اتنا ہی اور صرف اسی قدر نہ اس سے کچھ کم اور نہ زیادہ۔

اس کے ہوش سنبھالنے پر جو سب سے پہلی بات اسکو یاد رہ گئی وہ تھی اطاعت اور فرمانبرداری [illegible] مردوں کی [illegible] اپنے والد کی فرمانبرداری، بھائیوں کی اطاعت کرو چچاؤں کی فرمانبرداری کرو اور پھر شوہر کی اطاعت کرو، اور اپنے بیٹوں کی فرمانبرداری کرو بغیر کچھ سوال کئے ہر دم ہر وقت فرمانبرداری ہی کرتے رہو۔

بڑوں کی تابعداری، مردوں کی اطاعت یہی لڑکیوں کو سبق سکھایا جاتا اور [illegible] میں مذہب کو بھی شریک کر کے خوفِ خدا کا ڈر لڑکیوں کے دل میں بٹھا دیا جاتا تاکہ اس کے برخلاف کوئی جذبہ دل میں پیدا نہ ہو سکے۔

درحقیقت فرمانبرداری اور اطاعت کوئی آسان بات [illegible] نہ تھی۔ شروع ہی سے اناکشی ایک سرکش اور انقلابی جذبہ رکھتی تھی، وہ ضدی اور خودرائے بھی تھی اس کی ماں اس کی اس صفت سے واقف ہو کر اس پر اور بھی سختی کرنے لگی۔ روزمرہ کے کاموں میں اور کھیل کود کے موقعوں پر بھی اس کے بھائیوں کو ترجیح دینا اس کے نزدیک کوئی بے انصافی کی بات نہ تھی کیونکہ اس کی ماں کی اسی انداز میں پرورش ہوئی تھی نہ صرف یہ بلکہ اس کی دادی اور پردادی نے بھی اسی نہج پر زندگی گزاری تھی۔

اناکشی ایک تجسس بھری لڑکی تھی جس کے لبوں پر "کیوں؟" اور "کس لئے" کے سوالات بار بار آتے اور ان سوالات کا گلا گھونٹ دیا جاتا۔

اناکشی کو یاد نہیں رہا کہ اس نے اپنے انقلابی جذبات کو روکا اور ان کو دبا دیا کیونکہ اس نے فرمانبرداری اور اطاعت کرنے ہی میں اپنی بھلائی کی راہ دیکھی ....

ایک صابر ہندوستانی عورت کی طرح لیکن حقیقت میں اس نے انقلابی خیالات کو ترک نہیں کیا تھا بلکہ فرمانبرداری اور اطاعت کا صرف لبادہ اوڑھ لیا تھا۔

من کی آنکھیں بند کئے وہ ایسے کام کئے جا رہی تھی [illegible] کے لئے اس کو کہا جاتا اگرچہ وہ اس کو ناپسند ہوتا اور [illegible] کی مرضی اور ضمیر کے خلاف ہی کیوں نہ ہوتا کیونکہ اس گاؤں کا دستور اور تقاضہ ہی یہی تھا اس کی مثال ایسی ہے کہ اگر وہ دوڑنا چاہتی اور ناچنا چاہتی اور جب دوڑتے دوڑتے اور ناچتے ناچتے اس کے پاؤں تھک جاتے تو وہ بیٹھ جاتی اور کسی دوسرے کام کی طرف متوجہ ہو جاتی سینے پرونے میں لگ جاتی لیکن اس کا دل تو آزاد رہتا اس کے خیالات کو تو کوئی مقید نہ کر سکتا تھا اس لئے تصور میں وہ دوڑتی رہتی اور ناچتی رہتی اس کے قدم گھاس کو روندتے محسوس کرتے اور اس کے بالوں سے نرم ہوا کے جھونکے کھیلتے اور اس کے رخساروں کے بوسے لیتے کیونکہ تصورات کا یہ سفر صرف تنہائی میں طے پاتا اس طرح اس کا عمل اور ذہن دو مختلف راہوں پر چلتے جن میں کبھی تصادم نہ ہوتا تھا۔

جب وہ (۱۶) برس کی ہوئی تو اس کی شادی کر دی گئی اس خصوص میں بھی اس نے بڑوں کی اطاعت کی تھی مگر وہ اس بات سے بھی انکار نہ کر سکتی تھی کہ اس کو شخصی طور پر اس شادی سے ایک اطمینان اور مسرت محسوس ہوئی تھی سلک کے قیمتی کپڑے جب اس کو پہنائے گئے مختلف قسم کی لذیذ مٹھائیاں جب اس کو کھانے کو ملیں تو اس کو مزہ آ گیا۔

کیونکہ حقیقت میں وہ ایک بچی ہی تھی. اس کا شوہر لمبا چوڑا ایک مضبوط جسم کا مالک تھا اوّل اوّل تو وہ کانپ جاتی اور ڈر جاتی تھی اپنے شوہر سے اور زندگی کے اس نئے تجربہ سے بعد میں وہ حیران رہ گئی یہ دیکھ کر کہ اس کا شوہر عام مردوں سے بالکل مختلف ہے ایسے مردوں سے جس کا نقشہ اس کے دل میں بٹھا دیا گیا تھا کہ مرد ایک طاقتور جانور ہوتا ہے. لیکن اس کا شوہر بھی طاقتور وحشی نظر آتا تھا. دراصل وہ شرمیلا تھا نرم دل اور نہایت شریف آدمی تھا وہ اکثر گاؤں کے باہر کے حالات شہری زندگی کے واقعات، وہاں کے لوگوں کے طور طریق رہن سہن کے واقعات اس سے بیان کرتا تھا.

وہ سب کچھ سن کر پیچ و تاب کھاتی اور سمجھتی کہ یہ ظلم ہے اور بے انصافی ہے اور بے رحمی ہے جو اس گاؤں میں عورتوں کے ساتھ روا رکھی جاتی ہے وہ نا کام سعی کرتی کہ اس کا شوہر اس کے ساتھ مساویانہ سلوک کرے ایسا کرنے کے لئے وہ کس طرح اپنے شوہر کو ترغیب دے اور اسکو آمادہ کرے اپنی سعی میں ناکام ہو کر اس نے سوچنا بھی ترک کر دیا تھا اور اپنی پہلی روش فرمانبرداری اور اطاعت کی طرف با دلِ ناخواستہ راغب ہو گئی اس طرز عمل سے وہ خوش نہیں ہوا بلکہ ناراضگی اور بیزاری کا اس نے اظہار کیا وہ سمجھ گئی وہ اپنے مقصد میں ناکام ہو گئی. اس لئے جان و دل سے اسکی اطاعت کرنے لگی سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار بھی نہ تھا جس کو سمجھ کر وہ اور بھی رعونت اور نفرت کا برتاؤ اس سے کرنے لگے.

اس طرح زندگی ناقابل برداشت ہو گئی اگر اس کے درمیان ایک نئی زندگی کے آثار اس میں نمودار نہ ہوئے ہوتے ...... انتظار کے مہینوں میں وہ سوچتی رہتی کہ وہ کس طرح اپنے بچوں کی پرورش کرے گی.

وہ ان کو مکمل آزادی دے گی کھیلنے کی آزادی، سوچنے کی آزادی، اپنے کام کے منتخب کرنے کی آزادی، پڑھنے کی آزادی، اور سیکھنے کی آزادی وہ اپنے بچوں کو سب کچھ دے گی جس سے وہ خود عمر بھر محروم رہی اور اب اپنے بچوں کے ذریعہ وہ ان محرومیوں سے چھٹکارا پائے گی اور ایک حد تک ان محرومیوں کو دور کر سکے گی.

اس کی پہلی اولاد ایک لڑکی تھی ایک سال بعد ایک لڑکے کا بھی اضافہ ہوا اور یہ دونوں اس کی زندگی کی خوشبو اور سرمایۂ حیات بن چکے تھے صرف یہ بلکہ اس کے تمام بلند تصورات، توانائیوں اور مشغولیوں کا مرکز بن گئے تھے اس کے اپنے قدرتی مشاہدات سے جو اس کی روشن دماغی نے حاصل کئے تھے. وہ اپنے بچوں کو بلا تکلف روشناس کر رہی تھی جس کی بدولت وہ بے پایاں مسرت اور شادمانی محسوس کر رہی تھی.

ٹھیک اسی وقت اس کے شوہر کو شہر میں ایک ملازمت مل گئی. اس گاؤں کے لوگوں کو ایسا واقعہ کبھی پیش نہ آیا اور نہ انھوں نے کبھی گاؤں سے باہر جانے کی خواہش کی اور نہ کبھی اس کے متعلق سوچا. اسی لئے انہوں نے خیال کیا کہ انا کشی کے شوہر نے ذاتی کوشش سے ان سے دور رہ کر اور ان سے کٹ کر باہر جانے کا پلان بنایا ہے تاکہ وہ ایک اچھا مستقبل بنائے.

گاؤں والوں کے بے فائدہ شور وغل کو نظر انداز کر کے اور نوجوانوں کی حاسدانہ نکتہ چینیوں اور بڑے بوڑھوں کے اندیشوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بالآخر یہ خاندان شہر منتقل ہو گیا۔

اناکشی کے لئے شہری زندگی کا پہلا تجربہ بہت پرجوش اور پرتپاک رہا اور ایسی سہولتیں دیکھ کر حیران رہ گئی جس کی وجہ سے اس کے کام آسان ہو گئے مثلاً نل سے پینے کیلئے اور برتنے کے لئے پانی حاصل کرنا بہت آسان ہو گیا۔ گاؤں میں اس کے لئے گھنٹوں کیو میں کھڑے رہ کر انتظار کرنا پڑتا تب جا کر پانی دستیاب ہوتا اس کا مکان "مین روڈ" پر تھا اس لئے وہ روزانہ گھنٹوں آدمیوں کے ایک سمندر کو اپنے گھر کے سامنے سے گزرتا دیکھا کرتی تھی اس نے تصوّر تک نہیں کیا تھا کہ دنیا میں اتنے لوگ رہتے ہیں اس کی مثال ایک مینڈک کی سی تھی۔ جو باؤلی میں رہتا ہے اور باولی کو ہی سمندر سمجھتا ہے جب تک وہ باؤلی سے باہر آکر سمندر کو دیکھتا نہیں اسی طرح اس کا گاؤں جو اس کی دنیا تھی اس کی نظروں میں پارہ پارہ ہو گیا کیونکہ شہر کی وسعت اس کی گہما گہمی دیکھ کر حیران رہ گئی۔ جس چیز کی طرف وہ زیادہ متوجہ ہوئی وہ عورت تھی بالکل مختلف عورت چہرہ پہ غازہ ملے لپ اسٹک لگائے بنی سنوری مردوں کی بانہوں میں باہیں ڈالے، بے تکلف ہنستی ہوئی، مسکراتی ہوئی سڑک پر چل رہی ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ بعض عورتیں بھڑ کیلے لباسوں میں اسکوٹر کے پیچھے بیٹھی مردوں کی کمر میں ہاتھ ڈالے ہوئے ہوا کے دوش بدوش۔ بڑی بڑی کارخانوں اور فیکٹریوں میں

کام کرنے والی عورتیں اور بلا کسی کام کے اِدھر اُدھر گھومنے والی عورتیں ان سب نے اَناکشی کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا اس کے ساتھ جب وہ دیکھتی کہ زیادہ عمر والی معمر عورتیں بھی محنت اور مشقت کر رہی ہیں اور ان کے چہروں پر تھکن اور پژمردگی چھائی ہوئی ہے تو اس کا دل دکھ سے بھر جاتا کیونکہ دیہات میں اس عمر کی عورتیں مکمل آرام کرتیں اور نوجوان عورتیں جب گھر کے کام سے فرصت پاتیں ان کی خدمت کرتیں اسی لئے ان کے چہروں پر تازگی رہتی۔ اَناکشی نے شہر کی معمر عورتوں کی طرف سے اس کے اپنے دل میں ہمدردی کا جذبہ محسوس کیا

اِس کے شوہر کے والدین اپنے دوسرے لڑکوں کے ساتھ گاؤں میں ہی ٹھہر گئے تھے۔ اس لئے اناکشی نے محسوس کیا کہ اب اس کے گھر پر مکمل طور پر اس کی اپنی حکومت ہے۔ بلا شرکت غیر اُسے مسرّت اور شادمانی کا نشہ سا محسوس ہوا اب وہ جو چاہے کر سکتی ہے اور جس چیز کو چاہے حاصل کر سکتی ہے۔ اگرچہ وہ اپنی ساس کو چاہتی تھی لیکن گھریلو معاملات میں اپنی مرضی کے مطابق عمل کرنے کی لذت سے اب تک وہ ناآشنا تھی۔ آج کیا چیز پکائی جائے۔ کیا چیزیں خریدی جائیں اب تک وہ دوسروں کی اطاعت اور تابعداری کرتی آئی تھی مگر آج وہ صرف اپنی مرضی کی مالک تھی اور اپنی خواہش کے مطابق عمل کرنے کی مسرت محسوس کر رہی تھی اس کے لئے یہ ایک نئی لذت تھی نئی مسرت

ان کے مکان کے بالکل روبرو ایک اسکول تھا۔ گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر فرصت کے اوقات وہ اکثر اپنے گھر کی کھڑکی میں سے سڑک کا نظارہ کرتی نہ صرف یہ بلکہ سڑک کے اس پار اسکول کے لان اور کھیل کے میدان پر بھی اس کی نظریں رہتیں وہ بڑے شوق سے اسکول کے بچوں

کو کھیل کود میں مصروف دیکھتی چھوٹے بچے للن پہ گلاٹیاں لگاتے بڑی عمر کے لڑکے فٹ بال اور کبڈی کھیلا کرتے۔

وہ یہ دیکھ کر حیران رہ جاتی کہ بے شمار لڑکیاں بھی اسکول آیا کرتی تھیں۔ لڑکوں کے دوش بدوش کلاسوں میں بیٹھ کر پڑھنے کے لئے گاؤں میں لڑکے ضرور اسکول جایا کرتے تھے۔ اگرچہ دھرم شالے کی اس بلڈنگ کو اسکول کہا جائے جہاں لڑکے گشت کرتے نظر آتے کیونکہ ماسٹر اکثر گھر کے کاموں میں مصروف رہ کر اسکول سے غائب رہتے مگر گاؤں میں لڑکیوں کا اسکول جانا تو کسی نے کبھی سنا بھی نہیں۔

لڑکیوں کو اسکول جاتا دیکھ کر اس کا دل دکھ اور غم سے بھر جاتا کیونکہ وہ اس مسرت سے چاہنے کے باوجود آشنا نہ ہوئی تھی۔ اسی لئے اس کی زبردست خواہش اب یہ ہوئی کہ وہ اپنے بچوں کو اسکول ضرور بھیجے گی جس چیز کو وہ حاصل نہ کر سکی اس کے بچے حاصل کریں گے لیکن اس کا یہ عزم اور ارادہ زمین پر ایک زبردست زلزلہ آنے کا پیش خیمہ ہے۔ نئے اور قدیم خیالات کا تصادم ایک بڑے طوفان کا محرک ہو سکتا ہے اس رات اس نے کھانا کھلانے کے بعد اس کا تذکرہ اپنے شوہر سے کیا۔ کھانے کے بعد حسب معمول پان پیش کر کے وہ نیچی نظریں کئے کھڑی رہی اور پھر صاف نرم لہجے میں وہ بولی میرا خیال ہے کہ ہماری لڑکی اب بڑی ہو گئی ہے اور اسکول جانے کے قابل ہے۔

وہ حیرت بھری نظروں سے اسے دیکھتا رہا اور پھر ان نظروں میں طنز اور حقارت نے اپنا ڈیرہ جما لیا اس نے سوچا کہ آج تک اس نے کبھی اس سے آنکھیں ملا کر بات نہیں کی سوائے اطاعت اور فرمانبرداری کے اناکشی نے کسی چیز کا مطالبہ نہیں کیا میں نے اس سے شادی کی اور بچے بھی پیدا ہوئے مجھے یہ تک معلوم نہیں ہوا کہ وہ ہے کیسی سچ تو یہ ہے کہ وہ اس کی ساتھی اور دوست نہیں کہلا سکتی اس کو باندی یا خادمہ کہہ سکتے ہیں۔

"تم کب سے یہ سوچنے لگی ہو" اس نے حقارت بھرے لہجے میں کہا "اسکول کیا تم سمجھتی ہو کہ اسکول میں مفت تعلیم دی جاتی ہے ہم کتابیں خریدنے کے لئے کہاں سے روپے لائیں گے علاوہ اس کے دیگر بے شمار اخراجات کرنے پڑتے ہیں۔ اور وہ بھی لڑکی جبکہ اس کی زندگی باورچی خانے سے شروع ہوتی ہے اور بستر پر ختم ہو جاتی ہے شوہر کے لئے کھانا پکانا اور بچے پیدا کرنا بس یہی لڑکی اور عورت کے فرائض ہوتے ہیں۔ نہ اس سے کم اور نہ اس سے زیادہ"

"میری طرح" اناکشی نے دل میں کہا اور غصے کی چنگاری اس کی آنکھوں سے نکلنے لگی اور وہ اب بھی میرے ساتھ حقارت کا برتاؤ کر رہا ہے۔

"میں چاہتی ہوں کہ میری لڑکی بھی اسکول جایا کرے" ایک مضبوط ارادے اور آہنی عزم کے ساتھ وہ بولی گویا وہ آج تک اسی عزم اور ارادے کی پذیرائی کے لئے جیتی رہی تھی اسی موقع پر اس کو لڑنا ہے اب تک وہ اپنے لئے نہیں لڑی لیکن آج وہ اپنے بچوں کے لئے لڑے گی۔ اگر وہ اس وقت بھی بزدلی کا مظاہرہ کرے گی تو یقینا ہے کہ وہ آج سب کچھ ہار جائے گی۔

"اس نے جامہ اتار دیا آج وہ بے نقاب ہو گئی ہے"

اس نے دل میں کہا اس نے آج تک یہ لفظ استعمال نہیں کیا۔ حالانکہ میں تمنا کرتا تھا کہ وہ کبھی تو یہ لفظ استعمال کرے یا میں نے خود اس کو کبھی بڑھاوا نہیں دیا یا کبھی اس کی پروا نہیں کی اس لئے اب مجھے اس کے غصہ کو ابھارنا ہے اس کی انا کو آگ لگانا ہے اور اس کے جلال اور غضب کو طیش میں لانا ہے یہ سوچ کر ترش رو تبسم اس کے ہونٹوں پر کھیل گیا اور اس نے کہا۔

"آج کل تمہاری پرواز آسمانوں سے باتیں کر رہی ہے آج کل تم بہت اونچی اڑ رہی ہو میں نہیں سمجھتا تھا کہ تم اتنی سمجھ بوجھ رکھتی ہو تم اپنی لڑکی کو فرمانبرداری اور اطاعت کی تعلیم کیوں نہیں دیتیں۔ جیسی تعلیم تمکو تمہاری والدہ نے دی تھی۔"

یہ سن کر وہ تڑپ گئی اور اچھل گئی گویا اس کو کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو برسوں سے یہ لفظ اطاعت اس کے دماغ میں ایک طوفان، ایک ہیجان اور نفرت انگیز خلش پیدا کر رہا تھا روشن خیالی کے انقلابی نظریوں نے جن کو وہ اب تک کنٹرول کر رہی تھی آج ان حدوں کو توڑ دیا تھا۔ جن کے اظہار کی اس میں سکت تھی نہ یارا تھا۔

اس نے نظریں اٹھا کر اپنے شوہر کو دیکھا زندگی میں آج پہلی دفعہ اپنے شوہر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں کیونکہ اس کو یہ تعلیم دی گئی تھی کہ نیک وفادار عورت کو کبھی اپنے شوہر سے آنکھیں ملا کر بات نہ کرنا چاہیئے نہ صرف یہ بلکہ اپنے بھائیوں سے بھی اور اپنے والد سے بھی، زندگی میں وہ پہلی دفعہ غصہ سے بھڑک اٹھی اور اس کو ۔۔۔ کہ اس تعلیم ہوا باطل ہو گئی جب اس نے دیکھا اور محسوس کیا کہ اس کے بچوں کا مستقبل تاریک ہونے والا ہے اس کی مثال ایک شیرنی جیسی ہو گئی تھی جو اپنے سے قوی تر دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنی گوری سے بچے چھاڑ کر باہر نکل آئی ہو، وہ اپنی بیوی کی نفرت بھری نظر میں جن سے غیظ و غضب کی چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ دیکھ کر دب گیا اور شکست کھا گیا۔ کیونکہ اس کی آواز برس ہا برس کی کچلی ہوئی آزلوی کی ایک فریاد تھی۔'

جب اس نے کہا "فرمانبرداری اور اطاعت بندگی اور اطاعت آخر کب تک اور کس حد تک؟ میں نے اس اطاعت اور غلامی کا کیا پھل پایا جو میں اپنی لڑکی کو قدم بہ قدم چلنے کی ہدایت دوں کیا میں زندہ تھی کیا میری بھی کوئی زندگی تھی کیا تم جانتے نہیں تھے کہ ایک زندہ لاش بیوی کے روپ میں تمہارے ساتھ رہی تم چاہتے ہو کہ تمہارے بچے بھی بزدل اور ڈرپوک اور جاہل رہیں جو اپنے برے بھلے کی سوجھ کی بھی صلاحیت نہ رکھیں اگر تمہارا یہ منشا تھا تو تم کو اپنے گاؤں ہی میں رہنا تھا آخر تم گاؤں میں ٹھہرے کیوں نہیں؟ کیونکہ تم آزادی چاہتے تھے گلا گھوٹنے والے ماحول سے نکل کر کھلی فضا میں سانس لینا چاہتے تھے جس چیز کو تم خود عزیز رکھتے ہو اسی چیز سے دوسروں کو محروم کرنے کا تم کو کیا حق حاصل ہے لہٰذا میرے دونوں بچے اسکول جائیں گے ۔۔۔۔۔۔۔ ورنہ ۔۔۔۔۔۔۔"

"اس کے آگے وہ سمجھ نہ سکی کہ اس کو کیا کہنا چاہیئے۔ وہ خاموش ہو گئی۔ پریشان ہو گئی۔ اور غصّے سے سُرخ ہو گئی۔

۔۔۔۔۔۔ ورنہ ورنہ وہ اس کے آگے کیا کہے وہ اپنے شوہر

یہ کیا اختیار رکھتی ہے آخر کار وہ ایک جاہل اور گنوار عورت تھی جس کو [illegible] سے یہ تعلیم دی گئی تھی کہ اس کو مرد پر انحصار کرنا چاہیئے کیا ہوگا اس نے سوچا اگر اس کا شوہر انکار کردے اور صرف "نہیں" اس کی زبان سے نکلے اس طرح اس کی روشن [illegible] کی تمنا اور آرزو سب خاک میں مل جائیں گے غیر معمولی غصے اور شدید ناراضگی نے اس کی آنکھوں میں اشکوں کا ایک سمندر موجزن کردیا اسے اب معلوم ہوگیا کہ وہ بالکل کمزور اور ناتوان ہے وہ کچھ کر نہیں سکتی اس نے نظریں نیچی کرلیں اور مسلسل اشک اس کی آنکھوں سے ٹپکنے لگے.......... اس چھوٹے سے کمرے میں بالکل خاموشی چھائی ہوئی تھی وہ دل میں کہنے لگی وہ جہاں سے چلی تھی اب بھی اسی جگہ کھڑی ہوئی ہے ایک انچ بھی آگے نہ بڑھ سکی اس نے کچھ بھی حاصل نہ کیا.........

وہ انتظار میں تھی کہ نہیں کا لفظ اس کی زبان سے نکلے گا یا اس کی بے عزتی کی جائے گی یا کوئی طنز بھرا جملہ کہا جائیگا.

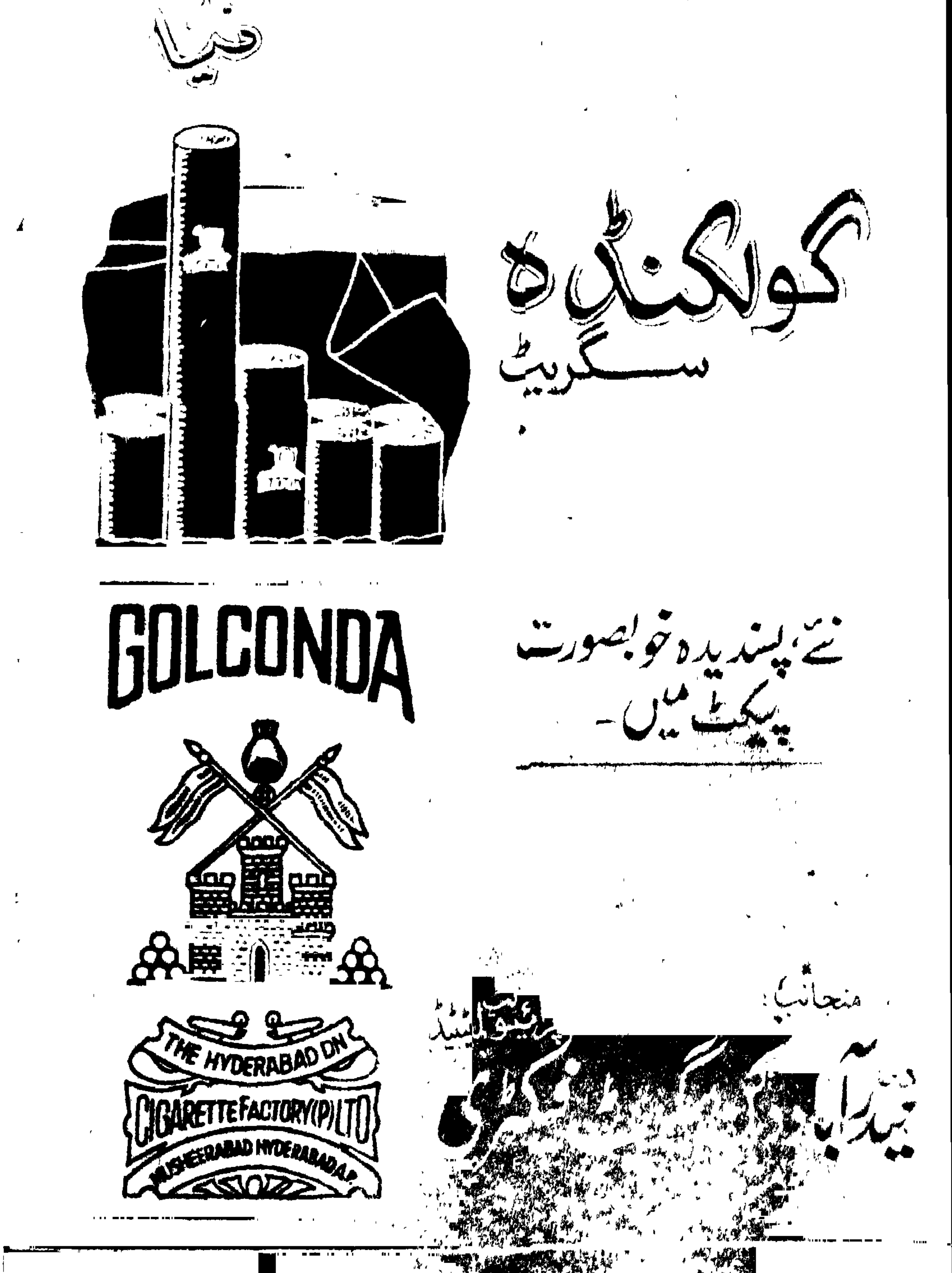
........ایسی کوئی بات نہیں ہوئی آج تک اس کو علم نہ تھا کہ اس کا شوہر اس قدر شریف اور نیک آدمی ہے. اس کی آواز میں حیرت انگیز نرمی اور حلاوت تھی جب اس نے کہا "بیوی کے روپ میں مجھے ایک نڈر اور بہادر بیوی ملی ہے جو ایک شیرنی کی طرح جری ہے اس تمام عرصہ میں تم نے صرف تحمل اور صبر کا مظاہرہ کیا. حالانکہ تم میں جوش تھا ولولہ تھا اور حوصلہ تھا.........."

[illegible] نے اس کی ٹھوڑی کو پکڑ کر [illegible]

"اب میری شیرنی کیوں رو رہی ہے. خاموش ہوجاؤ آج تم نے جنگ جیت لی ہے ہمارے بچے ضرور [illegible] جائیں گے" وہ ہنسا اور اس کے آنسو پونچھ ڈالے اور سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا"

مجھے حقیقت میں اس بات کا افسوس ہے کہ اس تمام عرصہ میں میں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے اس خیال سے کہ تم دیہات کی ایک کم عقل بے وقوف عورت ہو جس سے مجھے کبھی کوئی شکایت نہ ہوگی مگر اب میں نے جانا......... تم میں جذبہ تھا ولولہ تھا اور حوصلہ تھا ہوشمندی تھی اور روشن خیالی تھی جس کو میری نا سمجھی نے دبا دیا تھا. اب میرے بچوں کا مستقبل تابناک ہوگا اور روشن کیونکہ تمہارا حوصلہ امنگ اور جوش ان کو آگے بڑھائے گا .... آگے بہت آگے........ اب تو مجھ سے آنکھیں ملاؤ، نظریں اٹھاؤ اب تو خوش ہو نا........ "

سچ ہے آج اُسے دنیا مل گئی اس کی اپنی دنیا جس کے لئے وہ جی رہی تھی جس کی ایک نئی صبح طلوع ہو رہی تھی۔


نیا
گولکنڈہ
سگریٹ
GOLCONDA
نئے، پسندیدہ خوبصورت
پیکٹ میں۔
THE HYDERABAD DN
CIGARETTE FACTORY(P) LTD
MUSHEERABAD HYDERABAD A.P.
منجانب:

غزلیں

نادر اسلوبی

دشمنی شیشے کی ہے یہ دوستی شیشے کی ہے ÷ ٹوٹ جانا ہے سبھی کو زندگی شیشے کی ہے
کیا کریں بازار میں سوداگری شیشے کی ہے ÷ مال بھی شیشے کا ہے اور ساکھ بھی شیشے کی ہے
دل نچھاور کرنے والے ہوش کے ناخن تو لے ÷ مورتی پتھر کی اور آرتی شیشے کی ہے
جوش کا وہ وقت تھا اب ہوش کا ہے وقت یہ ÷ وہ صدی پتھر کی تھی پر یہ صدی شیشے کی ہے
اس صنم انداز کی صورت گری مقصود ہے ÷ آذری پتھر کی ہے تو شاعری شیشے کی ہے
حادثوں کی بھیڑ میری زندگی کے ساتھ ہے ÷ میں جہاں رہتا ہوں نادر وہ گلی شیشے کی ہے

قیصر قلندر

منتظر آنکھوں میں جلوے کی کرن لہرائے گی ÷ صبح آئے گی تو شب بھر کی جلن تڑپائے گی
گل بدن لمحوں کو روندے گی ونا کر اپسرا ÷ مضمحل چہرے پہ ہر دل کی کیفیت چھا جائے گی
پھر کسی آشفتہ سر کو ڈھونڈنے نکلیں گے لوگ ÷ پھر روایت چھوڑ کر دنیا کسے اپنائے گی
درد کا قصہ سنانے کی نہ سننے کی ہے تاب ÷ دل زدوں کی داستاں اب خون کیا رلوائے گی
شام کا تارا سحر سے پہلے خاکستر ہوا ÷ منزلِ شب تک صبا اب کیا خبر لے جائے گی
ایک لمحے نے مجھے آشوبِ تنہائی دیا ÷ زندگی اے زندگی اب خواب کیا دکھلائے گی

اب قرار آبادہ ساعت کی بشارت کون دے
عشرتِ امید قیصر پھول کب برسائے گی

زبان

از ۔ سیّد حمید الدین قادری شرفی۔ ریسرچ اسکالر

آفرینندۂ حقیقی نے آب و تراب کے پیکر انسان کو اعلیٰ ترین تخلیقی شہکار کے روپ میں پیدا کر کے اسے کائنات کی خسروی عطا کر دی۔ تمام مخلوقات میں اسے اشرف و افضل بنانے کے لئے عقل و نطق کی دولت سے مالا مال کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ اس کی فطرت میں ایسا وجدان پیدا کیا جس کے ذریعہ وہ بلا کسی خارجی رہنمائی کے خود ہی ایک منظم منضبط معاشرتی زندگی کے لئے ماحول کو سازگار بنا سکے۔ چنانچہ انسانی سماج کی ابتداء اسی وجدانِ باطنی کا نتیجہ تھی۔ انسان فطرتاً مدنی الطبع واقع ہوا ہے۔ اسی لئے اس کو سماجی حیوان سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے جب انسان ابتداء ہی سے سماجی زندگی کا عادی رہا ہے تو اسے اپنی حیات کے ہر دور میں اپنے احساسات، جذبات اور خیالات کے اظہار کے لئے کسی نہ کسی وسیلہ کی حاجت ضرور رہی ہوگی یوں تو ہر ذی روح اس حد تک یعنی اپنے مافی الضمیر یا ضرورت کے اظہار کے لئے قدرت کے عطیہ سے محروم نہیں انسانوں کے علاوہ تمام حیوانات کسی نہ کسی طرح حرکات و سکنات، اشاروں، آوازوں، چیخ و چنگھاڑ کے ذریعہ اپنا کام چلاتے ہیں۔ لیکن اس ضمن میں صرف انسان ہی پر قدرت کی خاص مہربانی یہ ہے کہ اسے نطق و گویائی کی صلاحیت سے نوازا گیا ہے۔ انسان ہی کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ نہ صرف مذکورہ بالا تمام وسائل سے بلکہ تکلم یا گویائی کے ذریعہ اپنے خیالات، جذبات اور احساسات کا اظہار کر سکتا ہے۔

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسان کی سماجی و معاشرتی ضروریات کے پیش نظر گویائی کی بے پناہ اہمیت ہے۔ بلکہ تکلم قدرت کا سب سے عظیم الشان عطیہ ہے۔ انسانی سماج کی یہی ضروریات انسانی نطق کی اساس پر کسی بھی زبان کی پیدائش کا سبب بنتی ہے۔ دنیا بھر میں اس وقت جتنی زبانیں رائج ہیں یا ماضی میں تھیں۔ ان سب کی ابتداء تشکیل و تہذیب کا بنیادی مقصد حیاتِ انسانی کی ضرورتوں کو پورا کرنا ہی تو ہے۔ انفرادی یا سماجی زندگی میں زبان کے اہم اور بنیادی کردار سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا ہے۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی یہ حقیقت روشن ہے کہ کائنات کی رنگا رنگ دلچسپیوں، انسانی زندگی کی تنوع کیفیتوں، سماجی زندگی کے بندھنوں نیز زندگی کی ان گنت ضرورتوں میں جو شعوری و لاشعوری ارتباط ہے وہ محض زبان کے وجود کے فیض سے ہے ورنہ حیاتِ انسانی اور عالم جمادات میں کوئی خاص فرق و امتیاز نہ رہتا۔

زبانوں کی ابتدا کب ہوئی اس کے اسباب کیا تھے۔ دنیا بھر کی زبانوں کے آپسی تعلقات ان کی کیفیات نسلی و تاریخی احوال اور زبانوں سے متعلق تقسیم کی

تفصیلات میں جانا یہاں بے موقع ہوگا۔ اپنے موضوع کی مناسبت سے زبان کے بارے میں دو چار باتیں خالی از دلچسپی نہ ہونگی

زبان ترسیل و ابلاغ کا وہ فطری ذریعہ ہے جس سے معاشرتی زندگی کے تقاضوں کی تکمیل ممکن ہوتی ہے۔ اظہار کے لئے جو ذرائع نہایت مسلّمہ اور مفید مانے جاتے ہیں ان میں تین طریقے بے حد مقبول ہیں۔

(۱) اِشارہ (۲) تکلّم اور (۳) تحریر۔ ان میں سے تکلّم ہی وہ ذریعۂ اِظہار ہے جس کا زبان سے واسطہ ہے۔ البتہ بہت ساری غیر شعوری اور بے ارادہ نکلنے والی آوازیں مثلاً رونا، ہنسنا، چیخنا، چلّانا وغیرہ ان میں اگرچہ اعضاءِ صوتی کا بھرپور استعمال ہوتا ہے لیکن ہم انہیں زبان کے زمرہ میں شامل نہیں کر سکتے کیونکہ "صرف ارادی" INTENTATIVE آوازیں ہی زبان کہلاتی ہیں۔ (ہند آریائی اور اردو ص ۳۶، سید حمیدالدین قادری شرفی بحوالہ لسانی مطالعے ص ۲۲ پروفیسر گیان چند)

زبان انسان کا ایک اہم ترین تخلیقی کارنامہ ہے۔ اس نے محض بے ہنگم آوازوں کو بامعنی بنایا اور کلمات کو خیالات اور اشیاء کی علامت کے طور پر استعمال کیا زبان گویا مختلف انسانی جذبات و احساسات مشاہدات و تجربات کے تبادلہ اور انسانی اعمال حرکات و سکنات کے لئے پیرایہ متعین کرتی ہے۔ بہرحال زبان انسانی جہد و کاوش تخلیق و اختراع کا ایسا فقیدالمثال شاہکار ہے جس پر جس قدر ناز کیا جائے کم ہے

مختلف زبانوں کی ابتداء اور ارتقاء، تشکیل و تکمیل ایک مستقل موضوع ہے تاہم یہاں مختلف زبانوں کے متعلق اختصار کے ساتھ ماہرینِ السنہ کے نظریات کا جائزہ لینا مفید ہوگا۔ ماہرینِ لسانیات نے الگ الگ زبانوں کی متنوع خصوصیات کی بناء پر تمام زبانوں کے ایک ہی منبع کو ماننے میں تامّل کیا ہے۔ ان کا یہ تامّل اس لئے ناقابلِ فہم ہے کہ ساری انسانی برادری کو ایک ہی فرد کی اولاد تسلیم کیا جاتا ہے۔ تو پھر زبانوں کو کسی ایک منبع سے کیوں مانا نہیں جاسکتا جس طرح فردِ واحد کی اولاد رفتہ رفتہ بڑھتی پھیلتی گئی اور الگ الگ نسلوں، گروہوں، قبیلوں اور خاندانوں میں بٹتی گئی اور پھر یہ باور کرنے میں کیا دشواری ہے کہ دنیا کی تمام زبانیں اِسی اصول کی بناء پر ایک ہی منبع سے نکل کر مختلف گروہوں، جماعتوں، خاندانوں اور طبقوں کی صورت میں پھیل گئیں۔

بہرحال ماہرینِ لسانیات زبانوں کو دو طرح سے بانٹتے ہیں (۱) قواعدی اساس پر (۲) نسلی و تاریخی بنیاد پر۔ اول الذکر قسم میں قواعد، صوتی کیفیات، بناوٹ اور الفاظ کے آپسی تعلقات کو سامنے رکھ کر انہیں کئی زمروں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ جب کہ موخرالذکر قسم میں زبانوں کے نسلی و تاریخی پس منظر کی روشنی میں انہیں الگ الگ بانٹا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے دنیا بھر کی زبانوں کو آٹھ بڑے بڑے خاندانوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

(۱) سامی (۲) بانتو (۳) ہندچینی (۴) دراوڑ (۵) سلایائی (۶) نندا (۷) امریکی (۸) ہند یوروپی۔ ان میں سامی اور ہندیوروپی خاندان بے حد وسیع و قیع اور اہم ہیں۔ دنیا کی اکثر مشہور و مقبول زبانوں کا تعلق انہی سے ہے۔

سامی خاندان کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ عظیم اور وقیع زبان عربی ہے۔ جب کہ دنیا کی اہم ترین زبانوں انگریزی، جرمنی، فرانسیسی، اردو اور ہندی کا برصغیر کی وہ زبانیں ہیں جن کے بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد لگ بھگ ایک سو کروڑ نفوس پر مشتمل ہے۔

زبان اور ادب کا تعلق بلاشبہ چولی دامن کا ساتھ کہلایا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ کسی بھی زبان کی عظمت و اہمیت کا اندازہ اس کے ادب کے سرمائے اور معیار ہی سے کیا جا سکتا ہے۔

غزلیں

رزاق افسر

حکایتوں میں نہ کہنہ روایتوں میں اُتر
تو اپنے ذہن کی تازہ فراستوں میں اُتر

کٹی وہ رات حسیں خواب جس میں دیکھے تھے
نمودِ صبح کی سیمیں لطافتوں میں اُتر

تمام دن تو کٹا اک حسیں تصوّر میں
صدائے شب ہے کہ تنہا شکایتوں میں اُتر

فریب خوردہ محبت کی ہار کر بازی
سلوکِ صدق و صفا کی وضاحتوں میں اُتر

ملامتوں کا نہ تضحیک کا نشانہ بن!
سمجھ کے سوچ کے گہری علامتوں میں اُتر

حیات اپنی تو ہر پل سفر مدام سفر
تھکن کا نام نہ لے اور مسافتوں میں اُتر

نفس نفس پہ بھٹکتا تو چھوڑ کر افسر
جلا یہ فن کی معطّر فصاحتوں میں اُتر

احتشام اختر

اشک سے سیراب ہو گی ایک دن
ارضِ دل شاداب ہو گی ایک دن

عشق میرا اک حقیقت ہے مگر
یہ حقیقت خواب ہو گی ایک دن

کیا خبر تھی درد کی بہتی ندی
اس قدر بے آب ہو گی ایک دن

اُس کے چہرے پہ دمکتی ہے ابھی
یہ کرن مہتاب ہو گی ایک دن

کھیلتا ہوں موجِ دل سے میں ابھی
موج سیلاب ہو گی ایک دن

شفیع اللہ خان

ظالموں سے کرم کی آس میاں
تلخیوں میں کہاں مٹھاس میاں

آج دل ہے بہت اُداس میاں
بیٹھ جاؤ ہمارے پاس میاں

نفسی نفسی پڑی ہے دُنیا میں!
جس کو دیکھو ہے بے حواس میاں

غلط ہو گئے ہیں اندازے
کام آیا نہ کچھ قیاس میاں

تیرگی میں سسک رہے ہیں لوگ
چھوڑ کر روشنی کی آس میاں

یہ صدی ننگِ آدمیت ہے
ساری دُنیا ہے بے لباس میاں

سب کو پڑھ کر سنا رہا ہے راز
آپ کا خط ہے اس کے پاس میاں

صبر کا پھل

رضا اعجاز
ٹورنٹو (امریکہ)

تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ تم مجھے خط لکھو گی تب یہ میری دلی تمنا بن گئی تھی کہ تمہاری تحریر میرے نام اور میرے پاس آئے۔

آج تمہاری تحریر آگئی ہے۔ لیکن ہائے وہ یوں آئی ہے کہ تمنا کو کرب کا روپ ملا ہے اور ایک سانحہ گزر گیا۔ اس کو دیکھ رہا ہوں تو محسوس ہو رہا ہے جیسے تم میرے روبرو آکر میرے اندر جھانک رہی ہو۔ اور میرے وجود کے اندر گزرنے والے اس سانحے کا پتہ چلا رہی ہو۔ یہ سانحہ یکایک ایک طوفان کی طرح آیا اور مجھے ملیا میٹ کر کے رکھ دیا۔ اس سانحہ کا پتہ اگر تم نے اب چلا بھی لیا تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ وقت پر لگا کر اڑ گیا ہے۔ اب یہ وقت نہیں آئے گا۔ کبھی نہیں لوٹے گا۔

پتہ نہیں تمہیں اب وہ دن یاد ہوگا بھی یا نہیں جب میں تمہارے گھر پر عید کے موقع پر آیا تھا۔ گرمی کے دن ہونے کے باعث سب لوگ صحن میں بیٹھے تھے شائد کچھ دیر قبل صحن میں چھڑکاؤ ہوا تھا۔ مٹی میں سے سوندھی سوندھی بو نکل رہی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک اونچی کرسی خالی تھی۔ جس میں بیٹھ کر میں سب کے لئے نمایاں بن گیا تھا۔ ان دنوں میرے افسانے نئے نئے شائع ہونے شروع ہوئے تھے۔ سب اپنے پرچوں میں میرے افسانے آتے تھے تمہاری یہ عادت تھی کا

موضوع میرے افسانے بن گئے۔ اسی وقت تم اپنے گھر کے دروازے میں نمودار ہوئی تھیں اور مجھے دیکھ کر شرماتی لجاتی اور مسکراتی مجھے سلام کر کے میرے سامنے سے ہوتی ہوئی میری کرسی کے پیچھے آگئی تھیں۔ تمہارے ہاتھ میں میرے لئے لایا ہوا شربت کا گلاس تھا۔ شربت کا گلاس دیتے ہوئے تم نے میرے ایک افسانے پر مجھے مبارکباد دی تھی۔ اور مجھے بہت بڑا افسانہ نگار کہا تھا۔ مجھے اپنی تعریف اچھی لگ رہی تھی۔ اس لئے کرید کرید کر تم سے دوسرے افسانوں کے بارے میں بھی پوچھتا جا رہا تھا۔ باتوں ہی باتوں میں تم نے میرے افسانوں کے بہت سے جملے جوں کے توں دہرائے تھے اور اس کے بعد میرے شائع شدہ افسانوں کے عنوانوں کو اس تسلسل کے ساتھ دہرایا تھا جس میں کہ یہ شائع ہوئے ہیں۔ میں چونک گیا تھا۔ ان افسانوں کا خالق ہونے کے باوجود میں اپنے ذہن میں ان کے عنوانوں کے تسلسل کو ان جملوں کو اتنی احتیاط سے نہیں رکھ سکا تھا۔ تم نے تو میرے سامنے بڑا کمال کر دیا۔ تمہاری یادداشت اور ذہنی قوتیں غیر معمولی بھی نہیں ہیں۔ اگر ہوتیں تو میں تعجب نہیں کرتا۔ میری تحریر کو تم نے ان گنت زاویوں سے سراہا تھا۔

وہ دن میرے لئے غیر معمولی بن گیا تھا۔ میں نے اپنی ڈائری میں نوٹ کیا کہ میں بہت خوش ہوں۔ میں خود

کیا کہ تم نے میرے افسانوں کو کئی بار پڑھا ہوگا۔ تمہارے جملوں اور تمہارے پرکھنے کے زاویوں کا میں نے جائزہ لیا۔

تو ان زاویوں میں میرے افسانوں میں بسنے والے انسانوں کی نہیں بلکہ ان کرداروں کو اُجاگر کرنے والے افسانہ نگار کی شخصیت کے اُبھارنے کا گمان ہو رہا تھا۔ تم اپنی میٹھی آواز اور پُر زور جملوں کے سہارے سے بار بار یہ بتانا چاہ رہی تھیں کہ تم میرے افسانوں کی پرستار ہی نہیں بلکہ مجھے بھی پسند کرتی ہو۔

تمہارے جملوں کی مٹھاس کی شہ پا کر میری اُمنگ نے نئی کروٹ لی اور میں نے زیادہ اعتماد اور قوت کا احساس کیا تھا میں کئی دنوں تک تمہاری اداؤں کے بارے میں سوچتا رہا۔ آہستہ آہستہ مجھ پر کسی جادو کا اثر ہونے لگا۔ میں خاموشی ہی خاموشی کے ساتھ تم سے محبت کرنے لگا۔ میری پلکوں پر آکر تم بیٹھ گئیں۔ میرے دل و دماغ پر تمہاری حکومت ہو گئی۔ کہانیاں لکھنے کے لئے میں جیسے ہی قلم اٹھاتا تو تم اٹھلاتی ہوئی میری تنہائی میں آجاتیں اور میرے افسانوں کے اندر اندر نئے نئے تراش تراش کر جملے دینے لگتیں۔ میرے [illegible] لکھے ہوئے الفاظ تمہارے منہ سے نکلے ہوئے موتی محسوس ہونے لگے۔ میرے قلم کی نوک اور تمہاری زبان میں ایک نسبت سی ہو گئی تھی۔ تمہارا تصور مجھے بے چین کرنے لگا۔ ایک تڑپ مجھے ستانے لگی۔ میں نے کئی بار چاہا تھا کہ تمہارے سامنے کھل کر اس بات کا اظہار کر دوں کہ میں اپنے افسانوں کی ایک پرستار کا شیدائی بن گیا ہوں۔ اور وہ تم ہو۔ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں اس اظہار کے لئے میں نے ایک اچھے موقع کی تلاش شروع کر دی تھی۔ سچ بات تو یہ ہے کہ ان دنوں میرے اندر احساس کمتری غلبہ تھا۔ میرا تعلیمی پروگرام مکمل ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا اور میرے گھریلو ماحول میں مجھ پر ہونے والی حق تلفی کے باعث میری زبان گنگ ہو گئی تھی۔ تم جانتی ہو کہ تمہارے خاندان اور ہمارے خاندان کو ملانے والی ایک دور کی رشتہ داری ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ میرے اظہار کا اگر مذاق اُڑ گیا تو میں کہیں کا نہ رہوں گا۔

یہ اندیشہ تھا کہ ایسا مذاق ایک پھانس کی طرح میرے دل پر ہمیشہ قائم رہ جائے گا جس کی وجہ یہی ہماری دور کی رشتہ داری ہے۔ مضبوط ترین دوستی کی جڑوں کو اکھیڑ دیا جا سکتا ہے لیکن ذرا سی رشتہ داری جو آباء و اجداد کی دین ہے کبھی نہیں ٹوٹتی۔ ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ رشتہ داری کے ساتھ یہ پھانس بھی زندہ رہ جاتی ہے۔ اس لئے میری ہمت اپنا سر نگوں کئے بیٹھی رہی۔

میرے لئے محبت کا اظہار کرنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ تمہارے درمیان کسی رازدار کا توسط بھی نہیں تھا۔ اگر مجھے کوئی رازدار مل جاتا تو مجھے دل کے آئینہ خانوں کا حال کہیں مل جاتا جہاں تمہاری غیر موجودگی کے باوجود تمہارے عکس مسکراتے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ میری مشکل کا حل صرف یہ ہے کہ محبت کے اقرار کی پہل تمہاری طرف سے ہو جائے۔ مبہم الفاظ کے ذریعہ نہیں، افسانوں کی تعریف کے پردوں میں نہیں۔ بلکہ سیدھے سادے الفاظ کی مٹھاس میں تم مجھ سے صاف صاف کہہ دو کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔ اور محبت اس خواب کو حقیقت کا جامہ پہنانے کے لئے چاہ رہی ہے کہ میں تمہارا گھونگھٹ اٹھاؤں اور اس راہ پر تمہیں لے کر نکل جاؤں جس کا تعین مستقبل میں ہم دونوں کریں گے۔

تمہاری طرف سے محبت کے اظہار کا پھل پانے کے لئے میں نے اپنے افسانوں کی نہج بدل دی تاکہ میری یہ بدلی ہوئی نہج تمہیں اکسا سکے۔ میں نے ایسے رومانی افسانے لکھنے شروع کئے جن میں محبت کا اقرار پہلے لڑکی کی طرف سے ہوتا ہے۔ میرے افسانوں کا لڑکا احساس کمتری کا شکار ہونے لگا۔ وہ کسی دقیانوسی سماج کی لڑکیوں کی طرح گھٹنے لگا اس کی زبان میری طرح گنگ ہو گئی۔ میری طرح وہ تنہائیوں میں اپنی دعا کی قبولیت کے لئے ہاتھ اٹھانے لگا۔ جوں ہی میرے یہ افسانے شائع ہو جاتے میں موقع نکال کر ضرور تمہارے گھر آیا کرتا تھا۔ تاکہ افسانوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے ان افسانوں کی تعریف میں آئے ہوئے خطوط کا عمداً ذکر کروں۔ تم سے بات کرتے وقت کبھی مجھے تنہائی نہیں ملی۔ ورنہ مجھے یہ کہنے کی ہمت مل جاتی کہ ایک خط تم بھی مجھے لکھو۔ میرا خیال تھا کہ تمہاری تحریروں میں اپنے آپ کو تلاش کروں گا۔ اور اس خط و کتابت میں میں تمہیں جتا کر تم سے وہ گفتگو کروا لوں گا جس کے لئے میں اور شاید تم بھی صدیوں سے حیران اور منتظر ہیں۔

ایک دن اچانک تم نے کہہ دیا تھا کہ تم بھی مجھے خط لکھو گی۔ اس وقت میرا دل بہت زور سے دھڑکا تھا۔ کیونکہ تمہارا جملہ میری منزل کا نشان تھا۔ یہ جاننے کے لئے کہ تم مذاق نہیں کر رہی ہو اور اگر مذاق ہو بھی تو اسے سنجیدگی میں بدلنے کے لئے میں نے جرأت کر کے تم سے چاہا تھا کہ تم مجھ سے اس بات کا وعدہ کرو کہ تم مجھے ضرور خط لکھو گی۔

تم نے بہت سنجیدگی کے ساتھ دو بار مسلسل ہاں کہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی بڑے دلکش انداز میں ہنکاری بھری تھی جو اس بات کا سرٹیفکیٹ تھا کہ تم مذاق نہیں کر رہی ہو اور اپنا وعدہ ایفا کرو گی۔

اس واقعہ کے بعد میرے افسانے شائع ہوئے تو میں احتیاطاً تمہارے گھر نہیں گیا تھا کہ میری غیر موجودگی کے باعث خط لکھنے کا تم کو خیال آئے۔ میں بہت بے چین ہو کر سوچا کرتا تھا کہ تمہارے قلم سے میرا نام کیسے لگے گا۔ تم مجھے کون سے القاب سے مخاطب کرو گی۔ مجھے خط لکھتے وقت تمہارے چہرے پر کتنی سرخی آئے گی۔ میرے لئے جملوں کا انتخاب کرتے وقت کیا تم بھی اپنے آپ کو کھو دو گی۔؟

تمہارے نام سے میں نے اپنے آپ کو خطوط لکھے اور ان خطوط کے خود ہی بہت سے جواب لکھے۔ یہ میری دیوانگی تھی۔ یا انتظار کی شدید آگ جو مجھے جلا جلا کر اس کے اندر تمہیں پیدا کرتی رہی۔ تمہارا خط نہیں آیا لیکن میرے انتظار کی ڈور نہیں ٹوٹی۔ میری امید قائم رہی۔ چار بار سڑک پر تمہارا اور میرا آمنا سامنا ہوا تھا۔ ہر بار ہمارے مخالف تھے۔ تم پیدل کالج سے واپس آ رہی تھیں۔ اور میں آٹو رکشا کے ذریعہ اپنے کام پر جا رہا تھا۔ مخالف سمتوں میں بڑھنے والے صرف پل بھر کے لئے ہی ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں۔ اسکے بعد دوری میں دونوں طرف سے اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ چار وقت کا آمنا سامنا صرف چار ثانئے ہی دے سکا۔ یہ چار ثانئے صرف ہاتھ اٹھا کر سلام کرنے میں چلے گئے۔ ہاں میری آنکھوں نے تمہارے ہونٹوں کی مسکراہٹ اور تمہارے ہشاش بشاش چہرے کی بہت سی عمدہ تصویریں اتاری

تھیں اور میں متوازی راستوں کی تمنا میں جلتا رہا۔ سمت ایک ہو تو راستے متوازی بھی ہو سکتے ہیں۔ اور متوازی راستوں پر چلنے والے ہمراہی بھی بن سکتے ہیں۔

میرے ناموافق حالات نے مجھے مجبور کیا کہ میں گھر چھوڑ کر دوسرے شہر چلا جاؤں میں نے وہاں ملازمت کر لی۔ میرے افسانے شائع ہوتے رہے۔ میرا خواب زندہ رہا ——— میری اُمید کے تار پر رنگ برنگے تصوّرات کی جھڑی لئے تم رقص کرتی رہیں۔ اور مجھے تسلّی دیتی رہیں کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ میرے نام پڑھنے والوں کے خطوط آتے رہے۔ اس کارواں میں ایک مجنوں کی تلاش جاری رہی۔

آج ڈاکیئے نے گیارہ خطوط دیئے ہیں۔ ایک گلابی رنگ کے لفافے پر میری نظر ٹھہر گئی۔ اوپر میرا نام اور پتہ تھا۔ اور نیچے ایک کونے میں اسٹائل کے ساتھ تم نے اپنا نام لکھ دیا تھا۔ میرے دل میں بہت سے گلاب کھل گئے۔ میری خوشی بے انتہا ہو گئی میں پاگلوں کی طرح سوچنے لگا کہ آج مجھے اتنی زیادہ خوشی مل گئی ہے کہ اسے رکھنے کو میں جگہ کہاں سے لاؤں۔ میرا دل میری روح کے تہہ خانے، زمین کی کشادگی، آسمان کی وسعت اتنا بڑا ظرف نہیں رکھتے کہ مجھے ملنے والی خوشی کو میری خاطر سنبھال سکیں۔ تمہارے ہاتھ سے لکھے ہوئے میرے نام اور تمہارے نام کو بس دیکھتا رہا جیسے یہ اجنتا کے نقوش ہوں۔ جیسے یہ ایک تاج محل کی تعمیر کا خاکہ ہوں میں نے فوراً شکرانہ کی نماز پڑھی۔ اور طے کیا کہ مٹھائی منگوا کر فاتحہ دوں گا اور اڑوس پڑوس کے بچوں میں بانٹ دوں گا۔

شکرانے کی نماز پڑھنے کے بعد ٹوپی اتارے بغیر اور جائے نماز پر ہی میں نے تمہارے لفافے کی تحریر کو دوبارہ دیکھا اور وہیں بیٹھے بیٹھے میں نے لفافے کو چاک کیا۔

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ جسے میں نے خوشی سمجھ کر سمیٹا تھا وہ خوشی نہیں تھی بلکہ مواد تھا۔ آناً فاناً میری تمنا ایک رِستا ہوا زخم بن گئی، ایک ایسا کرب بن گئی جس کی کوئی انتہا نہیں، کوئی مداوا نہیں کوئی مرہم نہیں۔

گلابی لفافے میں سے تمہاری شادی کا دعوت نامہ نکلا۔ جو میرے آنسوؤں سے وضو کر کے میری بچھائی ہوئی جائے نماز پر بہت دیر سے سجدہ کر رہا ہے اور میں اپنے محل کے منہدم ہونے پر ایک سکتے میں آ کر بے سُدھ پڑا ماتم کر رہا ہوں

بزمِ خیال

(اس عنوان کے تحت دو علمی و ادبی سوالوں کے جوابات دیئے جاتے ہیں)

س ۔ کیا محبت اہلِ اللہ کی ضرورت ہے ۔ ؟

جواب: اللہ والوں کی محبت ہی سے اللہ کی یاد کا شوق پیدا ہوتا ہے ۔ ان کی صورت دیکھ کر اللہ تعالیٰ یاد آجاتے ہیں اور ان کی نورانی گفتگو سے اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہوتی ہے ۔ اہلِ اللہ کی محبت میں ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ وہ اگر کسی شخص کی طرف نظر کر لیتے ہیں تو وہ شخص باسعادت ہو جاتا ہے ۔ اقبال نے سچ کہا ہے کہ ؎

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

جو شخص نیک لوگوں سے محبت کرتا ہے ان کی نیکی کا حصہ اس کو ملتا ہے ۔

سوال: کیا کتاب خوانی سے دین کی تعلیم حاصل ہو سکتی ہے ؟

جواب: خالی کتاب خوانی کافی نہیں جب تک کسی انسانِ کامل کی صحبت میسر نہ ہو ۔ انسان تو انسان ہی سے بنتا ہے ۔ اسلامی تعلیمات کا نصب العین تو اس کے اولین معلم حضرت رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور اولین متعلم حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ اجمعین سے ملتا ہے کہ اس کا مطلب کتاب خوانی یا لکھنا پڑھنا ہونا ہرگز نہ تھا ۔ بلکہ وہ کسی مردِ کامل کے سامنے زانوئے ادب تہہ کر کے علم حاصل کرتا ہے اور کامل بنتا ہے ۔ جن باتوں کو تم سمجھ نہیں سکتے اسے اہلِ علم سے پوچھتے رہا کرو ۔ اللہ تعالیٰ نے نبیین، صدیقین، شہداء اور صالحین کو دین کی تعلیم کے لیئے ہی پیدا کیا ہے ۔

اہلِ قلم حضرات

اپنی نگارشات، صفحہ کے ایک طرف، صاف اور اچھی تحریر میں روانہ فرما کر ادارہ سے تعاون فرمائیں:

فون نمبر 525/17

ماہنامہ ذوقِ نظر حیدرآباد

جلد (۳) شمارہ (۳)

مارچ ۱۹۸۷ء

زرِ تعاون سالانہ پچاس روپے فی شمارہ پانچ روپے

عرب ممالک سے فی شمارہ ۵ ریال

ایڈیٹر پرنٹر اینڈ پبلیشر: محمد بشیر الدین بشیر وارثی • مقام طباعت: دائرہ الیکٹرک پریس چھتہ بازار

مقام اشاعت: دفتر ماہنامہ "ذوقِ نظر" ۲۱۳-۸-۲۲ چھتہ بازار حیدرآباد-۲

اس شمارے میں

حرفِ آغاز

جس طرح قومی زبان ہندی کا سنسکرت کے ساتھ گہرا رشتہ ہے اسی طرح ہر زبان کے بنیادی رشتے کسی نہ کسی قدیم زبان سے منسلک رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر اُردو کا فارسی سے، فارسی کا عربی سے اور عربی کا رشتہ کسی زمانے میں عبرانی اور سریانی زبانوں سے بہت گہرا رہا ہے۔ عربی ایک کامل زبان کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ اس پر عبور پانے کے لئے اب کسی اور زبان کا مطالعہ ضروری نہیں رہا لیکن یہی بات ہندی، اُردو اور فارسی کے متعلق نہیں کہی جا سکتی۔

آج جو اُردو کا معیار دن بدن گرتا چلا جا رہا ہے اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس کا فارسی سے رشتہ منقطع ہو چکا ہے۔ فارسی کی بنیادی معلومات کے بغیر اُردو پر عبور پانا اگر نا ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے اور آج کل کے اُردو ادبا اور شعراء کی تحریریں گواہ ہیں کہ فارسی کی مبادیات سے ناواقفیت نے انھیں اُردو میں کن مشکلات سے دوچار کر دیا ہے۔

فارسی کے جتنے افعال ہیں ان سے مشتق ہزاروں الفاظ اُردو میں صدیوں سے رائج ہیں۔ اگر ان مصادر و افعال سے کوئی نابلد ہو تو وہ اُردو کے ہزارہا الفاظ کی ساخت سے ناواقف ہی رہے گا اور اس سے قدم قدم پر غلطیوں کا احتمال ہے۔

اُردو میں قبر کھودنے والے کو گورکن کہتے ہیں یہ دو لفظوں سے مرکب ہے۔ ایک "گور" اور دوسرا "کَن"۔ اسی طرح کسی جماعت کے متحرک ممبروں کو "کارکُن" کہتے ہیں۔ یہ بھی دو لفظوں سے مرکب ہے۔ ایک "کار" اور دوسرا "کُن"۔ مگر آج کے اُردو داں حضرات ان دونوں لفظوں کو ایک ہی ہجے سے ادا کرتے ہیں۔ یعنی ـــ گورکُن اور کارکَن ـــ کَن اور کُن ـ فارسی کے دو مختلف فعلوں ـــ کندن (کھودنا) اور کردن (کرنا) سے بنے ہیں۔ ان دونوں سے جو امر بنے ہیں ـــ کَن اور کُن ـــ ان کا تلفظ مختلف ہے۔ اور ان کی ادائیگی میں ذرا سی بھی غلطی مطلب کو گویا بدل دیتی ہے یا پھر لفظ کو مہمل کر دیتی ہے۔ یہ تو صرف ایک مثال پیش کی گئی ہے ورنہ فارسی سے ناواقفیت نے کئی ادیبوں اور شاعروں کے ہاں ایسی ایسی مضحکہ خیز ترکیبوں کو جنم دیا ہے کہ عقل انگشت بدنداں رہ جاتی ہے۔

معلوم ہوا کہ فارسی سے دور رہ کر اُردو زیادہ دن زندہ نہ رہ سکے گی۔ موجودہ دو تین نسلوں کے خاتمے کے بعد یہ زبان رفتہ رفتہ غلط روی کا شکار ہو کر پہلے تو ہندوستان کے مختلف شہروں میں مختلف انداز کی بولی بن کر رہ جائیگی اور یہ بولی بھی رفتہ رفتہ ہندی میں ضم ہو جائیگی یا پھر اس کا چلن ختم ہو جائیگا۔ اُردو رسم الخط میں جو بھیانک غلطیاں آج دیکھنے میں آ رہی ہیں وہ بڑھتے بڑھتے ساری زبان کو مسخ کر کے رہیں گی اور وہ دن زیادہ دور نہیں جب ان غلطیوں کی بہتات سے گھبرا کر لوگ دیوناگری رسم الخط اختیار کر لیں گے۔

آخر اس کا علاج کیا کیا جائے؟ اس کا صرف ایک ہی علاج ہے اور وہ یہ ہے کہ جن مدرسوں اور اسکولوں میں اردو کی تعلیم ہوتی ہے وہاں اُردو کے نصاب ہی میں فارسی کی مبادیات کو شریک کر دیا جائے۔ اس طرح اگر ۱۰۰ نمبر کا پرچہ ہو تو ستر فیصد نمبر اردو کیلئے اور تیس فیصد فارسی کے لئے مختص کر دیئے جائیں اور ایسا نصاب بنایا جائے کہ معلم اور طالب علم دونوں کو فارسی کی شُد بُد ہو جائے اس طرح ہو سکتا ہے کہ آئندہ پندرہ سال میں اُردو زبان نہ صرف صحت مند اور تندرست ہو جائے بلکہ اس کی زوال پذیری ختم ہو کر یہ پھر ترقی کی راہ پر گامزن ہو جائے۔

القرآن

مصنف
احمد دیدات

مترجم
علی احمد جلیلی

حضرت محمد صلعم کی پہلی وحی

سورہ (۹۶) اقرا۔ پڑھو یا علق (منجمد خون کا لوتھڑا)

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ — (اے محمد صلعم) آپ پر جو قرآن
الَّذِیْ خَلَقَ ۞ — نازل ہوا کرے گا۔ اپنے رب
خَلَقَ الْاِنْسَانَ — کا نام لے کر پڑھا کیجئے۔
مِنْ عَلَقٍ ۞ اِقْرَاْ — جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے
وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۞ — سے پیدا کیجئے آپ قرآن پڑھا
الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ — کیجئے آپ کا رب بڑا کریم ہے
عَلَّمَ الْاِنْسَانَ — جس نے قلم سے تعلیم دی
مَا لَمْ — انسان کو ان چیزوں کی تعلیم دی
یَعْلَمْ ۞ — جس کو وہ نہیں جانتا تھا۔

یہ سورۃ العلق کی پہلی پانچ آیتیں ہیں جواب قرآن پاک کی (۹۶)ویں سورۃ ہے اور جنہیں جبرئیل نے اپنی پہلی آمد پر پاک پیغمبر کو پڑھائی تھیں۔

دوسری وحی

(دوسری آیت ایک تہمت کے جواب میں ہے)

سورہ (۶۸) —— قلم یا نون

نٓ وَالْقَلَمِ — ن۔ قسم ہے قلم کی اور ان
وَمَا یَسْطُرُوْنَ ۞ — (فرشتوں) کے لکھنے کی
مَا اَنْتَ بِنِعْمَةِ — کہ آپ اپنے رب کے فضل
رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ۞ — سے مجنون نہیں ہیں۔
وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا — اور بے شک آپ کے لئے ایسا
غَیْرَ مَمْنُوْنٍ ۞ — ہی اجر ہے جو (کبھی ختم ہونے والا
نہیں ہے۔
وَاِنَّكَ لَعَلٰی خُلُقٍ — اور بے شک آپ اخلاق حسنہ
عَظِیْمٍ ۞ — کے اعلیٰ معیار پر ہیں۔

(قرآن پاک ۶۸: ۱-۴)

انسانوں میں سب سے زیادہ سلیم العقل اور دانشمند تھے۔ لیکن انسان کی یہ عادت ہے کہ وہ سچائی کو جھوٹ اور ہوشمندی کو دیوانگی کہتا ہے۔ ان کے عظیم پیش رو حضرت عیسیٰ اپنے دشمنوں کو ایسے بہتانوں سے بری نہ تھے۔ مسیحی مذہب کی کتابوں میں ذیل کی یہ تحریر ملتی ہے۔

"اور بہت سے لوگوں نے کہا۔ اس کے قبضے میں ایک آسیب ہے۔ وہ دیوانہ ہے تم اُسے کیوں سنتے ہو؟"

(جان ۱۰: ۲۰)

خود ان کے قریب دوستی بعض اوقات یہ سمجھ بیٹھے کہ حضرت عیسیٰ عقل و ہوش سے محروم ہیں، اور جب ان کے دوستوں نے ایسا سنا تو وہ ان کو پکڑنے کے لئے نکل پڑے کیونکہ انھوں نے کہا کہ وہ (حضرت مسیح) آپے میں نہیں ہیں۔ اور وہ یہودی عالم جو یروشلم سے آئے بولے کہ ان مسیح کے قبضے میں شیطان ہے بس کی مدد سے [illegible]

کو بھگاتے ہیں۔

یہ اور دوسرے معجزاتی مظاہروں کے باوجود یہ واقعہ ہے کہ
"ان کی برادری والوں تک نے بھی ان کی بات پر یقین نہیں کیا"
(جان ۷ : ۵) خوش قسمتی سے حضرت محمد صلعم کی صورت مختلف
تھی۔ ان کے پہلے اور آخری اسلام قبول کرنے والوں میں
ان کے قریبی لوگ اور ان کے چاہنے والے ہی زیادہ تھے
جو آپ کو اچھی طرح پہچانتے تھے۔

یہ سب مانتے ہیں کہ دوسری وحی ایک بہتان کا جواب
تھی۔ (دیکھیے شکل ۲)

تب تیسری بار جب جبرئیلؑ آئے تو آنحضرت صلعم پہ
اَلْمُزَّمِّل کی وہ پہلی دس آیتیں نازل ہوئیں جو قرآن
پاک کی ۷۳ ویں سورۃ ہے۔ (دیکھیے شکل ۳۔ یہاں میں
آپ کی توجہ صرف پانچویں آیت کی طرف مبذول کرواتا ہوں
جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

جبرئیل کی تیسری بار آمد

سورۃ (۷۳)

یٰٓاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا ۙ نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِیْلًا ۙ اَوْ زِدْ عَلَیْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا ؕ	مزمل یا کپڑوں میں لپٹے ہوئے اے اپنے کو کپڑوں میں لپٹنے والے۔ رات کو (نماز میں) کھڑے رہا کرو۔ مگر تھوڑی رات یعنی نصف رات یا اس سے کسی قدر کم یا اس سے کچھ زیادہ اور قرآن کو خوب صاف صاف پڑھا کرو۔
اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا ۝	ہم تم پر ایک بھاری کلام کا بوجھ ڈالنے کو ہیں۔

اللہ کے بندے حضرت محمد صلعم کو یوں تو جو کچھ عطا ہوا
تھا، اچھا نفیس، اہم اور گراں قدر تھا۔ لیکن وحی کے شانوں کے
پاس اپنے رسول کے لئے اور بہت کچھ غیر معمولی چیزیں تھیں۔
جبرئیل علیہ السلام جب چوتھی بار آئے تو ہمارے نبی کیلئے
نصف سورۂ مُدَّثِّر (پہلی تیس آیتیں) لائے، جو قرآن
مجید کی (۷۴) ویں سورۃ ہے۔ (دیکھیے شکل ۴)
اس وقت تک حضرت محمد صلعم پر وقتِ واحد میں جتنی آیتیں
وحی کے ذریعہ نازل ہوئی تھیں۔ یہ ان میں سب سے زیادہ تھیں۔
انھیں جیسے اس بات کا اندازہ تھا کہ پہلی وحی جو پانچ آیتوں
سے شروع ہوئی تھی۔ بڑھتے بڑھتے ان کی تعداد (۳۰)
تک پہنچ جائے گی۔ اگر وحی نازل ہونے کا سلسلہ اسی
تسلسل میں سورۂ مدثر کی مزید ۲۶ آیتوں کے نزول تک
جاری رہتا۔ تو زیرِ بحث کبھی کے تکمیل پا چکی ہوتی لیکن
جبرئیل اس سورۃ مدثر کی (۷۴) کی تیسویں آیت پر ٹھہر
جاتے ہیں۔

سورۂ رحمٰن

اے فنا انجام انساں کب تجھے ہوش آئے گا
تیرگی میں ٹھوکریں آخر کہاں تک کھائے گا
اس تمرد کی روش سے بھی کبھی شرمائے گا
کیا کرے گا سامنے سے جب حجاب اٹھ جائے گا
کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

یہ سحر کا حُسن، یہ سیارگان اور یہ فضا
یہ معطر باغ، سبزہ، یہ کلیاں دلربا
یہ بیاباں، یہ کھلے میدان، یہ ٹھنڈی ہوا
سوچ تو کیا کیا کیا ہے تجھ کو قدرت نے عطا
کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

خلد میں حوریں تیری مشتاق ہیں آنکھیں اٹھا
نیچی نظریں جن کا زیور، جن کی آرائش حیا
جن وانساں میں کسی نے بھی نہیں جن کو چھوا
جن کی باتیں عطر میں ڈوبی ہوئی جیسے صبا
کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

اپنے مرکز سے نہ چل منہ پھیر کر بہرِ خدا
بھولتا ہے کوئی اپنی انتہا اور ابتدا
یاد ہے وہ دور بھی تجھ کو جب تو خاک تھا
کس نے اپنی سانس سے تجھ کو منور کر دیا
کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

سبز گہرے رنگ کی بیلیں چڑھی ہیں جا بجا
نرم شاخیں جھومتی ہیں، رقص کرتی ہے صبا
پھل وہ شاخوں میں لگے ہیں دل فریب و خوش نما
جن کا ہر ریشہ ہے قند و شہد میں ڈوبا ہوا
کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

پھول میں خوشبو بھری جنگل کی بوٹی میں دوا
بحر سے موتی نکالے صاف روشن خوش نما
آگ سے شعلہ نکالا، ابر سے آبِ صفا
کس سے ہو سکتا ہے اس کی بخششوں کا حق ادا
کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

ہر نفس طوفان ہے، ہر سانس ہے اک زلزلہ
موت کی جانب رواں ہے زندگی کا قافلہ
مضطرب ہر چیز ہے جنبش میں ہے ارض و سما
ان میں قائم ہے تو تیرے رب کے چہرے کی ضیا
کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

صبح کے شفاف تاروں سے برستی ہے ضیا
شام کو رنگِ شفق کرتا ہے اک محشر بپا
چودھویں کے چاند سے بہتا ہے دریا نور کا
جھوم کر برسات میں اٹھی ہے متوالی گھٹا
کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

جوشؔ ملیح آبادی

مولف محمد عبدالمجید صدیقی
لاہور

سیرت النبیؐ بعد از وصال النبیؐ

سرزمینِ ہند پر جن اولیائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا ہے ان میں سب سے پہلے ولی حضرت داتا گنج بخش علی بن عثمان ہجویری رحمۃ اللہ علیہ ہیں جو سلطان محمود غزنوی کے دور میں لاہور تشریف لائے اور یہیں قیام فرمایا۔ ہزاروں لوگ آپ کے دست مبارک و حق پرست پر بیعت کر کے مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اور جنھوں نے تصوف پر پہلی کتاب "کشف المحجوب" تحریر فرمائی۔ یہ کتاب تصوف پر ایک بنیادی اور جامع کتاب ہے۔ جب خواجہ معین الدین چشتیؒ ہندوستان تشریف لائے تو انہوں نے آپ کے مزار مبارک پر چلہ کشی کی بعد فراغتِ چلہ کشی جو شعر آپ نے ان بزرگ کے تعلق سے فرمایا وہ یہ ہے۔ (اس سے گنج بخشؒ کی شانِ ولایت کا اظہار ہوتا ہے جو آج بھی مقام چلہ کشی کی دیوار پر آستانِ حضرتِ ممدوح تحریر ہے

گنج بخش فیضِ عالم مظہر ذات خدا
ناقصاں را پیر کامل کاملاں را راہنما

حضرت داتا گنج بخشؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک روز حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خواب میں دیکھا اور عرض کیا "یا رسول اللہ! مجھے کوئی وصیت فرمائیے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا" احبس حواسک" (اپنے حواس کو اپنے قابو میں رکھ)

اور حقیقت میں حواس خمسہ یعنی دیکھنا، سننا، چھونا، بولنا، سونگھنا) کو احکامِ الٰہی کے تابع رکھنا ہی سب سے بڑا اور مکمل مجاہدہ ہے۔ جس سے انسان صحیح معنوں میں مومن اور متقی بنتا ہے، تمام قسم کے علوم اور احساسات ان ہی پانچ دروازوں سے حاصل ہوتے ہیں اور انسان کی معلومات میں کوئی ایسی چیز نہیں جس کا حصول ان پانچ حواس کے ذریعہ نہ ہوتا ہو۔
(کشف المحجوب از حضرت داتا گنج بخشؒ اردو ترجمہ از عبدالرحمٰن طارق بی۔ اے صفحہ ۲۸۱)

حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ اوشی (ترکستان) میں ۵۸۲ھ میں پیدا ہوئے اور بعہد التمش دہلی میں ۱۴ ربیع الاول ۶۳۳ھ میں وصال فرمایا آپ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے اجل خلیفہ ہیں۔

آپ فرماتے ہیں کہ مجھ کو ابتدا میں قرآن مجید یاد نہ ہوتا تھا اس لئے متردد تھا، ایک رات میں نے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خواب میں دیکھا میں نے اپنی آنکھیں آپؐ کے پائے مبارک پر رکھ دیں اور رونا شروع کر دیا اور عرض کیا کہ آپ مجھ کو حافظہ عطا فرما دیں تاکہ میں قرآن مجید یاد کر سکوں۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ "سورۂ یوسف" کی تلاوت کیا کر" خدا تعالیٰ چاہے

تو تجھے قرآن یاد ہو جائے گا. جب میں بیدار ہوا اور سورۂ یوسف کی تلاوت اختیار کی تو خداوندِ قدوس نے اس آخری عمر میں مجھ کو قرآن مجید کا حافظ کر دیا. پھر فرمایا جو کوئی قرآن مجید یاد کرنا چاہئے اُسے چاہیئے کہ روزآنہ پابندی سے سورۂ یوسف پڑھا کرے۔

(بزمِ صوفیہ از سید صباح الدین عبدالرحمٰن ؒ)
(اُردو ترجمہ کتاب "فوائد السالکین" یعنی ملفوظات حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ جمع کردہ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ صفحہ ۲۱ تا ۲۲)

محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاءؒ جن کا اصلی نام سید محمد تھا بدایوں میں پیدا ہوئے اور ۱۷ / ربیع الثانی ۷۲۵ھ مطابق ۳ / اپریل ۱۳۲۵ء بروز چہارشنبہ. آپ کی تاریخ وصال ہے۔ غیاث پور (دہلی) میں روضۂ مبارک ہے جہاں زائرین کا ہجوم رہتا ہے. آپ کے مرشد گرامی حضرت بابا فرید گنج شکرؒ نے جب آپ کو خلعتِ خلافت عطا فرمائی تو "نظام الدین اولیاء" کہہ کر خطاب فرمایا تھا۔

حضرتؒ کی محبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عالم تھا کہ وصال سے چند روز قبل خواب میں دیکھا کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں "نظام! جلد آ، تجھ سے ملنے کا بہت اشتیاق ہے۔

اس خواب کے بعد سفرِ آخرت کے لئے بے چین ہو گئے" وصال سے ۴۰ روز قبل سے کھانا بالکل ترک کر دیا۔ اب آنکھوں سے ہر وقت آنسو جاری رہتے تھے. وصال کے روز لنگر کو ملکیت کے تمام چیزیں غربا و مساکین میں تقسیم کروا دیں تاکہ خدا تعالیٰ کے یہاں کسی چیز کا مواخذہ نہ ہو۔

(نفحات اولیاءؒ صفحہ ۳۱۲) (بزم صوفیہ صـ۲۲۳)

ایک مرتبہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پُر فتوح کو ثواب پہنچانے کے لئے عمدہ کھانے پکوائے. تیاری کے بعد خدام نے کھانا تقسیم کرنا چاہا. آپؒ نے فرمایا ٹھہر جاؤ۔ کچھ دیر بعد پھر یہی جواب ملا. کسی خدام نے انتظار کی وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ میں کیسے اجازت دیتا کہ اس وقت میرے بھائی حضرت علی احمد صابرؒ نے بھی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پُر فتوح کو ثواب کے لئے پکھنے ہوئے چنے تقسیم کئے تھے تو میں نے دیکھا کہ آپؐ ہمہ تن اُدھر متوجہ ہیں۔ پس ایسی حالت میں میں نے اپنا کھانا تقسیم کرنا پسند نہ کیا. بلکہ یہ چاہا کہ ذرا ادھر متوجہ ہوں تو پھر کھانا تقسیم کرواؤں۔

تو دیکھئے! آپؐ کو حضرت صابرؒ کے چنے کس قدر محبوب تھے کہ ہمہ تن اس کی طرف متوجہ تھے. حالانکہ حضرت سلطان جیؒ کے کھانے بظاہر ان سے بہت بڑھے ہوئے تھے. سچ ہے وہاں تو خلوص دیکھا جاتا ہے۔ اگرچہ ہدیہ قلیل ہو مگر خلوص زیادہ ہو تو ثواب زیادہ ملے گا اور اگر ہدیہ زیادہ ہو مگر خلوص کم ہو تو ثواب کم ملے گا اور اگر خلوص اور ہدیہ دونوں زیادہ ہوں تو نورٌ علی نور۔

(مواعظ اشرفیہ جلد نمبر ۵ از حکیم الامت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ مرتبہ مفتی عبدالرحمٰن خاں مکتبہ اشرف المعارف، ملتان شہر (پاکستان)، صـ۳۴۹ تا ۳۵۱)

معراج نامہ

سیّد صادق علی خاں عابدؔ قادری

عرش پر آرہے ہیں حبیبِ خداؐ　　　دھوم ہے عرش پر آج صلِّ علیٰ
خوابِ راحت میں تھے رات میں مصطفیٰؐ　　　آکے جبرئیلؑ نے یہ ادب سے کہا
"چلئے چلئے سوئے عرش یا مصطفیٰؐ!　　　منتظر ہے خدا عرش پر آپؐ کا"
پھر تو سرکار لبیک کہہ کر اٹھے　　　سب سے پہلے تو بیت المقدس آگئے
اِس جگہ انبیاءؑ کی امامت کئے　　　مقتدی ان کے سب انبیاءؑ ہوگئے
لیکے جبرئیلؑ انھیں پھر روانہ ہوئے　　　سدرۃ المنتہیٰ پر بس آکر رُکے
سدرۃ المنتہیٰ پر جو پہنچے نبیؐ　　　با ادب ہو کے جبرئیلؑ نے عرض کی
"یا رسولِ خداؐ! میری حد ہے یہی　　　آگے بڑھنے کی جرأت نہیں یا نبیؐ!
آرزو، رہبری کی ادھوری رہی　　　خوں رلاتی رہے گی یہ شرمندگی"
پھر تو تنہا روانہ ہوئے مصطفیٰؐ　　　اس سفر میں تھا عزمِ سفر رہنما
نام لیکر خدا کا سفر جو کیا　　　فاصلہ بھی تو دم بھر میں طے ہوگیا
قابَ قوسین تک آگئے مصطفیٰؐ　　　مرحبا، مرحبا، مرحبا، مرحبا
حور و غلماں ادب سے کھڑے تھے یہاں　　　تھی فضا لامکاں کی بھی عنبر فشاں
اک فضائے محبت تھی ہر سو یہاں　　　عرشِ اعظم پہ تھا دیدنی اِک سماں
آج خوشیوں میں ڈوبے تھے کون و مکاں　　　ہیں نبیؐ مہماں اور خدا میزباں
تاجدارِ حرمؐ کو یہ عزت ملی　　　عرشِ اعظم پہ آنے کی دعوت ملی
کب جہاں میں کسے ایسی رفعت ملی　　　کس نبی کو بھلا یہ سعادت ملی
کب خدا سے کسے اتنی قربت ملی　　　حق تعالیٰ کی کس کو یہ چاہت ملی
آج معراج کی شب یہ عقدہ کھلا　　　حق بھی بیچین تھا اُنؐ کا دیدار کا

عرش پر خیر مقدم کچھ ایسا ہوا — اُنؐ کی عظمت کا اندازہ سب کو ہوا
شبِ معراج دیکھا عجب معجزہ — ایک پل میں کوئی عرش پر آگیا
"التحیات" کی آرہی تھی صدا — "السلامُ علیک" کہہ رہا تھا خدا
یوں سلامِ خدا، مصطفیٰؐ نے لیا — "السلامُ علینا" جواباً کہا
پھر خدا سے ملے یوں حبیبِ خداؐ — آئینہ کے مقابل ہو جیوں آئینہ
عبد و معبود میں پھر ہوئی گفتگو — تھے خدا کے، رسولِ خداؐ روبرو
کیا بتائیں کہ کیسی تھی یہ گفتگو — اور معراج کی بڑھ گئی آبرو
محوِ حیرت تھی موسیٰؑ کی بھی جستجو — جن کے دل کی نہ پوری ہوئی آرزو
سیرِ افلاک کی بھی کرائی گئی — اِن کو دوزخ و جنّت دکھائی گئی
وجہِ تخلیقِ عالم بتائی گئی — ابنِ آدمؑ کی عظمت دکھائی گئی
کیسی ہو گی قیامت بتائی گئی — شانِ رحمت بھی اُس کی جتائی گئی
دفعتاً یادِ اُمّت کی کیا آگئی — یادِ اُمّت کی آقاؐ کو تڑپا گئی
رحمتِ حق بھی تو جوش میں آگئی — رحمتوں کی گھٹا ہر طرف چھا گئی
میرے آقاؐ کے دل کو جو بھلا گئی — ساری اُمت یہ اب مغفرت پا گئی
پھر ملی خلعتِ فاخرہ آپؐ کو — اور نمازوں کا تحفہ ملا آپؐ کو
یا نبیؐ! کیا کہوں، کیا ملا آپؐ کو — حق تعالیٰ نے سب کچھ دیا آپؐ کو
ہو مبارک حبیبِ خداؐ! آپؐ کو — آج کی شب ملا مدعا آپؐ کو
حق سے مل کر ملا جب سکونِ دلی — واپسی کی بھی تیاری ہونے لگی
عرش سے مصطفیٰؐ کی سواری چلی — چل کے سیدھی یہ "بیت الشرف" پر رکی
فرش سے عرش تک جا کے آئے نبیؐ — اور زنجیرِ در ہل رہی تھی ابھی
جس کی خاطر ہوا عرش پر اہتمام — خیر مقدم کیا جس کا ربِ انام
شخصیت جس کی تھی واجب الاحترام — جس پہ خالق نے بھیجے درود و سلام

عرش تک جا کے آیا جو عالی مقام
اُسؐ کی خدمت میں عابدؔ! ہمارا سلام

منقبت حضرت سیدنا صدیق اکبرؓ

رسولؐ پاک سے کتنی تھی الفتِ صدیقؓ
کہ خود دلیل مکمل ہے تربتِ صدیقؓ

نبیؐ کے بعد ہوئے پہلے رہنما بے شک
یہ صورتیں ہیں سلامت بہ صورتِ صدیقؓ

رفیقِ غار بھی دمسازِ دین و دنیا بھی
نہیں ہے کوئی جوابِ رفاقتِ صدیقؓ

جنھیں وسیلے سے نسبت نہیں وہ کیا جانیں
سمجھنے والے سمجھتے ہیں نسبتِ صدیقؓ

بغیر قربِ نبیؐ قربِ حق ہے ناممکن
نبیؐ کے قرب کو لازم ہے قربتِ صدیقؓ

نہیں ہے کس کو محبت رسولؐ سے لیکن
نصیب اپنی جگہ ہے محبتِ صدیقؓ

داؤد نصیب

منقبت

سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراؓ

ورائے فہمِ انساں سیرتِ خاتونِ جنت ہے
وہ عالم میں مسلّم عظمتِ خاتونِ جنت ہے

نبیؐ ابّا ہیں علیؓ میاں، حسنؑ ان کے حسینؑ ان کے
پسندِ حق تعالیٰ رفعتِ خاتونِ جنت ہے

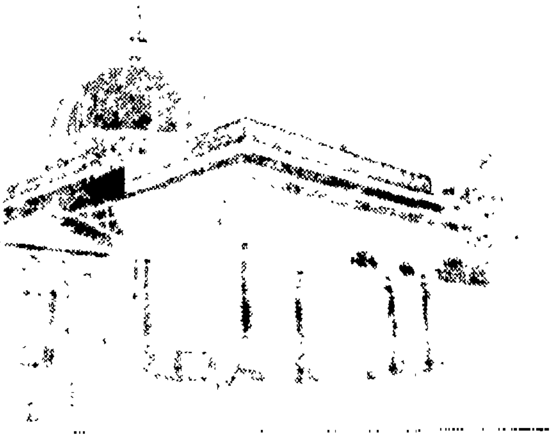
نمونہ ہے خواتیں کے لئے کردار احمدؐ کا
نبیؐ سے ملتی جلتی فطرتِ خاتونِ جنت ہے

نہ لوٹا ہاتھ خالی کوئی سائل آپ کے در سے
سخاوت ہی سخاوت عادتِ خاتونِ جنت ہے

انہیں کے لاڈلوں سے نور ملتا ہے زمانے کو
جہاں میں کار فرما نسبتِ خاتونِ جنت ہے

بشیرِ وارثی ابنِ علیؑ سے فیض پاتا ہے
مقدر سے غلام عترتِ خاتونِ جنت ہے

بشیر وارثی



روضۂ حضرت خواجۂ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ

زائرینِ اجمیر شریف سے گذارش

حیدرآباد و بیرونِ حیدرآباد سے زیارت کیلئے اجمیر شریف جانے والوں کو توجہ دلائی جاتی ہے کہ اجمیر شریف میں حیدرآباد ہاؤز کے نام سے ایک قیام گاہ کا انتظام کیا گیا ہے جہاں ہر قسم کی سہولت ہے۔ سید مہتاب احمد نیازی و سید افتخار احمد نیازی و سید فروغ احمد نیازی اس قیام گاہ کے بہترین منتظمین میں سے ہیں اور آنے والے زائرین کا اچھی طرح سے خیال فرماتے ہیں اور جو لوگ قیام کے ساتھ طعام کی خواہش کرتے ہیں۔ ماشاء اللہ اس کا بھی انتظام ہو جاتا ہے۔ اگر آپ جانا چاہیں تو جانے سے قبل مندرجۂ ذیل پتہ پر اطلاع دیں:

سید مہتاب احمد چشتی نیازی

حیدرآباد ہاؤز

محلہ چاہ ارہٹ۔ پوسٹ بکس ۱۲۵ اجمیر شریف (انڈیا)

المشتہر:

حاجی محمد عثمان میاں حیدرآبادی۔ ایس، ایم، قربان علی جنرل مرچنٹ، سدی عنبر بازار حیدرآباد

نوٹ: اگر اطلاع نہ دے سکیں تو ریلوے اسٹیشن اجمیر شریف پہ پتہ دریافت کریں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

منقبت خواجۂ خواجگان غریب نوازؒ

خدائی تم پہ ہے قربان آج بھی خواجہؒ ۔۔۔ ملی ہے تم کو عجب شان خواجگی خواجہؒ
کرم کا کون نہیں تم سے ملتجی خواجہؒ ۔۔۔ تمہارے سامنے ہے سب کی زندگی خواجہؒ
غم جہاں نہ غم دامن تہی خواجہؒ ۔۔۔ تمہارے ہوتے ہوئے ہم کو کیا کمی خواجہؒ
دلوں کا کعبہ نہ ہو کیوں تیری گلی خواجہؒ ۔۔۔ یہاں سنورتی ہے قسمت ہر ایک کی خواجہؒ
قدم دریغ نہ رکھو دلوں کی محفل سے ۔۔۔ کہ یہ چراغ ہیں صدیوں کی روشنی خواجہؒ
نہ جانے شان تری خواجۂ جہاں کیا ہے ۔۔۔ تیری نظر نے بنائے ہیں کتنے ہی خواجہؒ
اس آستاں سے زمانوں نے جھولیاں بھر لیں ۔۔۔ تیری عطا میں نہ آئی مگر کمی خواجہؒ
شعاع نورِ ازل ہے تری نظر کیا ہے ۔۔۔ کہ جس پہ پڑ گئی سب کچھ بنا گئی خواجہؒ
کرم کی آس پہ دن عمر کے گزرتے ہیں ۔۔۔ ترا کرم ہے کروڑوں کی زندگی خواجہؒ
نہاں ہے نورِ نبیؐ خواجگی کے پردے میں ۔۔۔ بہارِ حسنِ ازل کی ہیں سنجری خواجہؒ

نگاہِ شوقؔ کو برسوں ہوئے قدم دیکھے
حیات بن گئی دیدار تشنگی خواجہؒ

خواجہ شوقؔ

حافظ مقبول احمد

خواجۂ خواجگان

سلطان الہند غریب نواز معین الدینؒ

ہندوستان میں اسلام کی ضیا پاشیاں خلافتِ راشدہ کے زمانے میں شروع ہوگئی تھیں۔ حضرت سیدنا ذوالنورین حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد میں جناب حکیم جبلۃ العدی، حضرت سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہ کے عہد میں جناب حارث بن مرۃ، جناب معاویہ کے زمانے میں امیر مہلب بن ابی صفرہ، تبلیغ اسلام کے لئے ہندوستان آئے۔ علاوہ ازیں ۸۵ ہجری میں ولید بن عبدالملک نے دولہا ائے راجہ اجمیر کے یہاں روشن علی کو اپنا سفیر بنا کر بھیجا۔ ۹۲ ہجری میں فاتح اعظم محمد بن قاسم عماد الدین ثقفی ہندوستان آئے۔ اس کے بعد کے زمانے کے لئے مورخین کی رائے ہے کہ اولیاء اللہ ہندوستان آتے رہے اور یہاں تبلیغِ اسلام کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ جاری رہا۔ چنانچہ ۲۹۵ھ میں حضرت سیدنا امام محمد اسمٰعیل بخاری اور ۴۱۱ ہجری میں حضرت خواجہ ابو محمد چشتی کی ہندوستان میں تشریف آوری بیان کی جاتی ہے۔ بعض تاریخی دستاویز شاہد ہیں کہ حضرت خواجہ زندانی بھی ہندوستان میں تشریف لائے تھے اور قنوج میں آپ کا مزار مبارک بھی موجود ہے۔ اس کے بعد حضرت سیدنا مخدوم داتا گنج بخش علی ہجویریؒ ہندوستان تشریف لائے اور ۴۲۵ ہجری میں لاہور میں وصال فرمایا۔ بدایوں میں بھی بہت سے شہدائے جلیل القدر کے مزارات موجود ہیں۔ جو ۱۲۰۹ ہجری کے معرکوں میں شہید ہوئے۔ اس کے بعد ۵۸۸ھ میں حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت غیبی کی تعمیل میں سلطان الہند غریب نواز معین الملت والدین حضرت خواجہ معین الدین چشتی سجزی رحمۃ اللہ علیہ نے ہندوستان میں قدم رنجہ فرمایا اور اسلام کی شمع روشن کی اور ایمان کے چراغ فروزاں کئے۔ سبحان اللہ!!! (مرتب)

چراغ چشتیاں

آفتاب چشتیاں حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے والد بزرگوار سیدنا حضرت امام حسینؓ کی اولاد میں سے تھے اور والدہ محترمہ سیدنا حضرت امام حسن کی اولاد میں سے تھیں، حضرت غوث اعظمؓ حضرت خواجہ کے ماموں تھے، گویا خاندانی عظمت و شرافت اور وجاہت حضرت خواجہؒ کو ورثہ میں ملی تھی۔

حضرت خواجہ سرزمین سجز میں ۵۳۰ ہجری میں پیدا ہوئے سجز علاقہ سیستان (خراسان) کے جنوب میں واقع ہے۔ بعض کتب میں اصفہان کو حضرت خواجہ کا مولد لکھا ہے۔ حضرت خواجہ کا اسمِ مبارک معین الدین ہے۔ والدین حسن بھی پکارتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت خواجہ کو وہ بزرگی عطا فرمائی جو گروہ اولیاء کرام میں چند ایک کو ہی عطا ہوئی ہے۔ بعد وصال (۶۳۳ھ) حضرت خواجہ کی پیشانی مبارک پر ھٰذا حبیب اللہ کا مبارک کلمہ بھی لکھا دیکھا گیا جب کہ بارگاہِ رسالتماب سے "قطب مشائخ بحر و بر" کا لقب عطا ہوا۔ اور مخلوق نے بھی

حضرت خواجہؒ کو مختلف القابات سے یاد کیا ہے۔ جن میں سُلطان الہند، غریب نواز، ولی الہند خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ حضرت خواجہؒ کے سوا یہ عظیم القابات اب تک کسی دوسرے بزرگ کو نہیں دیئے گئے۔

چشتی کا لقب حضرت خواجہ ابو اِسحاق شامیؒ سے مروّج ہوا ہے۔ کہتے ہیں جب یہ بزرگ حضرت خواجہ ممشاد علی دینوریؒ کے پاس بیعت کے لئے حاضر ہوئے تو حضرت پیر و مرشد نے نام پوچھا۔ اِن کے جواب کے بعد فرمایا آج سے آپؒ ابو اسحاق چشتیؒ ہیں، جو لوگ آپ سے سلسلہ ارادت قائم کریں گے وہ بھی چشتی کہلائیں گے۔ چشت ہرات سے تیس کوس ہے، اور آج کل اس کا نام خواقلان ہے۔ حضرت ابو اسحاقؒ مرشد کے فرمان پر چشت میں ہی تشریف لائے اور رشد و حیات میں مصروف ہوئے۔ آپؒ کے سلسلہ کے بزرگان میں سے حضرت خواجہ ابو احمد چشتیؒ، حضرت خواجہ محمد چشتیؒ، حضرت خواجہ ابو یوسف چشتیؒ، حضرت خواجہ مودود چشتیؒ مشہور بزرگ گزرے ہیں، جو چشت میں رہے اور وہیں مدفون ہوئے۔ یہ سب کے سب حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے پیرانِ عظام ہیں۔ حضرت خواجہ غریب نواز بھی چشتی کہلائے ہندوستان میں حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے جانشین بھی چشتی کہلاتے ہیں۔ ہندوستان میں یہ سلسلۂ عالیہ حضرت خواجہ غریب نواز سے چلا ہے۔

جائے عبرت

حضرت خواجہ غریب نوازؒ نے جب ہوش سنبھالا تو سنجر سے خراسان تشریف لائے سمرقند و بخارا بھی گئے [illegible] کی حفظ کیا۔ [illegible] میں حضرتؒ بیس سال کی عمر تک [illegible] میں مصروف رہے۔ اس کے بعد ظاہری علوم حاصل کرنے کے لئے عراق گئے۔ ہارون پہنچے اور بغداد شریف بھی آئے جہاں حضرت غوث الاعظمؒ کی خدمت میں حاضری دی۔ غوث پاکؒ نے اس نوجوانی کے عالم میں آپؒ کی باطنی ترقی کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ یہ مرد مقتضائے روزگار ہے۔ بہت سے لوگ اس سے منزلِ مقصود کو پہنچیں گے۔ حضرت خواجہؒ نے ہارون پہنچ کر حضرت خواجہ عثمان ہارونیؒ کے ہاتھ پر بیعت کی اور اڑھائی سال تک اُن کی خدمت میں رہ کر خرقۂ خلافت حاصل کیا، حضرت خواجہؒ کا سلسلۂ بیعت پندرہ واسطوں میں جدِّ اعلیٰ حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ سے جا ملتا ہے۔

ہارون سے حضرت خواجہؒ بغداد شریف آئے، حضرت خواجہ شہاب الدین سہروردیؒ سے ملاقات فرمائی اور وہاں سے شام کا سفر اختیار فرمایا۔ اِس سفر کے دوران ایک بزرگ احمد محمد الواحدیؒ غزنوی سے اپنی ملاقات کا حال تحریر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ یہ بزرگ شام کے نزدیک ایک غار میں رہتے تھے۔ بہت لاغر تھے، دو شیر ان کے سامنے کھڑے تھے۔ حضرت خواجہؒ اُن کے خوف کے سبب آگے نہ بڑھتے تھے کہ وہ بزرگ بولے، چلے آؤ ڈرو نہیں۔

نیز فرمایا "اگر تم کسی کو نقصان پہنچانے کا ارادہ نہ کرو گے تو وہ بھی تمہیں نقصان نہیں پہنچائے گا۔ شیر کیا چیز ہے جو ان سے خوف کرتے ہو جو خدا سے ڈرتا ہے اس سے سب ڈرتے ہیں"۔ یہ سن کر حضرتؒ ان کے قریب گئے، فرمایا خوب آئے خلقت سے الگ ہو کر اس غار میں رہتا ہوں ایک چیز کے خوف سے روتے ہوئے تیس سال گزرے ہیں"۔ حضرت خواجہؒ نے پوچھا "وہ خوف کیا ہے؟"۔ فرمایا "نماز جب پڑھتا ہوں تو یہ دیکھ کر روتا ہوں کہ اس نماز کی کیا حقیقت ہے جو میں پڑھتا ہوں اگر ذرہ بھر نماز با

شرط فوت ہو جائے تو میرا سب کیا ہوا بیکار ہو جائے" اور فرمایا "اگر درویش نے حق نماز ادا کیا تو بڑا کام کیا ورنہ عمر غفلت میں گزار دی"۔

وہاں سے حضرت خواجہؒ کرمان وارد ہوئے۔ فرماتے ہیں ایک مرتبہ کرمان میں حضرت شیخ احد الدین کرمانیؒ کی ہمراہی میں سفر میں تھے۔ ایک بزرگ سے ملاقات ہوئی جو بہت ہی کمزور اور کم گو تھے۔ چاہا کہ اُن سے کمزوری کا سبب دریافت کروں۔ بولے "بھئی ایک دن دوستوں کے ساتھ ایک قبرستان سے گزر ہوا اور کسی بات پر ہنسی پڑا۔ ایک قبر سے آواز آئی اے غافل جس کا مقام قبر ہو، ملک الموت جس کا حریف ہو اور زیر خاک سانپ بچھو مونس ہوں، اس کو ہنسی سے کیا کام، اس روز سے اِس غار میں مقیم ہوں اور قبر کی باتوں پر روتا ہوں اور اس روز سے بوجہ شرمندگی آسمان کی طرف نہیں دیکھتا۔

پیرِ کامل

حضرت خواجہ غریب نوازؒ نے ستائیس سال کی عمر میں ہندوستان کے لیئے سفر فرمایا۔

دورانِ سفر ہمدان میں حضرت شیخ یوسف ہمدانی سے ملاقات فرمائی۔ ہمدان سے تبریز تشریف لائے اور شیخ ابو سعید تبریزیؒ سے ملے جو شیخ جلال الدین تبریزی کے پیر و مرشد ہیں اور یہاں سے استر آباد تشریف لائے اور حضرت شیخ ناصر الدینؒ سے ملاقات ہوئی جو دو واسطوں سے حضرت بایزید بسطامیؒ سے نسبت رکھتے تھے، وہاں سے بخارا میں آئے، یہاں ایک نابینا بزرگ سے ملے، ان سے پوچھا آپ کب سے نابینا ہوئے ہیں۔" بولے "جب کمالیت کو پہنچا اور نگاہ عظمت و وحدانیت پر پڑی تو ایک دن میری نگاہ بھولے سے غیر پر پڑ گئی۔ غیب سے آواز آئی۔" دعویٰ ہماری محبت کا کرتا ہے اور نظر غیر پر ڈالتا ہے۔" جب سے آواز سُنی تو شرمندہ ہوں بارگاہِ الٰہی میں دعا کی جو آنکھ دوست کے سوا غیر کو دیکھے وہ اندھی ہو جائے پس دونوں آنکھیں اندھی ہو گئیں"۔

خرقان میں گئے اور حضرت ابو الحسن خرقانیؒ کے مزار سے باطنی فیض حاصل کیا۔ پھر سمرقند، ہرات اور سبزوار سے ہوتے ہوئے ملتان پہنچے۔

ملتان میں ایک بزرگ سے ملاقات ہوئی، انھوں نے فرمایا" اہلِ محبت کی توبہ تین قسم کی ہوتی ہے، اول بوجہ ندامت، دوم ترکِ معصیت کے خیال سے، سوم اپنے آپ کو دشمنی اور ظلم سے پاک رکھنے کے لئے"۔

ملتان سے لاہور وارد ہوئے۔ حضرت داتا گنج بخشؒ کے مزار پر معتکف رہے اور باطنی فیض سے مالا مال ہوئے اور جب یہاں سے چلے تو یہ شعر جو حضرت داتا گنج بخشؒ کے آستانۂ عالیہ پر رقم ہے فرمایا ؎

گنج بخشِ فیضِ عالم مظہرِ نورِ خدا
ناقصاں را پیرِ کامل کاملاں را رہنما

لاہور سے حضرت خواجہؒ غزنی واپس چلے گئے اور بلخ سے ہوتے ہوئے بغداد شریف پہنچے اور حضرت پیر و مرشد خواجہ عثمان ہارونیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اس حاضری کے متعلق حضرت خواجہؒ فرماتے ہیں۔

"حضرت پیر و مرشد نے ارشاد فرمایا" دو رکعت نماز ادا کر" میں نے ادا کی، پھر فرمایا" قبلہ رو بیٹھ" میں نے تعمیل کی، حکم ہوا" سورہ بقر پڑھ" میں نے پڑھی۔ ارشاد ہوا" اکیس بار درود شریف پڑھ" میں نے پڑھا۔

پھر میرا ہاتھ پکڑ کر آسمان کی طرف دیکھا اور فرمایا "آ تجھے خدا تک پہنچا دوں"۔ پھر کلاہ چہار ترکی پہنائی اور بیٹھنے کا ارشاد ہوا۔ فرمایا "ایک دن اور رات مجاہدہ میں رہو"۔ اگلے روز حاضر ہوا۔ فرمایا "ایک ہزار بار سورۂ اخلاص پڑھ اور آسمان کی طرف دیکھ"۔ میں نے تعمیل میں آسمان کی طرف دیکھا فرمایا "کیا نظر آیا؟" عرض کیا "عرشِ اعظم"۔ فرمایا "زمین کی طرف دیکھ"۔ میں نے نظر ڈالی، پوچھا کیا دیکھا؟ عرض کیا "تحت الثریٰ"۔ فرمایا "ایک ہزار بار سورۂ اخلاص پڑھ"۔ میں نے تعمیل ارشاد کی، فرمایا "اب آسمان کو دیکھ" میں نے دیکھا فرمایا "کیا نظر آیا؟" بولا "حجابِ عظمت" فرمایا "آنکھیں بند کر"، میں نے بند کرلیں۔ حکم ہوا "آنکھیں کھول"، میں نے کھولیں دو انگلیاں دکھا کر فرمایا "ان میں کچھ نظر آتا ہے؟" عرض کیا "اٹھارہ ہزار عالم" فرمایا "وہ سامنے کی اینٹ اٹھالا"۔ میں نے اینٹ اٹھائی۔ وہاں سے مٹھی بھر دینار نکلے۔ حکم ہوا "یہ لے اور فقرا میں تقسیم کردے"۔ میں نے تعمیل کی۔ فرمایا "چند روز ہماری صحبت میں رہ"۔ عرض کیا "جیسا ارشاد ہو حاضر ہوں"۔

درجۂ کمال

حضرت خواجہؒ اپنے پیر و مرشد خواجہ عثمان ہارونیؒ کے ساتھ حرمین شریفین بھی گئے۔ راستے میں ایک شہر میں پہنچے جہاں درویشوں کی ایک جماعت سے ملاقات ہوئی۔ جو شراب الٰہی سے سرشار اور عالمِ حیرت میں گم تھی۔ وہاں سے کعبۃ اللہ میں گئے حضرت پیر و مرشد نے ان کا ہاتھ پکڑا اور حق تعالےٰ کے سپرد کیا اور ان کے لئے دعا فرمائی۔ آواز آئی "ہم نے معین الدین کو قبول کیا"۔ وہاں سے مدینہ [illegible] گئے۔ روضۂ اقدس

سرکارِ دوجہاں پر حاضر ہوکر سلام عرض کیا۔ آواز آئی "وعلیکم السلام یا قطب المشائخ بحر و بر"۔ ادھر پیر و مرشد خوش ہوکر بولے "اب تو درجۂ کمال کو پہنچ گیا"۔ وہاں سے نکلا اور پھر اوشؔ میں آئے۔ یہاں حضرت شیخ بہاالدین اوشیؒ سے ملے، یہ بڑے کامل بزرگ تھے۔ جو شخص ان کی خدمت میں آتا محروم نہ جاتا، اگر وہ برہنہ ہوتا تو اسے کپڑا دیتے۔ ان کے لئے عالمِ غیب سے اور کپڑے آجاتے۔ انھوں نے حضرت خواجہؒ کو نصیحت فرمائی "جو کچھ تجھے ملے وہ خدا کی راہ میں دینا، دولت جمع نہ کرنا اور خدا کے بندوں کو کھانا پہنچانا تاکہ خدا کے دوستوں میں ہوجاؤ"۔

بدخشاں بھی گئے۔ وہاں ایک بزرگ سے ملے جن کی سو سال عمر تھی، ان کا ایک پاؤں کٹا ہوا تھا ان کے دریافت کرنے پر بولے "ایک مرتبہ میں نے اپنی خواہشِ نفس سے اس پاؤں کو گھر سے باہر نکالا تھا کہ ندا آئی "تمہارا ہم سے یہی عہد تھا؟" میں کانپ اٹھا، اسی وقت پاؤں کاٹ کر پھینک دیا، چالیس سال ہوگئے ہیں اور اسی غم میں مبتلا ہوں کہ قیامت کے روز کیا منہ دکھاؤں گا"۔

خواجہ غریب نوازؒ فرماتے ہیں کہ میں دس سال حضرت پیر و مرشد کے ہمراہ سفر میں رہا، بعد ازاں حضرت بغداد میں آکر گوشہ نشین ہوگئے۔ فرماتے ہیں اوشؔ کے سفر کے قیام میں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کو والدہ انھیں بسم اللہ خوانی کے لئے لائیں۔ خواجہ قطب الدینؒ کی عمر ساڑھے چار سال کی ہوگی۔

سیوستان کے سفر کا ایک واقعہ لکھتے ہیں کہ وہاں ایک بزرگ ہمدم الدین محمدؒ رہتے تھے، جو کوئی ان کے پاس

آتا محروم نہ جاتا۔ اسے عالم غیب سے کوئی چیز لا کر دیتا اور کہتے کہ اس درویش کو ایمان کی سلامتی کی دعا سے یاد کرنا۔ کیونکہ اگر یہ قبر میں ایمان سلامت لے گیا تو بہت بڑا کام کیا۔ نیز مارے خوف کے بید کی طرح کانپتے، اس کا سبب یہ فرمایا کہ میں ایک مرتبہ بصرہ میں ایک بزرگ کو دیکھا جو ایک قبر کے پاس بیٹھے تھے۔ اور مردہ کو سخت عذاب ہو رہا تھا۔ وہ بزرگ نعرہ مار کر مثل نمک کے گھل کر پانی ہو گئے۔ اس روز سے عذاب قبر کا خوف طاری ہے۔ آج تیس برس کے بعد آپ سے گفتگو کی ہے۔

دمشق کے سفر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ دمشق کی مسجد کے سامنے بارہ ہزار انبیاء کے مزارات ہیں ان کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ نیز یہاں کے بزرگوں سے بھی ملے۔

ولی الہند دمشق سے حضرت خواجہ غریب نوازؒ سنجار میں شیخ نجم الدین کبریٰ سے ملے اور بغداد شریف میں حضرت غوث اعظمؒ سے دوبارہ ملاقات ہوئی یہاں حضرت خواجہؒ ایک حجرہ میں معتکف بھی رہے۔ اور حضرت غوث اعظمؓ سے باطنی فیوض حاصل کئے۔

کہتے ہیں حضرت خواجہ غریب نوازؒ بیس سال پیر و مرشد کے پاس رہے۔ اس وقت آپ کی عمر شریف باون سال کی تھی کہ حضرت خواجہ عثمان ہارونیؒ نے آپ کو خلافت سے سرفراز فرمایا اور تبرکات سرور کائناتؐ جو خواجگانِ چشت میں سلسلہ بہ سلسلہ چلے آتے تھے آپ کو عطا فرما کر اپنا جانشین بنایا۔ حضرت پیر و مرشد کی بیس سالہ خدمت و رفاقت کے بارے میں حضرت خواجہؒ فرماتے ہیں کہ حضرت خواجہ عثمان ہارونیؒ نے ارشاد فرمایا۔ "اے معین الدین میں نے یہ سب کام تیری تکمیل کے لئے کئے ہیں۔" نیز یہ نصیحت فرمائی کہ خلق سے طمع نہ رکھنا۔ آبادی سے دور مخلوق سے کنارہ کش رہنا اور کسی سے کچھ طلب نہ کرنا۔" اس کے بعد پیر و مرشد نے آپ کو بغل میں لیا، سر و چشم بوسہ دیا اور فرمایا۔ "تجھ کو خدا کے سپرد کیا۔" اس عنایت و محبت و شفقت سے حضرت پیر و مرشد نے آپؒ کو روانہ کیا۔ ان سے جدا ہو کر آپؒ نے پھر مسافت اختیار کی، عام طور پر قبرستان میں بسیر کرتے۔ جس جگہ شہرت ہو جاتی وہاں سے چپکے سے دوسری جگہ تشریف لے جاتے۔ ان ایام میں حضرت خواجہ اوحدؒ بھی گئے۔ حضرت قطب الاقطابؒ سے بھی ملے اور انہیں از راہ کرم اپنی چادر عنایت فرمائی۔ اور مریدی سے سرفراز کیا۔ حضرت قطب الاقطابؒ کی رفاقت میں کعبۃ اللہ بھی گئے۔ اس سفر کے حالات میں حضرت قطب الاقطاب لکھتے ہیں کہ میں حضرت خواجہؒ کے ساتھ کعبہ کے سفر میں تھا، ایک دن صبح کی نماز کے بعد روانہ ہو کر ایک شہر میں پہنچے۔ یہاں ایک بزرگ سے ملے جو اعتکاف میں تھے غار کے اندر مانند سوکھی لکڑی کے تھے اور آنکھیں کھولے عالم حیرت میں گم کھڑے تھے۔ ہم ایک ماہ تک ان کے پاس رہے اس عرصہ میں ہم سے ایک مرتبہ متوجہ ہوئے اور فرمایا "تمہیں میرے اس حال سے تکلیف ہوئی مگر تمہارے اس ملال سے مجھے مکافات

بخشش ہوگی۔ کیونکہ اہلِ صفا کا قول ہے کہ جو درویش کی خدمت کرتا ہے وہ مقبول ہوتا ہے۔ نیز فرمایا کہ میں شیخ اسلم طوسی کا فرزند ہوں۔ تیس سال سے حیرت میں گم ہوں اللہ تعالیٰ مجھے آپ کی وجہ سے عالمِ صحو میں لایا ہے۔ میری یہ بات یاد رکھو کہ جب تم اُنس میدان میں قدم رکھا ہے تو ہوائے نفس سے دنیا کی طرف متوجہ نہ ہونا، جو ملے اسے صرف کردینا، اس میں سے کچھ نہ بچانا حق تعالیٰ کے سوا کسی سے مشغول نہ ہونا۔" یہ کہہ کر وہ بزرگ پھر عالمِ تحیر میں مشغول ہوگئے۔

ایک دن حضرت خواجہ غریب نوازؒ حرم کعبہ میں مشغولِ عبادت تھے کہ غیب سے آواز آئی "اے معین الدین" ہم تجھ سے خوش ہیں تجھے بخش دیا، کچھ مانگ تاکہ عطا کیا جائے" آپؒ نے عرض کیا۔ "اے خداوند کریم میرے مریدوں کو بخش دے"۔ آواز آئی منظور ہے"۔

یہاں سے فارغ ہو کر حضرت خواجہؒ مدینہ عالیہ پہنچے ایک دن بارِ رسالت مآب سے بشارت ہوئی "اے معین الدین تو ہمارے دین کا معین (مددگار) ہے۔ میں نے ولایت ہندوستان کی تجھے عطا کی وہاں کفر و ظلمت پھیلی ہوئی ہے تو اجمیر میں جا"۔ نیز از راہِ عنایت حضرت خواجہ کو ایک انارِ بہشتی عطا فرمایا۔ اور عالمِ رویا میں خطۂ اجمیر بھی آپؒ کو دکھایا گیا۔

واردِ اجمیر

حضرت خواجہؒ کی اجمیر میں آمد کے متعلق حضرت شیخ محدث دہلویؒ اخبار الاخیار میں لکھتے ہیں۔ حضرت خواجہؒ بزرگ رائے پتھورا کے زمانے میں اجمیر آکر عبادت میں مشغول ہوئے۔ ایک دن راجہ نے ایک مسلمان کو آزار پہنچایا۔ اس نے آکر حضرت خواجہ سے شکایت کی۔ حضرت خواجہؒ نے راجہ کے پاس ایک آدمی کو بھیجا مگر رائے پتھورا نے حضرت خواجہ کی بات نا مانی اور کہا کہ وہ (حضرت خواجہؒ) وہاں بیٹھ کر غیب کی باتیں بتاتے ہیں۔ حضرت خواجہؒ نے سُنا اور فرمایا "ہم نے رائے پتھورا کو زندہ گرفتار کر کے دے دیا۔" چنانچہ انہی دنوں معز الدین سام کا لشکر غزنی سے آگیا۔ رائے پتھورا نے لشکرِ اسلام کا مقابلہ کیا اور بدست معز الدین سام گرفتار ہوا۔

کہتے ہیں کہ رائے پتھورا کی ماں نے بیٹے (راجہ) سے کہا تھا یہ (حضرت خواجہؒ) وہی بزرگ ہیں جن کے بارے میں میں نے تمہیں آج سے بارہ سال پہلے کہا تھا" ان سے سرکشی نہ کرنا بلکہ تواضع اور عجز کے ساتھ پیش آنا۔ تاکہ تیری سلطنت قائم رہے ورنہ تو اپنی سلطنت کی آخر سمجھ لے"۔

(اقتباس از وقائع معین الدین چشتیؒ مصنفہ بالو لال)

اجمیر شریف میں حضرت خواجہؒ شہر سے باہر سایہ دار درختوں کے نیچے قیام فرما تھے۔ راجہ کے ملازم مانع ہوئے اور کہنے لگے کہ یہاں نہ بیٹھئے۔ یہ جگہ راجہ کے اونٹوں کے بیٹھنے کی ہے۔ حضرت خواجہؒ وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا۔ "یہاں اونٹ بیٹھے ہیں تو بیٹھیں"۔ وہاں سے انا ساگر کے کنارے تک ایک پہاڑی پر قیام فرمایا۔ جب اس جگہ اونٹ بٹھائے گئے تو وہ ایسے بیٹھے کہ اٹھائے نہ اٹھے راجہ کے ملازم بہت گھبرائے۔ بات راجہ کے کانوں تک پہنچی۔ بولا کہ ان

بزرگوں (حضرت خواجہؒ) سے معافی مانگو"۔ وہ لوگ حضرت خواجہؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور معذرت چاہی۔ فرمایا "جاؤ اونٹ کھڑے ہوں گے۔" انہوں نے دیکھا کہ واقعی اونٹ کھڑے ہو گئے تھے۔

اناساگر کے کنارے بہت سے مندر تھے راجہ کے مندر کا پجاری سادھو رام اپنے مذہب کا بڑا عالم تھا وہ چاہتا تھا کہ حضرت خواجہؒ یہاں سے کہیں اور چلے جائیں۔ لیکن حضرت خواجہؒ کی کرامات دیکھ کر بہت معتقد ہوا اور اسلام قبول کیا۔ حضرت خواجہؒ نے سادھو رام کا جسے شادی دیو بھی کہا جاتا تھا، اسلامی نام سعدی رکھا، ایک بڑا جوگی اجے پال بھی حضرت خواجہؒ کے ہاتھ پر مسلمان ہوا۔ اس کا نام عبداللہ رکھا گیا۔ مشہور ہے کہ عبداللہؒ نے حیات جاودانی پائی ہے اور بھولے بھٹکے مسافروں کو راہ بتلاتے ہیں اور ہر جمعہ کی شب کو حضرت کے مزار عالیہ پر حاضری دیتے ہیں۔ ان دونوں بڑے پجاریوں کے اسلام قبول کرنے کے بعد حضرت خواجہؒ ان کی درخواست پر اناساگر کی پہاڑی سے جھالرہ کے قریب تشریف لے گئے اور یہاں قیام فرمایا۔ محمد یادگار جو پہلے ہی تائب ہو کر ایمان لے آیا تھا اور اب حضرت خواجہؒ کے خدام میں شمار ہوتا تھا، فقرا کے قیام کے بندوبست پر مامور فرمایا۔ نیز اس جگہ عبادت گاہ اور لنگر خانہ بھی تعمیر کرایا۔ جہاں حضرت خواجہ غریب نوازؒ کا مزار شریف ہے۔ یہاں لنگر خانہ تھا۔

جب متعدد سرکردہ ہندو دائرہ اسلام میں آ گئے تو راجہ کی تنگی بڑھ گئی۔ ادھر حضرت خواجہؒ نے اسے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ راجہ نے کہلا بھیجا کہ آپ ہماری سرحد سے باہر نکل جائیں۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ اس کو نکالنے والا بھی عنقریب آتا ہے۔ اسی شب حضرت خواجہ نے شہاب الدین غوریؒ کو عالم رویا میں فرمایا کہ خدا تعالیٰ نے تجھے ہندوستان کی شاہی بخشی ہے۔ اس طرف توجہ کر"۔ سلطان اس خواب سے بہت خوش ہوئے

بعض کتب میں لکھا ہے کہ حضرت خواجہ صاحبؒ اس وقت اجمیر سے تشریف لے گئے تھے اور اوش میں چلے آئے تھے، اور شہاب الدین غوری کے ساتھ دوبارہ تشریف لائے۔ شہاب الدین غوری پہلے راجہ سے شکست کھا چکا تھا۔ لیکن حضرت خواجہؒ کی بشارت کے بعد بادشاہ نے بہت سا لشکر اکٹھا کیا اور راجہ پتھورا سے مقابلہ کیا اور اسے زندہ گرفتار کیا اور حضرت خواجہؒ سلطان الہند کے لقب سے ملقب ہوئے۔

بود و باش

راجہ پرتھوی راج کو شکست دینے کے بعد سلطان شہاب الدین غوری، ہانسی، سمانہ اور کہرام فتح کرتا ہوا اجمیر شریف پہنچا اور اجمیر شریف کو فتح کیا اور اپنا تسلط قائم کیا۔ یہ ۸۹۹ھ کا واقعہ ہے اور پرتھوی راج کے لڑکے کو کہ وہ فرمانبردار و مطیع رہے گا راجہ کا جانشین مقرر کیا۔

"عطائے رسولؐ" کا مولف بیان کرتا ہے کہ جب بادشاہ اجمیر شریف میں داخل ہوا تو مغرب کا وقت تھا۔ حضرت خواجہ غریب نوازؒ مع ساتھیوں کے نماز میں مصروف تھے کہ شہاب الدین غوری بھی آ کر جماعت میں شریک ہو گیا اور حضرت خواجہؒ کے پیچھے

نماز پڑھنے کا شرف حاصل کیا اور نماز کے بعد قدم بوس ہوا۔

اس وقت قاضی حمید الدین ناگوریؒ بھی اجمیر شریف میں موجود تھے۔ اس ملاقات میں حضرت خواجہ غریب نوازؒ نے بادشاہ کو شرف مریدی سے سرفراز کیا اور ناتواں شاہ سے ملنے کا حکم دیا۔ بادشاہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کے ارشاد پر ملک شاہ سے ملا۔ قنوج کا راجہ جے چند بھی راجہ کے ساتھ تھا۔ یہ بھی پیر ملک شاہ کا چیلہ بن گیا۔ انھوں نے اس کے گلے میں کنٹھی باندھی ناتواں شاہ نے جے چند کو دعا دی اور فرمایا کہ تم نے ہمارے کنٹھی نہیں باندھی بلکہ ہم نے تمہاری کھنٹی اپنے گلے میں باندھی ہے۔ ہماری اولاد (مرید) جنگ میں تمہاری اولاد کے ساتھ جان دے گی۔

راجہ جے چند نے میراں ناتواں شاہ (جنھیں ناطع شاہ بھی کہتے ہیں) کی خدمت میں جاگیر کی سند پیش کی مگر میراں نے قبول نہیں کی اور راجہ کی خوشنودی کے لیئے اوڑھنے کے لئے گردا رنگ کی دو چادریں لیں۔ راجہ نے انھیں راٹھوروں کا گرو تسلیم کیا۔

کہتے ہیں کہ جب حضرت خواجہ غریب نوازؒ اجمیر میں وارد ہوئے اس وقت تک حضرت خواجہؒ کی شادی نہ ہوئی تھی، ۵۹۰ ہجری میں ایک شب حضرت خواجہؒ عالم رویا میں حضور نبی کریمؐ کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ حضورؐ نے انھیں نکاح کرنے کا ارشاد فرمایا۔ اسی دن ایک راجہ کی بیٹی جہاد میں آئی تھی۔ حضرت خواجہؒ نے اس کا اسلامی نام "امۃ اللہ" رکھا اور ان سے نکاح فرمایا۔ یہ بی بی بہت نیک تھیں۔ حضرت خواجہ غریب نوازؒ کی بعض اولاد اسی نیک بخت خاتون کے بطن سے ہے، خواجہ فخر الدینؒ، خواجہ حسام الدینؒ اور حضرت بی بی حافظ جمالؒ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن بعض مورخوں کو اس سے اختلاف ہے۔ وہ انھیں بی بی عصمت (حضرت خواجہؒ کی دوسری زوجہ) کی اولاد بتلاتے ہیں۔ کیونکہ ان کا نکاح بھی حضرت خواجہؒ کے ساتھ اسی زمانے میں ہوا تھا۔

۵۹۸ ہجری میں حضرت خواجہ غریب نوازؒ نے پھر بغداد شریف کا سفر اختیار کیا۔ اجمیر شریف میں اقامت پذیر ہونے کے بعد بھی حضرت خواجہ غریب نوازؒ کا متعدد بار بلخ، غزنین، اور بغداد شریف وغیرہ ممالک میں تشریف لے جانا ثابت ہوتا ہے۔ اس طرح حضرت خواجہؒ کے دستِ حق پرست سے جگہ جگہ دینِ اسلام کا پرچم نصب ہوا اور بے شمار لوگ ان سے فیض یاب ہوئے۔ لیکن اجمیر شریف کی سرزمین ان سب جگہوں سے بازی لے گئی۔ جسے حضرت خواجہؒ ایسے یگانۂ روزگار اور بے مثل بزرگ کا مسکن و مدفن ہونے کا فخر حاصل ہوا کہ آج بھی فلک جھک کر اجمیر شریف کی پہاڑیوں کو سلام کر رہا ہے۔

جود و سخا

یوں تو حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے فیضان بے پایاں سے ایک جہاں فیض یاب ہوا۔ حضرت خواجہ قطب الاقطابؒ اور قاضی حمید الدین ناگوریؒ ایسے بلند پایہ بزرگ بھی حضرت خواجہؒ کی عنایت سے میسر ہوئے اور حضرت خواجہؒ سے بے شمار کرامات دیکھنے میں آئیں جن کے تذکروں سے کتابیں بھری پڑی ہیں۔

حضرت خواجہؒ نے شکر گذار بندوں کی طرح تمام عمر عبادات اور مجاہدات میں بسر کی، راتیں عبادت و ریاضت میں بسر فرماتے۔ عموماً عشار کے وضو سے صبح کی نماز ادا فرماتے سفر و حضر میں دو قرآن پاک ہر روز، ایک دن میں اور ایک رات میں ختم کرتے۔ حضرت قطب الاقطاب فرماتے ہیں کہ میں بیس برس تک ان کی خدمت میں رہا میں نے نہیں سُنا کہ کبھی حضرت نے اپنی صحت کی دعا مانگی ہو بلکہ اکثر فرماتے کہ "خداوند معین الدین کو درد عطا فرما۔"

قطب الاقطاب فرماتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ اس دُعا کے الفاظ کے بارے میں عرض کیا۔ فرمایا "جب کوئی مسلمان درد (تکلیف) میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کے گناہ معاف ہوتے ہیں۔ اور یہ چیز مسلمان کے ایمان کی صحت کی دلیل ہے۔"

حضرت خواجہؒ اکثر حالتِ استغراق میں آنکھیں بند رکھتے تھے، جب نماز کا وقت ہوتا تو آنکھیں کھولتے اور اگر استغراق بڑھ جاتا تو حضرت قطب الاقطابؒ اور حضرت قاضی صاحبؒ "الصلواۃ الصلوٰۃ" بلند آواز سے فرماتے۔ حضرت خواجہؒ ہوش میں آجاتے اور فرماتے "شرع محمدی سے چارہ نہیں" سبحان اللہ مجھے کہاں سے کہاں لائے"۔ کہتے ہیں ایسے میں حضرت خواجہؒ کی نگاہِ کرم جس پر پڑتی وہ ولی ہو جاتا۔

حضرت خواجہؒ اپنے پیر و مرشد کا بہت احترام فرماتے تھے۔ ایک روز ایک جگہ احباب کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے استفسار پر فرمایا کہ ادھر ہمارے پیر و مرشد کا مزار شریف ہے۔ جب میں نے ادھر نگاہ ڈالی تو مزارِ اقدس نظر آیا۔ اس لئے تعظیم کے لئے کھڑا ہو گیا ہوں"۔

حضرت خواجہ غریب نوازؒ نبی کریمؐ کی سنت کی بہت پابندی فرماتے تھے۔ اور خوفِ خدا اس درجہ غالب تھا کہ حضرت کانپتے اور روتے تھے۔ مشہور ہے کہ جو شخص تین روز حضرت خواجہؒ کی صحبت بابرکت میں رہتا وہ صاحبِ کرامت ہو جاتا۔ بلا امتیاز مذہب و ملت جو ملنے آتا اس سے خندہ پیشانی سے ملتے۔ مریض یا حاجت مند آتا اس کی دل جوئی اور حاجت براری فرماتے اس کے حق میں دعائے خیر کرتے اور جو مناسب خیال فرماتے مصلے کے نیچے سے نکال کر عنایت فرماتے۔

روایت ہے کہ ایک روز حضرت بہت خوش تھے۔ حاضرین سے فرمایا "مانگو جو مانگنا ہے" صوفی حمید الدینؒ نے عرض کیا۔ "بندہ کی کیا مجال ہے جو زبان کھولے مولا کا چاہا میرا چاہا ہے"۔ فرمایا "میں نے تیرے لئے خدا سے دعا کی ہے تو دنیا و آخرت میں معزز و مکرم رہے" حضرت قطب الاقطاب بھی موجود تھے۔ انھوں نے حضرت خواجہؒ کو جو مائل بہ کرم دیکھا تو یہ شعر عرض کیا۔

"ہرچہ تو خواہی بخواہم بروئے سر بر آستانم
بندہ را فرماں نباشد ہرچہ برآئی بر آنم"

حضرت خواجہ یہ سُن کر بہت خوش ہوئے اور فرمایا "سلطان التارکین حمید الدین صوفیؒ" و "قطب الاقطاب بختیار اوشیؒ"۔ اسی دن سے دونوں حضرات ان خطابات سے یاد کئے جاتے ہیں۔

کتب میں لکھا ہے کہ حضرت خواجہؒ تمام مقاماتِ غوثی، قطبی و قطب الاقطابی طے کر کے مرتبہ محبوبیت پر پہنچ گئے تھے اور استغراق فنائے احدیت میں دوست کے ساتھ رنگ ۔ گئے تھے۔

ارشاداتِ عالیہ

ایک روز ارشاد فرمایا کہ امام فقیہ ابو اللیث سمرقندی کی کتاب میں لکھا دیکھا ہے کہ روزانہ ایک فرشتہ پکار کر کہتا ہے جو شخص خدا تعالیٰ کا فریضہ ادا نہیں کرتا وہ خدا تعالیٰ کی بخشش سے دور ہو جاتا ہے اور دوسرا فرشتہ یہ کہتا ہے کہ جو رسولِ خدا کی سنت ترک کرتا ہے وہ حضورؐ کی شفاعت سے محروم ہو جاتا ہے۔"

فرمایا" ایک مرتبہ مسجد کبریٰ میں بغداد کے اولیائ اللہ کے ساتھ بیٹھا تھا۔ وضوں میں انگلیوں کے خلال کے متعلق بات ہو رہی تھی۔ میں نے کہا یہ بھی ایک سنت ہے۔ نیز حضورؐ نے صحابہؓ کو انگلیوں میں خلال کرنے کی طرف متوجہ فرمایا تھا۔ ایک مرتبہ خواجہ اجل شیرازی کے پاس بیٹھا تھا۔ نماز شام کا وقت ہو گیا۔ غیب سے آواز آئی" امتی ہو اور محبت کا دعویٰ کرتے ہو، لیکن ان کی سنت ترک کرتے ہو" اس دن سے مرتے دم تک ان سے کوئی سنت ترک نہ ہوئی۔

فرمایا" نماز مومن کی معراج ہے۔ ایک راز ہے جو بندہ اپنے پروردگار سے کہتا ہے۔" نیز فرمایا کہ میں نے خواجہ عثمان ہارونیؒ سے سنا ہے کہ قیامت کے دن انبیا اولیائ اور مسلمانوں سے نماز کا حساب ہوگا۔ جو نماز سے عہدہ برآ ہوگا خلاصی پائے گا۔ اور جو عہدہ برآنہ ہوگا دوزخ میں جائے گا۔

فرمایا نماز دین کا رکن ہے اور رکن ستون ہوتا ہے پس جب ستون قائم ہوگا تو مکان بھی قائم ہے۔ جب ستون نکل جائے تو چھت گر پڑے گی۔ پس نماز بمنزلہ ستون ہے یہ نہ ہوگی تو اس شخص کا اسلام و دین نہ ہوں گے۔ اللہ نے کسی عبادت کی اتنی تاکید نہیں فرمائی جتنی کہ نماز کی۔

ارشاد فرمایا" کیسے ہیں وہ مسلمان جو وقت پر نماز ادا نہیں کرتے اور اس قدر دیر کرتے ہیں کہ وقت گذر جاتا ہے۔ فرمایا کہ جو شخص پانچوں نمازیں وقت پر ادا کرتا ہے وہ قیامت کے دن اس کی رہنما بنتی ہیں۔

فرمایا کہ جب نماز ادا کرے تو رکوع و سجود کما حقہ بجالائے اور ارکان نماز اچھی طرح ملحوظ رکھے۔

فرمایا کہ جو بھوکوں کو کھانا دیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی ہزار حاجتیں پوری کرتا ہے، اسے دوزخ سے خلاصی دیتا ہے اور اسے بہشت میں جگہ دیتا ہے۔"

فرمایا" جس نے جھوٹی قسم کھائی اس نے گویا اپنے گھر کو ویران کیا۔ اس کے گھر سے خیر و برکت اٹھ جاتی ہے

فرمایا اہل سلوک میں قہقہہ ایک گناہ کبیرہ ہے۔

فرمایا کہ اس سے بڑا کوئی گناہ نہیں کہ کسی مسلمان کو بلا وجہ ستایا جاوے۔ فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کا نام سنے یا کلام اللہ سنے تو دل نرم نہ ہو اور ہیبت خدا سے نہ ڈرے اس سے بڑا گناہ نہیں۔

فرمایا" کلام اللہ پڑھنے والے کو اللہ دو ثواب عطا کرتا ہے۔ ایک پڑھنے کا اور دوسرا اسے دیکھنے کا جو شخص کلام اللہ دیکھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی بینائی زیادہ کرتا

ہے۔ اس کی آنکھ کبھی نہیں دکھتی۔

فرمایا "ایک مرتبہ ایک بزرگ کے پاس ایک نابینا آیا اور عرض کیا کہ میں نے بینائی کے لئے بہت علاج کئے مگر فائدہ نہیں ہوا۔ ان بزرگ نے کلام مجید منگا کر سورۂ فاتحہ تلاوت کی اور قرآن شریف اٹھا کر اس کی دونوں آنکھوں سے ملا، نابینا کی آنکھیں روشن ہو گئیں۔

فرمایا "جو شخص علماء اور مشائخ سے محبت کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرتے ہیں اور جو ان سے منہ پھیرتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے منہ پھیر لیتے ہیں۔

فرمایا "جو شخص اپنے پیر کی خدمت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے بہشت میں جگہ دے گا۔"

فرمایا "مرید کو لازم ہے کہ جو کچھ پیر سے سنے اس پر عمل کرے" فرمایا "جو درود یا وظیفہ ہر روز کوئی پڑھتا ہے اسے ترک نہ کرے۔ دن کو نہ پڑھ سکے تو رات کو پڑھے۔

حضرت خواجہ غریب نوازؒ بلند پایہ بزرگ ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اعلیٰ پایہ کے مصنف بھی تھے۔ حضرت کی تصانیف میں کنز الاسرار (گنج اسرار) جس میں معرفت کی تعلیم دی گئی ہے اور انیس الارواح جس میں حضرت خواجہؒ نے اپنے پیر و مرشد کے ارشادات درج کئے ہیں۔ نیز معراج الانوار (کشف الاسرار) جسے طالبان حق کے لئے مرتب فرمایا اور رسالہ تصوف جو منظوم ہے اور تصوف پر روشنی ڈالتا ہے۔ اور دیوانِ معینؒ حضرتؒ کے کلام لاکلام کا مجموعہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ حضرت خواجہ کا کلام معرفت سے لبریز ہے۔ حضرت خواجہؒ نے رباعیات بھی کہی ہیں۔ ذیل میں چند ایک جھلکیاں ہیں۔

عاشق ہمہ دم فکرِ رُخِ دوست کند
معشوق کرشمہ کہ نکو ست کند
ما جرم و خطا کنیم و او لطف عطا
ہر کس چیزے کہ لائق او ست کند

اے باج نبیؐ بر سرِ تاج نبیؐ
اے داد شہنشاہ زتیغ تو باج نبیؐ
اے تو کہ معراج تو بالا شد
یک قیامت احمدی معراج نبیؐ

شاہ است حسینؑ بادشاہ است حسینؑ
دین است حسینؑ دین پناہ است حسینؑ
سر داد نہ داد دست در دستِ یزید
حقا کہ بنا لا الٰہ است حسینؑ

کارے کہ حسینؑ اختیار کردی
در گلشنِ مصطفٰےؐ بہار کردی
از ہیچ پیمبراں نیاید ایں کار
واللہ اے حسینؑ کہ تو کردی

اب حضرت خواجہؒ کے چند اشعار بھی تبرکاً دیکھئے!

زپیش بر افگن نقاب دعوئے را
ببیں بدیدۂ صورت جمال معنیٰ را

حُسنش چو آید جلوہ گر طاقت نماند چشم تر
از دیدۂ دل کن نظر تا بنگری دیدار او

چو من زبادۂ عشقِ تو مست و بے خبرم
ہمہ جمال تو بینم ہر چہ در نگرم

ہستی طلبا است ز نور وجود اد
کونین شبنمی است ز دریائے جود او

تاثرات

حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے وصال کو آج ساڑھے سات سو سال ہو چکے ہیں لیکن ان کے مزارِ پُر انوار پر آج بھی وہی چہل پہل ہے۔ حضرت خواجہ غریب نواز کے دربار گہربار میں اس طویل عرصہ میں بڑے سے بڑے بادشاہ، راجے، مہاراجے انگریز اور دیگر حکمرانوں نے حاضر ہو کر اپنی شاہی کی سلامتی چاہی ہے۔ بڑے بڑے اولیائے کرام نے حاضر ہو کر حضرت خواجہؒ کے حضور ہدیۂ نیاز پیش کیا ہے اور اپنی ولایت کی خیر منائی ہے۔ آج بھی وہاں حاجت مندوں کی بھیڑ دیکھی جاتی ہے۔ بلکہ دن دونی رات چوگنی ترقی ہے۔ ملک بھر میں حضرت خواجہؒ کا ہی وہ مزارِ پُر انوار ہے جس کے بارے میں ایک انگریز حکمران نے لکھا تھا کہ یہاں ایک "قبر" حکومت کر رہی ہے۔ کیوں نہ ہو حضرت غریب نوازؒ کو حضور سرکارِ دوجہاںؐ نے ہندوستان کی مملکت سونپی ہے۔ اسی لئے حضرت خواجہؒ کی حکومت ہمیشہ ہمیشہ قائم رہے گی۔ کیا مسلمان اور کیا ہندو اور کیا عیسائی سب ہی خواجہؒ کے گرویدہ ہیں۔

حیدرآباد کے وزیر اعظم سر کشن پرشاد ۱۹۲۲ء میں جب مزارِ اقدس پر حاضر ہوئے تو بے ساختہ کہا۔

جھکتے ہیں شاہوں کے سر خواجہ کی وہ سرکار ہے
ہیں ملک در ہاں وہ شاہِ چشت کا دربار ہے

اجمیر کی سنگلاخ زمین میں حضرت خواجہ غریب نوازؒ کا مزارِ پُر انوار نیرِ تاباں کی طرح جگمگا رہا ہے۔ اردگرد پہاڑوں کی چوٹیوں اور ڈھلوانوں پر حضرت خواجہؒ کے عشاق کے لاتعداد مزارات پھیلے پڑے ہیں۔ ایک چوٹی پر حضرت خواجہؒ کا چلہ مبارک ہے تو اس سے ہٹ کر حضرت قطب الاقطابؒ کی چلہ گاہ ہے۔ گویا ہر طرف روحانیت کے جھنڈے گڑے ہوئے ہیں۔ اجمیر کے باسی آج بھی بازاروں میں "یا گریب نواج" کہتے ہوئے ملتے ہیں۔ حضرت کی چوکھٹوں پر پیشانیاں رگڑتے نظر آتے ہیں۔ حضرت خواجہ غریب نوازؒ کا آستانہ عالیہ بیشمار مخلوق کا آج بھی ملجا و ماوا ہے۔ حضرت خواجہؒ کے احاطہ مزار مبارک میں بادشاہوں کی بڑی بڑی مساجد شاہجہانی، اکبری، عالمگیری میں اذانیں گونج رہی ہیں، جیسے حضرت خواجہؒ آج بھی دعوت حق دے رہے ہیں۔ آستانہ عالیہ کی حدود میں داخل ہوتے ہوتے ہی آدمی پر ایک رقت سی طاری ہو جاتی ہے اور آستانہ عالیہ کے اندر جا کر تو بے اختیار آنسو بہہ نکلتے ہیں۔ اور زائر جب باہر نکلتا ہے تو ایک نئی فرحت محسوس کرتا ہے شاید یہی وجہ ہے کہ دکھیوں اور حاجت مندوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ کھینچے چلے آتے ہیں اور حضرت خواجہ غریب نوازؒ نہ جانے کس انداز اور کس فراغ دلی سے انھیں نوازتے ہیں کہ ان کے سارے دکھ درد دور ہو جاتے ہیں، وہ روتے ہوئے جاتے ہیں اور ہنستے

ہوئے لوٹتے ہیں۔

وصالِ مبارک

حضرت سفر اور حضر میں ہمیشہ قائم اللیل اور صائم النہار رہا کرتے تھے۔ ریاضت و مجاہدات کے زمانے میں حضرتؒ مسلسل سات سات روز تک روزے سے رہتے اور صرف افطار پر اکتفا فرماتے تھے۔ ساتویں روز خشک روٹی کا ایک ٹکڑا جو وزن میں ۵ مثقال سے کسی حالت میں بھی زیادہ نہ ہوتا تھا، پانی میں بھگو کر تناول فرمایا کرتے تھے۔

لباس مبارک ہمیشہ دوہرے کپڑے کا بخیہ شدہ ہوتا تھا جب کہیں سے پھٹ جاتا تھا جس قسم کا کپڑا میسر ہوتا تھا بلا تامل پیوند لگا لیا کرتے تھے۔ حضرتؒ کے جسمِ اقدس پر ہمیشہ پیوندار لباس رہا کرتا تھا۔

حضرت نے بایمائے حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم بڑی عمر میں شادی کی تھی۔ حضرت کی پہلی شادی حضرت خواجہ وحیدالدین مشہدیؒ کی صاحبزادی بی بی عصمتؒ سے ۵۸۹ ہجری میں ہوئی تھی اور دوسری بی بی امت اللہؒ سے۔ پہلی بیوی سے تین صاحبزادے خواجہ ابوسعیدؒ خواجہ فخرالدینؒ اور خواجہ حسام الدینؒ پیدا ہوئے اور دوسری بیوی سے صاحبزادی بی بی حافظ جمال صاحبہ۔ الغرض حضرت کی صلبی اولاد صرف تین لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔

وصال سے کچھ روز پہلے حضرت کو معلوم ہو چکا تھا کہ محبوبِ حقیقی سے وصال کا وقت قریب آگیا ہے اسی روز سے حضرتؒ پر ایک خاص کیفیت طاری رہنے لگی، وصال سے چند روز پیشتر حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کو اپنا خلیفہ مقرر فرما کر دہلی روانہ فرمایا

۵ رجب المرجب ۶۳۲ھ کی شام کو حضرتؒ پر اس خاص کیفیت کا غلبہ زیادہ ہوگیا چنانچہ بعد نمازِ عشا حجرۂ مبارک کا دروازہ بند کرنے کے بعد حضرت نے خدام کو اندر آنے سے منع فرمایا۔ خدام تمام رات حجرہ کے باہر حاضر رہے اور صدائے وجد سنتے رہے لیکن آخر شب میں آواز آنی موقوف ہوگئی۔ نمازِ فجر کے وقت خدام دروازہ کھلنے کا انتظار کرتے رہے۔ جب دروازہ نہ کھلا تو خدام نے دستک دی، کوئی جواب نہ آیا تو دروازہ توڑا گیا۔ دیکھا حضرتؒ وصال بحق ہو چکے تھے اور حضرتؒ کی پیشانی مبارک پر بخطِ نور لکھا تھا۔ **ھٰذا حبیب اللہ مات فی حب اللہ۔**

حضرت کے بڑے صاحبزادے حضرت خواجہ فخرالدینؒ نے حضرتؒ کے جنازہ کی نماز پڑھائی۔ انبیاء علیہم السلام کی سنت کے مطابق حضرتؒ بمقام اجمیر اسی حجرۂ مبارک میں جہاں حضرت بود و باش رکھتے تھے محوِ استراحت ہیں۔

نمازِ جنازہ میں علاوہ مقامی و بیرونی مسلمانوں کے رجال الغیب ابدال اور اقطابِ زمانہ بھی شریک تھے، جن کی امامت حضرت خضر علیہ السلام نے فرمائی تھی۔ جس وقت حضرتؒ کا جسمِ اقدس قبر میں اتارا گیا۔ حضرت کا روئے مبارک چودھویں رات کے چاند کی طرح منور و تاباں تھا۔ حضرتؒ کی لحدِ مبارک سے عرصہ دراز تک ایسی عمدہ خوشبو آتی رہی کہ جس سے روح و قلب پر کیف کا ایک خاص عالم طاری ہو جاتا تھا۔ آج بھی اہلِ باطن اس خوشبو سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

بلاشبہ حضرت خواجہؒ کا مزارِ مبارک مرجعِ خاص و عام ہے جہاں دور دور سے لوگ دربارِ عالیہ پر حاضری دیتے ہیں اور فیضیاب و بامراد لوٹتے ہیں۔

⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘

منقبتیں حضور غریب نوازؒ

(۱)

بہر صورت نگاہوں میں ہے صورت میرے خواجہؒ کی
نظر سے پھر بھی اوجھل ہے حقیقت میرے خواجہؒ کی

رسول اللہؐ کی تصویر پھر جاتی ہے آنکھوں میں
تصور میں جب آجاتی ہے صورت میرے خواجہؒ کی

مرا جی چاہتا ہے اُس پہ بھی قربان ہو جاؤں
نظر آتی ہے جس میں بھی شباہت میرے خواجہؒ کی

قرارِ جانِ مشتاقاں سرورِ دیدۂ پاکاں!
علی الاطلاق ہوتی ہے جو زیارت میرے خواجہؒ کی

دل و جاں کو عوض اُس کا سمجھنا کم نگاہی ہے
نہیں ہے اس قدر سستی محبت میرے خواجہؒ کی

ابھی مشہود ہو جائے مقامِ قربِ "اَو اَدنیٰ"
ذرا ایسی ہو ہی جاتی ہے عنایت میرے خواجہؒ کی

معین الدینؒ سے لے کر مقامِ مصطفائیؐ تک
نہ جانے کتنے پردوں میں ہے صورت میرے خواجہؒ کی

جہاں جاؤں جہاں بیٹھوں وہ میرے ساتھ ہیں کامل
مکمل سی مکمل ہے معیت میرے خواجہؒ کی

حضرت کامل شطاریؒ

(۲)

معینِ ملتِ خیرالورا غریب نوازؒ
شعورِ مسلکِ مشکل کشا غریب نوازؒ

ہیں نورِ چشمِ علی مرتضیٰؓ غریب نواز
سرورِ قلبِ رسولِ خدا غریب نواز

ہر اک کا ملجا و ماوی ہے آپ ہی کا در
ہر اک غریب کے ہیں آسرا غریب نوازؒ

بہارِ گلشنِ عرفان ہیں عطائے رسولؐ
کہ دو جہاں کے ہیں حاجت روا غریب نوازؒ

پڑی اچٹتی ہوئی جس پہ کر لیا اپنا
تری نگاہِ کرم کے فدا غریب نوازؒ

دکن میں ہند میں سارے جہاں میں یا خواجہؒ
نہیں ہے کوئی تمہارے سوا غریب نوازؒ

حرم میں دیر میں قلب و نگاہِ مومن میں
ہیں ہر مقام پہ جلوہ نما غریب نوازؒ

انہیں کے نام سے ہوتی ہیں مشکلیں آساں
پکاریں یا علیؓ یا غوثؒ یا غریب نوازؒ

درِ حضورؒ پہ حاضر ہے زورؔ آغائی
کرم کی ایک نظر اُس پہ یا غریب نوازؒ

محمد علی زورؔ آغائی

حضرت خواجہ غریب نوازؒ کی تعلیمات

(ادارہ)

حضرت خواجہ غریب نوازؒ نے فرمایا :

" جو لوگ عارف ہیں اور دوست کی محبت میں مستغرق رہتے ہیں ان کے متعلق مرقوم ہے کہ جو بندہ رات کو طہارت سے سوتا ہے، فرشتہ کو ارشاد باری ہوتا ہے کہ جب تک وہ بیدار نہ ہو اس کے پاس رہو، فرشتہ عرض کرتا ہے کہ خداوند تعالیٰ اس بندے کو بخش دے کیونکہ نیک ہے اور طہارت کے ساتھ سویا ہے ۔"

پھر فرمایا : -

" شرح عارفان میں آیا ہے کہ جو بندہ طہارت سے سوتا ہے فرشتے اس کی روح زیر عرش لے جاتے ہیں باری تعالیٰ کا ارشاد ہوتا ہے کہ اس کو خلعتِ نور پہنایا جائے، جب وہ سجدہ کرتا ہے ارشاد ہوتا ہے کہ یہ نیک بندہ ہے ۔ جو رات کو طہارت سے سویا تھا جو بے طہارت سوتا ہے اس کی روح کو آسمانِ اول سے گرا دیتے ہیں یہ اس قابل نہیں ہے کہ آسمانِ اول پر لے جایا جائے اور خدا تعالیٰ کو سجدہ کرے ۔"

حضرت خواجہ غریب نوازؒ نے فرمایا کہ : -

" جامع الحکایات میں لکھا ہے کہ پہلے زمانہ میں ایک جوان فسق و فجور میں مبتلا تھا، تمام مسلمان اس سے بیزار ہو گئے تھے ۔ ہر چند اس کو سمجھایا جاتا تھا مگر وہ کسی کی نصیحت نہیں مانتا تھا، الغرض جب وہ مر گیا تو ایک بزرگ نے خواب میں دیکھا کہ اس کے سر پہ تاج ہے کمر میں زر نگاری پٹی لگی ہے اور لباسِ فاخرہ پہنے ہوئے ہے ۔ فرشتوں کو حکم ہوا کہ اس کو بہشت میں پہنچا دو ۔ بزرگ نے اس سے دریافت کیا کہ تو نے اپنی زندگی فسق و فجور میں گذاری تھی، پھر تجھے یہ دولت کیسے نصیب ہوئی ۔ کہنے لگا مجھ سے دنیا میں صرف ایک نیک کام ہوا کہ جب میں قرآن مجید کو دیکھتا تھا کھڑا ہو جاتا تھا، تعظیم کرتا تھا اور اس کو عزت کی نظر سے دیکھتا تھا ۔ صرف کلام پاک کی عظمت کے باعث خدائے تعالیٰ نے میرے سب گناہ بخش دے اور یہ درجہ عطا فرمایا ۔"

حضرت خواجہ غریب نوازؒ نے فرمایا کہ :

" پچھلے زمانہ میں ایک شخص ایسا گزرا ہے کہ جب وہ مشائخ کو دیکھتا تھا، منہ پھیر لیا کرتا تھا، اور آتشِ رشک و حسد سے جلنے لگتا تھا، الغرض اس کا انتقال ہو گیا ۔ جب اس کو قبر میں اتارا ہر چند چاہا کہ اس کا منہ قبلہ کی طرف کریں، مگر کسی طرح اس کا منہ قبلہ کی جانب نہیں ہوتا تھا، دوسری جانب پھر جاتا تھا خلقت کو حیرت ہوئی، غیب سے آواز آئی کہ تم لوگ اس شخص کے لئے کیوں رنج کرتے ہو، یہ وہ شخص ہے جو دنیا میں علماء اور مشائخ کو دیکھتا تھا تو منہ

پھیر لیتا تھا، پس جو شخص نے میرے دوستوں سے منہ پھیرا وہ میری رحمت سے محروم رہا اور گمراہ ہوا۔ قیامت کے دن ریچھ کی صورت میں اٹھایا جائے گا۔"

حضرت خواجہ غریب نوازؒ نے فرمایا: -

"قہقہہ گناہوں میں سے ایک گناہ ہے، گورستان میں ہنسنے کی ممانعت آئی ہے کیوں کہ وہ عبرت کی جگہ ہے نہ کہ لہو و بازی کی۔ حضور رسول اللہؐ نے خبر دی کہ جب کوئی گورستان میں گزرتا ہے، اس سے مردے کہتے ہیں کہ اے غافل! اگر تجھے یہ معلوم ہوتا کہ تجھے کیا درپیش ہے تو تیرے جسم کا گوشت پوست گر جاتا"۔

حضرت خواجہ غریب نوازؒ نے فرمایا کہ: -

"میں نے حضرت خواجہ عثمان ہارونی قدس سرہٗ سے سُنا ہے کہ قیامت کے دن کل انبیاء اولیاء اور مسلمانوں سے نماز کا حساب ہوگا، پس جو نماز سے عہدہ برآمد ہوگا خوشی پائے گا۔ جو اس کے جواب سے قاصر رہے گا عذابِ دوزخ میں مبتلا ہوگا"۔

آپ نے فرمایا کہ: -

"نماز دین کا رکن ہے اور رکن ستون ہوتا، پس جب ستون قائم ہو گیا تو مکان بھی قائم ہوگا۔ جب ستون نکل گیا تو چھت گر پڑے گی، چونکہ اسلام اور دین کے لئے نماز بمنزلہ ستون ہے۔ پس جب نماز میں فرض، سنت، رکوع سجود میں خلل پڑے گا، اس سے حقیقت اسلام و دین اور اس کے جزیات خراب ہو جائیں گے"۔

"آپ نے حسبِ ذیل حکایت بیان فرمائی: -

"ایک دن حضور سرورِ عالمؐ کا گزر ایک قوم پر ہوا، حضورؐ نے دیکھا کہ وہ لوگ خدا کا ذکر کر رہے ہیں مگر لہو و لعب میں مبتلا ہیں۔ اور ذکر خدا سے ان کا دل نرم نہیں ہوتا پس حضورؐ کھڑے ہو گئے اور فرمایا: -

یہ منافقوں کا طائفہ ہے کہ کلام ربانی سن کر ان کا دل نرم نہیں ہوتا"۔ ••

ملفوظات غریب نوازؒ

محمد اعظم ہنگولی

• عاشق کا دل آتش کدۂ محبت ہے، جو اس میں آئے اسے جلا کر ناچیز کر دیتا ہے، کیوں کہ عشق کی آگ سے تیز کوئی آگ نہیں۔

• عشق کی راہ ایسی ہے کہ جو اس راہ پر چلتا ہے اس کا نام و نشان نہیں ملتا۔

• اہلِ عرفان یادِ الٰہی کے سوا اور کوئی بات زبان سے نہیں نکالتے۔

• عارف سے ادنیٰ بات یہ ظاہر ہوتی ہے کہ وہ ملک و مال سے بیزار ہو جاتا ہے۔

• اگر دوست کی دوستی میں دونوں جہاں بھی بخش دیئے جائیں تب بھی کم ہے۔

• اہلِ محبت اگرچہ محبت میں مہجور ہیں، مگر کام ایسے لوگوں کا اختیار کرتے ہیں جو سوتے اور جاگتے ہیں مطلوب کے طالب ہیں اور اپنی دوست داری سے فارغ ہو کر مشاہدۂ دوست میں مشغول ہیں۔

• معشوق خود عاشق کی طلب گاری کو دیکھتا ہے محبت کی راہ میں مطیعان کا کلم ہے۔

• عارف وہ ہے جو اس بات کی جد و جہد کرتا ہے کہ ایک دم نصیب ہو جائے، اور عارف کا دم وہ ہے جو ذکرِ خدا کرے اور اپنی تمام عمر اس ایک دم پر فدا کرے مگر ایسا دم نصیب ہو جائے تو زہے نصیب، کیوں کہ ایسا دم زمین و آسمان میں سالہا سال تک تلاش کرنے پر بھی میسر نہیں آتا۔

• حاجی لوگ جسم کے ساتھ خانۂ کعبہ کا طواف کرتے ہیں پھر بھی انہیں مشاہدہ حاصل نہیں ہوتا، مگر عشاق دل سے حجابِ عظمت کا طواف کرتے ہیں۔ گر اس کے سوا اور چیز کو دیکھ لیتے ہیں تو فریاد کرتے ہیں اور بقا (مشاہدہ) چاہتے ہیں۔

• اہلِ سلوک میں محبت ایک ایسا علم ہے کہ لاکھوں علماء اس کو سمجھانا چاہتے ہیں مگر ذرہ بھر بھی ان کو اس کی خبر نہیں ہوتی اور زہد میں ایک ایسی طاعت ہے جس کی زاہدوں کو بھی خبر نہیں۔ وہ اس سے غافل ہیں۔ وہ ایک بھید ہے جو دونوں جہان سے باہر ہے اور اسے اہلِ محبت اور اہلِ عشق کے سوا کوئی نہیں جانتا جو دونوں جہاں میں ثابت ہوتا ہے، وہ اس بھید کو جانتا ہے بعد ازاں وہ دعوے نہیں کرتا، تاکہ دعوائے اسے رنج نہ پہنچائے۔

• دوست کے اسرار خوبصورت ہیں اور خوبصورت عاشق کے دل میں جاگزیں ہوتے ہیں۔

• اگر ہو سکے تو بقا حاصل کرو، صلاحیت اور زہد تو ایک ہوا کی طرح ہیں جو تم پر چلتی ہے۔

• جب اللہ تعالیٰ اپنی رضا کسی کو دے دے تو وہ بہشت کیا کرے

• اس راہ (راہِ سلوک) میں بہت سے مرد عاجز اور عاجز ہو گئے۔

• گناہ تمہیں اتنا نقصان نہیں پہنچا سکتا جتنا مسلمان بھائی کو خوار و ذلیل کرنا۔

• نیکوں کی صحبت نیک کام سے بہتر ہے اور بدوں کی صحبت بدکام سے بدتر ہے۔

• عشق و محبت میں گفتگو، حرکت و مشغلہ اس وقت تک ہے جب تک باہر ہیں۔ جب اندر پہنچتے ہیں خاموشی سکون اور آرام میسر آتا ہے اور فریاد و شور ہرگز نہیں رہتا

• فریاد کی دیری اس وقت تک رہتی ہے جب تک دوست سے غائب اور اپنا عاشق بنا ہوا ہے، جب حضوری حاصل ہوتی ہے تو فریاد گفتگو نہیں رہتی۔

• اللہ تعالیٰ کے عارف ایسے ہوتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے کچھ نہیں لیتے۔

• ہر وہ عارف جس میں تقوے ہو وہ گداگری کرے تو لقمہ حرام کھاتا ہے۔

• اہلِ سلوک اور اہلِ محبت میں محبت یہ ہے کہ دوست کے مطیع رہیں اور ڈرتے ہیں کہ کہیں دور نہ کر دیئے جائیں۔

• عارف دنیا کا دشمن اور خدا کا دوست ہوتا ہے وہ دنیا میں متنفر ہوتا ہے اور اسے غل وغش اور حسدات کی خبر تک نہیں ہوتی۔

• عارف اس وقت تک روتا ہے جب تک راہ میں ہوتا ہے لیکن جب حقائق قرب پہنچ جاتا ہے اور وصال حاصل ہو جاتا ہے تو گریہ نہیں رہتا۔

• اللہ تعالیٰ کے ایسے عاشق بھی ہوتے ہیں جنھیں اس کی دوستی نے خاموش کر رکھا ہے، انہیں عالم موجودات کی کسی چیز کی خبر نہیں ہوتی۔

• جس دل میں اللہ تعالیٰ کی دوستی ہوتی ہے اس کی جان کو قرار حاصل ہوتا ہے۔ پس اس کو چاہئے کہ دونوں جہان کو بیگانہ دیکھے اگر ایسا نہیں کرے گا تو عاشق صادق نہیں۔

• درویشی اس کا نام ہے کہ جو آئے اسے محروم نہ جانے دے۔ اگر بھوکا ہے کھانا کھلائے، اگر ننگا ہے تو نفیس کپڑا پہنائے ہر حال اسے خالی نہ جانے دے، اس کا حال پوچھ کر دلجوئی کرنا چاہیئے۔

• راہِ محبت میں عاشق وہ ہے جو دونوں جہان سے دل اٹھائے۔

• محبت چار معنیٰ رکھتی ہے اول ذکرِ خدا میں دل و جان سے خوش رہنا، دوم ذکرِ خدا کو بزرگ تر جاننا، سوم اس کے ساتھ مشغلہ رہے، دوسروں سے قطع تعلق کرلے، چہارم اپنے آپ پر روئے اور اس پر جس کو اس سے غیرت ہے۔

• محبت میں صادق وہ ہے جو ماں باپ، فرزند و برادران سے خدا اور رسولؐ کے لیئے قطع تعلق کرے اور سب سے بیزار ہو۔

• محب وہ ہے جو نفس، کلام اللہ کے مطابق حق کی دوستی میں صادق رہے۔

• عارفوں کا توکل سوائے خدا کے کسی اور پر نہیں ہوتا، نہ وہ کسی اور کی طرف التفات نہیں کرتے ہیں۔

• عاشقوں کا ایثار عاشقی بے نیازی ہے اور مجنوں کا

آرزو ہے۔

• عارفوں میں صادق وہ ہے جس کی ملکیت میں کچھ نہ ہو، نہ وہ کسی کا مالک ہو۔

• عارفوں کی خصلت محبت میں اخلاص ہے۔

• جہاں میں عزیز ترین یہ ہے کہ درویش درویشوں سے ملیں اور جو کچھ دل میں ہو صاف صاف بیان کریں۔ اور بدترین چیز ہے کہ درویش درویشوں سے جدا رہیں۔

• اللہ تعالیٰ سے دوستی اس طرح ہوتی ہے کہ جن چیزوں سے اللہ تعالیٰ سے دشمنی رکھتا ہے ان سے دشمنی رکھے یعنی دنیا نفس سے۔

• عارف محبت میں کامل اس وقت ہوتا ہے جب درمیان سے گفتگو اٹھ جائے، ایسا ہو جائے کہ یا دوست رہے یا خود۔

• حقیقتاً متوکل وہ ہے جو خلقت کے آزار و رنج پہنچانے پر نہ کسی سے شکایت کرے نہ حکایت۔

• اہلِ توکل پر غلباتِ شوق میں ایسا وقت آتا ہے کہ اس وقت اگر انہیں ذرہ ذرہ کر دیا جائے اور ان کو تلوار سے زخمی کر دیا جائے یا کوئی اور تکلیف پہنچائی جائے تو انہیں مطلق خبر نہیں ہوتی۔

• عارف کا توکل حق کے ساتھ اس طرح ہوتا ہے کہ وہ عالمِ سکر میں متحیر ہوتا ہے۔

• عارف وہ ہے جو راہ حق میں سوائے حق کے کسی کو نہ دیکھے۔

• توبہ کے چند مقامات ہیں، جاہلوں سے دور رہنا، باطل کو ترک کرنا، منکروں سے روگردانی کرنا، محبوب سے محبت رکھنا، خیرات کرنا، توبہ کو درست کرنا اور مظالم کو رد کرنا۔

• جب محب مملکت کا دعوےٰ کرتا ہے، محبت کے درجے سے گر جاتا ہے۔

• محبت وفا کا دعویٰ وصال اور حرمت باطل کے ساتھ ہیں۔

• اہلِ محبت وہ لوگ ہیں جو صرف حق تعالیٰ کی بات سنتے ہیں۔

• جب اہلِ محبت مرتا ہے جلد بخش دیا جاتا ہے۔

• دل وہ ہے جو اپنے حال سے خالی ہو اور مشاہدہ دوست میں باقی ہو۔

• عارف وہ ہے کہ جب صبح کو اٹھے تو اسے رات کی بابت کچھ یاد نہ ہو۔

• اے غافل اسی سفر کا توشہ تیار کر جو تجھے در پیش ہے، یعنی سفرِ آخرت کا۔

• اہلِ محبت کے گروہ اور حق کے درمیان کوئی حجاب نہیں۔

• محبت میں عارف وہ ہے جسے کوئی شئے عجیب نہ معلوم ہو کیونکہ تسلیم و دعوے ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔

• سب سے اچھا وہ وقت ہے جب کہ وسواس نفس نہ ہو اور خلقت سے رہائی حاصل ہو۔

• جس کو محبت و فقر عطا کیے جاتے ہیں اسے وحشت نہیں دی جاتی کہ وہ اس پر فریفتہ ہو جائے۔

• یقین ایک نور ہے جس سے انسان منور ہو جاتا ہے۔ بعد ازاں وہ محبان و متقیان میں شامل ہو جاتا ہے۔

• بقا عین حق ہے۔

• تجرید یہ ہے کہ صفاتِ محبوب محب کے دل اور صفات میں جاگزیں ہو جائیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے "جو مجھ سے محبت کرتا ہے" میں اس کے لئے کان اور آنکھ بن جاتا ہوں۔

• علم محیط ہے اور معرفت اس کا جزو ہے۔ پس خدا کہاں اور بندہ کہاں، علم خدا ہی کو ہے مگر معرفت ہر دو کو ہے۔

• جب تک عارف کو سِرِ خالص نصیب نہیں ہوتا۔ اس کا کوئی فعل خالص نہیں ہوتا۔

• جس کو خدا دوست رکھتا ہے اس پر بلا نازل کرتا ہے۔

• عارف وہ ہے جو سوائے ذکر حق کے کسی کو دوست نہیں رکھتا۔

• دوستی اس کا نام ہے کہ اس کا ذکر دل سے کرے کیوں کہ دل یاد کے لئے بنایا گیا ہے۔

• کتاب محبت میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے بندہ جب میرا ذکر تجھ پر غالب ہو جاتا ہے میں تیرا عاشق ہو جاتا ہوں۔

• عارف آفتاب صفت ہوتے ہیں۔ ان سے تمام عالم منوّر ہوتا ہے۔

• چار چیزیں گوہر نفس ہیں۔ اول درویشی جو تونگر کر دے۔ دوسرے بھوک جو سیر کر دے۔ تیسرے اندوہ جو شادی دکھائے، چوتھے دشمن کے ساتھ ایسی مردی جو دوستی دکھائے۔

• اہل محبت کا یہ مرتبہ ہے کہ اگر ان سے پوچھیں کہ شب کی نماز پڑھ لی تو کہیں اس سے فراغت نہیں۔ ہم ملک الموت کے گرد پھرتے ہیں، جب درماندہ ہو جاتے ہیں اس کا ہاتھ پکڑ لیتے ہیں۔

• عارف وہ ہے جو تمام عالم سے خبردار ہو، اور لاکھوں معنی بیان کرے اور ہر وقت بحر معانی میں شناوری کرتا رہے تاکہ اسرار الٰہی اس سے نکالے اور جوہر یان مہر کو دکھائے کہ وہ اسے پسند کریں اور جانیں کہ عارف ہے۔

• عارف وہ ہے جو ہر وقت ولولۂ عشق اور قدرت آفرینش میں متحیر رہے، اگر کھڑا ہے تو دوست کے دم میں ہے اگر بیٹھا ہے تو دوست کے ذکر میں ہے اگر خواب میں ہے تو دوست کے خیال میں ہے۔ اگر بیدار ہے تو دوست کے حجاب عظمت کے گرد طوائف میں ہے۔

• عارف اس کو کہتے ہیں جس پر عالم غیب سے صد ہزار تجلیات نازل ہوں اور ایک وقت میں چند ہزار حال و تجلیات اس میں دمبدم پیدا ہوں۔

• عارف کی ایک علامت یہ ہے کہ وہ ہر وقت متبسم رہتا ہے جس وقت عارف مسکراتا ہے اس وقت عالم ملکوت میں مقربان اس کے سامنے ہوتے ہیں، جو کچھ ان سے ظاہر ہوتا ہے وہ اسے دیکھ کر مسکراتا ہے۔

• عارف پر ایک ایسی حالت طاری ہوتی ہے کہ اس وقت ہزار ایسے ملک پیش کئے جائیں جن میں ہر قسم کے عجائبات ہوں تو وہ ان کو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا، مگر اس چیز کو جو اس پر طاری کی گئی ہے۔

• عارفوں پر ایک حالت طاری ہوتی ہے کہ اس

وقت وہ عرش سے حجابِ عظمت تک کا فاصلہ طے کر لیتے ہیں اور وہاں سے حجاب کبریا تک پہنچ جاتے ہیں پھر دوسرے قدم میں اپنے مقام تک آجاتے ہیں. مگر یہ ادنیٰ درجہ عارفوں کا ہے، لیکن جو کامل ہیں ان کا درجہ خدا ہی جانتا ہے کہ وہ کہاں سے کہاں پہنچتے ہیں اور کب واپس آجاتے ہیں۔

• عارف وہ ہے جو کہیں بھی ہو اور کچھ بھی طلب کرے، وہ اس کے سامنے آجائے، جس سے بات کرے جواب پائے، اس راہ میں وہ عارف نہیں جو خدا کے سوا کسی اور چیز کے درپے ہو۔

• عارفوں کا ایک درجہ اس قسم کا ہوتا ہے کہ اس درجہ پر وہ دنیا و مافیہا اپنی دو انگلیوں میں دیکھتے ہیں۔

• عارف کا کمتر درجہ یہ ہے کہ صفاتِ حق اس میں پائی جائیں۔

• مرید کو طاعت میں اس وقت لطف آتا ہے جب طاعت میں خوشی و خرمی حاصل ہوتی ہے۔ اس خوشی میں وہ حجاب سے قریب ہو جاتا ہے۔

• عارف کا کمال درجہ یہ ہے کہ پہلے دلی نور دکھائے پھر کوئی اگر دعوے کے ساتھ سامنے آئے تو اسے بقوت کرامت ملزم بنا دے۔

• جب عارف خاموش ہوتا ہے تو اس سے یہ مطلب ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے باتیں کرتا ہے۔ جب آنکھیں بند کرتا ہے تو اس لئے نہیں کھولتا کہ شاید اسرافیل صور نہ پھونک دے۔

• جس نے خدا کو پہچان لیا اگر وہ خلق سے دور نہ بھاگے سمجھ لو اس میں کوئی نعمت نہیں۔

• عارف کا کمال یہ ہے کہ اپنے آپ کو راہِ خدا میں جلا دے۔

• قیامت کے دن اگر بہشت میں کوئی چیز پہنچائے گی، تو وہ زہد ہے نہ کہ (صرف) علم و عمل۔

• عارف خواہ معرفت کے متعلق کتنا ہی بیان کرے اور دوست کی گلی میں پھرے، مگر جب تک معارف یاد نہ کرے معرفت کو نہیں پہنچتا۔

• اہلِ محبت کی فریاد بوجہ شوق و اشتیاق اس وقت تک رہتی ہے جب تک کہ وہ دوست نہ مل جائے۔ کیونکہ عاشق اسی وقت تک واویلا کرتا ہے۔ جب تک دولتِ مشاہدہ حاصل نہیں ہوتی۔ جب مشاہدہ حاصل ہو جاتا ہے گفتگو نہیں رہتی۔

• دریاؤں کا بہتا پانی شور کرتا ہے، لیکن جب سمندر سے مل جاتا ہے آواز نہیں رہتی۔ اسی طرح جب عاشق معشوق سے واصل ہو جاتا ہے تو واویلا نہیں کرتا۔

• جب عارف کا حال کامل ہو جاتا ہے تو لاکھوں مقام سے باہر نکلتا ہے اور اپنا کام ترقی پذیر پاتا ہے۔ اگر اس مقام سے نہ نکلے تو اسی مقام میں حیران رہ جاتا ہے، یعنی ابھی کنارے پر ہے اسے راہ معلوم ہی نہیں۔ اس لئے زیادہ تر ضائع ہی رہتا ہے۔

• درویش میں اتنی قوت باطنی ہونی چاہیئے کہ اگر سننے والا حکایت اولیاء اللہ میں شک کرے تو اسے مشاہدہ کرا کر قائل کر دے۔ ••

مکتوباتِ عالیہ

عبدالصمد چشتی

حضرت خواجہ غریب نوازؒ نے جہاں اپنی تصانیف ملفوظات اور قلم پاروں کے نایاب و نادر روزگار ذخیرے چھوڑے وہاں حضرت کے مکاتیب عالیہ کے بھی چند نہایت بیش قیمت اور یگانہ روزگار نسخے موجود ہیں جو طالبان دین اور عقیدت مندانِ غریب نوازؒ کے لئے نورِ بصیرت اور غذائے روحانی مہیا کرتے ہیں۔ ان مکتوبات کے لئے ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف میں نورِ معرفت کی تابش موجیں مار رہی ہیں اور بعض ایسے اسرار و رموز کے پردے اٹھتے دکھائی دیتے ہیں جن سے نہ صرف مکتوبات عالیہ پر روحانی اثرات مرتب ہوئے ہیں بلکہ ان کے مطالعے سے ہر دور میں لوگ مستفید ہوتے رہتے ہیں۔ یہ تمام مکتوبات عالیہ اس زمانے کی مروجہ فارسی زبان میں رقم ہیں اور اسلوب نگارش کے لحاظ سے مایۂ امتیاز قرار دیئے جا سکتے ہیں۔

یہ مکاتیب حضرت خواجہ غریب نوازؒ نے اپنے خلیفۂ اعظم و جانشین حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کو وقتاً فوقتاً رقم فرمائے ہیں۔ یہ مکاتیب اسرار الواصلین کے مولف احمد اختر صاحب کے وسیلے سے ہم تک پہنچے ہیں جنہوں نے اپنی سیاحت کے دوران قدیم قلمی نسخوں سے بسندِ صحیح نقل کئے ہیں۔

حضرتؒ کے مکاتیب جمیل کے بعض اقتباسات کے اردو ترجمے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

"حقائق و معارف سے واقف رب العالمین کے عاشق،

برادرم خواجہ قطب الدین!

کو معلوم ہو، لوگوں میں عاقل ترین وہ فقراء ہیں جنہوں نے درویشی و مرادی اختیار کرلی ہے کیونکہ اس میں مراد نامرادی ہے اور نامرادی مراد ہے۔ برخلاف اس کے اہلِ غفلت نے صحت کو زحمت اور زحمت کو صحت خیال کر رکھا ہے۔ پس دانا وہی ہے جو دنیاوی مراد ترک کرکے فقر و نامرادی اختیار کرے اور اپنی مراد چھوڑ کر نامرادی سے موافقت کرے۔ ع

"نامرادے تا نگردی بامرادے کے رسی"

پس مرد کو حق تعالےٰ سے وابستگی لازم ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اگر خدا آنکھ دے تو ہر راہ میں سوا اس کے کچھ نہ دیکھے۔ جہاں میں جسے دیکھے اس میں اس کی حقیقت دیکھے، کیونکہ ہر ذرۂ خاک جہاں نما ہے۔ اگر دیکھا جائے بجز شوق مواصلت ظاہری اور کیا لکھوں۔"

(ترجمہ اسرار الواصلین)

اپنے ایک اور مکتوب میں حضرتؒ اپنے جانشین کو اسرار الٰہی کے چند نکات سمجھاتے ہیں اور تاکید ہے کہ طالبانِ حق اور مریدین صادق اسے سمجھ لیں تاکہ ان امور میں کسی قسم کی فروگذاشت کا شبہ باقی نہ رہے۔ مکتوب ملاحظہ ہو:

"میرے دلی محب، میرے قلبی دوست! برادرم خواجہ قطب الدین دہلوی!!

اللہ تعالےٰ آپ کو دونوں جہاں کی سعادت عطا

بندہ مسکین معین الدین

عزیز من! جس نے اللہ تعالیٰ کو پہچان لیا وہ کبھی سوال یا خواہش یا آرزو نہیں کرتا جس نے نہیں پہچانا ہے وہ ان کی بات کو نہیں سمجھ سکتا۔ دوسرے حرص و ہوا کو ترک کرنا چاہیئے۔ جس نے حرص و ہوا کو ترک کیا اس نے مقصود حاصل کرلیا۔ چنانچہ ایسے شخص کیلئے باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"جس نے اپنی خواہشات نفسانی کو روکا اس کا ٹھکانا بہشت ہے" جس دل کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے پھیر دیا اسے کثرت شہوات کے کفن میں لپیٹ کر زمین ندامت میں دفن کر دینا چاہیئے۔

ایک بار خواجہ بایزید بسطامیؒ نے فرمایا کہ "ایک دن خواب میں دیدار الٰہی سے مشرف ہوا۔ پوچھا" بایزید کیا چاہتے ہو؟" عرض کیا "جو تو چاہتا ہے" خطاب ہوا" اچھا جس طرح تو میرا ہے اسی طرح میں تیرا ہوں"۔

ہر کہ گردن نہد رضا او را
مر مرا حق نگاہبان باشد

جو تصوف کی ماہیت سے واقف ہونا چاہے وہ اپنے اوپر آسائش کا دروازہ بند کرلے۔ پھر زانوئے محبت کے بل بیٹھ جائے۔ اگر یہ کام کرلیا تو سمجھو کہ اہلِ تصوف ہوگیا۔ طالبانِ حق کو یہ امر دل و جان سے بجالانا چاہیئے۔ انشاً اللہ تعالیٰ وسوسہ شیطانی سے نجات پائے گا اور دونوں کی مرادیں حاصل کرے گا

ایک روز میرے شیخ علیہ الرحمہ نے فرمایا "معین الدین کیا تجھے معلوم ہے کہ "صاحب حضور" کسے کہتے ہیں؟ صاحب حضور وہ ہے کہ ہر وقت مقام عبودیت میں ہو اور ہر ایک واقعہ کو اللہ کی طرف سے خیال کرے اور جانے اور اس پر راضی رہے' وہ جہان کا بادشاہ ہے' بلکہ جہان کا بادشاہ اس کا محتاج ہے۔ بعض درویش کہتے ہیں کہ جب طالب کمال حاصل کرلیتا ہے تو گھبراہٹ نہیں رہتی یہ غلط ہے۔ دوسرے جو کہتے ہیں کہ عبادت کرنا بھی اس لئے ضروری نہیں ہوتا یہ بھی غلط ہے۔ کیونکہ سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وسلم ہمیشہ عبادت' بندگی اور عبودیت میں سربسجود رہے اور اس کے باوجود عجز کا یہ عالم کہ حضورؐ فرماتے تھے۔

" ہم نے تیری ایسی عبادت نہیں کی جیسا کہ حق تھا"

یقین جانو کہ جب عارف کمالیت کا درجہ حاصل کرتا ہے تو اس وقت کمال درجہ کی ریاضت جس سے مراد نماز ہے نہایت صدق دل سے ادا کرتا ہے۔ جو کوئی شخص یہ معلوم کرکے صدق سے کام لیتا ہے تو اسے اتنی پیاس محسوس ہوتی ہے گویا اس نے آگ کے کئی پیالے پی رکھے ہیں۔ جوں جوں ایسے پیالے پیتا ہے پیاس غلبہ کرتی ہے۔ اس واسطہ کے جمال لامتناہی کی انتہا نہیں۔ اس وقت اس کا سکون بے سکون اور آرام بے آرام ہوتا جاتا ہے تا وقتیکہ لقائے الٰہی سے مشرف نہ ہو جائے۔

والسلام فقیر معین الدین

(اسرار الواصلین ص ۸۵، ۸۶)

حضرت خواجہ غریب نوازؒ قطب الاقطابؒ کو اپنے ایک مکتوب میں قربتِ الٰہی کی منزلوں کے اسرار و رموز کو بعض حوالوں اور دلائل سے سمجھاتے ہوئے نظر آتے ہیں

اس وقیع مسئلہ کا جس خوبصورتی اور سادگی کے ساتھ حضرت خواجہ نے احاطہ فرمایا ہے۔ دوسرے بزرگوں نے اس ضمن میں دفاتر کے دفاتر اسی موضوع پر رقم کئے ہیں مگر حضرتؒ نے اس مسئلہ کی تمام باریکیوں کو اپنی نگاہِ معجز نما سے ایک مختصر خلاصہ کی شکل میں پیش کر دیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

درمند طالبِ شوق، دیدار الٰہی کے آرزومند، درویش وجفاکیش میرے بھائی خواجہ قطب الدین!

اللہ تعالیٰ آپ کو دونوں جہاں میں سعادت نصیب فرمائے۔

سلام مسنون کے بعد مقصود یہ ہے کہ ایک روز خواجہ عثمان ہارونی کی خدمت میں خاکسار بمعہ اپنے مرید بھائیوں کہ حاضر تھا کہ اتنے میں ایک شخص نے حاضر خدمت ہوکر حضرت خواجہ صاحب سے دریافت فرمایا:

"یا خواجہ! یہ کیسے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ کسی شخص کو قربِ الٰہی حاصل ہو گیا ہے۔"

خواجہ صاحبؒ نے فرمایا:

"نیک عملوں کی توفیق اس سب سے بڑی ساخت ہے۔ یقین جانو جس شخص کو نیک کاموں کی توفیق دی گئی ہے اس کے قرب کا دروازہ کھل گیا ہے۔"

پھر آبدیدہ ہو کر فرمایا "ایک شخص کے ہاں ایک صاحبِ وقت لونڈی تھی ہر رات نصف شب کے وقت اٹھ کر وضو کر کے دو رکعت نماز ادا کرتی اور شکر حق بجا لاتی پھر ہاتھ اٹھا کر دعا کرتی:

"پروردگار میں تیرا قرب حاصل کر چکی ہوں۔ مجھے اپنے سے دور نہ رکھنا۔"

اس لونڈی کے آقا نے یہ ماجرا سن کر اس سے پوچھا:

"تمہیں کیوں کر معلوم ہوا کہ تمہیں قرب الٰہی حاصل ہے"

لونڈی نے کہا "مجھے یوں معلوم ہے کہ اس نے مجھے آدھی رات کے وقت جاگ کر دو رکعت نماز پڑھنے کی توفیق دے رکھی ہے۔ اسواسطے میں جانتی ہوں کہ مجھے قرب حاصل ہے۔

آقا نے کہا:

"لونڈی! جا میں تجھے راہ خدا میں آزاد کرتا ہوں۔"

پس انسان کو دن رات عبادت الٰہی میں مصروف رہنا چاہیئے تاکہ اس کا نام نیک لوگوں کے دفتر میں درج ہو جائے اور نفس و شیطان کی قید سے بچ جائے

والسلام فقیر معین الدین چشتی سجزی۔

(اسرار الواصلین)

قربِ الٰہی کے ساتھ ہی ساتھ خداشناسی بھی ایک رقیق مسئلہ ہے اور اس کی طلب اور حصول کے باب میں اب تک کئی بزرگوں نے طبع آزمائی فرمائی ہے اور اس دشوار گذار منزل تک پہنچنے میں رہنمائی کی ہے حضرت خواجہؒ نے اپنے ایک مکتوب میں اس نکتہ پر قلم اٹھایا ہے اور بفضلہ تعالیٰ نہایت سلجھے ہوئے انداز میں اس کی گرہ کشائی فرمائی ہے۔ طالبانِ حق کے لئے اس مکتوب کا ایک ایک لفظ رہنمائی کی روشن قندیلوں کی مثال ہے ملاحظہ ہو۔

اللہ الصمد کے اسرار سے واقف لم یلد ولم یولد کے انوار کے ماہر میرے بھائی قطب الدین!

اللہ تعالیٰ آپ کے مدراج کو زیادہ کرے"۔
فقیر پُر تقصیر معین الدین سجزی کی طرف سے خوشی
خوشی آمیز اور انس و محبت سے بھرا ہوا سلام پہنچے۔
مقصود یہ کہ تا دمِ تحریر صحت ظاہری کے سبب مشکور ہوں
اللہ تعالیٰ آپ کو ثوابِ دارین عطا فرمائے۔
بھائی میرے شیخ خواجہ عثمان ہارونیؒ فرماتے ہیں:
سوائے اہلِ معرفت کے کسی اور کو عشق کے رموزات
سے واقف نہیں کرنا چاہیئے۔"
جب خواجہ شیخ سعدی میگوئیؒ نے آنجناب سے پوچھا:
"اہلِ معرفت کو کیوں کر پہچان سکتے ہیں"۔
تو آپؒ نے فرمایا:
"اہلِ معرفت کی علامت تُرک ہے جس میں ترک
ہے یقین جانو کہ وہ اہلِ معرفت ہے اور اُسے خداشناسی
حاصل ہے۔ اور جس میں ترک نہیں اس میں معرفت
حق کی بو بھی نہیں۔ یہ اچھی طرح یقین کرلو کہ کلمۂ شہادت
اور نفی و اثبات حق تعالیٰ کی معرفت ہے۔ مال و مرتبہ
بڑے بھاری بت ہیں۔ انہوں نے بہت لوگوں کو سیدھی
راہ سے گمراہ کیا اور کر رہے ہیں۔ یہ معبود خلائق بن رہے
ہیں۔ بہت لوگ جاہ و مال کی پرستش کرتے ہیں۔ پس جس
نے مال و جاہ کی محبت کو دل سے نکال دیا اس نے گویا
پوری نفی کردی ہے اور جسے حق تعالیٰ کی معرفت حاصل
ہوگئی اس نے پورا پورا اثبات کرلیا اور یہ بات
لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ کے کہنے اور اس پر عمل کرنے سے
حاصل ہوتی ہے۔ پس جس نے کلمۂ شہادت نہیں پڑھا اسے
خداشناسی حاصل نہیں ہوئی۔" والسلام"

حضرت غریب نوازؒ نے اپنی زندگی کی طرح اپنے خطوط
سے بھی اسرار و رموزِ دین کی نقاب کشائی کا کام لیا ہے۔
اور یہ بات ہمیشہ ذہن نشین رکھنا چاہیئے کہ یہ پیغامات
حضرت ایک ایسے شاگرد اور خلیفہ کے نام مرحمت فرما
رہے ہیں جو خود دین کے لقب سے مشرف ہونے والا ہے۔
ایسے اسرار و رموز کے متعلق خواجہ صاحبؒ نے جن الفاظ
میں وضاحت فرمائی ہے اُن کی سالمیت اور صحت بالائے
شک و شبہ ہے۔

یہ تمام خطوط کسی کے ذاتی امور سے عبارت نہیں،
بلکہ دو زندگیوں کی سرگزشت ہیں جنہوں نے اپنی ذات کو
نکال کر ذاتِ برحق کے لیئے زندہ رہے اور اس کی ذات کی
خوشنودی ان کی حاصلِ زندگی بنی۔

کلمۂ شہادت کے باب میں حضرتؒ کا معجز نمایاں
قلم یوں رقمطراز ہوتا ہے:

مخزنِ اسرار یزدانی، معدنِ فیوضاتِ سبحانی
میرے بھائی خواجہ قطب الدین
اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے!

ایک روز میرے شیخؒ نے نفی و اثبات کے کلمہ کی بابت
کیا خوب فرمایا کہ نفی اپنے آپ کو نہ دیکھنا اور اثبات اللہ
تعالیٰ جل جلالہ کو دیکھنا ہے کیونکہ کوئی خود بین، خدا
بین نہیں ہوسکتا۔ پس نفی کی نفی کرنے والا ہونا چاہیئے
ورنہ نفی کا کوئی فائدہ نہیں، اگر یہ خیال کریں کہ ہستی صرف
اللہ تعالیٰ کی ہستی ہے تو مطلب حاصل ہوجاتا ہے۔

واضح رہے کہ کلمۂ شہادت، نماز، روزہ وغیرہ
کی صورت بھی اور حقیقت بھی، ان کے حقائق کو چھوڑ کر

صرف ظاہر صورتوں پر قناعت کرلینا فضول ہے۔ وہ شخص بڑا احمق ہے جو ان کے حقائق تک نہیں پہنچتا۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ تھا اور ہمیشہ رہے گا۔ سالک ابتدا میں نابینا ہوتا ہے۔ جب حق تعالیٰ کی طرف سے اسے بینائی مل جاتی ہے تو پھر اس سے دیکھتا اور سنتا ہے، اپنے آپ کو فراموش کر دیتا ہے۔ جب ایسی صورت ہو جائے تو واصل ہمیشہ کے لئے زندہ ہو جاتا ہے۔ "زیادہ والسلام"

" عارف معارف حق آگاہ، عاشق اللہ

بھائی خواجہ قطب الدین اویسی

اللہ تعالیٰ آپ کے فقر کو زیادہ کرے۔ دعاگو کی طرف سے انس آمیز سلام کے بعد مکشوف رائے معرفت پیرا ہو۔

عزیز من! اپنے مریدوں کو ضرور بتادینا کہ فقیر مرشد کامل کیا مراد ہے، اور اسکی علامت کیا ہے، اور یہ کیونکر پہچانا جاتا ہے؟

مشاہیر طریقت قدس اللہ اسرارہم نے فرمایا ہے:

" الفقیر مالا یحتاج الی کل شئی قدیر " فقیر اس کو کہتے ہیں جو تمام ضروریات سے فارغ ہوا اور اس کے باقی رہنے والے جمال کے سوا اور کسی چیز کا طالب نہ ہو۔ کیونکہ تمام موجودات اسکے باقی رہنے والے کا آئینہ اور مظہر ہیں اسواسطے وہ ان میں اپنا مقصود دیکھتا ہے"

بعض بزرگوں نے اس کی تشریح یوں فرمائی ہے:

کامل فقیر اسے کہتے ہیں جس کے دل میں سوائے اللہ تعالےٰ کے اور کوئی اس کا مقصود و مطلوب نہ ہو۔ جب ماسوا اللہ دل سے دور ہو جاتا ہے مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔"

پس طالب کو ہمیشہ مطلوب و مقصود کے درپے رہنا چاہیئے اب یہ معلوم کرلینا چاہیئے کہ مطلوب و مقصود کیا ہے۔ پس معلوم ہونا چاہیئے کہ مقصود یہی درد و سوز ہے۔ خواہ حقیقی ہو یا مجازی، یہاں سوز مجازی سے مراد ابتدائے احکام شریعت ہے" والسلام"۔

اور آخر میں حضرتؒ کا ایک مکتوب پیش کیا جاتا ہے جس میں حقیقت و مجاز پر خامہ فرسائی کی گئی ہے اور خوب حق ادا ہوا ہے۔

محب ہمراز اہل یقین،

برادرم خواجہ قطب الدین دہلوی

رب العالمین ہر کام میں تمہاری رہنمائی فرمائے

از فقیر معین الدین

مَنْ عَرَفَ اللهَ لَا يَقُولُ اللهَ وَمَنْ يَقُولُ مَا عَرَفَ اللهَ یعنی جسے معرفتِ حق تعالیٰ حاصل ہو جاتی ہے وہ اللہ اللہ نہیں کہتا پھرتا جو کہتا پھرتا ہے اُسے معرفت میسر نہیں بمصداق مَنْ عَرَفَ رَبَّهُ فَقَدْ كَلَّ لِسَانُهُ وَقَطَعَ أَمْرُهُ" یعنی جس نے اپنے رب کی معرفت حاصل ہو گئی وہ گونگا اور لنگڑا ہو گیا۔ عارف کامل کی حالت مقام یاد سے بھی گذر جاتی ہے کیونکہ یاد بھی ایک قسم کی دوئی ہے اور دوئی عارفوں کے نزدیک نقص ہے۔ ارشاد خداوندی ہے وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَمَا كُنْتُمْ یعنی تم جہاں بھی ہو خدا تمہارے ساتھ ہے۔

عارف صحیح معنوں میں شہنشاہ ہو جاتا ہے۔ اسے بجز ذات ایزدی نہ کسی سے امید ہوتی ہے اور نہ کسی سے ڈر۔ ایسے لوگوں کے حق میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ یعنی اولیاء اللہ کو نہ کسی کا خوف ہوتا ہے نہ کسی کا ڈر۔ اللہ تعالیٰ بندے کے دل میں ہے اور دل قلب انسان میں، مگر دل دو قسم کا ہے ایک دل مجازی۔ دوسرا حقیقی۔

حقیقی دل وہ ہے جو نہ داہنے جانب ہے نہ بائیں جانب نہ اوپر کی طرف، نہ نیچے کی جانب دور ہے نہ نزدیک مگر اس حقیقی دل کی شناخت آسان نہیں۔ صرف مقربانِ خدا اسے جانتے ہیں مومن کامل کا دل درحقیقت عرش خدا ہوتا ہے

قلب المومن عرش اللہ تعالےٰ

قرب حضوری بغیر صحبتِ مرشد کامل حاصل نہیں ہو سکتی۔

کامل درطالبانِ صادق سوال و جواب نہیں کیا کرتے بلکہ خاموش اور باادب رہتے ہیں۔

" والسلام"


FAROOKY
TOOTH POWDER

فارم نمبر ۴ تحت ضابطہ ۸

بابت ملکیت و دیگر تفصیلات برائے ماہنامہ "ذوقِ نظر" حیدرآباد آندھراپردیش

مقام اشاعت: ۲۲-۸-۶۱۳ چھتہ بازار حیدرآباد ۲...۵

اوقات اشاعت: ماہنامہ

پرنٹر کا نام: محمد بشیرالدین وارثی

پتہ: ۲۲-۸-۶۱۳ چھتہ بازار حیدرآباد ۲...۵

قومیت: ہندوستانی

پبلیشر کا نام: محمد بشیرالدین وارثی

پتہ: ۲۲-۸-۶۱۳ چھتہ بازار حیدرآباد ۲...۵

قومیت: ہندوستانی

ایڈیٹر کا نام: محمد بشیرالدین وارثی

پتہ: ۲۲-۸-۶۱۳ چھتہ بازار حیدرآباد ۲...۵

قومیت: ہندوستانی

مالک کا نام: محمد بشیرالدین وارثی

پتہ: ۲۲-۸-۶۱۳ چھتہ بازار حیدرآباد ۲...۵

قومیت ہندوستانی

میں محمد بشیرالدین وارثی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کی حد تک درست ہیں۔

شرح دستخط

محمد بشیرالدین وارثی

۲۸ر فروری ۱۹۸۶ء

جناب مبشر احمد صاحب
(ریٹائرڈ جائنٹ سکریٹری)

حیدرآباد - دیدہ و شنیدہ

حضرات! جب کوئی ملک یا شہر معرضِ وجود میں آتا ہے اور ایک بار اس کی علاقائی حدیں متعین ہو جاتی ہیں تو جغرافیہ کا کام ختم ہو جاتا ہے اور تاریخ اپنا کام شروع کر دیتی ہے۔ حتی الامکان کہ ان جغرافیائی یا علاقائی حدود میں رد و بدل بھی تاریخ اور تاریخی عوامل کا مرہون ہوتا ہے۔ ایک براعظم کی سی وسعت رکھنے والے ملک میں وقوع کے اعتبار سے جغرافیہ جب کسی شہر کو "دل" کا مرتبہ بخشے اور جس دل کی ہر دھڑکن کو تاریخ اپنے صفحات کی زینت بنائے تو اس شہر کی اہمیت کا کیا پوچھنا۔

ہندوستان کے دل اس شہر کی تاریخ جو کبھی بھاگیہ نگر کہلایا اور پھر حیدرآباد بنا۔ ایک اچٹتی سی بھی نظر دوڑائی جائے تو نئے نئے اور بدلتے مناظر سامنے آتے ہیں۔ اس کی گذرگاہوں شاہراؤں، پگڈنڈیوں اور راستوں پر ملک کے اندر اور ملک کے باہر سے آنے والے قافلوں اور کاروانوں کی نہ ٹوٹنے والی قطاریں فروخت اور تبادلہ کی غرض سے ہر قسم کی اشیاء اور نوادرات سے بھری بھی سجائی لاریاں لئے ملیں گی۔ تبادلہ صرف اشیاء اور اموال ہی کا نہیں بلکہ افکار، تصورات اور الفاظ کا بھی کارواں آتے رہے۔ لاریاں خالی کرتے اور جھولیاں بھرتے رہے۔ آخرکار یہ سرزمین آسودگی اور ذہنی سکون کے جویا اہلِ اظہارِ ذات کے مواقع کے متلاشی مختلف متحرک معاشروں کے لئے مامن اور جائے پناہ بن کر رہی۔ تاریخ کا یہی وہ موڑ تھا جب کہ مملکت آصفیہ کی بنیاد پڑی۔ اثر اندازی، اثر پذیری اور باہمی تعامل کا وہ عمل شروع ہوا جس نے ایک ایسے نظامِ اقدار کو جنم دیا جو اس مملکت کی شناخت اور...... (Ethos) قرار پایا۔ رواداری، تحمل اور یگانگت صرف ایک آئیڈیل ہی کی حیثیت نہ رکھتی تھی بلکہ روزمرہ کی زندگی میں کارفرما ایک جیتی جاگتی حقیقت بھی تھی۔

حضرات! میں جب پیدا ہوا اس وقت تک ہمارے خاندان کو قلمروئے آصفی میں آباد ہوئے نصف صدی سے زائد کی مدت گزر چکی تھی۔ سالار جنگ اول کے زمانے میں جب انصرام مملکت کی خاطر نظم و نسق کے ڈھانچہ کی صورت گری اور اس میں باقاعدگی پیدا کرنے کی غرض سے مختلف شعبوں کے ماہرین کو طلب کیا گیا تو ہمارے خاندان کے ایک بزرگ محمد ذکریا کو جو میرے دادا کے ماموں ہوتے تھے۔ مددگار صوبیدار، مقرر کیا گیا اور محکمۂ پیمائش و بندوبست کی تنظیم کا کام سپرد کیا گیا۔ ذکریا صاحب لکھنؤ اور بنارس میں یہ کام کر چکے تھے اور ان کے بنارس کے قیام کے دوران میں ہی سر سید سے جو اس زمانے میں وہاں کی عدالت کے سب جج تھے ان کے دوستانہ تعلقات استوار ہوئے تھے۔ ان قدیم دو

مراسم کے پیش نظر سرسید جب کبھی حیدرآباد آتے اپنے قیام کی مدت میں ان سے متعدد مرتبہ ملاقات کرتے۔

ذکریا صاحب اس مکان میں رہتے تھے جہاں آجکل ہوٹل جیا انٹرنیشنل قائم ہے۔ حیدرآباد آنے کے چند ہی دنوں بعد ذکریا صاحب نے میرے دادا مجیب احمد تمنائی کو بھی یہاں بلا لیا۔ تاکہ وہ اپنے باپ اور دادا کے نقش قدم پر چل کر ایسی سرگرمیوں میں نہ معروف ہو جائیں جن کے باعث خاندان کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔

مجیب احمد کے والد نے ۱۸۵۷ء کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا جس کی پاداش میں انہیں سہارن پور سے جلا وطن کر کے بنارس بھیج دیا گیا اور برسوں ان کے خلاف مقدمہ چلتا رہا۔ تمنائی صاحب کے دادا سید احمد بریلوی کی تحریک میں پیش پیش رہ چکے تھے۔ حیدرآباد آنے کے کچھ عرصہ بعد تمنائی صاحب نے اپنے آپ کو صحافت سے وابستہ کر لیا وہ تقریباً (۵۰) سال تک اس وقت کے مشہور ترین روزنامہ "مشیر دکن" کے اداریے لکھتے اور ہر طرح سے اخبار کو سنبھالے رہے۔ "مشیر دکن" کے مالک کشن راؤ صاحب تھے جو ایک وضعدار شخصیت کے حامل تھے۔ وہ تقریباً ہر روز ہی ہمارے گھر آیا کرتے۔ انتہائی مشفق اور سب پر بے حد مہربان تھے ان کے سورگباش ہونے کے بعد ان کے فرزند اور جانشین واسدیو راؤ صاحب کا بھی یہی دستور رہا۔ ان حضرات کے خلوص، یگانگت اور ہمارے بزرگوں سے مخلصانہ روابط کو دیکھتے ہمارے ذہن میں ہرگز کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ ہم اور وہ کوئی غیر ہیں۔ ہم لوگ اپنے دوسرے بزرگوں کی طرح ان کی کمالِ دل سے عزت اور بڑا احترام کرتے تھے۔ تمنائی صاحب نے صحافت کی مصروفیت کے علاوہ سرکاری ملازمت بھی اختیار کر لی۔ ان کو محکمۂ فینانس میں مترجم مقرر کیا گیا۔ ان کے ساتھ ہی مولوی عبدالحق اور مولانا ظفر علی صاحب بھی مترجم مقرر ہوئے ان تینوں کی آپس میں بہت دوستی تھی۔ عبدالحق بابائے اردو حیدرآباد آنے کے بعد اپنے دوست مجیب احمد تمنائی کے ساتھ ذکریا صاحب کے گھر میں قیام پذیر رہے۔ جب کہ مولانا ظفر علی خان (میرے دادا کے بیان کے بموجب) توپ کے سانچے کے ایک مکان میں کرایہ سے اتر گئے۔

ذکریا صاحب کے انتقال کے بعد ورثا نے جب جائیداد فروخت کر دی تو مجیب احمد تمنائی نے ہنومان ٹیکری میں زور آور خان کی مسجد کے سامنے اپنے لئے ایک مکان خرید لیا۔ یہاں سید ہاشمی فرید آبادی اور ماڈی پتی ہنمنت راؤ صاحب کا پڑوس رہا۔ ہاشمی صاحب چند برس کے قیام کے بعد منتقل ہو گئے۔ لیکن ماڈی پتی صاحب کا برس ہا برس ساتھ رہا اور ہمارا یہ ساتھ صرف اس وقت چھوٹا جب تمنائی صاحب کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد اس مکان کو فروخت کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ ماڈی پتی صاحب انتہائی حلیم الطبع، بردبار اور سنجیدہ آدمی تھے۔ وکالت کے پیشہ سے وابستہ تھے اور کامیاب وکیلوں میں گنے جاتے تھے۔ سماجی اور تعمیری کاموں کے لئے کافی وقت نکال لیتے تھے۔ ان کے پاس ملاقاتیوں اور مشوروں کے خواہاں حضرات کا ہر وقت ایک تانتا سا بندھا رہتا۔ ان کے ملنے والوں میں سے بعض حضرات ہمارے ہاں بھی آ جاتے تھے۔

مجھے اس زمانہ میں کرکٹ کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ گھر کے صحن میں پریکٹس ہوتی۔ بدقسمتی سے گیند

تھوڑی تھوڑی دیر سے ان کے گھر میں جا گرتی۔ ہر بار ان کے گھر بھاگا بھاگا جاتا، ہر کونا چھانتا، گیند ڈھونڈ نکالتا اور واپس آکر پھر کھیل میں مصروف ہو جاتا۔ بار بار کی یہ در اندازی اگرچہ ماڈی پتی صاحب کی مصروفیتوں میں خلل کا باعث بنتی مگر وہ اسے خندہ پیشانی سے سہہ لیتے۔ ایک دن اتفاق کی بات ہے گیند ان کے غسل خانہ کے روشن دان سے زور سے ٹکرائی اور اس کا شیشہ ٹوٹ کر چکنا چور ہو گیا شیشہ کے ریزے غسل خانہ کے اندر جا گرے۔ جہاں ان کی اہلیہ اس وقت غسل میں مصروف تھیں اور چند ریزے ان کے جسم میں بھی پیوست ہو گئے۔ ماڈی پتی صاحب کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا وہ فوراً میری شکایت کے لئے دادا کے پاس داد رسی کے لئے پہنچے۔ معاملہ کی سنگینی اور اہمیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسی وقت اجلاس کاملہ طلب کیا گیا جو دادا، دادی اور والدہ پر مشتمل تھا۔ مجھے اصالتاً اپنی صفائی پیش کرنی پڑی۔ کیونکہ منوہر راج سکسینہ صاحب کی قانونی امداد سوسائٹی کی قسم کی کوئی چیز اس وقت تک وجود میں نہیں آئی تھی۔ میں نے یہ دلیل پیش کی کہ ماڈی پتی صاحب کی دیواروں، درختوں کی ٹہنیوں اور روشن دانوں سے ٹکرا ٹکرا کر گیند کا حلیہ بدل گیا ہے اور اگر ایک نئی گیند دلوا دی جائے تو وہ "نیک رویہ" ثابت ہو گی۔ اسے قابو رکھنا بھی آسان ہو گا۔ اور وہ ماڈی پتی صاحب کے گھر کا کبھی رخ نہ کرے گی۔ مگر یہ استدلال ناقابل قبول قرار دیا گیا اور کرکٹ گیند کی ضبطی کا فیصلہ صادر کیا گیا۔ میں اس اجلاس کے معزز صدر سے جو ہائی کورٹ کے ایک ممتاز جج بھی ہیں۔ اس فیصلہ کی واجبیت یا غیر واجبیت کے تعلق سے سوال چھیڑ کر انہیں الجھن میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔

اب میں نے پتنگ بازی کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا اپنی چھت کے علاوہ پڑوس کی بھی ساری چھتیں زیر نگیں آگئیں۔ ماڈی پتی صاحب کی دیواروں اور چھتوں پر بھی یلغار رہتی اور دھما چوکڑی مچتی۔

ایک روز ایک بڑی خوبصورت سی پتنگ ہمارے صحن میں امرود کے درخت کی چوٹی میں آ پھنسی۔ میں اسے نکالنے کے لئے فوراً درخت پر چڑھ گیا۔ پتنگ کو ٹہنیوں سے چھڑایا، حفاظت سے سنبھالے درخت سے نیچے اتر رہا تھا کہ پاؤں پھسل گیا اور ڈالی ہاتھ سے چھوٹ گئی اور میں دھڑام سے زمین پر آگرا اور گرتے ہی بیہوش ہو گیا۔ اسی وقت کرنل ڈاکٹر واگھرے کو طلب کیا گیا۔ وہ چند منٹ کے اندر پہنچ گئے۔ ماڈی پتی صاحب تک یہ خبر پہنچی وہ اپنا سب کچھ کام کاج ادھورا چھوڑ کر چلے آئے۔ مجھے ہوش میں آتے آتے کئی گھنٹے لگ گئے۔ اس وقت تک ماڈی پتی صاحب، ڈاکٹر واگھرے کے ہمراہ برابر میرے سرہانے بیٹھے رہے۔ اس اثنا میں ان کے کھانے کا وقت بھی آ پہنچا اور اس غرض سے بلاوا آنے پر، جیسا کہ میری والدہ بیان کرتی تھیں "ماڈی پتی نے کہلا بھیجا کہ جب تک میں ہوش میں نہ آجاؤں وہ کھانا نہ کھائیں گے اور انھوں نے کیا بھی یہی۔ بلند کرداری، بزرگی اور خوش ہمسائیگی کی ایک ارفع مثال!

پتنگ بازی ہی کے دور کا ذکر ہے کہ دو بار چھت پر سے گرنے کے سبب پتنگ بازی کی سرگرمیوں

یہ تہدید عائد کی گئی کہ جائے عمل عرف گھر کے بیرونی صحن تک محدود رہے گا۔ بادل ناخواستہ اِس قدغن کو قبول کرنا پڑا۔ مگر اِس میں مصیبت یہ تھی کہ پندرہ منٹ یا آدھ گھنٹہ سے کوئی نا کوئی ملاقاتی نازل ہوتا اور مجھے دادا کو مطلع کرنے کے لئے گھر کے اندر جانا پڑتا۔ خاص طور پر ایسے وقت جبکہ پتنگ آسمانوں کی بلندیوں کو چھوتی ہوتی۔

ملاقات کے لئے آنے والوں میں ایک اہم شخصیت ایم۔ نرسنگ راؤ صاحب، مدیر "رعیت" کی تھی۔ ایسے موقعوں پر میں ان کو احتیاط سے سنبھالے رکھنے کی تاکید کرکے ڈور ان کے ہاتھوں میں تھما دیتا۔ بڑی پھرتی سے گھر کے اندر جا کر دادا کو اطلاع دے کر واپس لوٹتا اور ڈور کا دوبارہ جائزہ لیتا۔

ایک دِن ایک ایسے ہی وقت نرسنگ راؤ صاحب حسبِ معمول تشریف لائے۔ ہمیشہ کی طرح ڈور ان کے گرفت میں دے کر، اندر اطلاع دینے چلا گیا۔ اب کی لوٹنے میں ذرا سی دیر لگ گئی۔ ہوا یوں کہ اس وقت دادا نماز میں مصروف تھے اور مجھے مجبوراً ان کے نماز سے فارغ ہونے تک ٹھہرا رہنا پڑا۔ واپس لوٹا تو کیا دیکھتا ہوں کہ نرسنگ راؤ صاحب چرخی پر ڈور لپٹنے میں منہمک ہیں۔ کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ وہ بیچارے Remote Control کی ٹیکنیک سے نابلد۔ پتنگ کی ڈور کہیں درمیان سے ٹوٹ گئی تھی اور پتنگ آسمانوں کی پہنائیوں میں پنہاں ہو چکی تھی۔ اس سانحہ پر خفیف سے تھے (اور میں بالکل کنگ ——)۔

دوسرے دن کیا دیکھتا ہوں کہ نرسنگ راؤ صاحب تلافیٔ مافات کے طور پر نصف درجن مختلف رنگوں کی پتنگیں بغل میں دبائے تشریف لائے ہیں۔ میں بھونچکا اور دادا ان کی اس حرکت پر حد درجہ متاثر ہوئے۔ نرسنگ راؤ صاحب کے چہرہ سے بشاشت سی ٹپکتی ہوئی۔ گویا کوئی بڑا بوجھ ہلکا ہو گیا ہو جو اب یہی کہ میں نے اپنا فرض پورا کیا ہے۔ کتنا احساس تھا ان بزرگوں کو اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کا اور کتنا لحاظ تھا اس کا کہ ان کی کسی بات یا عمل سے کسی کو دکھ نہ پہنچنے پائے۔

گھر پر اکثر ملاقات کے لئے آنے والی ایک اور ہستی جس کا نام اِس وقت ذہن کی لوح پر ابھرتا ہے وہ مانک راؤ وٹھل راؤ صاحب، مولف "بستان آصفیہ" کی ہے۔ "بستان آصفیہ" جو کئی جلدوں پر مشتمل ہے قدیم حیدرآباد کے تاریخی واقعات کا ایک اہم ماخذ اور انتہائی معتبر و مستند ریفرنس تصوّر کی جاتی ہے اِس کے علاوہ ان کی دو ایک اور کتابیں بھی میری نظر سے گزری ہیں جو اخلاقی موضوعات پر ہیں۔ مانک راؤ صاحب پائیگاہ میں صدر محاسب تھے۔ دبلے، پتلے، میانہ قد، دھوتی پر شیروانی پہنتے، چھوٹی دیوار کی سیاہ ٹوپی زیبِ سر، جب آتے کاغذوں کا پلندہ بغل میں دبائے دیر تک بحث اور گفتگو کا سلسلہ جاری رہتا۔ کچھ دنوں کے فصل سے پھر آتے اور چھوڑا ہوا پلندہ واپس لے جاتے۔ عیدین اور دوسرے مواقع پر بالالتزام مبارکباد دینے آتے۔ تلسنکرات کے موقع پر بڑی پابندی سے ملنے آتے اور اپنے ہمراہ چاندی کی چھوٹی چھوٹی ڈبیاں جو مختلف رنگوں کے تل تماداونوں سے بھری ہوتیں فرود لاتے

خاندان کے ہر فرد کو ایک ایک ڈبیا پیش کی جاتی۔ نتیجہ یہ تھا کہ ہم سب اپنے حصہ کی ڈبیا کے لئے تلسنکرات کے آنے کی بے تابی سے منتظر رہتے جتنے کہ عید کے موقعہ پر اپنے استادوں سے ملنے والی وصلیوں کے۔ علم و عمل کسر نفسی اور روایات کی پاسداری کی بولتی تصویر!

آصفجاہی حکمرانوں کے دور کی علمی، تہذیبی، معاشرتی اور ذہنی سرگرمیوں اور کاوشوں کا اجمالاً احاطہ بھی وقت کا طلبگار ہے۔ وقت کی تنگی کے سبب مجھے افسوس ہے کہ میں بہت سی ان شخصیتوں کا جنہیں میں نے قریب سے دیکھا ہے سرسری طور پر بھی تذکرہ نہ کرسکوں گا مثلاً بابائے اردو مولوی عبدالحق، اختر علی خان، منظور جنگ، نثار یار جنگ، یٰسین جنگ، مہدی نواز جنگ، ڈاکٹر محی الدین شریف، اکرام حسین، عباس حسین، کاظم علی باغ، فانی بدایونی، ضامن کنتوری، جگر مرادآبادی، علی اختر، وقار احمد، عبدالرزاق راشد، حکیم حبیب اللہ سدھوری، حیرت بدایونی، اسمٰعیل خان خانی خورجوی، ماہر القادری، تابش دہلوی وغیرہ۔

مختصراً یہ عرض کروں گا کہ مزاج اور ہیئت ترکیبی کے بنیادی اختلاف کے باوجود مختلف معاشروں میں چند ایسے عناصر بھی شامل ہوتے ہیں جو قدر مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب تاریخ کا جبر ان کو ایک دوسرے کے قریب لے آئے تو سیاسی انقلابات، معاشی تبدیلیوں، معاشرتی رشتوں کے از سر نو تعین کے باوصف یہ مشترکہ بنیاد ایک ایسا ذہنی اور فکری سانچہ تیار کرتی ہے۔ جس میں وسیع النظری اور انسان دوستی کے جذبات باہم پیوست ہوکر واحد غالب جذبہ بن جاتے ہیں۔ شخصی حکمرانی کے ادارہ میں مضمر خامیوں کے باوجود ذہن و فکر کے اس سانچہ کی تشکیل اور اپنے دور حکمرانی میں اس پر سختی سے عمل پیرائی تاریخ اور ملک کو خانوادۂ آصفجاہی کی سب سے بڑی دین ہے۔ مجھ جیسے لوگ جنہوں نے زندگی میں پچھلے دور کی بھی ایک جھلک دیکھی ہے عجب خلجان میں مبتلا ہیں۔ ذیل کا شعر اس کیفیت کی بڑی حد تک ترجمانی کرتا ہے۔

جو دن گزر گئے ہیں تیرے التفات میں ہے میں ان کو جوڑ لوں کہ گھٹا دوں حیات میں۔

انگریزی سے ترجمہ

مترجم (علی بن ایاز)

بیمار

یہ بالکل بے ہودہ سی بات تھی۔ ہم یہاں تعطیل منانے آئے تھے۔ لیکن ایک ناکارہ چھوٹی سی کتیا کی بیماری نے ہمارا سارا مزا کرکرا حقیقتاً وہ کتے کی نوع سے نہ تھی۔ کم از کم کوئی کتا جس میں ذرا سا بھی احساس خوداری کا شائبہ ہو وہ کبھی اس سے رشتہ نوع کا اعتراف پسند نہ کرسکتا تھا۔ وہ تو ایک متحرک قسم کا بالوں کا گول گپھا تھی۔

لیکن بالوں کا یہ گول گپھا اب حرکت نہ کرسکتا تھا۔ گیارہ انچ کی یہ کلبی خرافات بلانکٹوں میں لپٹی پڑی تھی۔ اس کی دو سیاہ جیسی چیز جنھیں آنکھیں کہہ سکتے ہیں، کسی چیز کی طرف دھیان نہ دیتی تھیں۔

"اب جینفر کیسی ہے"۔ میں نے ٹینس کے لئے جاتے ہوئے دریافت کیا۔

دیکھا آپ نے اس خرافت کا نام تھا جنیفر۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی خرافت ہوسکتی ہے۔

جنیفر کے مالک نے اپنے سر کو جنبش دی۔

"کچھ زیادہ ٹھیک نہیں"، اس نے جواب دیا۔ کیا آپ اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔

میں نے دیکھنا قبول کیا۔ گو مجھے معلوم تھا کہ اس کو دیکھنے میں کھیل کا وقت نکلا جا رہا تھا۔ ہم جنیفر کی ٹوکری کے پاس گئے۔ جنیفر نے مجھے پہچاننے سے انکار کردیا۔ میں نے اس کے قیافہ سے دریافت کیا کہ وہ اس تیض تیض میں ہے کہ کیا وہ اب کتیا ہے اور مرنے کے بعد وہ اس سورگ میں جائے گی جو اس کی نوع کے لئے مقدر ہے۔

میں ٹوکری کے پاس سے واپس آرہا تھا کہ ایک شخص نے دبے پاؤں آکر دریافت کیا "جنیفر کیسی ہے۔؟"

جنیفر کے مالک نے کہا "کچھ زیادہ اچھی نہیں"۔

اس شخص نے جنیفر کو دور سے جھانک کر دیکھا اور پلٹ گیا۔ خود اس کی حالت کتیا سے کم خستہ نہ تھی۔ اسے دیکھ کر یہ کرنا مشکل تھا۔ کہ وہ بھوتوں کو دیکھ کر نہیں آیا۔

میں نے ٹینس کے تین سٹ کھیلے اور واپس ہوا۔

"اب جنیفر کیسی ہے۔؟" میں نے پوچھا۔

"معلوم ہوتا ہے، اب کچھ ٹھیک ہے۔ اس کے مالک نے کہا۔

"ٹھیک ہے" میں نے جوش میں کہا "ہرے" اور میں یہ بھول گیا کہ میں تین سٹ ہار چکا ہوں۔

میرے بازو والی میز پر ایک اکیلا شخص بیٹھا ہوا تھا۔ یہ شخص دو روز پہلے آیا تھا۔ جنیفر اس وقت اچھی تھی۔ اور اس کی آمد پر اس نے ٹانگوں میں لوٹ کر اور اس کے کاندھوں تک اچھل کر اس کا استقبال کیا تھا۔ صرف یہی ایک سماجی تعلق تھا جس میں اس شخص نے کامیابی حاصل کی تھی۔ ایک فٹ سے زیادہ طویل جانداروں میں سے کسی کو دوست بنانا اس کے لئے مشکل تھا۔ جب میں مچھلی کھا رہا تھا تو اس نے جھک کر کھنکارتے ہوئے پوچھا۔

"معاف فرمانا جناب میں نے ابھی آپ کو اس کے مالک سے گفتگو کرتے دیکھا ہے۔

"ہاں میں نے جواب دیا۔

"تو۔ تو۔ وہ چھوٹی سی شئے اب کیسی ہے"۔

"وہ چھوٹی سی شئے، کیا نام ہے اس کا" اس کا مالک تو بڑی شئے تھا"۔

"ذرا ٹھیک ہے" میں نے اس اکیلے آدمی سے کہا۔

"ہاں ذرا ٹھیک ہے"۔ اس نے زیر لب کہا "ذرا ٹھیک ہے، یہ تو اچھی بات ہے"۔ پھر وہ مچھلی کھاتے کھاتے سوچ میں ڈوب گیا۔

صبح میں خبر ملی کہ جنیفر نے کچھ کھانے سے انکار کر دیا ہے۔ میں اس کے مالک کے پاس ایک ناشپاتی لے گیا۔

"جنیفر یہ کھائے گی" میں نے پوچھا۔ "آپ کی بڑی عنایت۔ آپ بڑے اچھے ہیں۔ وہ کوئی چیز چھو نہیں رہی ہے"۔

اس کے مالک نے کہا "مجھے بڑی پریشانی ہے"۔

"تو پھر ڈاکٹر سے کیوں نہ مشورہ کیا جائے۔ میں نے تجویز کی۔ اِس علاقہ میں صرف ایک ہی ڈاکٹر ہے" اور وہ بھی باہر گیا ہے" اس نے جواب دیا۔

میں نے غصہ میں کہا" اس کی نسبت قانون بنانا چاہیئے۔ میں نے ناشپاتی خود کھائی اس کا مزہ کھٹا معلوم ہوا۔

شام میں جنیفر کی حالت اور بگڑ گئی۔ حقیقتاً اس کی حالت اس قدر بگڑ گئی تھی کہ ایک جماعت نے آخری دیدار کی تیاریاں کریں۔ صحیح تو یہ ہے کہ دو جماعتوں نے کیونکہ چھ سے زائد آدمیوں کی بھیڑ سے جنیفر کی حالت کے اور بگڑنے کا احتمال تھا۔ میں دوسری جماعت میں تھا ہم لوگ خاموشی کے ساتھ گئے اور ٹوکری کو گھیر کر کھڑے اُون سے بھرے بالوں کے اس گچھے کو دیکھتے رہے۔ "اس کی آنکھیں بند ہیں" میرے ایک دوست نے غلط سمت دیکھتے ہوئے کہا۔

جب میں نے اسے صحیح سمت دکھلائی تو ہم نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں کھلی ہیں اور وہ نیم وا نظروں سے انہیں دیکھ رہی ہے

"تم اب اتنے لمبے چوڑے ہو"۔ اس کی آنکھیں کہتی معلوم ہوتی تھیں۔ "میرے لئے کچھ نہیں کر سکتے"۔

ہم کو شرمندگی کا احساس ہوا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کے ایک حصہ جسم کو چھوا۔ اس نے میرے ہاتھ کو چاٹا اور میں نے بڑا فخر محسوس کیا جیسے کوئی بھاری اعزاز مل گیا۔

"بہتر تو یہ ہے کہ اسے پراگندہ نہ کیا جائے"۔ میرے ایک ساتھی نے کہا۔

اسے حسد ہو رہا تھا کہ جنیفر نے اُسے چاٹا کیوں نہیں۔ تاہم اس کی بات معقول تھی اور جنیفر کے مالک کی نظریں دیکھ کر ہم سب جلد ہی واپس ہو گئے۔ باہر میں نے اس اکیلے شخص کو پایا۔

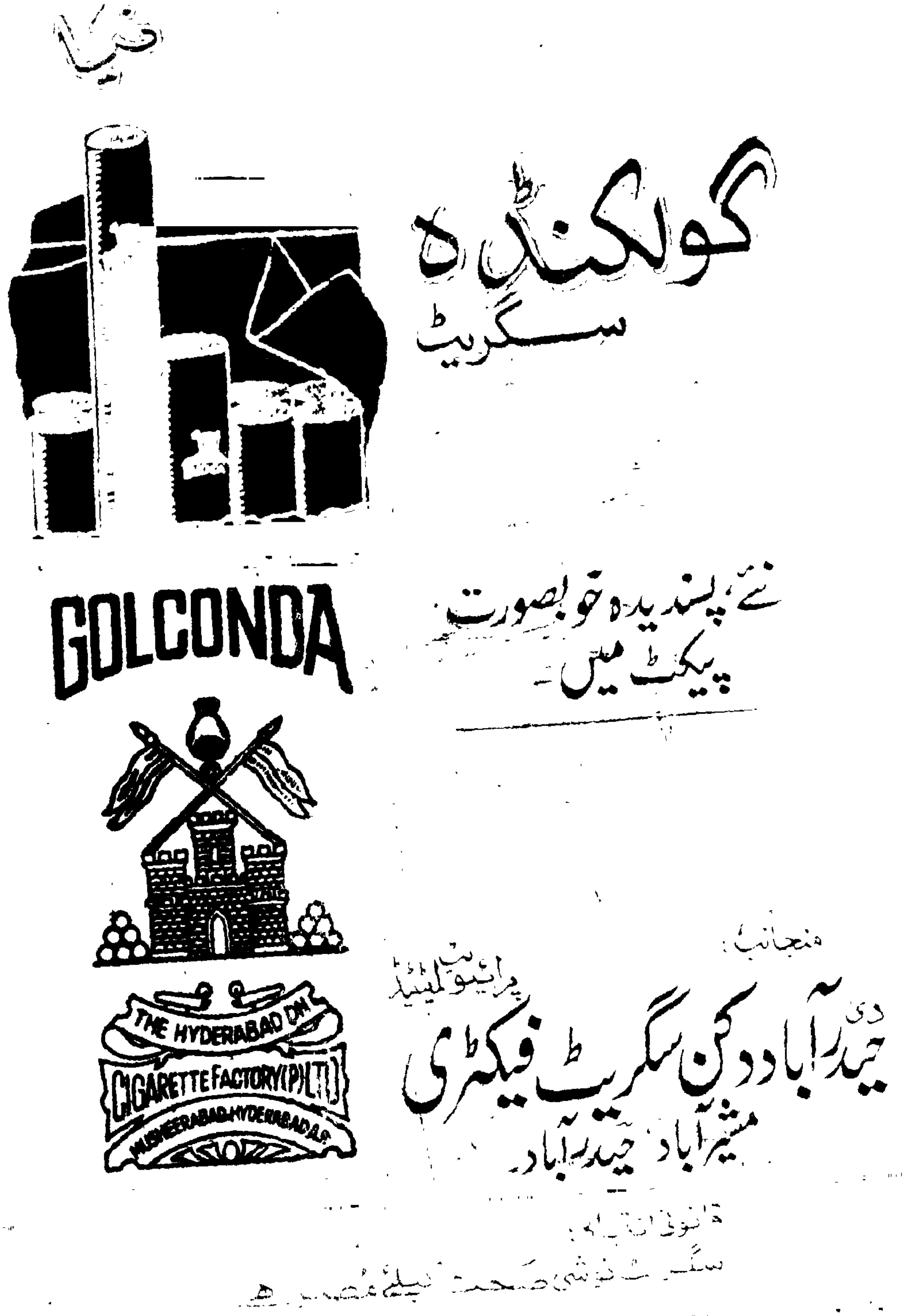
کیا نام ہے اس کا کیسی ہے" اس نے پوچھا ؟

"کچھ ٹھیک نہیں" میں نے جواب دیا "کون جانے کیا ہو"۔

اس نے یاس آمیز انداز سے الفاظ دہرائے "کون جانے"۔

رات گزر گئی۔ صبح جب میں سیڑھیوں پر سے اتر رہا تھا تو مجھے بھونکنے کی آواز آئی۔ پھر ایک شعلے میرے پاس آکر میرے گرد پھری، میری ٹانگوں میں گھسی اور ناشتہ کی گھنٹی سے ٹکرا کر غصہ کی حالت میں دوڑتی ہوئی چلی گئی۔

ہم سب خوش تھے صرف ایک شخص غیر حاضر تھا۔ وہی اکیلا شخص۔ بعد میں معلوم ہوا کہ رات سے بیمار اور فریش ہے۔ مگر کسی کو اس کی ذرہ برابر بھی پرواہ نہ تھی۔


نیا
گولکنڈہ
سگریٹ
GOLCONDA
نئے، پسندیدہ خوبصورت
پیکٹ میں۔
THE HYDERABAD DN
CIGARETTE FACTORY (P) LTD.
MUSHEERABAD, HYDERABAD A.P.
منجانب:
دی
حیدرآباد دکن سگریٹ فیکٹری
پرائیوٹ لمیٹڈ
مشیرآباد حیدرآباد۔
قانونی انتباہ:
سگریٹ نوشی صحت کیلئے مضر ہے

جن کی واپسی

دلیپ سنگھ

ایک کباڑی جو میرے ہاں ردّی خریدنے کے لئے آیا تھا، غلطی سے میرے آنگن میں ایک ٹوٹا ہوا چراغ بھول گیا۔ میں نے اسے باہر پھینکنے کی غرض سے جو ہاتھ لگایا تو اس میں سے دھویں کا ایک بادل امڈ آیا جس نے آہستہ آہستہ ایک جن کی صورت اختیار کر لی۔ اور مجھ سے یوں مخاطب ہوا

"جولُ کیا مانگتا ہے۔"

میں نے کہا حضور ایک تو آپ اُردو غلط بول رہے ہیں۔ اگر کسی اہلِ زبان نے سن لیا خواہ مخواہ لفڑا ہو جائے گا۔ دوسرے یہ کہ میں کوئی بھکاری نہیں ہوں جو کسی سے کچھ مانگوں۔ میں محنت مزدوری کر کے گزارا کرنے والا آدمی ہوں

جن کہنے لگا یہ سب کچھ چراغ کو ہاتھ لگانے سے پہلے سوچنا تھا۔ اب جب تو مجھے بلا ہی بیٹھا ہے تو کچھ نہ کچھ تو مانگنا ہی پڑے گا۔ میں نے کہا حضور پھر کبھی سہی

جن کہنے لگا کیا میں کوئی سرکاری کلرک ہوں جو فائیل کو پینڈنگ رکھ لوں۔ مجھے ابھی اسی وقت تمہارے لیے کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔ بول کیا کروں۔ اگر چاہوں تو میں تمہیں منسٹر بنا سکتا ہوں۔ میں نے کہا مجھ سے منسٹری کیسے ہوگی۔ حکومت کو چلانا کوئی معمولی کام تو ہے نہیں۔

جن ہنسا اور کہنے لگا اے بھولے انسان، حکومتیں کیا منسٹر چلاتے ہیں۔ منسٹر تو فقط اس لیے بنائے جاتے ہیں کہ اپنے چند رشتہ داروں اور دوست یاروں کی زندگی میں رنگ بھر سکیں۔ میں نے کہا اگر یہ بات ہے تو پھر حکومت چل کیسے رہی ہے۔ کہنے لگا۔ یہ کسی اُس فقیر کی دُعا سے چل رہی ہے۔

جس کا اتا پتہ مجھے بھی معلوم نہیں۔"

میرے نہ نہ کرنے پر بھی جن نے کچھ ایسا چکر چلایا کہ میں نے اپنے آپ کو ایک گردش میں پایا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ میں راشٹرپتی بھون میں بطور وزیر تعلیم حلف لے رہا ہوں۔

راشٹرپتی بھون سے اپنی کوٹھی کی طرف آتے ہوئے میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ اگر قسمت نے مجھے کلرکی کی کرسی سے اٹھا کر وزارت کی کرسی پر بٹھا ہی دیا ہے تو میں پورے انصاف سے حکومت کروں گا۔

کسی نا اہل رشتہ دار یا ناکارہ دوست کی ہرگز مدد نہیں کروں گا۔ میرا انصاف عدلِ جہانگیری ہوگا۔ اس چکر میں چاہے میری

ن کو جاپا کی چکی ہی کیوں نہ پیسنی پڑے۔ آخر گھر میں بھی تو پیس رہی ہے۔

گھر پہنچ کر میں نے کاغذ قلم ہاتھ میں لیا اور ایک لسٹ بنانا شروع کی کہ بطور منسٹر یہ کروں گا اور یہ نہیں کروں گا۔ بسم اللہ یہ لکھ کر کی کہ کسی نااہل کی مدد نہیں کروں گا۔ ابھی یہاں تک ہی لکھنے پایا تھا کہ دیکھتا ہوں نگینہ صاحب دروازے سے تشریف لا رہے ہیں۔ نگینہ صاحب میرے کافی ہاؤس کے دوستوں میں سے ہیں ویسے تو ہم انھیں شاعر کہتے ہیں۔ لیکن جو شعر وہ لکھتے ہیں وہ ایسے ہوتے ہیں کہ انھیں سن کر اکثر لوگوں کے کان کی لویں سُرخ ہو جاتی ہیں۔ ایسے شعر آپ عورتوں کو ہرگز نہیں سنا سکتے۔ اس لیے ہم سب مرد لوگ ان کے شعر سنتے اور پھر بعد میں الگ الگ اپنی بیویوں کو سُناتے تھے۔

نگینہ صاحب مجھے دیکھتے ہی بغل گیر ہو گئے اور کہنے لگے مبارک ہو" آج کے اخبار میں تمہارے وزیر بننے کی خبر پڑھ کر میری باچھیں کھل گئیں۔ مجھے نگینہ صاحب کی بات پر رتی بھر شک نہیں تھا۔ کیونکہ ان کی باچھیں ابھی تک کھلی ہوئی تھیں۔

اور سچی بات یہ ہے کہ اتنی کھلی ہوئی باچھیں میں نے اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔

نگینہ صاحب کہنے لگے کہ اگر خدا نے تمہیں وزیر بنا ہی دیا ہے تو بھائی غیر جانب داری سے حکومت کرنا۔ نہ کا ہلوں سے دوستی نا کاہوں سے بیر اس سلسلے میں تمہیں یقین دلانا چاہتا ہوں کہ کم از کم میں تم سے کبھی کوئی فائدہ اٹھانے کی کوئی کوشش نہیں کروں گا۔

میں دل ہی دل میں خوش ہوا کہ نگینہ صاحب وہی کہہ رہے ہیں جو میں چاہتا ہوں۔

کچھ دیر بعد نگینہ صاحب فرمانے لگے کہ آج ایک نظم ہوئی ہے جو میں تمہیں سنانے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ میں نے کہا آپ کی نظم سنا میری موجودہ پوزیشن میں کچھ مشکل سا ہو گیا ہے۔ ہنس کر کہنے لگے " ویسی نہیں ہے۔ اور سچی بات یہ ہے کہ یہ نظم میں نے خود نہیں لکھی کسی غیبی طاقت نے مجھ سے لکھوائی ہے۔

نگینہ صاحب کی نظم میں میری شخصیت کی بڑائی کے بارے میں کچھ ایسی باتیں تھیں جن سے میں بالکل واقف نہیں تھا۔

نظم میں ایک شعر ایسا بھی تھا جسے سن کر میں پانی پانی ہو گیا۔ نگینہ صاحب نے کہا تھا۔

میں تجھے اکبر اعظم کی طرح مانتا ہوں
تو سکندر ہے میرے عہد کا میں جانتا ہوں

میں نے شرما کر کہا نگینہ صاحب آپ کچھ مبالغہ آمیزی سے کام لے رہے ہیں۔

اور ایسے بھی جمہوریت کے اس دور میں سکندر ثانی کا پیدا ہونا کچھ مشکل سا ہو گیا ہے کیونکہ کسی دوسرے ملک کو فتح کرنا تو کجا، دوسرے ملک میں گھسنے کے لئے پاسپورٹ اور ویزا کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور پھر تلوار ہاتھ میں لے کر سفر کرنے پر آج کل سخت پابندی ہے۔ پر نگینہ صاحب میری کہاں سننے والے تھے۔

کہنے لگے نگینہ نے زندگی بھر کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ لوگ اگر تمہاری عظمت سے آگاہ نہیں ہیں۔ تو محض اس لیے کہ ان کے پاس نگینہ رکھنے کا ہنر نہیں ہے۔ خیر کچھ ہی دنوں میں یہ حقیقت پوری دنیا پر آشکار ہو جائے گی۔ میں نے پوچھا وہ کیسے

کہنے لگے میں اس نظم کو اپنی کتاب میں شامل کر رہا ہوں ۔ جو اگلے ہفتے منظر عام پر آجائے گی ۔ تمہارا اس سلسلے میں اتنا ہی فرض ہے کہ اس کتاب کی دو ہزار کاپیاں خرید واکر لائبریری تک پہنچادو کیونکہ تمہیں اور مجھے کوئی حق نہیں کہ ہم تمہاری عظمت کو دنیا کی نظروں سے پوشیدہ رکھیں ۔

میں ابھی اسی اُدھیڑبن میں تھا کہ نگینہ صاحب کے حملے سے کیسے نجات پاؤں کہ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک اور صاحب دروازے سے داخل ہو رہے ہیں ۔ انہوں نے اپنے تعارف میں کہا کہ وہ مشہور تاریخ داں پروفیسر سکینہ ہیں ۔ میں نے کہا حضور کو کبھی پہلے نہیں دیکھا ۔ کہنے لگے کہ تاریخی ریسرچ میں ایسا گم ہوں کہ کبھی ابھروں تو کوئی دیکھے ۔ آج بھی اسی سلسلے میں تاریخ کے پرانے اوراق دیکھ رہا تھا ۔ جب مجھے یہ ہاتھ لگا "یہ" سے مراد ایک خاندانی شجرہ تھا ۔

جس کے بارے میں انھوں نے فرمایا کہ میرے خاندان کا ہے ۔ شجرے کے حساب سے ہمارے خاندان کا تعلق ایک اونچے راجپوت گھرانے سے تھا جس کا سلسلہ بھگوان کرشن سے جا ملتا تھا ۔

مجھے اس حقیقت سے انکار نہیں کہ بچپن میں میرے ہاتھوں ایک دو گوالنوں کی گگریاں پھوٹ گئیں تھیں ۔ مجھے اس سے بھی انکار نہیں کہ میں نے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر کچھ لڑکیوں کو بنسی کی مدھر تانیں سنائی تھیں ۔ لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ حرکتیں مجھ سے میری رگوں میں بہنے والا خون کرا رہا تھا ۔ میں نے پروفیسر سکینہ سے گذارش کی کہ بغور دیکھنے کے باوجود مجھے اپنے یا اپنے والد کے چہرے کے گرد کبھی کوئی حالہ نہیں نظر آیا ۔ لیکن تاریخ داں ٹس سے مس نہیں ہوا ۔ کہنے لگا جناب اس لیے نظر نہیں آیا کہ آپ کے پاس ایک ریسرچر کی نگاہ نہیں ہے ۔

پروفیسر سکینہ کہنے لگے یہ جو شجرۂ نسب مجھے اچانک مل گیا ہے ۔ اس کو میرے دیباچے کے ساتھ سرکاری خرچ پر شائع ہونا چاہیے ۔ سرکار جو ہزاروں روپے اس قسم کی ریسرچ پر برباد کر رہی ہے کہ علامہ اقبال قبل از دوپہر پیدا ہوئے تھے یا بعد از دوپہر، میری اس ریسرچ پر کیوں خرچ نہ کرے جس سے یہ راز کھلتا ہے کہ اس کے وزیروں میں سے ایک ایسا بھی ہے ۔ جس کے خون میں بھگوان کرشن کے خون کی ملاوٹ ہے ۔

میں پروفیسر سکینہ کی ریسرچ کا جواز ڈھونڈ رہا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں ۔ میرے پرائمری اسکول کے اُستاد منشی حکومت رائے چلے آرہے ہیں ۔ منشی جی بھی اچھی طرح کمرے میں داخل بھی نہ ہوئے تھے کہ کہنے لگے میں نے ہمیشہ تمہیں یہی کہا بیٹا کہ چھپی ہوئی کتابوں میں کچھ نہیں ہوتا ۔ اور مجھے خوشی ہے کہ تم نے ہمیشہ میری نصیحت پر عمل کیا ۔ میں نے سدا یہ کہا کہ علم کتابیں پڑھنے سے نہیں ملتا ۔ استاد کی خدمت کرنے سے ملتا ہے ۔ بڑا آدمی بننا ہے تو استاد کے گھر میں برتن دھوؤ ۔ اس کا حقہ بھرو ۔ اس کے گھر کے چولہے کے لئے جنگل سے ایندھن لاؤ ۔ میری نصیحتوں کا نتیجہ آج سب کے سامنے ہے جو لڑکا چھٹی جماعت میں تین بار فیل ہوا ۔ آج ہمارا وزیر تعلیم ہے ۔ اور اس لیے ہے کہ اس نے کتابوں

پر ہیں ماسٹر حکومت رائے کی نصیحت پر عمل کیا۔" ماسٹر حکومت رائے نے بتایا کہ انہوں نے اپنی تمام نصیحتوں کو یکجا کر کے ایک کتابی شکل دی ہے جس کا نام ہے "حکومت رائے کے اقوالِ زرین" ماسٹر جی نے کہا کہ اب ضروری ہو گیا ہے کہ اس کتاب کو نصاب میں داخل کیا جائے۔ تاکہ ہندوستان کے تمام بچے وہ رتبہ حاصل کر سکیں جو مجھے نصیب ہوا ہے۔ میں نے کوشش کی کہ ماسٹر جی کو آگاہ کر دوں کہ میرے منسٹر بننے میں ان کے اقوالِ زریں کا نہیں اس چراغ کا دخل ہے جو ایک کباڑی غلطی سے میرے آنگن میں چھوڑ گیا ہے۔ لیکن ماسٹر جی نے ڈانٹ کر کہا کہ فضول بک بک بند کرو، ورنہ ناک سے پکڑ کر وہی تھپڑ ماروں گا جو تم نے کئی بار کھائے ہیں۔ اور یہ کہہ کر وہ اس زور سے ہنسے جیسے ابھی ابھی انہوں نے سال بھر کا بہترین لطیفہ سنایا ہو۔

میں سوچ رہا تھا کہ ان لوگوں کے حلقۂ دام سے نکلوں تو کیسے نکلوں۔ اسی وقت میرے سکریٹری نے آ کر کہا کہ سر آپ کو فوراً ایک جلسے کی صدارت کے لیے جانا ہے۔

یہ دانشوروں کا جلسہ تھا جس میں ادیب، تاریخ داں اور استاد لوگ شامل تھے۔ جلسے میں جو تقریریں ہوئیں ان میں زبردست احتجاج کیا گیا کہ سرکار خواہ مخواہ ہمارے کاموں میں دخل دیتی رہتی ہے ہم زندگی میں جو کچھ کر رہے ہیں کسی فائدے کی خاطر نہیں کر رہے ہیں۔ ہمیں یہ ہرگز پسند نہیں ہے کہ سرکار ہمارے کام میں دخل دے۔ ہم جو چاہیں گے لکھیں گے جو چاہیں گے پڑھائیں گے۔ ہمیں اس سلسلے میں پوری آزادی ہونی چاہئیے سرکار کو چاہئیے کہ وہ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دے۔ تقاریر کے بعد چیتالیاں بجیں ان میں نگینہ صاحب۔ پروفیسر سکینہ اور ماسٹر حکومت رائے نے پڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

جلسہ گاہ سے جب میں گھر پہنچا تو بری طرح جھنّایا ہوا تھا۔ صبح کے واقعات اور جلسہ گاہ کی تقاریر میرے دماغ کے اکھاڑے میں کشتیاں لڑ رہے تھے۔

جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ اچانک کسی نے شفقت بھرے ہاتھ سے مجھے بیدار کیا۔ میں نے دیکھا کہ وہی چراغ والا جن میرے سامنے کھڑا تھا اور کہہ رہا تھا۔ کوئی خدمت میرے لائق ہو۔ میں نے تقریباً چیخ کر جواب دیا۔ خدا کے لئے مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ مجھے حکومت کو چلانے میں مکمل آزادی ہونی چاہئیے مجھے کسی کے مشورے اقوالِ زریں یا تاریخی ریسرچ کی ضرورت نہیں ہے۔ جن حیران و پریشان کچھ دیر تک مجھے تاکتا رہا۔ اور پھر مایوس ہو کر میرے دیکھتے ہی دیکھتے چراغ میں گھس گیا۔

غزلیں

تسنیم فاروقی

میں یوں تو بہت خوب کیاری کیاری تھی
ہیں کہیں پہ غریبوں کی آہ و زاری تھی

ہمارے دن تھے کبھی زندگی ہماری تھی
کوئی ہمارا تھا ہم سے کسی کی یاری تھی

پھر اس کے بعد کوئی سچ نہ روبرو آیا
کرن تھی ایک مگر آئینے پہ بھاری تھی

جگہ کہاں تھی محبت کہاں پہ رکھتی پاؤں
قدم قدم پہ تعصب کی شہر یاری تھی

وہ دور دیس سے آیا تھا شہر میں لینے
نہ شاعری تھی نہ فن تھا نہ انکساری تھی

وہ رات تھی کہ چراغوں کی لو پہ بھاری تھی
میں وہ ہوں پشت ہوا پہ مری سواری تھی

اسی لئے تو ستاروں نے ہجرتیں کرلیں
میں پانچ حرف کا تسنیم کچھ نہیں ہوں مگر

اقبال شیدائی

جد و جہد زندگی کی انتہا کرتے ہوئے
جی رہے ہیں خاک کو ہم کیمیا کرتے ہوئے

یا الٰہی اور برسا اس پہ بارش حسن کی
کوچۂ دشمن سے گزرے یہ دعا کرتے ہوئے

جو بھی دے گا سزائیں تو مان لیں گے ہم مگر
سوچ رکھ کر ہاتھ دل پر فیصلہ کرتے ہوئے

کر لیا ہم نے ہی اپنے دل کو پتھر آخرش
درد و غم سے زندگی کو آشنا کرتے ہوئے

یاد آجاتی ہے اس کی بے وفائی دفعتاً
سہم سا جاتا ہوں میں ذکر وفا کرتے ہوئے

جانے اے اقبال شیدائی ہے منزل کونسی
ڈر رہا ہوں خود سے خود کا سامنا کرتے ہوئے

بزمِ خیال

(اس عنوان کے تحت دو علمی و ادبی سوالوں کے جواب دیئے جاتے ہیں)

سوال ۔ سانپ کا زہر کیا کام آتا ہے۔

جواب ۔ سانپ کے منہ میں زہریلی تھیلیاں اوپر کے جبڑے کی پچھلی طرف ہوتی ہیں اور ان کا براہِ راست تعلق کاٹنے والے دانتوں سے ہوتا ہے۔ جب سانپ کسی کو ڈستا ہے۔ تو ان دانتوں کے دباؤ سے تھیلیوں کا زہر دانتوں کے ذریعہ زخم میں منتقل ہو جاتا ہے۔ مصنوعی طریقوں سے بھی سانپ کا زہر حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہ زہر بالکل بے رنگ ہوتا ہے۔ نہ یہ پانی کی طرح رقیق ہوتا ہے نہ انڈے کی سفیدی کی طرح گاڑھا۔ جب اسے خشک کیا جاتا ہے تو یہ ہلکے زرد رنگ کے دانوں میں بدل جاتا ہے۔ طبِ یونانی اور آیورویدمیں بطورِ خوراک سانپ کا زہر بڑی احتیاط اور طبی نگرانی میں استعمال کرایا جاتا ہے اور مقدار خوراک بھی ایک رتی کا سوواں حصہ ہوتا ہے کیونکہ ½ رتی بھی اس کا زہر ہلاک کر دیتا ہے۔ وید سانپ کے زہر کو اس سے بھی کم مقدار میں تازہ گنّے کے رس کے ساتھ استسقا کے مریضوں کو دیتے ہیں۔ منہ کے ذریعہ سانپ کا زہر کھانے سے یہ معدے اور آنتوں میں جذب نہیں ہوتا ہاں اگر منہ، مسوڑوں حلق یا معدے اور آنتوں میں زخم ہو گا تو یہ زہر زخم کے ذریعہ خون میں جذب ہو کر زہریلا اثر پیدا کر دے گا۔ مغربی طب میں اس کو مرگی اور رعشہ جیسی بیماریوں میں بذریعہ انجکشن استعمال کیا جاتا ہے۔

سوال ۔ بیل پھل کے کیا فائدے ہیں۔

ج ۔ بیل پھل ایک درخت کا تازہ اور نیم پختہ پھل ہوتا ہے۔ اس کا کانٹے دار درخت پندرہ سے پچیس فٹ بلند ہوتا ہے۔ تنا بہت موٹا ہوتا ہے مگر اس پر کانٹے نہیں ہوتے۔ تین پتے ایک ساتھ ہر شاخ پر نکلتے ہیں۔ گرمی شروع ہونے سے پہلے اس کے پرانے پتے جھڑ جاتے ہیں اور نئے پتے نکلنے لگتے ہیں۔ اس کے پھل موسمِ گرما میں پکتے ہیں۔ پھل نارنج کے برابر ہوتا ہے اور اس کا وزن آدھ پاؤ سے لے کر آدھ سیر تک ہوتا ہے۔ برادرانِ وطن اس کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس کے پتوں کو شیو جی کی مورتی پر چڑھاتے ہیں۔

موسمِ گرما میں اس کے پھل کے تازہ گودے کو رات پانی میں بھگو کر صبح مصری میں ملا کر پینے سے پرانے دستوں کو بند کر دیتا ہے۔ پرانی پیچش میں بہت فائدہ مند ہے۔ آؤں اور خون کو بند کرتا ہے۔ بچوں کو اسہال اور پیچش میں بہت فائدہ دیتا ہے۔ شربت بیل اور بیل پھل کا مربّہ اس کے مشہور مرکبات ہیں اور عام طور پر دواسازوں کے ہاں ملتے ہیں۔

ماہنامہ

ذوقِ نظر

حیدرآباد

فون نمبر 525117

جلد (۳)　　محمد قلی قطب شاہ نمبر　　شمارہ (۴)

اپریل ۱۹۸۷ء

مدیر اعلیٰ: محمد بشیر الدین بشیر واثقی

مدیر انتظامی: خورشید جنیدی

ناظم نشر و اشاعت: عابد قادری　　مشیر قانونی: محمد شمیم ایڈوکیٹ

مجلسِ مشاورت

ڈاکٹر عبدالستار خان　　ڈاکٹر یعقوب عمر　　ڈاکٹر وحید اشرف

علی احمد جلیلی　　مبشر احمد　　ڈاکٹر عقیل ہاشمی

زرِ تعاون

سالانہ پچاس روپے　　فی شمارہ پانچ روپے

عرب ممالک سے　　فی شمارہ ۵ ریال

ایڈیٹر پرنٹر پبلشر محمد بشیر الدین بشیر واثقی ★ مقام اشاعت: دائرہ الیکٹرک پریس چھتہ بازار

مقام اشاعت دفتر ماہنامہ ذوقِ نظر ۱۳-۶-۸-۲۲ چھتہ بازار حیدرآباد

اس شمارے میں

حرفِ آغاز

سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام کی رنگینی پر اُسے حافظ دکن کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ جس طرح اودھ کے حکمران واجد علی شاہ نے اپنے دور میں فنونِ لطیفہ میں جان ڈالدی تھی بالکل اسی طرح محمد قلی قطب شاہ نے بھی فنون لطیفہ کی بے مثال سرپرستی کی تھی اور اس سلسلہ میں اُس نے جو خدمات انجام دیں واجد علی شاہ اس معیار تک نہیں پہونچ سکے۔

محمد قلی آئین جہانبانی سے بھی بخوبی واقف تھا۔ اس نے ایران کی عظیم سلطنت صفویہ سے سیاسی تعلقات اُستوار کئے اور سفیروں کی باقاعدہ آمد و رفت سے ایرانی تہذیب و تمدن کی جو چھاپ دکنی معاشرے پر پڑی وہ آج تک نمایاں ہے۔ اسی لئے دکن کو اس زمانے میں ایران ثانی بھی کہا جانے لگا تھا۔

حیرت کی بات تو یہ ہے کہ صفوی حکمرانوں نے مذہب پرستی کے شدید جذبے کے تحت فنون لطیفہ کی سرپرستی سے ہاتھ اٹھالیا تھا اور شاعر و نقاش و سنگتراش و موسیقار مربیوں اور قدردانوں کی تلاش میں ہندوستان کا رخ کرنے لگے تھے۔ سلطان محمد قلی بھی صفیوں کی طرح مذہب اثنا عشری کا پیرو تھا مگر اس نے کبھی ایسی شدید مذہب پرستی کا اظہار نہیں کیا۔ جہاں وہ آئمہ معصومینؑ اور اہلِ بیتؑ کی محبت میں سرشار نظر آتا ہے۔ وہیں وہ نئے شعر و سخن کا متوالا بھی نظر آتا ہے۔ موسیقی اور دیگر فنونِ لطیفہ کی سرپرستی میں بھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ ایسا اعتدال شاید ہی کہیں اور پایا جائے۔

وہ ایسا کج کلاہ تھا جس نے بیک وقت دین و دنیا دونوں کی باگیں انتہائی مضبوطی سے تھام رکھی تھیں۔ اور وہ دونوں میں سے کسی ایک کو بھی ہاتھ سے دینا نہیں چاہتا تھا۔ وہ مذہب کے لئے دُنیا کی جائز لذتوں سے بھی دست بردار نہ ہوا وہیں اس نے دنیا کے لئے مذہب کا استحصال بھی نہیں کیا۔ اور قطب شاہی حکمرانوں کا یہ اعتدال دکن کے لوگوں کا خمیر بن گیا۔ یہاں کی آبادی میں وسیع القلبی اور رواداری کے جذبات پیدا ہوئے اور ایک گنگا جمنی تہذیب کی بنیاد پڑی جس نے دکن کو صدیوں تک گہوارۂ امن و آشتی بنائے رکھا۔ آج بھی دکنی تہذیب کے یہ روشن عناصر ہمارے ملک اور ہماری قوم کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔ آج ہمارا ملک جس خلفشار سے گزر رہا ہے اس کا واحد علاج یہ ہے کہ قطب شاہی کجکلاہوں کی بنائی ہوئی روایات کی پاسداری کی جائے مختلف الخیال اور مختلف مذاہب کے لوگوں کے مابین جو صلح و آشتی کی فضا انہوں نے پیدا کردی تھی اُسے دوبارہ رواج دیا جائے تو قدیم دکن کی طرح سارا ملک جنت نشان بن سکتا ہے

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی۔

ڈاکٹر یعقوب عمر

حمد

سرِ سجدہ ہے قلم کیسے تمنا لکھوں
ماورئ فکر کی حد سے ہے تجھے کیا لکھوں

ابتدا، وقت کا عہد، برجِ ازل، شامِ ابد
حق تو یہ ہے کہ میں کیا ان کے علاوہ لکھوں

آسماں، سمت، زمیں، ذہن، خطا اور عطا
پہلے ان سب کو پڑھوں پھر تجھے تنہا لکھوں

حرف بھی تو ہے، عبارت بھی ترے نورِ فلس
پھر بھی گمراہ ہوں گر تجھ کو صحیفہ لکھوں

میں کہ عاصی ہوں طلب آخری منزل میری
تو کہ رحمت ہے تجھے کیسے نہ وعدہ لکھوں

مجھ کو احساس ہے کہ کوتاہئ فن کا اُمید
اور کچھ لکھ نہیں سکتا ہوں تو سجدہ لکھوں

علی عباس اُمید
۹۶/۴۶ جمو نگر بھوپال
۴۶۲۰۰۳

نعت شریف

مالک ہے وہ تمام کا مختار آپؐ ہیں
حق کی ہر ایک چیز کے حقدار آپؐ ہیں

مظہر خدا کا نور نمودار آپؐ ہیں
یعنی حضورؐ نور کی تکرار آپؐ ہیں

معراج سے ہر ایک پہ ظاہر ہو گیا
دیدارِ حق کا حاصلِ دیدار آپؐ ہیں

ورنہ کہاں کے ارض و سما مہر و ماہتاب
یہ ساری وجہ گرمئ بازار آپؐ ہیں

جو دیکھتا ہے دیکھ رہا ہے نظر مگر
ملا، جو مجھ میں ملا ہے وہ سرکار آپؐ ہیں

کوئی پہنچ سکا نہ بلندی تلک آپؐ کی
معیار رکھنے والوں کا معیار آپؐ ہیں

کیا پوچھنا ہے رحمتِ عالم کی شان کا
ہر ایک کوتاہ کے طرفدار آپؐ ہیں

ہر چیز کی نظم ہے خود اثبات کی دلیل
کہتا ہے چیخ چیخ کے انوار آپؐ ہیں

جاؤں کہاں پناہ ہے بس آپ ہی کے
میں بندہ آپ کا ہوں سرکار آپؐ ہیں

داؤد نصیب
(صدر بزمِ مجاہد اقبال حیدرآباد)

سیرت النبیؐ بعد از وصال النبیؐ

ان نیک بخت صاحبِ دل مسلمانوں کے خواب جنھوں نے حضورِ رحمتِ عالمؐ کی زیارتِ بابرکت کی ہے جنہیں "حیات النبیؐ بعد وصال النبیؐ" مرتبہ جناب محمد عبد المجید صاحب صدیقی ایڈوکیٹ ہائی کورٹ لاہور (پاکستان) سے عوام الناس کے استفادہ کے لئے شکریہ کے ساتھ پیش کیا جارہا ہے۔ امید کہ قارئین کرام اس سلسلہ کو پسند فرمائیں گے۔ ..

خواب نمبر (۱)

(۱) فریقین زندہ ہیں (۲) آپؐ ایک نومسلم جس نے "پیغمبر صحرا" کتاب لکھی ہے جو آپ کو پسند ہے اس کی گرفتاری پر بے قرار ہو جاتے ہیں اور خواب میں تشریف لاکر ایک مالدار مسلمان کو حکم فرماتے ہیں کہ اسکی زرِ ضمانت ادا کرے اور اسے رہائی دلوائے۔

بیرسٹر کے ایل گابا ۱۸۹۹ء میں پیدا ہوئے ان کے والد لالہ ہرکشن لال گابا ڈپٹی کمشنر ملتان کے دفتر میں کلرک تھے۔ مگر دیکھتے ہی دیکھتے اتنی ترقی کی کہ حکومت پنجاب کے وزیر تعلیم بن گئے۔ وہ کروڑپتی سرمایہ دار تھے اور ان کا دل اور دسترخوان وسیع تھا۔ آخر زمانہ میں انگریز حکمرانوں کے زیرِ عتاب آگئے۔ اور نہایت کسمپرسی کے عالم میں جان دی۔ وسیع جائداد کوڑیوں کے دام نیلام کردی گئی۔ کے ایل گابا نے ۱۹۳۲ء میں اسلام قبول کیا اور ان کا نام کنہیا لال گابا کی جگہ خالد لطیف گابا رکھ دیا گیا۔ یعنی دستخط اب بھی گابا ہی رہے۔ ان کے اسلام قبول کرنے پر ہندو سماج میں زلزلہ آگیا اور ان کو دوبارہ ہندو بنانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا گیا مگر یہ اسلام پر قائم رہے اور آج بھی قائم ہیں۔ قبول اسلام کے بعد آپ نے حضرت محمدؐ کی حیات طیبہ پر انگریزی میں ایک کتاب لکھی جس کا نام prophet of the desert (پیغمبرِ صحرا) ہے اس کتاب کے کئی ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں۔ گابا نے اپنی خود نوشت حیات ---- Friends and foes کے اندر حسبِ ذیل واقعہ بیان کیا ہے۔

[illegible] کورٹ کے چیف جسٹس سر ڈگلس [illegible] نے بوڑھے لالہ ہرکشن لال [illegible]) کسی بات پر مجھ سے ناراض [illegible] ایک جھوٹے مقدمہ میں مجھے ملوث کر کے [illegible] کر دیا۔ ضمانت پر رہائی کے لئے انگریز ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج لاہور نے ڈیڑھ لاکھ روپیہ زرِ ضمانت مقرر کیا۔ روزنامہ "زمیندار" اور "احسان" نے [illegible] سے بار بار اپیل کی کہ اس نو مسلم کو قید سے [illegible] جائے مگر پورے ہندوستان میں ایک مسلمان بھی اتنی رقم بطورِ ضمانت پیش نہ کر سکا۔ جس کی وجہ سے مجھے چند ہفتے جیل میں گزارنے پڑے۔ اسی اثنا میں سیالکوٹ کے ایک ٹھیکیدار الحاج ملک سردار علی کو خلاصۂ کائنات حضرت نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی۔ آپ نے حکم فرمایا ۔۔

"سردار علی اٹھو اور صبح لاہور جا کر ایک نو مسلم قیدی خالد لطیف گابا کی سیشن کورٹ میں ڈیڑھ لاکھ روپئے کی ضمانت دے آؤ اور اسے قید سے رہائی دلاؤ۔ اس میں کوئی کوتاہی ہرگز نہ کرنا۔ اس نے میرے متعلق ایک کتاب "پیغمبر صحرا" لکھی ہے جو مجھے بہت پسند آئی ہے"

ملک سردار علی اس زیارت با برکت سے بے حد مسرور ہوگئے۔ صبح کاغذات کی تصدیق کے لئے عدالت پہنچے مگر ہندو ڈپٹی کمشنر مسٹر چندرا آئی۔سی۔ایس نے آپ کو ڈرایا، دھمکایا اور کہا کیا باہر بھاگ جائے گا [illegible] جائے گی تم ضمانت [illegible]

ملک صاحب نے جواب دیا کہ جن بزرگ ویر تر [illegible] کام کے لئے حکم فرمایا ہے اس پر اگر میری [illegible] جائے تو مقام مسرت ہوگا۔ ڈیڑھ لاکھ [illegible] میں نہیں جانتا خالد لطیف گابا کون شخص ہے [illegible] اس کو کبھی نہیں دیکھا۔ مجھے تو خواب میں اس کا نام بتایا گیا ہے۔

ہندو ڈپٹی کمشنر نے کاغذات کی تصدیق نہ کی۔ مجبوراً ملک صاحب نے دو تین دوستوں سے [illegible] روپیہ نقد جمع کیا اور لاہور آ کر انگریز سیشن جج کی عدالت میں نقد زرِ ضمانت پیش کر کے مجھے رہائی دلائی۔

ملک صاحب اب قریب (۸۷) سال کے ہیں۔ سیالکوٹ (پاکستان) میں جا کر کوئی بھی اُن سے ملاقات کر سکتا ہے۔ اس کام کو اپنے لئے توشۂ آخرت اور سرمایہ حیات سمجھتے ہیں۔ گابا صاحب قیام پاکستان کے وقت ۱۹۴۷ء میں لاہور سے بمبئی (بھارت) چلے گئے تھے آج بھی وہیں موجود ہیں۔

از: مولانا محمد جلال الدین کامل حسامی

شب برأت کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ نے جس طرح اپنی ذات پاک کے سوا سبھوں میں ایک کو دوسرے پر فضیلت والا رکھا ہے خواہ وہ پیغمبر ہو یا ولی ۔ انسان ہو کہ فرشتے آسمانی کتابیں ہو کہ زمانہ کے لیل و نہار ۔ قرآن مجید میں ہے اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا آپ دیکھ لیجئے ہم نے ایک کو دوسرے پر کس طرح فضیلت دی ہے البتہ آخرت درجوں کے اعتبار سے بھی بہت بڑی ہے اور فضیلت کے اعتبار سے بھی بہت بڑی ہے (پ۱۵ ر۲) دنیا کے لیل و نہار میں سے شب برات بھی ایک رات ہے جو فی نفسہ تو دیگر راتوں کے منجملہ ایک ہے مگر اللہ تعالیٰ نے نصف شعبان یعنی شعبان کی پندرھویں شب کو اس میں انجام پانے والے کاموں کے لحاظ سے اِس کو مبارک رات سے موسوم فرمایا ہے ۔ چنانچہ سورہ دخان کی ابتدائی آیات میں لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ کا جو ذکر فرمایا ہے اس سے بعضوں نے اسی شب برات کو بتانے کی کوشش کی ہے ۔ کیوں کہ دیگر اہل علم نے شب قدر کا دوسرا نام لَيْلَةُ الْمُبَارَكَة بتایا ہے ۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ سورۂ قدر میں شب قدر کے بارے میں اس کے جو اوصاف بیان فرمائے ہیں یعنی روح یا حضرت جبرئیلؑ کا اترنا اور فرشتوں کا زمین پر آنا ۔ اس شب کو قرآن کا لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر آنا اور ہزار مہینوں سے بہتر ہونا لیکن اس مقام پر لیلۃ مبارکہ میں فیصلے کئے جانے کی رات بتانے کی وجہ شب قدر کے علاوہ شب سمجھنے کی گنجائش پائی جاتی ہے ۔ اگرچہ فضیلت میں شب برات کم ہے بہ نسبت شب قدر کے مگر عام راتوں سے بدرجہا فضیلت والی ضرور ہے اور جسے اپنے آئندہ کی فکر ہو وہ شب قدر سے زیادہ اس شب برات میں اللہ تعالیٰ کی طرف ضرور راغب ہوگا تاکہ اس کے لئے آنے والے سال میں مصائب کے بجائے فوائد اور خوبیاں رکھی جائیں ۔ یہی وجہ ہے کہ بزرگوں نے اس شب برات میں اعمال میں تین بار سورۂ یٰسین پڑھنے کا طریقہ بتایا کہ اس رات صبح صادق سے پہلے تک پہلے دو رکعت نفل نماز ادا کر کے ایک مرتبہ سورۂ یٰسین کو شروع سے آخر تک پڑھ کر حضور قلب کے ساتھ اپنے اور اپنے لوگوں کی صحت و عافیت کے ساتھ درازی عمر کے لئے دعا کرے ۔ پھر اٹھ کر دو رکعت نفل پڑھ کر دوسرے بار سورۂ یٰسین پڑھنے کے بعد اپنے اور اپنے لوگوں کے لئے کشادگی رزق کی دعا کرے ۔ اس کے بعد تیسری مرتبہ پھر دو رکعت نفل پڑھ کر سورۂ یٰسین پڑھنے کے بعد بلاؤں کے دفع ہونے کی دعا کرے تو اللہ تعالیٰ ضرور قبول فرماتا ہے ۔ توبہ اور استغفار کرے تاکہ غضب الٰہی نہ ہونے پائے اور ہمارے لئے آنے والے سال میں یہ دنیا ایسی بسر ہو کر پریشانیاں دور ہوتی رہیں اور منتیں حاصل ہوتی رہیں اور اپنی

آخرت کو بہتر بنانے والے بن کر زندگی بسر کرتے رہیں اللہ تعالیٰ سے نیک گمان رکھیں تاکہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہمارے حق میں مہربانی ہی کا برتاؤ فرمائے۔ کیونکہ حدیثِ قدسی ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ میں اپنے بندے کے گمان کے ساتھ ہوں۔ میرے ساتھ جیسا گمان کیا جائے گا۔ ویسا ہی معاملہ اس کے ساتھ رہے گا۔

جس طرح اہلِ مقدمہ فیصلہ لکھے جاتے وقت اپنے فیصلہ لکھنے والے کی طرف ہمہ تن متوجہ رکھتے ہیں کہ فیصلہ کرنے والا ہم پر مہربان ہو تاکہ ہمارے نقصان کا فیصلہ صادر نہ فرمائے اسی طرح یہ شب برات فیصلے کی رات ہے ارشاد ہے کہ فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ ۝ یعنی اس رات میں حکمت والا معاملہ ہماری پیشی سے حکم ہو کر طے کیا جاتا ہے (پ ۲۵ ر ۱۴) اس لئے ہر مسلمان کو خواہ مرد ہو کہ عورت بچہ ہو یا بوڑھا سب کو چاہیئے کہ اس رات اذکار و عبادات میں مصروف رہیں۔ تسبیح و تہلیل اور مغفرت طلب کرتے رہیں اور اپنے گناہوں سے ایسی توبہ کرلیں کہ پھر دوبارہ ان کا ارتکاب نہیں کریں گے۔ اپنے سے ایسی حرکات سرزد نہ ہونے دیں جو مرضی الٰہی کے خلاف ہوں مگر دیکھا جاتا ہے کہ مسلمان اس طرح شب برات نہیں گزارتے۔ دلوں میں خوف الٰہی پیدا نہیں کرتے بلکہ کھانے پینے میں لگے رہتے ہیں سینما اور ٹی وی دیکھتے رہتے ہیں یہ نہیں خیال کرتے کہ مر جائیں گے تو یہی چیزیں عذاب کی شکل میں آکر تکلیف اور سخت عذاب کا سبب بنیں گی۔ مگر اس سے چھٹکارا نہ ہو سکے گا۔ چند مسلمان جو مسجد میں جاتے ہیں تو ان کا دل عبادت میں لگے رہنے کے بجائے کھانے چائے پینے اور باہمی گفتگو میں زیادہ گزرتا ہے۔ اس لئے رات آنے سے پہلے کھا پی کر نماز مغرب ادا کرنے کے بعد قرآن خوانی اور درود شریف پڑھنے لگیں۔ پھر نماز عشاء کے بعد مواعظ حسنہ سے مستفید ہوتے رہیں تاکہ دینداری کی اہمیت دلوں میں پیدا ہو۔ پھر اس کے بعد نوافل ادا کریں۔ صلوٰۃ تسبیح پڑھیں۔ بیزاری ہو تو قرآن مجید یا دیگر اذکار بدل بدل کر مختلف عبادتوں میں رات کو صرف کریں۔

حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منجملہ احسانات کے یہ بھی بہت بڑا احسان ہے کہ آپ نے اپنے امتیوں کو قبل از قبل اس سے واقف کر دیا کہ کب کیا ہوتا ہے۔ اگر واقف نہ کیئے جاتے تو یہ شب برات بھی دیگر راتوں کی طرح غفلت میں بسر ہونے کی وجہ گھاٹے میں رہتے معلوم ہوئے آپ سے اس رات کے فیوض حاصل کرنے کا موقع ملا ہے۔

خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو فیصلوں کی اس رات میں اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہ کر سعادت حاصل کرتے ہیں۔

جو مسلمان اس شب برات کے پہلے دن کو عرفہ کہتے ہیں وہ سخت غلطی کرتے ہیں۔ کیونکہ نویں ذالحجہ کے سوا کسی دن کو عرفہ نہ کہنا چاہیئے۔ اور اسے مُردوں کی عید بھی کہنا اس لئے غلط ہے کہ عالمِ ارواح میں عید کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں یہ ہے کہ اس شب برات میں مُردوں کیلئے مغفرت طلب کیجائے انکے لئے ایصالِ ثواب کی تدابیر جیسے فاتحہ اور کھلانا وغیرہ اختیار کیا جائے۔ اس شب برات میں اللہ تعالیٰ کے پاس انجام پانے والے امور تو ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان سے ہر مسلمان کو خصوصاً لرزتے ہوئے سربسجود ہونا چاہیئے مگر پٹاخے بجوں پھر ہونے جاتے ہیں مسلمان مرد مسجدوں میں جانا چاہیئے یا اپنے گھروں میں اپنی بیوی بچوں کیساتھ اذکار اور عبادت میں رات گزارنا چاہیئے۔ وما علینا الا البلاغ ــ ●●

کلام الملوک

غزل فارسی از: محمد قلی قطبشاہ

ساقی بیار بادہ کہ فصلِ بہار شد
صحنِ چمن زآب و ہوا لالہ زار شد

ما اقتدا بشربِ مُدامِ تو کردہ ایم
پُر کن پیالہ کہ زمانِ خمار شد

ہر جُرعہ کہ زہرِ غضب نوش کردہ ام
از دستِ آں نگار مرا سازگار شد

کردیم از رقیب نہاں رازِ دل چہ سُود
زاں یک نگاہ راز مرا آشکار شد

بر وعدہ وصال دلش خوش کُن اے حبیب
چوں قطب شہ زہجرِ رخت بیقرار شد

غزل

ڈاکٹر یعقوب عمر

محمد قلی قطبشاہ کی غزل کا آزاد ترجمہ

ساقی پلا شراب کہ فصلِ بہار ہے
آب و ہوا سے صحنِ چمن لالہ زار ہے

ہم تو نثار ہیں ترے شربِ مدام پر
بھر دے ہمارا جام کہ وقتِ خُمار ہے

زہرِ غضب کا جام بھی اُس دستِ ناز سے
سچ پوچھئے تو میرے لئے سازگار ہے

کیسے رکھوں رقیب سے پوشیدہ دل کا راز
جو اُس کی ہر نظر سے عیاں آشکار ہے!

کر وعدۂ وصال سے دل قطب شہ کا خوش
کب سے ترے فراق میں وہ بے قرار ہے

گولکنڈہ

علامہ اقبال مرحوم کی ایک طویل نظم کے چند شعر

لانگاہ عالمگیر یعنی وہ حصار
دوش پر اپنی اٹھائے سیکڑوں صدیوں کا بار

زندگی سے تھا کبھی معمور اب سنسان ہے
یہ خموشی اس کے ہنگاموں کا گورستان ہے

اپنے سکانِ کہن کی خاک کا دلدادہ ہے
کوہ کے سر پر مثالِ پاسباں استادہ ہے

خوابگہ شاہوں کی ہے یہ منزلِ حسرت فزا
دیدۂ عبرت! خراجِ اشکِ گلگوں کر ادا

ہے تو گورستان، مگر یہ خاک گردوں پایہ ہے
آہ! اک برگشتہ قسمت قوم کا سرمایہ ہے

مقبروں کی شان حیرت آفریں ہے اس قدر
جنبشِ مژگاں سے ہے چشمِ تماشا کو حذر

کیفیت ایسی ہے ناکامی کی اس تصویر میں
جو اتر سکتی نہیں آئینۂ تحریر میں

سوتے ہیں خاموش آبادی کے ہنگاموں سے دور
مضطرب رکھتی تھی جن کو آرزوئے ناصبور

قبر کی ظلمت میں ہے ان آفتابوں کی چمک
جن کے دروازوں پہ رہتا تھا جبیں گستر فلک

کیا یہی ہے ان شہنشاہوں کی عظمت کا مآل
جن کی تدبیرِ جہانبانی سے ڈرتا تھا زوال

اشک باری کے بہانے ہیں یہ اجڑے بام و در
گریۂ پیہم سے بینا ہے ہماری چشمِ تر

دل ہمارے یادِ عہدِ رفتہ سے خالی نہیں
اپنے شاہوں کو یہ امت بھولنے والی نہیں

محمد قلی

علامہ نجم آفندی مرحوم

وہ پہلا قطب شاہِ عالی مقام — محمد قلی شاہ جس کا ہے نام
اُسی نے رکھی اس کی بُنیاد ہے — یہ بلدہ جواب حیدرآباد ہے
یہ ظاہر ہے خود چار مینار سے۔ — بنایا ہے اس کو بڑے پیار سے
خُدا اس کو دیتا ہے ہر آتما — بڑا نیک تھا اور دھرماتما،
اُسے راج کرنے کا آتا تھا ڈھب — بڑے خوش تھے ہندو مسلمان سب
وہ دکھ سب کا سمجھتا رہا، — وہ دونوں کو اپنا سمجھتا رہا۔
غزل بھی کہی، مرثیہ بھی کہا — وہ اردو کی بھاشا کا شاعر بھی تھا۔
اُسی سے چلا قطب شاہوں کا راج — منایا ہے دِن جس کا جنتا نے آج

دماغ اور دِل کی یہ پہچان ہے
یہ سب لقذ صاحب کا احسان ہے

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید

محمد قلی قطب شاہ

نور سا بکھرا فضا میں زندگی گانے لگی
جو طبیعت مضطرب تھی، وہ سکوں پانے لگی
پھر کھلیں کلیاں چمن میں رنگ و بو کا دور ہے
اے محبت کے پیامی! شاعرِ شیریں سخن!
مرکزِ فصلِ بہاراں بن گیا تیرا چمن!
ہے تری اُلفت کا نقشِ جاودانی یہ نگر
خونِ دل دے کے جس کو تو نے پالا ۔ وہ زباں!
ہند میں جس کا ہوا تھا بول بالا — وہ زباں!
اُس کی محفل کے چراغوں کو بجھانے کے لئے
زلزلہ بن کر نیا شے ظلم جو ڈھا کر رہی!
پرچمِ انسانیت عالم میں لہرا کر رہی !
اِک جہانِ کاوش و فکر میں اس کی دھوم ہے
تیرے زریں عہد کا آغاز ہے بالا حصار
ہار میں ہے جیت پنہاں، جیت میں پنہاں ہے ہار
عیش کا جادو چلا تھا چار دن کے واسطے ،
دل میں لاکھوں غم ہوں لیکن مسکرانا چاہیئے
تفرقے ملت کے مذہب کے مٹانا چاہیئے

کس کے نغمے سن کے ہر شے وجد میں آنے لگی
چاندنی سرشار ہو کر رقص فرمانے لگی
گرمیٔ محفل دبی ہے اگرچہ محفل اور ہے
بانیٔ فردوسِ شہر حیدرآباد دکن !
تیرے ارمانوں کی بستی، تیرے خوابوں کا وطن!
کہہ رہا ہے آج بھی رنگیں کہانی یہ نگر
نور کے سانچے میں جس کو تو نے ڈھالا۔ وہ زباں!
جس کی محفل میں کیا تو نے اجالا — وہ زباں!
بڑھ رہے ہیں ہاتھ اُردو کو مٹانے کے لئے
امن کا پیغام ہر گوشے میں پہنچا کر رہی !
ابر کی صورت فضا پر جو زباں چھا کر رہی!
"روس و امریکا" ہی کیا؟ دنیا میں اس دھوم ہے
جو زبانِ حال سے یہ کہہ رہا ہے بار بار
ہے کبھی دورِ خزاں، تو ہے کبھی عہدِ بہار
آج سونی منزلیں ہیں اور ویراں راستے
آرزوؤں کی نئی محفل سجانا چاہیئے !
جو کیا تھا تو نے، ہم کو وہ دکھانا چاہیئے !

پیار کی منزل کے میر کارواں! تجھ کو سلام
اے محبت کی زمیں کے آسماں! تجھ کو سلام

ڈاکٹر محمد علی اثر

محمد قلی کی غزل گوئی

مملکت گولکنڈہ کا پانچواں فرماں روا، سلطان محمد قلی قطب شاہ، اُردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے جس نے صنفِ غزل پر باقاعدہ توجہ کی ہے۔ اور جس کا دیوان بہر قدیم ہی میں ترتیب و تدوین سے آراستہ ہو چکا تھا۔ یوں تو محمد قلی قطب شاہ سے قبل مشتاق، لطفی، فیروز، محمود اور خیالی قدیم دکنی کے باکمال غزل گو شاعر گذرے ہیں۔ لیکن کسی شاعر کا کلام مرتبہ دیوان کی شکل میں ہنوز دستیاب نہیں ہوا۔

قدیم دکنی غزل، بالخصوص دبستانِ گولکنڈہ کی غزل گوئی کا جائزہ لیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کم و بیش یہی خصوصیات دکنی کے دوسرے شاعروں کے ہاں بھی پائی جاتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہر شاعر کچھ نہ کچھ اپنی انفرادی خصوصیات کا حامل ضرور ہوتا ہے لیکن بحیثیت مجموعی، بعض نمایاں خصوصیات تمام دکنی شعرا میں مشترک نظر آتی ہیں۔

محمد قلی کا ضخیم دیوان پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ہے، جس میں کم و بیش تمام اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ رباعی اور مثنوی کی صنف کو چھوڑ کر محمد قلی کا تمام کلام غزل کے فارم میں ہے۔ غزل کی صنف کے لئے جس داخلی کیفیت اور خارجی ماحول کی ضرورت ہوتی ہے وہ محمد قلی کو میسر تھا، شاید اسی لئے غزل اس کی محبوب صنفِ سخن بن گئی۔ یہاں تک کہ اس کی وہ تخلیقات جنہیں ڈاکٹر زور نے عنوانات قائم کر کے نظموں سے تعبیر کیا ہے، دراصل مختلف موضوعات کے تحت کہی ہوئی مسلسل اور مربوط غزلیں ہی ہیں۔ سادگی و سلاست، روانی و برجستگی اور اصلیت و واقعیت محمد قلی کے کلام کی اہم اور نمایاں خصوصیات ہیں۔ اس نے اپنے تجربات زندگی، محسوسات اور مشاہدات کو سیدھے سادے الفاظ اور رواں پیرایہ بیان میں حقیقت پسندی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ محمد قلی کی غزلوں میں سوز و گداز ہے اور نہ فکر کی گہرائی، درد و غم کی روانی ہے اور نہ نشتریت۔ اس نے اپنی زندگی کی بہاریں عیش و نشاط اور راگ رنگ میں گذاریں۔ اس لئے اس کے کلام میں رنگینی و رعنائی ہے، تازگی و شگفتگی ہے، سیرابی و سرمستی ہے غرض آسودگی کے تمام روپ اس کی شاعری میں جلوہ گر ہیں۔ محمد قلی کا آرٹ کلاسیکی آرٹ کا نمائندہ کرتا ہے:

آسودگی کا آرزومند ہے۔ چوں کہ وہ ایک عظیم الشان سلطنت کا مطلق العنان بادشاہ تھا۔ اس کے محلوں میں کئی ملکوں کی منتخب حسینائیں جمع تھیں۔ اس لئے اس کی تمناؤں اور آرزوؤں کے آسودہ نہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ محمد قلی کی غزلیں اس کی رنگا رنگ طبیعت کی آئینہ دار ہیں۔ اس نے اپنے کلام میں اپنی بدنصیبی کا شکوہ کیا ہے اور نہ ناکامی اور محرومی پر آنسو بہائے ہیں۔ اس نے اپنے آپ کو مسرور رکھا اور خوشی کے اظہار کے لئے طرح طرح سے شکر بجا لاتا ہے۔

محمد قلی ایک کثیر المحبوب شاعر ہے۔ اس نے اپنی ان گنت محبوباؤں کی تعریف و توصیف میں متعدد غزلیں کہی ہیں۔ محمد قلی شاعری میں محبوب کی جنس مبہم نہیں رہتی بلکہ واضح طور پر اس کے لئے صیغہ تانیث استعمال کیا گیا ہے۔ اس نے اپنی محبوباؤں (پیاریوں) کو سکی، دھن، ناری پیاری، چھبیلی، سانولی وغیرہ ناموں سے یاد کیا ہے۔ محمد قلی ہندوستانیت کا بہت بڑا پرستار ہے۔ اس کی رگ رگ میں ہندوستانی تہذیب سرایت کر گئی ہے۔ وہ ہندوستان کی فضایاں اور مشہور رسم، تہوار اور طور طریق کو اپنے خیالات میں بسا لینا چاہتا ہے۔ محمد قلی کے کلام کے مطالعہ سے اس عہد کی سماجی زندگی کے متعلق بہت کچھ مواد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ شادی بیاہ کے رسوم مختلف موسموں عیدوں تہواروں اور کھیلوں وغیرہ کی تفصیلات کے دلچسپ مرقعے اس کے کلام میں جابجا بکھرے ہوئے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ محمد قلی کی شاعری نہ صرف اس کی منظوم سوانح حیات ہے بلکہ پورے عہد کی ایک مستند تاریخ بھی ہے جس میں چار سو سال پہلے کی زندگی کی بولتی ہوئی تصویریں نظر آتی ہیں۔

محمد قلی طبعاً راگ رنگ اور نغمہ و نشاط کا شاعر ہے اس لئے اس کی غزلوں میں زیادہ تر رنگینی، رعنائی، آسودگی اور سیرابی و سرمستی کے تمام روپ نمایاں ہو جاتے ہیں لیکن اس کی غزل محض عیش کوشی یا کامیاب عاشق کے نشاط وصل کی داستان ہی نہیں بلکہ ایک دردمند اور حساس دل شاعر کے جذبات کی ترجمان بھی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ محمد قلی کے کلام میں فراقیہ اشعار کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے لیکن یہ اشعار محمد قلی کے فکر و فن گہرائی اور گیرائی کا پتہ دیتے ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

بن سیر تمن سارے کلیاں سوکھ رہی ہیں
ٹک آ کے کر گشت چمن بھی لٹھے سارا

خدا جیو کی جان کوں دکھا ایک بار
دکھاں عرض کر غم کردں خوانناد

موں نظر سامنے نہیں ہے یار
نین پانی میں تیرتے دلدار

تج بن پیارے نیند ٹک نیناں میں نہیں آتی ہیں
رینی اندھاری ہے کٹھن تج بن کٹی جاتی نہیں

محمد قلی کی غزلوں میں حسن و عشق کے ساتھ مذہبی رنگ بھی شدت سے ابھرتا ہے۔ مذہبی رنگ کی غزلوں میں بھی محمد قلی نے جوش عقیدت اور اپنے اعتقادات سے والہانہ وابستگی کا اظہار کیا ہے۔ اس میں شک

ہیں کہ محمد قلی مذہب پر بھرپور عقیدہ رکھتا ہے اور مذہبی رسومات پر بھی چلتا ہے۔ لیکن مذہب کی حقیق روح سے اس کی شخصیت اور شاعری میں دونوں عاری ہیں اس کو مذہب کے صرف تہذیبی پہلوؤں سے دلچسپی ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ وہ اپنی عیش کوشی کو بھی نبی اور علی کا صدقہ قرار دیتا ہے۔ اسے مذہب اس لئے عزیز ہے کہ اس کی وجہ سے زندگی حکومت، دولت اور دنیوی کامرانی حاصل ہوئی ہے۔ مذہبی موضوعات پر اس نے بیسوں غزلیں کہی ہیں۔ لیکن کہیں بھی وہ ایک متقی یا پرہیزگار کی طرح عبادت کرتا دکھائی نہیں دیتا۔ بلکہ ہر تقریب میں اسے یہ فکر رہتی ہے کہ اس کی "پیاری" یا "سانولی" نے کونسا لباس زیب تن کیا ہے۔ اور نبی کے صدقے سے آج وہ کتنی پر کشش دکھائی دے رہی ہے۔

نبی کے صدقے یارا اماماں کرم تھے
کر و عیش جم بارا پیاریاں سوں پیارے
نبی صدقے قطب جسم عیش کر عیش
کہ تج در پر کھڑے ہیں فتح و اقبال

قدیم ادب کے بعض نقادوں اور محققوں نے محمد قلی قطب شاہ کی شاعری کو الہامی کہا ہے اور اس کو ایک عظیم المرتبت شاعر قرار دیا ہے حقیقت یہ ہے کہ محمد قلی کے یہاں نہ تو مضامین غیب سے آتے ہیں۔ اور نہ ہی اس نے عرش سے ادھر کی باتیں کی ہیں وہ تو اسی رنگ و بو کا ایک متقی ہے جو ہمیشہ اپنی بے شمار محبوباؤں اور بیب دیوں کے جھرمٹ میں گھرا رہتا ہے اور انہیں کے خد و خال عشوہ و حجاب اور رفتار و گفتار کے گیت گاتا ہے محمد قلی پر عظیم شاعر کی اصطلاح کا اطلاق بھی اس کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ کیوں کہ ایک عظیم شاعر وہ ہوتا ہے۔ جس کے کلام میں حقائق حیات کے بارے میں حکیمانہ بصیرت ملتی ہے۔ محمد قلی نہ بلند پایہ عالم تھا اور نہ فلسفی یا حکیم، اس نے اپنے محسوسات اور تجربات زندگی کو سادگی اور حقیقت پسندی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہی اس کی شاعری کا نمایاں وصف ہے۔ وہ ایک خوش گو اور اردو کا اولین صاحب دیوان شاعر ہے۔ اردو زبان کی تاریخ میں یہی واقعہ اس کے نام اور کلام کو ہمیشہ زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔

وقار خلیل

حیات محمد قلی قطب شاہ

سلطان محمد قلی، قطب شاہی سلسلے کے پانچویں بادشاہ تھے۔ ان سے پہلے اس خاندان کے چار بادشاہ، ابراہیم قلی، سبحان قلی، جمشید قلی اور سلطان قلی گولکنڈہ میں تخت نشین ہو چکے تھے۔

محمد قلی کے دادا، سلطان قلی ترکستان کے بہت بڑے اور اونچے درجے کے رئیس تھے۔ ان کے قبیلے کے لوگوں نے کئی سال تک مغربی ایران پر راج کیا۔ خاندانی لڑائی جھگڑوں کی وجہ سے محمد قلی کے دادا اپنے چچا کے ساتھ ہندوستان کی طرف چل نکلے اور بیدر پہنچے ان دنوں بیدر میں سلطان محمود پادشاہ بہمنی کا راج تھا۔ محمد قلی کے دادا نے محمود پادشاہ بہمنی کی حکومت میں نوکری کر لی۔ اور تلنگانے کے صوبہ دار ہوئے۔ محمود پادشاہ بہمنی کی حکومت کے خلاف جب دوسرے صوبہ داروں نے بغاوت کر دی تو سلطان قلی ایک وفادار صوبہ دار کی طرح محمود پادشاہ کے حامی رہے۔ محمود پادشاہ کے مرنے کے بعد گولکنڈہ کی آزادی کا اعلان کیا۔ اور قطب شاہی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔

قطب شاہی خاندان نے اپنی حکومت کے زمانے میں ہندو مسلم دوستی اور رعایا کی بھلائی کے لئے بہت اچھے کام کئے۔ سلطان قلی کے والد ابراہیم قلی کا زمانہ بھی شاندار رہا۔ گولکنڈہ میں اس نے ہندو رعایا کی بڑی خدمت کی اور تلنگو کے شاعروں اور ادیبوں کی بھی ایسی قدر دانی کی کہ پرانا تلنگو ادب اس کی تعریف سے بھرا پڑا ہے۔ ابراہیم قلی کے دربار میں بڑے بڑے ہندو امیر اور سپہ سالار موجود تھے۔ اور محلات میں بہت سی تلنگن عورتیں بھی کام کرتی تھیں۔

حیدرآباد شہر بسانے والا، اور چار مینار جیسی عظیم تاریخی عمارت کا جنم داتا، اردو زبان کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر سلطان محمد قلی قطب شاہ ۴ر اپریل ۱۵۶۶ء کو پیدا ہوا جیسا کہ شاہی گھرانوں میں خوشیاں منائی جاتی ہیں اسی طرح اس بلند اقبال شہزادے کی پیدائش پر خوب رنگ رلیاں رچائی گئیں۔ ان رنگ رلیوں کے بارے میں محمد قلی کی زندگی کے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے ملا وجہی نے بہت کچھ لکھا ہے۔ جن میں سے کچھ باتیں یہ ہیں: "ابراہیم قلی نے اپنے بیٹے کی پیدائش پر اتنی خیرات کی کہ انہوں نے سونے کا ایک نیا آسمان بنا ڈالا اور خود آسمان کو بھی خیرات میں اتنا زیادہ سونا دیا گیا کہ وہ اس کو رکھنے کے لئے جگہ ڈھونڈنے کے لئے رات دن چکر لگا رہا ہے اور زمین کو بادشاہ نے اتنی دولت بخش دی کہ وہ اس کے لئے آسمان سے جگہ مانگ رہی ہے اور اس قدر سونا رعایا میں بانٹا گیا کہ وہ اب مٹی سے بھی سستا ہو گیا ہے۔"

خوب پھلے پھولے، ترقی و کم قیمتی کے عرصے میں پیدا ہو گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ محمد قلی کے جنم دن پر بہت خیر خیرات کی گئی اور جی بھر کے خوشیاں منائی گئیں۔

نجومیوں اور رمالوں نے شہزادہ قلی کا زائچہ بنا کر اس کی خوش قسمتی، ترقی اور بڑے آدمی ہونے کی پیشن گوئی کی۔ جب یہ ہونہار شہزادہ بڑا ہوا تو مدرسے میں بٹھایا گیا۔ خاص استادوں کی نگرانی میں اس کی تعلیم اور تربیت ہوئی۔ یہ بچپن میں بہت ذہین اور چالاک تھا۔ کہتے ہیں کہ استادوں کو سبق دیتا تھا۔ اس نے خوش خط لکھنا انتہائی شوق سے سیکھا اور ساتھ ہی ساتھ کشتی لڑنا اور دوسرے جسمانی کرتب بھی زیادہ دلچسپی سے سیکھے۔ لیکن تعلیم کی طرف اس نے بہت کم توجہ دی۔ کیوں کہ وہ بچپن ہی سے شعر کہنے لگا تھا۔

ملا وجہی نے شہزادہ محمد قلی کا ناک نقشہ بھی لکھ دیا ہے۔ جس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بچپن میں بہت خوب صورت اور چھریرے بدن کا تھا۔ اس کا رنگ سفید، بال کالے دہانہ چھوٹا اور آنکھیں بڑی تھیں۔

محمد قلی کے باپ ابراہیم قلی قطب شاہ ۴ / جون ۱۵۸۰ء کو دنیا سے چل بسے اس وقت شہزادہ ۱۴ برس، سات ماہ اور آٹھ دن کا تھا۔ باپ کی وصیت کے مطابق محمد قلی قطب شاہ کو ۵ / جون ۱۵۸۰ء کو جمعہ کے دن راج گدی پر بٹھایا گیا۔ اس زمانہ گولکنڈہ کے ہندو اور مسلمان امیروں اور رعایا نے جی بھر کر خوشیاں منائیں۔ خود محمد قلی بھی بہت خوش تھا کہ وہ جمعہ کے دن پیدا ہوا تھا اور اسی دن اُسے راج گدی ملی۔ اس نے جی کھول کر انعامات بانٹے۔ امیروں سپاہیوں، سیدوں، عالموں کو تو خلعتیں اور بڑے بڑے تحفے دیئے۔ لیکن غریبوں اور لاچاروں کو بھی اپنی خیرات اور بخشش سے الگ نہ کیا۔ بلکہ اتنا دیا کہ غریب سکھی اور خوش حال ہو گئے۔ بچپن ہی سے محمد قلی سخی دل تھا۔ اور کم عمر بادشاہ ہوتے ہوئے بھی اس نے انصاف کی طرف خاص توجہ دی۔ اور اسی انصاف اور رعایا پروری کی وجہ سے اس کے اقبال کا ستارہ چمکنے لگا۔

راج گدی پر بیٹھنے کے بعد محمد قلی نے "ابوالمظفر سلطان محمد قلی قطب شاہ" اپنا پورا نام رکھا اور وہ اسی نام سے قطب شاہی تاریخوں میں یاد کیا جاتا ہے۔ محمد قلی کا عقیدہ تھا کہ وہ پیدائش سے اپنے نبی حضرت محمد صلعم کا قلی یعنی غلام ہے۔ اور اسی غلامی کی وجہ سے وہ دنیا میں پھلا پھولا اس نے اپنے شعروں میں لکھا ہے کہ دوسرے بادشاہ اپنی سلطنت اور دھن دولت پر گھمنڈ کرتے ہیں۔ لیکن میں صرف "محمد" کے نام اور ان کا غلام ہونے پر فخر کرتا ہوں۔ اسی وجہ سے میں کامیاب ہوں اور آج ایک اقبال مند بادشاہ ہوں۔

محمد قلی قطب شاہ کی راج دھانی گولکنڈہ تھی۔ اس انصاف پسندی اور خیر خیرات نے رعایا پر اچھا اثر چھوڑا۔ خاص و عام دور دور سے کھنچ کر آنے لگے تو راجدھانی گولکنڈہ میں اور آبادی کی گنجائش نہ رہی۔ سب سے پہلے وہاں کے امیروں نے اپنے باغ اور محل موسیٰ ندی کے کنارے بنائے۔ اس طرح آبادی بڑھنے لگی۔ یہاں تک کہ سلطان محمد قلی نے آج سے ۳۹۷ سال پہلے

۱۵۹۱ء میں سرکاری طور پر ایک شاندار شہر "حیدرآباد" کی نیو رکھی۔ اس طرح اس تاریخی شہر میں محمد قلی کے ہاتھوں "چارمینار" کی بھی بنیاد رکھی گئی۔

چارمینار ۱۸۶ فٹ اونچی عمارت ہے جسے اونیا ایک معجزہ بنایا گیا کہتے ہیں کہ چار مینار کی تعمیر میں تین لاکھ روپیوں کا خرچ آیا۔ چارمینار کے ساتھ ہی اس نے نئے شہر میں چار بازار اور چودہ ہزار دکانیں بھی بنوائیں۔ محمد قلی قطب شاہ نے جس چاؤ اور محبت سے حیدرآباد بسایا (۳) کا اندازہ خود اس کے کلام سے ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ ایک جگہ اپنی نظم "مناجات" میں خدا سے جہاں بہت سی باتوں کی دعا کرتا ہے وہیں اپنے شہر کی آبادی کے لئے بھی دعا کرتے ہوئے کہتا ہے۔ کہ "اے خدا تو میرے شہر کو لوگوں سے ایسا بھرپور رکھ جس طرح تو نے سمندروں کو مچھلیوں سے بھر دیا ہے"

پھر دھیرے دھیرے بازار محلے اور محل تعمیر کئے جانے لگے اور شہر حیدرآباد کو محمد قلی نے اس طرح سجایا جس طرح ایک انگوٹھی میں نگینہ سجتا اور بھلا معلوم ہوتا ہے سب سے پہلے چارمینار کے شمال مغرب کی طرف "دولت خانہ عالی" بنایا گیا۔ جس کے جلوخانے میں چاروں طرف چار اونچی کمانیں کھڑی کی گئیں۔ اور ایک آٹھ پہلو حوض بنایا گیا تاکہ فوجیوں اور اُن کے جانوروں کو پانی مل سکے۔ جلوخانہ کے مغرب میں شاہی محلات کی بنیاد رکھی گئی اور دولت خانۂ عالی کی ساٹھ فٹ اونچی اور چھ فٹ چوڑی کمان کے چھجے کی کمان پر ۳۶ فٹ کا ایک اور چھجہ رکھ کر چوکھٹ بنائی گئی جس میں صندل، ہاتھی دانت اور سونے کا ایک قدحہ لگایا گیا۔ دولت خانۂ عالی میں چھوٹے بڑے کئی محلات بھی بنائے گئے۔ یہ محلات قطب شاہی راج کے بعد توڑ دیئے گئے۔

محمد قلی قطب شاہ نے اپنے کلام میں سب سے پہلے "خداداد" محل کی تعریف لکھی ہے جس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آٹھ منزلہ محل حیدرآباد کا سب سے بڑا اور شاندار محل تھا۔ جو کھلا اور ہوادار ہونے کی وجہ سے آپ اپنا نمونہ تھا۔ افسوس کہ یہ محل سلطان محمد کے زمانے میں جل گیا۔ تاریخ لکھنے والے کا کہنا ہے کہ یہ محل فن تعمیر اور کلا کی ایک نمائش گاہ تھا جس میں کتب خانے اور کلاکاروں کے چتر جمع تھے۔

"محل کوہ طور" کے نام سے ایک اور شاندار محل بھی بنایا گیا، جہاں اب تھیٹر فلک نما ہے۔ اس کی تعریف میں محمد قلی نے لکھا ہے کہ " یہ محل اپنی اونچائی اور روشنی کی وجہ سے ساتویں آسمان کا قطب تارا معلوم ہوتا ہے اور اس کے اطراف جو میدان ہے وہ اتنا نورانی اور دلکش ہے کہ اس کے مقابلے میں چاند اور سورج بھی خود کو بے رونق سمجھ کر اس کو دیکھنے کے لئے روز آنے بے تاب ہو گئے ہیں"۔ اس تعریف سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعی یہ محل اپنی جگہ اور اونچائی کے اعتبار سے آپ اپنا نمونہ رہا ہے۔ اسی طرح "چندن محل" "گگن محل" "خداداد محل" تعمیر

حسن محل اور حنا محل جیسی شاندار عمارتیں محمد قلی قطب شاہ نے اپنے زمانے میں تعمیر کروائی تھیں۔

یہی نہیں، اس نے کئی ایک باغات بھی تعمیر کرائے تھے جن کے اطراف چاردیواری ہوتی تھی۔ جس پر سے تمام درخت اور ان کے پھل پھول نظر آتے تھے۔ چاردیواری کے ساتھ ساتھ سڑک بنائی جاتی، جہاں سے باغ کے خوبصورت مناظر دکھائی دیتے ہیں۔ اور جس پر اس کے پھولوں کی خوشبو مہکتی رہتی۔ باغوں میں "باغ محمد شاہی" کا ذکر سلطان محمد قلی نے اپنی ایک نظم میں تفصیل کے ساتھ کیا ہے اور ایک جگہ لکھا ہے کہ " سڑک سے جب میں باغ کو دیکھتا ہوں تو خوشی سے میرے دل کی کلی کھل جاتی ہے۔ اور اس کی خوشبو دنیا میں مہکنے لگتی ہے۔"

حیدرآباد کے بہت سے بازاروں میں دونوں طرف پانی کی نہریں بھی بنوائی گئی تھیں۔ اور اُن کے کنارے سایہ دار درخت لگائے گئے تھے۔ افسوس ہے کہ محمد قلی کے بنائے ہوئے محل آج باقی نہیں ہے۔ لیکن جو محل گولکنڈہ قلعے میں اب تک ٹوٹی پھوٹی حالت میں موجود ہیں ان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ چھ چھ سات سات منزلہ عمارتوں پر بھی اوپر تک پانی پہنچانے کے انتظامات کئے گئے ہیں۔ اور بعض محلوں کی چھتوں پر اب تک حوض موجود ہیں۔ حوضوں اور نہروں کے علاوہ محمد قلی قطب شاہ نے کئی حمام، مسجدیں، عاشور خانے، لنگر خانے، کاروان سرائیں اور دواخانے بھی بنائے تھے۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ ایک بڑا شاعر، ایک بڑے شہر کا بسانے والا ہونے کے علاوہ اونچے درجے کا دیش بھگت، رعایا پرور، فیاض اور رحم دل بھی تھا۔ اس کے راج میں کئی عیدیں اور تہوار بڑی شان و شوکت سے منائے جاتے تھے۔

قطب شاہی زمانے کی تاریخ کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حیدرآباد میں محرم کی تقریبوں کی ابتدا محمد قلی ہی نے کی ہے۔ محرم کے دنوں میں کیا ہندو، کیا مسلمان سبھی حصّہ لیتے تھے۔ اور ان دنوں سرکاری حکم کے ذریعہ باجے گاجے اور گانے بجانے بند کر دیئے جاتے تھے۔ ساری رعایا "امام حسین" کے غم میں سوگوار ہوتی اور مسلم بٹھائے جاتے تھے۔ بادشاہی عاشور خانہ سنہ ۹۹۴ھ میں محمد قلی نے تعمیر کرایا۔ جو اب تک موجود ہے محرم میں مجلسیں ہوتی تھیں۔ دس دن تک سوگ منایا جاتا تھا۔ مجلسوں اور ماتم میں خود بادشاہ بھی شریک ہوتا تھا۔ کربلا کے دیگر شہیدوں پر فاتحہ پڑھتا تھا۔ محرم کی دسویں یعنی شہادت کے دن بادشاہ کی سواری نکلتی تھی عوام کا بالکل ایسا ہی ہجوم ہوتا جیسا کہ آج کل "بی بی کے علم" کی سواری کے وقت ہوتا ہے۔

اس طرح حضرت محمدؐ کی پیدائش پر عید میلاد کا جشن منایا جاتا تھا۔ محل سجائے جاتے اور قسم قسم کے دسترخوان چنے جاتے تھے۔ شہر کو دلہن کی طرح سجایا جاتا اور جب عصر کے وقت ہاتھی پر بادشاہ کی سواری نکلتی تو امیر، امرا، غریب، غربا سبھی پیادہ چلتے۔ جب لوگوں کی نگاہیں بادشاہ پر پڑتیں تو وہ دعائیں دیتے

۔ شام کے وقت شاہی محل میں رعایا کو کھانا کھلایا جاتا اور ہر طرف روشنی کی جاتی۔ اور ناچ رنگ کی محفلیں ہوتی تھیں۔ محمد قلی قطب شاہ ہر سال عید میلاد کے موقع پر تازہ نظم بھی کہتا تھا۔

اسی طرح "شب برات" میں بھی وہ جی کھول کر چراغوں اور آتش بازیوں میں مصروف ہو جاتا۔ محمد قلی نے شب برات پر بہت سی نظمیں لکھی ہیں۔ اس طرح کے عیدوں اور تہواروں کا حال تاریخ سے کہیں زیادہ تفصیل کے ساتھ اس کی نظموں میں ہمیں ملتا ہے جو کلیات محمد قلی میں چھپی ہیں۔

جب رمضان مبارک کا چاند نظر آتا تو بادشاہ روزے رکھتا اور محلات کی بیگمات بھی نماز روزے کی پابند ہو جاتیں۔ رمضان کے تیس دن گزر جانے کے بعد جب شوال کا چاند آسمان پر نظر آتا تو خوشیاں منائی جاتیں۔ اور عیش و عشرت کے شادیانے بجنے لگتے۔ مصری پستے، بادام، دودھ اور کھجور منگوائے جاتے، شیرمال شیر خورما اور سیویاں پکائی جاتیں۔

اسی طرح محمد قلی کے کلام میں بقر عید سے متعلق بھی بہت سی معلومات ملتی ہیں۔ اس عید میں عام لوگوں کو دعوتیں دی جاتیں۔ قربانی کا گوشت اور سیخوں کے کباب کھلائے جاتے اور بچوں میں عیدی بانٹی جاتی تھی۔

سلطان محمد قلی نے عیدوں تہواروں کو ہندو مسلم ایکتا کا ذریعہ سمجھا اور ملک میں ایسی حالت پیدا کر دی تھی کہ سب مذہبوں کے لوگ اسے چاہتے تھے

اس کے زمانے میں نوروز، بسنت اور برسات کے شروع میں مرگ کا جشن جیسے تہوار بھی منائے جاتے تھے جن میں خود بادشاہ شریک ہوتا تھا۔ ان تہواروں پر محمد قلی نے بہت سی نظمیں لکھی ہیں اور ان کے منائے جانے کی غرض کو بیان کیا ہے۔

"جشن نوروز" نئے سال کے پہلے دن منایا جاتا تھا۔ اور "بسنت کا تہوار" بہار کے موسم کی آمد پر جب کہ کثرت سے پھول کھلتے تھے۔ اور سارا جنگل ہرا بھرا ہو جاتا تھا۔ بسنت کے تہوار کے دن گولکنڈہ میں شاندار میلہ لگتا اور ہندو عورتیں پھولوں کے ٹوکریاں لئے گاتی جاتی تھیں۔ چار سو سال گزرنے پر بھی یہ تہوار اور میلہ گولکنڈہ میں ابھی بھی لگتا ہے۔ اور اسی طرح کی چہل پہل اور رونق رہتی ہے۔

برسات کے شروع ہونے یعنی مرگ بیٹھنے کے دنوں میں بھی عید منائی جاتی تھی۔ دھوم دھام کی مجلسیں ہوتی تھیں اور ناچ گانے کے پروگرام بنتے تھے۔ بادشاہ اس موسم کی کیفیت پر ہر سال نئی نظمیں لکھتا تھا۔

محمد قلی اپنی سالگرہ کی تقریب بھی عیدوں اور تہواروں کی طرح بڑی دھوم دھام سے مناتا تھا۔ اگرچہ یہ اس کی گھریلو اور خانگی تقریب ہوتی مگر ہر طبقہ اور ہر قوم کی رعایا اس تقریب کو قومی عید کی طرح مناتی تھی۔ سالگرہ کے دن سب شاہی محلات کو آراستہ کیا جاتا۔ بڑے بڑے شامیانے تانے جاتے اور آتش بازی چھوڑی جاتی تھی بادشاہ چمکیلا لباس پہنے، سر پہ شاہی تاج رکھے جب تخت پر بیٹھتا تو اس کے سر پر سہرا باندھا جاتا اور

م لوگوں کو مشک زعفران لگایا جاتا۔ پھر بادشاہ مصری چبانے کے لئے دی جاتی۔ اس کے بعد نظر آتاری گئی اور ہیرے جواہرات نچھاور کئے جاتے۔ بادشاہ کے مصری چبانے کے ساتھ ہی رعایا میں مصری بانٹی جاتی تھی اور ناچ گانا شروع ہوتا تھا۔ کہتے ہیں کہ دعوت میں اتنے پھول پان تقسیم ہوتے کہ ان کا خرچ لکھنا مشکل تھا۔

بادشاہ کی سال گرہ کے دن سارے ملک میں ہر فرقے اور ہر مذہب کے ماننے والے سجدے کر کے یا ہاتھ اٹھا اٹھا کر اس کی زندگی کے لئے دعائیں کرتے تھے اور بادشاہ اپنی سال گرہ کے دن خدا کا سچا شکر گزار بندہ بن جاتا تھا۔ وہ اپنی عمر، ترقی اور اقبال کی دعائیں مانگتا تھا۔ اپنی سالگرہ پر اس نے کئی نظمیں لکھی ہیں۔ یہ باتیں بھی اس کی نظموں میں ہمیں ملتی ہیں۔

اب تک محمد قلی قطب شاہ کی امن پسند زندگی اور اس کی حکومت کی مسرتوں کے بارے میں لکھا گیا یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ ہر بادشاہ کو عیش و آرام کے ساتھ لڑائی جھگڑوں سے بھی واسطہ پڑتا رہا ہے۔ محمد قلی جہاں راگ رنگ کا شیدائی تھا وہیں پہ ایک کامیاب اور فاتح مند بادشاہ بھی تھا۔ اس کے تخت پر بیٹھنے کے زمانے میں گولکنڈہ کی فوجیں نظام شاہیوں کی مدد کرنے کے لئے بیجاپور کی سلطنت سے لڑ رہی تھیں۔ ملدرگ کو گھیرے میں لے رکھا تھا اور سخت لڑائی ہو رہی تھی۔ محمد قلی راج گدی پہ بیٹھنے کے فوراً بعد جنگ کے میدان کی طرف چل کھڑا ہوا۔ اس کے آنے کی خبر سے فوجوں میں جان پڑ گئی۔ اور ملدرگ کا قلعہ فتح ہوتے ہوتے رہ گیا۔ محمد قلی کی امن پسند طبیعت کو حالات نے بگڑنے نہ دیا اور صلح ہو گئی۔

۱۵۸۱ء میں گولکنڈہ کے دوسرے مخالفوں سے جھڑپ چل گئی۔ قطب شاہی فوجوں نے بہادری سے مقابلہ کیا اور ایسی جان توڑ لڑائی لڑی کہ ایک ہزار دشمنوں کو قید کر لیا۔ اور ایک ہزار سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اس طرح سب باغی جنگ کے میدان میں ختم ہو گئے اور فوجیں جیت کے ساتھ گولکنڈہ واپس ہو گئیں۔

۱۵۹۳ء میں پھر ایک بغاوت ہوئی، ان دنوں سلطان محمد قلی شہر حیدرآباد کی تعمیر میں مصروف تھا۔ ملک میں امن و آمان تھا مگر اس بغاوت کو ختم کرنے کے لئے قطب شاہ کو نکلنا پڑا۔ سب سے پہلے اس نے موسل مرگ کے قلعہ پہ حملہ کیا۔ جب قلعہ فتح ہو گیا اور قطب شاہی سپاہیوں نے اندر گھس کر قتل و خون کا بازار گرم کیا تو محمد قلی اس خبر کو سن کر ناراض ہوا۔ اور رحمدل نیک مزاج بادشاہ نے خون خرابے سے منع کیا۔ جتنے لوگ قتل ہونے سے بچ رہے تھے قلعہ سے نکل کر بادشاہ کے قدموں پر آ گرے اور اطاعت قبول کرلی۔

اسی سال قطب شاہ نے میر جملہ ملک امین الملک کو فوج کے چند سرداروں کے ساتھ وجیانگر کے راجہ کے مقابلے کے لئے روانہ کیا، جو اپنی طاقت پر ناز کرتا تھا۔ امین الملک کے جانے کے بعد خود محمد قلی بھی ان قلعوں کی طرف روانہ ہوا۔ جب وجیانگر کے راجہ کو ان فوجوں کے آنے کی خبر ملی تو اس نے فرماں بردار رہنے اور مالگزاری ادا کرنے کی درخواست اور قلعہ کی کنجیاں پیش کیں اور صلح ہو گئی۔

محمد قلی کی حکومت کے زمانے میں اس کے فرماں برداروں نے جب بھی بغاوت کی، انہیں دبا دیا گیا اور ہر میدان پر قطب شاہی فوجوں نے فتح کے جھنڈے گاڑ دیئے اور محمد قلی کی رحم دل طبیعت نے خون خرابے کو پھیلنے نہ دیا۔

۱۵۹۵ء میں جب محمد قلی کے ایک بہادر سپہ سالار مسلم خاں نے چند جاگیرداروں کو اپنا موافق بنا کر بغاوت کر دی تو اس بغاوت کو کچلنے کے لئے محمد قلی نے اپنے سپاہیوں کو تیاری کا حکم دیا اور امین الملک کے سپاہیوں کو لئے مسلم خاں کی جاگیر پہنچا جب اس کی اطلاع مسلم خاں اور دوسرے جاگیرداروں کو ہوئی تو وہ بہت پریشان ہوئے اور سب سامان چھوڑ کر مقابلہ کئے بغیر بیجانگر بھاگ گئے۔

سات آٹھ سال کی امن و شانتی کے بعد محمد قلی کی زندگی میں اس کے سگے بھائی خدابندہ نے ۱۶۰۸ء میں بغاوت کر کے پھر دنگا فساد پیدا کیا۔ خدابندہ محمد قلی سے تین سال چھوٹا تھا۔ اور اس کے تخت پر بیٹھنے کے بعد سے لگ بھگ پچیس سال تک بھائی کی نگرانی میں امن اور اطمنان کی زندگی گزار رہا تھا۔ اسے امید تھی کہ بھائی کے بعد وہ بادشاہ بنایا جائے گا۔ کیونکہ محمد قلی کا وہ ایک ہی سگا بھائی تھا۔ اور بادشاہ کے ہاں کوئی بھی لڑکا پیدا نہیں ہوا تھا۔ لیکن جب ۱۶۰۷ء میں محمد قلی نے اپنی بیٹی حیات بخشی بیگم کی شادی کر دی۔ اور اس کے بعد سے داماد کی راج گدی کا سوال پیدا ہوا تو شہزادہ خدابندہ کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ اور وہ بھائی کے خلاف بغاوت پر اتر آیا۔ حالانکہ محمد قلی خدابندہ کو بہت چاہتا تھا۔

محمد قلی کے خاص اور بھروسے کے نوکر چاکر اور دلباری اس کے بھائی خدابندہ کے ساتھ چھپی سازشیں کرنے لگے اور راج پاٹ چھیننے کے پروگرام بنائے جانے لگے۔ جیسے ہی اس سازش اور بغاوت کی خبر محمد قلی کو ہوئی، اس نے سازش کرنے والوں کو گرفتار کر لیا اور کڑی سزائیں دیں۔ اور خدابندہ کو گرفتار کر کے گولکنڈہ قلعہ میں رکھا گیا۔ یہ شہزادہ بھائی کی زندگی میں دو تین سال قید رہا۔ اور ۱۶۱۱ء میں انتقال کر گیا۔ بھائی کی بغاوت نے محمد قلی قطب شاہ کو بڑا دکھ پہنچایا۔ کیونکہ اس کو اپنے بھائی سے ایسی امید نہیں تھی۔ امیروں اور نوکروں کی سازش سے اس کی صحت کو بڑا دھکا لگا اور وہ اس واقعہ کے چودہ پندرہ مہینوں کے بعد دنیا سے چل بسا۔

محمد قلی قطب شاہ کے۔ ان میں جتنی بھی لڑائیاں لڑی گئیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک بڑے دل اور دماغ کا بادشاہ تھا۔ لڑائیوں کے اسباب، مقابلوں کے لئے فوجی تیاری اور جنگ کے وقت فوجی مدد کا انتظام، سپہ سالاروں اور سرداروں کا انتخاب اور لڑائیوں کے جلد ختم ہونے کے ڈھنگ اور ہارنے والوں کے ساتھ برتاؤ، یہ سب ایسی باتیں ہیں جن پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد قلی کو ملک گیری کی ہوس تھی اور نہ ہی اس نے لوٹ مار کی خاطر کسی پر حملہ کیا۔

محمد قلی کے درباریوں اور نوکروں میں ہمیشہ بہت سے ہندو کام کرتے تھے۔ اور ان میں سے کچھ تو اپنی عقل مندی، ہوشیاری اور بہادری کے سبب اونچے درجے پر پہنچ گئے تھے۔ بادشاہ کو ان پر پورا بھروسہ تھا۔ چنانچہ ان کی رائے اور اشارے سے بڑے بڑے مسلمان امیر اور سپہ سالار تک بدل دیئے جاتے تھے۔

محمد قلی اپنی ہندو رعایا اور راجاؤں کے ساتھ ہر وقت پریم اور محبت کا برتاؤ کرتا رہا۔ بعض موقعوں پر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں کوئی بھید بھاؤ ہی نہیں کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ دونوں کے ساتھ برابر کا سلوک کرتا تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو اپنی آنکھوں کا تارا سمجھتا تھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ اکثر ہندو راجاؤں اور باغیوں کو کچلنے اور ان سے مقابلہ کے لئے اس نے اپنے ہندو امیروں اور بہادروں ہی کو روانہ کیا جنہوں نے اپنے ہی مذہب والوں کے ساتھ گھمسان کی لڑائیاں لڑیں۔ اور ان کے راج کاج کو تہس نہس کیا۔ رعایا کے ساتھ ایک جیسا پریم اور محبت کا برتاؤ کرنا اور ان پر بھروسہ رکھنا محمد قلی کی فطرت میں داخل تھا۔ قطب شاہی زمانے کی تاریخ میں ایسے بہت سے واقعات ملتے ہیں جن کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد قلی کے زمانے میں گولکنڈہ کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے کیسے کیسے جاں نثار، دیر، بہادر اور اونچے درجہ کے امیر پیدا ہوئے۔

اب تک ہم نے سلطان محمد قلی کی پیدائش سلطنت کے کام کاج اور اس کے زمانے کی لڑائیوں کے واقعات پر روشنی ڈالی ہے۔ اب ہم اس کی گھریلو زندگی کا کچھ حال سنائیں گے۔ کہتے ہیں کہ محمد قلی کی ماں ہندو تھیں۔ اور یہ بھی مشہور ہے کہ اس کی بیوی ایک ناچنے والی بھاگ متی بھی ہندو تھی۔ جس کے پریم میں سلطان محمد قلی نے شہر حیدرآباد بسایا اور پہلے اس کا نام بھاگ نگر رکھا۔ مگر جب بھاگمتی کو "حیدر محل" کا خطاب دیا گیا تو بھاگ نگر کا نام "حیدر نگر" اور پھر "شہر حیدر" یا "حیدرآباد" سے بدل گیا ہے۔

محمد قلی قطب شاہ کو ایک زمانے تک کوئی اولاد نہ ہوئی۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ حیدرآباد بسائے جانے کے بعد شہزادی حیات بخشی بیگم سنہ ۱۵۹۲ء میں پیدا ہوئیں۔ اس کی شادی پندرہ سال کی عمر میں محمد قلی نے اپنے بھائی کے بیٹے مرزا محمد سلطان

۱۶۰۷ء میں رچائی۔ اس موقع پر مہزا رعل رو پے پانی کی طرح بہائے اور ایک مہینے تک سرکاری طور پر شادی کی خوشیاں منائے جانے کا اعلان کیا۔ کیوں کہ اُسے شہزادہ سلطان کو ولی عہد سلطنت بنانا تھا۔ شادی کے بعد محمد قلی نے بیٹی اور داماد کے رہنے کے لئے ایک بڑا محل تعمیر کروایا۔ جہاں حیات بخشی بیگم اپنے شوہر کے مرنے تک سن ۱۶۲۵ء تک رہیں حیات بخشی بیگم کے ایک لڑکا سلطان عبداللہ ہوا۔

عبداللہ قطب شاہ کی حکومت کے زمانے میں اورنگ زیب عالمگیر نے حملہ کیا تو حیات بخشی بیگم نے صلح کرانے میں بہت بڑا حصہ لیا چنانچہ وہ عالمگیر سے ملنے کے لئے مغلیہ لشکر میں گئی اور صلح کی شرطوں کے طے کرنے میں مردوں کی طرح بات چیت کرتی تھی۔ ۱۶۶۸ء میں محمد قلی کی اکلوتی بیٹی قریب قریب چھہتر سال کی عمر میں انتقال کیا۔ اور اس کے مرنے کے پانچ سال بعد اس کا اکلوتا بیٹا عبداللہ بھی ۱۶۷۲ء میں اپنا جانشین چھوڑے بغیر اس دنیا سے چل بسا۔

محمد قلی قطب شاہی بادشاہوں میں بڑے مرتبے کا حکمران تھا۔ جس نے اپنے باپ دادا کے مقابلے میں کم عمر پائی: اگرچہ دوسری تمام باتوں میں قدرت نے اس کے ساتھ بڑی فیاضی سے کام لیا۔ دل و دماغ کی جتنی اعلیٰ قوتیں اس کو عطا کی گئیں کسی اور قطب شاہی بادشاہ کو نصیب نہ ہوئیں۔ اس کے دور میں ہمیشہ سکھ چین کی بنسری بجتی رہی۔ جہاں قدرت نے اس پر اتنی مہربانیاں کیں وہیں اسے نحیف اور کمزور بنایا۔ کچھ تو دنیا کی رنگ رلیوں کی وجہ سے کمزور ہوگیا اور کچھ کمزوری بیماریوں سے بھی پیدا ہوئی۔ اس کی شاعری میں اکثر جگہ بیماری اور خدا سے صحت کی دعا کا ذکر ملتا ہے اور وہ کہتا ہے

اے خدا اپنے نبی کے صدقے میں قطب شاہ پر لطف و کرم کر کے دکھ کو دور کر اور آرام و شفا بخش۔ اے محمد قلی! تو اپنی بدقسمتی کی وجہ سے اپنے دل کو رنجیدہ نہ ہونے دے۔ کیوں کہ خدا میں بڑی قدرت ہے وہ ضرور تجھے صحت کا پیالہ پلائے گا۔

آخر وہ دن آہی گیا جس کو ویسے دور رکھنے کے لئے محمد قلی قطب شاہ دعائیں مانگا کرتا تھا۔ اکتوبر ۱۶۱۱ء میں وہ بیمار پڑا اور ڈھائی مہینے تک بخار کا سلسلہ جاری رہا۔ جس کے سبب وہ بہت ہی کمزور ہوگیا پھر سنبھل نہ سکا۔ غرض ہفتہ کی صبح میں ۱۱ر جنوری ۱۶۱۲ء کو اس کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہوگئیں۔ ۴۷ سال کی عمر میں ۳۲ سال چھ مہینے اور ۲۶ دن تک حکومت کر کے وہ اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔

محمد قلی نے شہر حیدرآباد میں اونچے اور عالی شان محلوں اور چار مینار کے علاوہ اپنے لئے ایک شاندار گنبد بھی اپنی خاندانی گنبدوں کے قریب گولکنڈہ میں بنوا لیا تھا۔ اسی طرح اس کا گنبد بھی قطب شاہی بادشاہ کے مقبروں میں

سب سے عظیم الشان ہے۔ یہ گنبد اس قدر اونچا ہے
کہ دور دور سے نظر آتا ہے۔ اس کا چبوترہ کشادہ
اور ہموار ہے۔ دوسرے گنبدوں کی طرح چاروں
طرف مقبروں یا درختوں سے گھرا ہوا نہیں ہے
یہی سبب ہے کہ یہ چبوترا ایک عام تفریح گاہ بن گیا
ہے۔ گولکنڈہ کے قریب اور دور بسنے والے کیا ہندو
کیا مسلمان، کیا مرد، کیا عورتیں سبھی آج بھی اس
مقبرے کی زیارت کو کھنچے آتے ہیں۔ اور فاتحہ پڑھ
کر مٹھائی بانٹتے ہیں۔

سلطان محمد قلی 'نیک دل' سخی اور فیاض
تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں سب سے زیادہ رقم
عمارتوں کی تعمیر اور عوام کی بھلائی میں خرچ کی۔ اس
کے دربار کے خاص انجینیر میر ابو طالب نے لکھا ہے
کہ ستر لاکھ کے قریب اخراجات عمارتوں کی تعمیر
میں ہوئے۔ ہر سال محرم میں محمد قلی ساٹھ ہزار
روپے مجاوروں اور خادموں کے وظیفوں اور امام
عاشورہ کے پکوان میں خرچ کیا کرتا تھا۔ اس کے
علاوہ دسویں محرم کے دن فاتحہ خوانی پر غریبوں اور
مستحقوں میں ہر سال بارہ ہزار روپے تقسیم کئے جاتے
تھے۔ اس نے اپنے زمانے میں صرف محرم کے لنگر میں
ایک کروڑ چونتیس لاکھ چالیس ہزار روپے خرچ کئے۔

محمد قلی نے اپنے عہد حکومت میں عید میلاد النبی
کے انعامات، دعوتوں اور خوشبو وغیرہ کے سلسلے میں
دو کروڑ چوبیس لاکھ روپے خرچ کئے۔ اور اتنی
ہی رقم خیرات اور صدقے کے طور پر غریبوں اور مسکینوں
میں بانٹی۔ اس طرح گیارہ کروڑ روپیوں کا حساب تو
تاریخوں میں صاف طور پر درج ہے۔ اس رقم
کے علاوہ محمد قلی نے دوسرے موقعوں پر جو
انعامات عطا کئے یا خیرات دی اس کا کوئی اندازہ
ہی نہیں کر سکتا۔

خود شہر حیدرآباد میں کوئی ضرورت مند
ایسا نہ تھا جسے محمد قلی نے کچھ نہ دیا ہو۔ رعایا
میں جس کسی کے یہاں شادی یا کوئی تقریب ہوتی
اگر وہ، بادشاہ کو اس کی اطلاع کرتا تو فوراً انعام
واکرام سے سرفراز ہوتا۔ دور دور کے ملکوں سے
جو لوگ حیدرآباد آتے ان کو وطن واپس جانے کے
لئے کافی رقمیں دی جاتیں اور ان کی حیثیت کے مطابق
خلعت سے نوازا جاتا تھا۔

محمد قلی کے زمانے میں اناج ٹیکس کے
طور پر چودہ لاکھ روپے سالانہ وصول ہوتے تھے
اور برہمن لوگ اس رقم کی وصولی میں رعایا کے ساتھ
بڑی سختی سے پیش آتے تھے۔ جب وہ تخت نشین ہوا
تو فوراً ہی یہ ٹیکس معاف کردیا۔ اس طرح محمد
قلی کی دریا دلی۔ اور رعایا پروری نے حکومت کو تقریباً
چار کروڑ روپے کی آمدنی سے محروم کردیا۔

ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اپنے
زمانے میں کبھی بھی کسی کے قتل کا حکم نہیں دیا اگر
کبھی کوئی ایسا مقدمہ پیش بھی ہوا تو اس پر انصاف

کیا گیا۔ اور قانونوں کے مطابق تصفیہ کیا گیا۔ اس کے وسیع دسترخوان کی دور دور تک شہرت تھی۔ چنانچہ اکثر مسافر اور سیاح اس شاہی دسترخوان پر موجود ہوتے تھے۔ کہتے ہیں کہ اس کے دسترخوان پر ہر وقت ایک ہزار آدمی کھانا کھاتے تھے۔ اور کسی کو کوئی روک ٹوک نہ تھی۔

محمد قلی نے اپنے بعد جو عظیم یادگاریں چھوڑی ہیں، ان میں سب سے زیادہ اہم اس کا اردو کلام ہے۔ اس کی بنائی ہوئی پتھر، چونے اور اینٹ کی اکثر عمارتیں ڈھ گئیں۔ صرف حیدرآباد کا چارمینار بادشاہی عاشور خانہ اور محمد قلی کا گنبد بچ گیا۔ لیکن نہ معلوم ان کی عمر بھی کتنی رہ گئی ہے۔

جیسا کہ ڈاکٹر زور نے اپنی کتاب "سلطان محمد قلی قطب شاہ" میں لکھا ہے ——— "وہ اردو کا پہلا محسن تھا، اور اس نے اس زبان کی ایسے وقت مدد کی جبکہ وہ اس کی بہت محتاج تھی۔ محمد قلی نے اردو پر وہ احسان کیا ہے جو بعد کے کسی بادشاہ یا شاعر سے نہ ہو سکا۔ اس نے نہ صرف اردو کے شاعروں اور ادیبوں کی قدر کی۔ بلکہ خود بھی اردو کا ایسا شیدائی تھا کہ اس زبان میں پچاس ہزار شعر لکھے۔ گویا بارہ سال کی عمر کے بعد سے اوسطاً ہر روز اس نے چار پانچ شعر ضرور لکھے ہوں گے۔ یہ اردو زبان کی خوش قسمتی نہیں تو اور کیا ہے۔ کہ اس کی سرپرستی میں محمد قلی جیسا بادشاہ رات اور دن مصروف ہو گیا۔

اس نے ہر رنگ میں شعر کہے ہیں اور اپنے دور حکومت کے بہت سے کارنامے اشعار میں عمدگی کے ساتھ لکھے ہیں۔

محمد قلی قطب شاہ نہ صرف اردو اور فارسی کا عظیم شاعر تھا بلکہ اس نے تلگو میں بھی ایک بڑا دیوان چھوڑا تھا۔ اس کا اردو کلام زندگی ہی میں مقبول ہوا اور اب تک مقبول ہے چنانچہ آج بھی دیہاتی عورتیں مختلف تقریبوں میں اس کے گیت گاتی ہیں۔ قطب شاہ کے کلام میں عربی، فارسی اور سنسکرت کے مشکل الفاظ نہیں ملتے۔ بلکہ اس نے آسان اور سادہ زبان میں شعر کہے ہیں۔

مجموعی طور پر محمد قلی قطب شاہ کی زندگی کا ہر ورق عوام کی خدمت، ہندو مسلم ایکتا اور مشترکہ کلچر کی تعمیر و ترقی سے رنگین ہے۔ بلاشبہ وہ ایک عظیم بادشاہ اور ایک بہت بڑا انسان تھا۔

کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے سو

"بارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کرکے چلو یاں کہ بہت یاد رہو"

پس محمد قلی آج ہم میں نہیں ہے، مگر اس کے کارنامے اسے رہتی دنیا تک زندہ رکھیں گے۔


FAROOKI
دن بھر کی
خوشگوار تازگی!
جڑی بوٹیوں سے یونانی طریقے پر تیار کیا گیا
منجن فاروقی دانتوں کی صرف چمک دمک ہی
بڑھاتا ہے بلکہ مسوڑھوں اور دانتوں
کی خرابی کو دور کرتا ہے
مناسب اور واجبی دام میں منجن فاروقی آپ
کے پیسے کا بہترین بدل ہے
دانتوں و دہن کی
مونہہ کی مکمل حفاظت کیلئے
منجن فاروقی
تیار کردہ
کارخانہ زندہ طلسمات

سائیکالوجی

رضا الجبار

شام کی چائے کا دور چل رہا تھا۔ میز کے اُوپر فرانس سے امپورٹ کئے ہوئے لذیذ بسکٹ بھی تھے اور سلمٰی کے ہاتھ کے بنائے ہوئے نفیس کیک بھی میز کے گرد سلمٰی کی بڑی بہن ساجدہ ہی نہیں، ان کی امّی بھی تھیں جن کے ہاتھوں میں اون کے دھاگوں کی بنائی کرنے والی سُوئیاں تیزی سے چل رہی تھیں۔ وہ اپنے بیٹے کے لئے پل اوور بُن رہی تھیں۔ مکمل ہونے کے بعد علیق کے پہننے کے لئے وہ اُسے امریکہ پارسل کر دیں گی۔ جہاں علیق انجینیر کی اعلیٰ تعلیم کے لئے گیا ہوا ہے۔ میز کے گرد سلمٰی اور ساجدہ کے ابّا بھی تھے جو اس دن طبیعت کی ناسازی کے باعث اپنی کمپنی کو نہیں گئے تھے اور اب چائے پینے کے بعد کلب جانا چاہتے تھے۔

میز کے گرد بیٹھے ہوئے لوگوں کی گفتگو کا موضوع یہ نہ تھا کہ فرانس سے امپورٹ کئے ہوئے بسکٹ اور سلمٰی کے ہاتھ کے بنائے ہوئے کیک میں سے کون سی چیز زیادہ لذیذ ہے، بلکہ ایک خط تھا جو ابھی تھوڑی دیر پہلے مسٹر فرمان علی منیجنگ ڈائرکٹر فرمان انجینیرنگ ورکس پرائیویٹ لمیٹڈ کے نام ان کے گھر کے پتے پر آیا تھا۔

فرمان علی صاحب کی پیشانی پر بل پڑے ہوئے تھے کیونکہ اس خط کو ان کے گھر کے پتے پر نہ آنا چاہئے تھا۔ ملازمت کے لئے دی جانے والی درخواست فیکٹری ہی کے پتے پر آنی چاہیئے۔ ایسے خطوط کے فون کو ان کی سکریٹری یا دفتر کا کلرک ہی لکھوتا ہے۔ درخواست گذار نے گھر کے پتے پر خط بھیج کر ڈسپلین کی خلاف ورزی ہی نہیں، ان کے رتبے کو بھی ٹھیس پہنچائی تھی۔ کیا ایک بہت بڑی اور مشہور پرائیویٹ لمیٹڈ کا منیجنگ ڈائرکٹر ایک معمولی بیروزگار اور کلرک کی ملازمت تلاش کرنے والے آدمی کا خط کھولے۔ ؟ ان کی بلند و بالا شخصیت کا علانیہ مذاق اُڑ گیا تھا۔

خط میز پر اس طرح پڑا ہوا تھا جیسے دنگل میں کوئی تھکا ہوا بے دم پہلوان دوبارہ اُٹھ کر اپنا ایک خاص داؤ دکھانے سے پہلے گھڑی بھر کے لئے پیٹ کے بل گر جانے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھ رہا ہو۔

منہ میں بسکٹ کا ٹکڑا رکھ کر بیگم فرمان نے خط اُٹھایا اور اسے اپنے سامنے رکھا۔ چائے کی چسکی لے کر وہ آواز سے پڑھنے لگیں۔

"محترمی جناب! میں سب سے پہلے اس گستاخی کی معافی مانگنا چاہتا ہوں کہ میں آپ کو براہ راست خط لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ میں ایسا نہ کرتا۔ لیکن کیا کروں مجبوری ہے۔ میرے حالات غیر معمولی ہیں......"

"یہ آدمی شریف معلوم ہوتا ہے" بیگم فرمان صاحب نے کہا "خط کے ابتدا ہی میں معافی مانگ لی۔"

فرمان علی کی پریشانی کے سارے بل مٹ گئے۔ انھیں

معافی مانگنے والے لوگ اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ احساسِ برتری کا اظہار ہے جب کہ سب ہی لوگوں کو معافی مانگنے والے پریشان و پشیمان اور مجبور و لاچار لوگ اچھے لگتے ہیں۔ کیونکہ ایسے لوگوں کے ذریعہ ہی انہیں اپنے احساس کو جِلا دینے کا موقع ملتا ہے۔

فرمان علی کا خیال تھا کہ اب غلطی ہو یا نہ ہو، معافی مانگ لینے کا عمل [illegible] اچھی ہے اور آدمی کی شرافت کو ظاہر کرتی ہے۔

"کیا غیر معمولی حالات ہیں؟" ساجدہ نے ہاتھ اٹھا کر پوچھا تو اس کی انگلی میں چمکتی ہوئی ہیرے کی انگوٹھی کی چمک سب کو لبھا گئی۔ جب سے ساجدہ نے ہیرے کی انگوٹھی پہنی ہے۔ اسے ہاتھ اٹھا کر بات کرنے کی نئی عادت سی پڑ گئی ہے شاید انگوٹھی اور اس میں جڑے ہوئے خوبصورت نگینوں اور [illegible] کی خاصیت ہے کہ وہ اپنے اثر سے ہاتھ کو ہلکا کر دیتے ہیں [illegible] وہ ہمیشہ ہواؤں میں اڑتا رہتا ہے۔ ساجدہ کے ہاتھ میں منگنی کی انگوٹھی تھی۔ جلد ہی اس کی شادی ہونے والی ہے۔ اس کا منگیتر لندن میں بیرسٹر ہے۔ وہ شادی کے لئے خاص طور پر ہندوستان آنے والا ہے اور شادی کے بعد دونوں ہنی مون منانے کے لئے پیرس جائیں گے۔

پیالی میں سے دوسرا گھونٹ پینے کے لئے بیگم فرمان علی نے پیالی اٹھائی تو خط ہوا کے جھونکے سے میز کے نیچے گر گیا۔

سلمیٰ نے کہا "ٹھیرئیے میں اٹھاتی ہوں"۔

سلمیٰ نے خط اٹھایا اور آگے پڑھا،

"...... میں نے فرسٹ ڈیویژن میں بی اے پاس کیا ہے اور اس کے بعد فرسٹ ڈیویژن ہی میں بی کام پاس کیا ہے۔..."

مسٹر فرمان علی، ان کی بیگم اور ساجدہ ایک ساتھ ہنس پڑے۔ فرمان علی بولے "غیر معمولی حالات ہیں جیسے بی اے اور بی کام پاس کر لینا کوئی تیر مارنا ہے۔ بی اے کرنے کے بعد بی کام کرنے کی کیا حماقت ہے۔ شش! اصولِ تعلیم کے بارے میں بھی لوگوں میں پلاننگ کا شعور نہیں!"

وہ پھر زور سے ہنسے۔ سلمیٰ بولی۔

"میں نے جملہ آدھا پڑھا ہے، آگے پڑھوں گی تو مطلب پورا ہوگا"۔ وہ آگے پڑھنے لگی: "............. لیکن میرے دونوں ہاتھ نہیں ہیں۔ وہ بچپن میں ریل کے ایکسیڈنٹ کی وجہ سے کٹ گئے........"

بیگم فرمان علی کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی.....

"او خدا! دونوں ہاتھ نہیں ہیں بے چارے کے؟"

ساجدہ نے ہاتھ بڑھا کر پوچھا "برابر تو پڑھ رہی ہو نا؟ دکھاؤ"۔ اور سلمیٰ کے ہاتھ سے خط کھینچ لیا۔

فرمان علی بولے "ہاتھ نہیں ہیں تو کام کیا کرے گا۔ کون ایسے آدمی کو نوکری دے کر سر کا بوجھ بڑھائے۔

خط ساجدہ کے آگے آ گیا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر تصدیق کی "ہاں! ہاتھ نہیں ہیں ۔۔۔!"

ساجدہ آگے پڑھنے لگی:

"...... کٹے ہوئے ہاتھوں کی جگہ لکڑی کے مصنوعی ہاتھ ہیں اور انگلیوں کی جگہ پر ایک کلپ ہے جس کے اندر پنسل کو پھنسا کر میں لکھ سکتا ہوں"۔

"یا میرے اللہ ۔۔۔!" بیگم فرمان علی پھر لمبی سانس بھر کر بولیں، "بے چارہ پنسل کو پھنسا کر لکھتا ہے۔ بس کرو بی بی، آگے نہ پڑھو۔ مجھ سے سنا نہیں جاتا۔ دیکھو میرے جسم کی روئیں بھی کھڑی ہو گئیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مجھے کانٹے چبھ رہے ہیں میں اتنی تکلیف کی باتیں سن نہیں سکتی۔

خدا خیر کرے۔ دنیا میں کیسی کیسی آزمائشیں ہوتی رہتی ہیں۔!"

ساجدہ نے خط میز پر رکھا۔ سلمیٰ بولی:

"آپ سچ کہہ رہی ہیں امی جان۔ دُنیا میں لوگوں پر بڑی بڑی آزمائشیں ہوتی ہیں اور یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ خدا نہ کرے ایسی کوئی آزمائش ہمارے اوپر بھی آئے۔ لیکن جو لوگ ایسے امتحانوں سے گزر رہے ہیں اور اپنی کمزوریوں پر عبور پانے کے لئے کوشش کر رہے ہیں، وہ قابلِ تعریف ہیں۔ ہیں نا ڈیڈی۔؟"

سلمیٰ، سائیکالوجی سے ایم اے کر رہی تھی۔ اس کے سوچنے سمجھنے اور کہنے کے انداز فرمان علی کے لئے بہت پیارے تھے اس لئے وہ دل ہی دل میں اپنی بیٹی کی قدر کرتے تھے۔

فرمان علی نے اپنی بیگم کو مخاطب کر کے کہا، ایسے کتنے واقعات ہوتے رہتے ہیں بیگم! اگر لوگ ہمیشہ جذباتی بن جائیں گے تو کوئی کام نہ کر سکیں گے۔

آگے پڑھنے کی اجازت ہے؟ سلمیٰ نے پوچھا۔

سلمیٰ کے بنائے ہوئے کیک کے ٹکڑے کو منہ میں ڈالا اور اُن کی بنائی کرتی ہوئیں بیگم فرمان بولیں "ہاں ہاں پڑھو بیٹی آگے کیا لکھا ہے۔"

سلمیٰ پڑھنے لگی:

"...... میں پورے اعتماد سے کہہ رہا ہوں کہ میں لکھنے اور پڑھنے کا کام اتنی ہی اچھی طرح کر سکتا ہوں جتنا اچھا دوسرا عام آدمی کر سکتا ہے صرف مجھے کام کرنے کے لئے موقع چاہیئے۔"

"میری فیکٹری کوئی تجربہ گاہ نہیں ہے کہ میں لوگوں کو ٹیلنٹ کے لئے مواقع فراہم کرتا رہوں۔" فرمان علی بولے۔

"اور آگے لکھا ہے" سلمیٰ نے کہا اور پڑھنے لگی:

"...... اخباروں میں اشتہار دیکھ کر۔ اب تک میں نے ملازمت کے لئے کئی سو درخواستیں بھیجی ہیں۔ درخواست میں جب بھی اپنے مصنوعی ہاتھوں کے بارے میں لکھتا ہوں تو مجھے انٹرویو کے لئے کوئی نہیں بلاتا۔ اور جب نہیں لکھتا ہوں تو انٹرویو کے لئے بلاتے ہیں لیکن مجھے دیکھنے کے بعد مجھ سے دو چار ہمدردی کی باتیں کر کے مجھے مایوس لوٹا دیتے ہیں۔

"کئی سو درخواستیں بھیجیں!" مسز فرمان علی حیرت سے بولیں، "ساجدہ نے تو ایک بھی درخواست کہیں نہیں بھیجی لیکن پھر بھی کتنے لوگ ہیں کہ اسے سروس دینے کے لئے دعوت دیتے رہتے ہیں۔"

"مسٹر فرمان علی شہر کے معزز اور بارسوخ آدمی ہیں، اس لئے ساجدہ کو سروس دے کر دراصل وہ فرمان علی انجینئر پر اپنا احسان جتانا چاہتے ہیں۔" سلمیٰ نے فوراً جواب دیا "اثر و رسوخ یا سفارشی خط کے بغیر آج کل باہر کی دنیا میں کہیں بھی کوئی کسی کو نہیں پوچھتا۔ امی جان! صلاحیت تعلیم اور قابلیت کا درجہ اب ضمنی ہے۔" "بیٹی اگر تم اس رفتار سے کہنے لگو گی تو یم اے کر کے لندن جانے کی بجائے کوئی گھٹیا لیبر لیڈر بن جاؤ گی۔" مسٹر فرمان علی بولے۔

"میں خط پڑھ رہی ہوں۔" سلمیٰ نے کہا اور پڑھنے لگی۔ "...... آپ سے گذارش ہے کہ اپنی بڑی فیکٹری میں جہاں کئی سو آدمی کام کرتے ہیں وہاں مجھے بھی کام کرنے کا موقعہ دیں۔ مستقل طور پر نہیں تو عارضی طور پر ہی سہی، صرف ایک موقعہ دیجئے۔"

"معاشی طور پر بے چارہ بہت پریشان معلوم ہوتا ہے۔" مسٹر فرمان علی بولے۔ "چلو ٹھیک سمجھ

زکوٰۃ کے لئے نکالے ہوئے پیسوں میں سے ایک سو روپے کا منی آرڈر کر دیں گے۔"

"میری طرف سے بھی اکاون شامل کر دیجئے۔ رمضان کا مہینہ بھی تو اب شروع ہونے والا ہے۔" بیگم فرمان بولیں۔"

ساجدہ نے انگوٹھی والا ہاتھ اٹھا کر کہا: "ڈیڈی میری طرف سے بھی پچاس روپے شریک کر کے کل دو سو ایک روپیوں کا منی آرڈر کر دیجئے۔"

"یہ اس کے مسائل کا حل نہیں ہے۔ سنئیے وہ آگے لکھ رہا ہے۔" سلمیٰ نے کہا اور پڑھنے لگی۔

"..........اگر آپ کے ہاں کوئی جگہ اس وقت خالی نہیں ہے۔ یا میرے بارے میں آپ کو کسی طرح کا شک ہے تو آپ میرے لئے کوئی تنخواہ طے نہ کیجئے۔ بس یوں ہی کام پہ آجانے دیجئے۔ میں اسے اپنی ٹریننگ یا آزمائش سمجھ لوں گا۔ اس سلسلے میں آپ کی رضامندی میرے مستقبل کے راستے کھول دے گی اور میں ہمیشہ آپ کا ممنون رہوں گا......"

سلمیٰ ذرا سا رک کر بولی "نیچے نام پتہ اور دوسری تفصیلات ہیں۔"

"کیا نام ہے؟" بیگم فرمان نے پوچھا۔

"محمد باقر حسین" سلمیٰ نے جواب دیا۔

"آئیں" اچانک ساجدہ چونکیں۔ بیگم اور مسٹر فرمان علی کی نگاہیں بھی ذرا سی اٹھیں کیونکہ اتفاق سے ساجدہ کے منگیتر کا نام بھی بیرسٹر باقر حسین تھا۔

"عمر اٹھائیس سال ہے۔" سلمیٰ نے کہا۔

"اٹھائیس سال کا ہمارا عتیق بھی ہے۔ دونوں ہم عمر ہیں گویا" بیگم فرمان نے کہا۔ "۲۳ ستمبر کو یہ صاحب پیدا ہوئے۔" سلمیٰ نے پڑھ کر فرمان علی کی طرف دیکھا۔ ردِ عمل دیکھنے کے لئے۔

وہ ہنس کر بولے "تو یہ تو ہماری شادی کی سالگرہ کا دن ہے" "انیس سو ستر میں اس نے بی کام کیا۔" سلمیٰ بولی۔ "میں نے بی اے اسی سال کیا تھا" ساجدہ نے کہا۔

"ساری باتیں ثابت کرتی ہیں کہ ایک آدمی دوسرے آدمی سے اتنا قریب ہے کہ کوئی مشترکہ تاریخ یا احساسات کے کسی پہلو کا ٹکراؤ یا وقوع پذیر ہونا کوئی حیرت کی بات نہیں بلکہ یہ عین ممکن ہے۔"

سلمیٰ کا یہ وزن دار استدلال فرمان علی کو نہ بھایا۔ وہ جواب دینے کی بجائے بے پروائی سے بولے "میرے بریف کیس میں اس کا پتہ رکھ دو۔ میں آفس سے منی آرڈر کروا دوں گا۔"

ڈیڈی سلمیٰ نے پھر کہا "یوں خیرات کے طور پر پیسے دینے سے کبھی احساس مجروح ہوتے ہیں خصوصاً ایسے لوگوں کے جو اپنی عزت آپ کرتے ہیں۔ ہم نے اس آدمی کو نہیں دیکھا ہے۔ اس لئے میری رائے ہے کہ آپ ایک خط لکھ کر اسے انٹرویو کے لئے بلا لیجئے۔ اسے تسلی بھی ہوگی۔ تب بات چیت کے دوران آپ پتہ چلائیے کہ اگر آپ اسے پیسے دینا چاہیں تو کیا وہ قبول کرے گا؟ آپ اس کا مشاہدہ کریں ورنہ کوئی کام لے کر یہ رقم اسے معاوضہ کے طور پر دے دیں۔"

"خیال بہت مناسب ہے" فرمان علی نے جواب دیا۔ باقی دو افراد نے بھی حامی بھری۔

آپ کے لیٹر پیڈ پر میں خط ٹائپ کر دوں گی۔ آج سے ٹھیک آٹھ دنوں کے بعد بدھ وار شام کے تین بجے وہ انٹرویو کے لئے۔ آپ کے آفس پر آئے۔"

"مجھے اعتراض نہیں ہے۔ میں دستخط کر دونگا۔"

○

آٹھ دنوں کے بعد اس دن صبح ہی سلمیٰ کو اپنے کالج کے گروپ کے ساتھ چند میل دور پرندوں کی ایک قیام گاہ پر پرندوں کی نفسیات کا مشاہدہ کرنے اور ایک تجربے کا پلان بنانے کے لئے جانا تھا۔ فرمان علی اچھے موڈ میں تھے وہ سلمیٰ کے پروگرام کا مذاق اُڑا رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جانوروں کی نفسیات سے زیادہ انسان کی نفسیات کا مطالعہ زیادہ وسیع ہی نہیں زیادہ دلچسپ اور کار آمد ہے اس لئے سلمیٰ کو اس میدان میں کام کرنا چاہیئے۔

سلمیٰ بڑی سنجیدگی سے یقین دلاتی رہی کہ انسانی نفسیات ہی اس کا مرکز ہے۔ صرف ابتدائی مشق کے لئے جانوروں پر تجربہ ضروری ہے۔

تین بجے فرمان علی کی سکریٹری نے اطلاع دی کہ باقر حسین انٹرویو کے لئے آئے ہیں۔ باقر حسین کیبن کے اندر آئے اور فرمان علی بہت ہی دلچسپی کے ساتھ انھیں مصنوعی ہاتھوں کے ذریعہ لکھتے ہوئے اور کام کرتے ہوئے دیکھتے رہے۔ دفعتاً ان کی سکریٹری حواس باختہ ہو کر بہت تیزی کے ساتھ اندر آئی۔ فرمان علی کی سوالیہ نگاہیں اٹھیں۔

"سر بہت غضب ہو گیا۔ مجھے فون پر ابھی ابھی اطلاع ملی ہے اور ساتھ ہی آپ سے یہ کہنے کے لئے کہا گیا ہے کہ آپ قطعی طور پر زیادہ فکر نہ کریں۔"

"کس بات کے لئے فکر نہ کروں۔"

"صبح سلمیٰ جس کار میں جا رہی تھیں اس کی ٹکر مخالف سمت سے آنے والی ایک تیز رفتار لاری سے ہو گئی۔ حادثہ سخت تھا۔ سامنے بیٹھا ہوا ان کا کلاس فیلو اسی وقت مر گیا۔ سلمیٰ اور ان کی ساتھی لڑکیاں پیچھے تھیں وہ بچ گئیں لیکن سلمیٰ کے پاؤں میں گہری چوٹ آئی ہے۔ پاؤں کی ہڈی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ آپ زیادہ فکر نہ کریں۔ ان کے پاؤں پر پلستر چڑھا دیا گیا۔ صبح کو وہ اپنے مقام پر جا ہی نہ سکیں۔ ہسپتال میں صبح ہی سے بے ہوش پڑی ہوئی تھیں اب انہیں ہوش آگیا ہے۔

"اوہ" فرمان علی کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ وہ بے انتہا فکر مند نظر آنے لگے اور بولے اتنا سب کچھ ہو گیا اور مجھے خبر ہی نہیں۔ حادثہ کہاں ہوا؟ سلمیٰ کون سے ہسپتال میں ہے؟ تم نے مجھے فون دیا کیوں نہیں؟"

"سر میں دینا چاہتی تھی لیکن اس سے پہلے ہی فون منقطع ہو گیا۔ مجھ سے بار بار کہا گیا ہے کہ آپ سے کہوں کہ آپ زیادہ پریشان نہ ہوں۔"

"میں پریشان کیوں نہ ہوں اچانک یوں ہو جائے اور مجھے فکر نہ ہو، یہ کہیں ممکن ہے۔ حادثہ اگر مہلک ہے تو اس کا اثر سلمیٰ کی ساری زندگی پر پڑے گا، اس کا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔ اس خیال سے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو رہے ہیں میری پریشانی کا اظہار ممکن نہیں۔"

"سر یہ بھی کہا گیا تھا کہ سلمی ہسپتال کی ایمبولنس سے چار بجے شام گھر پہنچا دی جائیں گی"

فرمان علی سر تھام کر بیٹھ گئے۔ چند لمحوں کے بعد وہ کھڑے ہو گئے اور بولے "میں گھر جا رہا ہوں۔ اس درمیان اگر کوئی فون آئے اور کوئی اطلاع ہو تو ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر مجھ سے ربط قائم کرنا۔"

"یس سر! ضرور میں ایسا ہی کروں گی۔"

چہرے پر پریشانی کے آثار لئے فرمان علی اپنے مکان پر پہنچے۔ وہ جوں ہی گھر کے اندر داخل ہوئے ان کا اور سلمی کا آمنا سامنا ہوا۔ لیکن سلمی اچھی تھی۔ ہمیشہ کی طرح مسکراہٹوں سے لبریز چہرہ تھا۔ اس کا جسم کسی حادثے یا کسی زخم کا کوئی پتہ نہیں دے رہا تھا۔

فرمان علی کے اوپر تھوڑی دیر کے لئے خاموشی طاری ہو گئی۔ ابھی کچھ دیر پہلے ان کا ذہن ایک بدلتی ہوئی کیفیت کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ انھوں نے اپنے ذہن کو مجبور کیا تھا کہ جو کچھ سنا ہے اسے وہ مان لے اب وہ ذہن کو پھر پچھلی پوزیشن پر لے جا رہے تھے۔

خاموشی توڑ کر فرمان علی سنجیدگی سے بولے:

"تم اچھی ہو۔ خدا کرے کہ تم اچھی ہی رہو۔ کسی نے غلط اطلاع دے کر میرے ہوش اڑا دیئے تھے!"

"کار کے حادثے میں میرا اپاہج بن جانے کی اطلاع نا ڈیڈی؟" "میں سخت فکرمند تھا۔ اپاہج بن کر زندگی گزارنا اتنا آسان نہیں۔ جب تک میں زندہ ہوں کوئی مسئلہ کوئی مشکل یا کوئی بات نہیں۔ مجھے فکر اپنی زندگی کے بعد والی تمہاری زندگی کی تھی؟" سلمی ہنسنے لگی،

"ڈیڈی وہ جو باقر حسین آپ کے ہاں انٹرویو کے لئے آئے میں نان کے والدین بھی اس فکر میں گھل رہے ہوں گے۔ ان کا خیال کون رکھے؟"

"میں نے جب ہی تہیہ کر لیا تھا کہ میں اسے اپنی کمپنی میں نوکر رکھوں گا"

"ویری گڈ ڈیڈی! ویری گڈ ڈیڈی!" سلمی تالی بجانے لگی۔ "مجھے بے انتہا خوشی ہے کہ ایک اچھے انسان پر نفسیات کا تجربہ کر کے میں نے جس احساس کو ابھارنا چاہا اس میں میں کامیاب رہی۔ مجھے خوشی ہے!"

قطعات

امیر دہلوی

ہمہ تن آفتاب بن جاتے جانِ حُسن و شباب بن جاتے
دیکھتے تم جو مست آنکھوں سے پھول جامِ شراب بن جاتے

جن سے وابستہ ہے ماضی کا وقار ان فسانوں کی حفاظت کیجئے
گلستاں پر بجلیوں کا ہے ہجوم آشیانوں کی حفاظت کیجئے

گُل نہ کر دیں کہیں چراغوں کو صاحبِ انجمن سے ڈرتا ہوں
خوف مجھ کو نہیں ہے غیروں کا مَیں تو اہلِ وطن سے ڈرتا ہوں

غزل

رو رو کے شبِ غم کو سحر ہم نے کیا ہے پلکوں پہ ہر آنسو کو گہر ہم نے کیا ہے
پھولوں کی محبت کے تقاضوں کو سمجھکر کانٹوں پہ بھی اے دوست گزر ہم نے کیا ہے
ایک ایک نظر اشک بداماں نظر آئی ہر سمت رہِ غم میں سفر ہم نے کیا ہے
کُل عمر کٹی گردشِ ایام سے لڑتے سر معرکۂ شام و سحر ہم نے کیا ہے

جلوؤں کو امیر اُنکے پئے اہلِ محبت
فردوسِ دل و خلدِ نظر ہم نے کیا ہے


نقالوں سے ہوشیار رہیے
ہماری پیاکنگ کی ہو بہو نقل کرکے معزز گاہکوں کو دھوکہ دیا جا رہا ہے۔ ملیریا
اور ہیضے جیسے مرض کے لیے ہماری دوا زندہ طلسمات حاصل کیجیے
بوتل کے کارک پر المونیم فائل جس پر نیگرو کی تصویر ہے وہی ہماری دوا ہے
ہیضہ
ملیریا
DA TILISM
زندہ طلسمات
ہیضہ کی علامات پیٹ کے درد کے ساتھ دست اور قے شروع ہوجاتے ہیں اور پیاس بڑھ جاتی ہے یونانی دوا زندہ طلسمات کے آٹھ قطرے پانی یا سوڈا واٹر میں شامل کرکے آدھے آدھے گھنٹے سے آرام ہونے تک استعمال کروائیں۔
غذا میں آش یا ساگودانہ دیں
ملیریا کی علامت یعنی جاڑے سے بخار آتا ہے عموماً شام کے بعد بخار تیز ہوجاتا ہے ایسی صورت میں آزمائی ہوئی یونانی دوا "زندہ طلسمات" آٹھ آٹھ قطرے پانی کے ساتھ استعمال کروائیے۔
زندہ طلسمات
۷۰ سال سے زیادہ عرصہ سے یونانی طریقہ علاج میں مشہور و ممتاز
کارخانہ زندہ طلسمات
منبر پیٹ - حیدرآباد - ۵۰۰۰۱۳

عارف لکھنوی

گمشدہ چہرہ

"ہاتھی لاکھ لٹے پھر بھی سوالاکھ کا" یہی کچھ لکھنؤ کے نواب اچھے مرزا کے لئے کہہ سکتے ہیں۔ باپ دادا نے اپنی جاگیریں اور محلات، اپنی رنگین مزاجی اور نوابی شوق میں ٹھکانے لگادیں تھیں لیکن نواب اچھے مرزا کو جو ورثے میں ملا تھا، وہ بھی اتنا تھا کہ کئی پشتیں آرام سے کھا کھلا کر گزریں۔ قیصر باغ میں بہت بڑی حویلی میں نواب صاحب کی رہائش تھی، حضرت گنج میں چار کوٹھیاں کرائے پر اٹھی تھیں۔ دکانوں کا کرایہ الگ سے آتا تھا۔ ملیح آباد میں باغات آم کے تھے۔ ہر سال جن کی فصل ٹھیکے پر فروخت ہو جاتی تھی۔ لکھنؤ کے مضافات میں زمین پر کاشت ہوتی تھی۔ غرض روپے پیسے کی ریل پیل نہ سہی تو کمی بھی نہیں تھی۔ نواب اچھے مرزا کا خاندان بھی مختصر تھا۔ ضعیف ماں، بیوی اور ایک بہن تھی جس کا جوانی میں انتقال ہوگیا۔ نواب صاحب کے اولاد کوئی ہوئی نہیں۔ شادی کو (۲۵) برس ہو گئے تھے، مصاحبوں اور دوستوں نے دوسری شادی کے لئے بہت کہا لیکن نواب صاحب راضی نہیں ہوئے۔ ایک تو خاندان ہی میں خالہ زاد بہن کے ساتھ شادی ہوئی تھی، دوسرے محبت کی شادی تھی۔ نواب صاحب کی خاندانی شرافت اور وضع داری نے یہ گوارا نہیں کیا کہ جس کو ایک مرتبہ اپنا کہہ دیا اب اسی سے بے وفائی کریں۔

نواب اچھے مرزا بڑے سکّے ٹھلّے کی شخصیت رکھتے تھے پچاس برس کے لگ بھگ عمر تھی لیکن چالیس سے زیادہ کے نہیں معلوم ہوتے تھے۔ سرخ و سفید رنگ، بھرا ہوا کسرتی جسم، درمیانی قد، داڑھی صاف لیکن چڑھی ہوئی مونچھیں جن کے دونوں سرے نوکدار ہوتے۔ بالوں میں سفیدی جھلکنے لگی تھی۔ جس سے ان کی شخصیت اور بھاری بھرکم اور بارعب ہوگئی تھی۔ بہت خوش اخلاق اور ملنسار حالانکہ دیکھنے میں معلوم ہوتا تھا کہ سخت غصے میں ہیں۔

نواب اچھے مرزا کے دو ہی شوق تھے، ایک شطرنج کھیلنا اور شام کو چہرا غ جلے چوک کی سیر، جہاں ایک دو گھنٹے کسی کوٹھے پر طوائف کا گانا سننا۔

لکھنؤ کے شرفا میں طوائف کا مجرا دیکھنا اور گانا سننا معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ یہ لکھنؤ تہذیب کا ایک حصہ تھا۔ شطرنج کا شوق یوں بہت تھا، تمام دن بساط جمی رہتی تھی۔ کبھی پنڈت رام چند آگئے۔ کبھی منشی گردھاری لال جی اور احباب نہ آسکے تو شوکت مرزا تو ان کے مصاحبین میں تھے، ان سے ہوتی رہتی تھی۔ لیکن شطرنج کا شوق یہاں تک کی حد تک اس وقت بڑھا جب ان کی دوستی ننھن خاں سے ہوئی۔ ننھن خاں سے ملاقات بھی ایک دلچسپ اتفاق تھا۔ پاٹے نالہ پر آغاجان کی بیٹھک میں روزانہ شطرنج کی محفل جمتی تھی۔ نواب اچھے مرزا کبھی آغا صاحب سے ملنے چلے جاتے تھے۔ آغا صاحب کی عمر اس وقت تقریباً (۷۵) سال

ہوگی، صحت بھی کمزور تھی، اس لئے کہیں آتے جاتے نہ تھے۔

ایک دن صبح کو ناشتے کے بعد نواب صاحب آغاجان کے یہاں پہونچ گئے۔ اس دن بیٹھک میں کچھ زیادہ ہی احباب اور کھلاڑیوں کا اجتماع تھا۔ آغا جان نے بتایا کہ کوئٹے کے ایک کھلاڑی آئے ہوئے ہیں، دو دن سے آرہے ہیں، اب تک دس پندرہ کھلاڑی کھیل چکے ہیں۔ لیکن ان سے کوئی جیت نہیں سکا۔ ایک عجیب خوبی یہ ہے کہ ایک مہرے پر وہ اپنا فرزیں کٹا دیتے ہیں اور فیل کی مدد سے دوسرے کھلاڑی کو مات دیتے ہیں۔ ایک تو ہارنے کی شرمندگی دوسرے یہ ذلت کہ مخالف کھلاڑی اپنا فرزیں کٹا دے، اس کے باوجود مات دے۔ مزید تفصیل ان کے متعلق یہ معلوم ہوئی کہ مرزا حکیم نام ہے، کوئٹے میں اچار، چٹنی، مربّے وغیرہ کا کاروبار کرتے ہیں۔ نواب اچھے مرزا نے اب ذرا توجہ سے مرزا حکیم کی طرف دیکھا۔ گہرا گندمی رنگ، عمر کوئی ۵۷ سال کے قریب، سر پر ترکی ٹوپی، کوٹ اور قمیص پائجامہ پہنے شطرنج کھیلنے میں منہمک ہیں۔

نواب اچھے مرزا سے تعارف ہوا بڑے تپاک سے ملے۔ نواب صاحب بھی بازی دیکھنے لگے۔ جانی بیگ سے بازی لگی ہوئی تھی۔ جانی بیگ کا شمار لکھنؤ کے اچھے شاعروں میں ہوتا تھا۔ لیکن بازی میں بھی وہی نقشہ تھا۔ مرزا حکیم صاحب نے بھی اپنا فرزیں کٹا دیا تھا۔ اور فیل گھوڑے کی مدد سے مخالف بازی پر دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ دوسرے کا فرزیں بھی کچھ کام نہیں کر رہا تھا۔ غرض پندرہ منٹ میں جانی بیگ کو مات ہوگئی۔ جانی بیگ شرمندگی اور افسردگی کے عالم میں بساط سے ہٹ گئے اور پاس ہی بیٹھے ہوئے ایک صاحب سے مخاطب ہوئے۔ ننّن خاں تم کیوں نہیں کھیلتے، بازی لگاؤ۔" مرزا حکیم نے بھی ایک شانِ بے نیازی سے کہا "جو صاحب چاہیں میں حاضر ہوں۔" ابھی ننّن خاں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ نواب اچھے مرزا سامنے گئے۔ "حکیم صاحب میں کھیلتا ہوں۔" تمام کھلاڑی بہت دلچسپی سے کھیل دیکھنے لگے کیوں کہ نواب صاحب کا یہ صرف شوق ہی نہیں تھا بلکہ اچھے اور تجربہ کار کھلاڑیوں میں شمار ہوتا تھا۔ خاص طور سے اپنا دفاع کر کے کھیلتے تھے۔ اس موقعے پر تو اور بھی احتیاط سے بازی لگائی اور ایسا نقشہ جمایا کہ مرزا حکیم کو وہ موقع نہیں ملنے دیا۔ جب وہ مخالف کے کمزور پہلو کو دیکھکر فرزیں کٹا دیتے تھے۔ بازی لمبی ہوتی گئی۔ تقریباً دو گھنٹے بازی چلی اور آخر میں برابری پر ختم ہوگئی۔ کسی کو مات نہ ہوسکی۔ یہ پہلی بڑی بات تھی۔ کل سے آج تک کھیل میں یہ پہلی بازی تھی جو برابر اٹھ گئی اور لکھنؤ کے ایک کھلاڑی کو مات نہیں ہوئی لیکن نواب صاحب کو دانتوں تلے پسینہ آگیا۔ تمام دن شطرنج کھیلنے پر بھی وہ تھکاوٹ نہیں ہوتی جو اس ایک بازی میں ہوئی۔ معلوم ہوتا تھا دماغ خالی ہوگیا۔ نواب اچھے مرزا نے مصلحتاً دوسری بازی نہیں لگائی کہ خدا نے اس مرتبہ عزت رکھ لی، کہیں ایسا نہ ہو، دوسری مرتبہ بازی الٹ جائے۔

اب اختر عالم ایک کھلاڑی نے بازی لگائی۔ یہ جان کر کے میں بھی اسی نقشے سے کھیلوں جیسا نواب صاحب نے کھیلا تھا تاکہ نہ جیت سکوں تو برابر سے بازی اٹھ جائے لیکن شروع ہوتے ہی مرزا حکیم نے ایسا مہروں کو جمایا کہ اختر عالم سنبھل ہی نہ سکے اور حسبِ سابق فرزیں کٹا کر مرزا حکیم نے مات دے دی۔ جانی بیگ نے پھر کہا "ننّن خاں تم کیوں نہیں کھیلتے۔" مرزا حکیم نے بھی کہا "آیئے جناب، سنا تھا لکھنؤ میں ایک سے ایک شاطر ہے لیکن۔۔۔" اس لیکن کے آگے جو مرزا حکیم کہنا چاہتے تھے وہ ان کے نہ کہنے پر بھی سب سمجھ گئے ننّن خاں کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ وہ یہ طعنہ برداشت نہ کر سکے اور بساط پر بازی جمادی اور صرف جواب میں اتنا کہا "مرزا صاحب لکھنؤ کے

شاطروں سے ابھی آپ کا کھیل کہاں ہوا ہے۔ یہاں تو احباب تقریبِ ملاقات کے لئے آجاتے ہیں، کچھ دل لگی ہوجاتی ہے۔ بہرحال اس ناچیز نے استادوں کا کھیل دیکھا ہے اور کچھ مہرے چلنا بھی سیکھے ہیں شاید آپ کے سامنے جم سکوں۔" مرزا حکیم سمجھ گئے کہ میرا جملہ اہلِ لکھنؤ کو ناگوار گذرا۔ کہنے لگے "یہ بات نہیں ہے جناب، آپ تمام صاحبان بہت اچھا کھیلتے ہیں۔" نبّن خاں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے بساط پر مہرے جمائے اور کھیل شروع ہوگیا۔

نبّن خاں لکھنؤ کے مانے ہوئے کھلاڑی تھے، اپنے وقت کے چند ایک مشہور شاطروں میں ان کا شمار تھا۔ دراصل نبّن خاں اتنی دیر سے مرزا حکیم کے کھیل کو سمجھ رہے تھے کہ یہ کس نقشے سے اپنا فرزیں کٹا کر دوسرے کو مات دیتے ہیں۔ اور اب ان کو اندازہ ہوگیا کہ فیل کا کھیل مرزا حکیم کی کمزوری ہے، اگر ایک فیل پیٹ لیا جائے، خاص طور سے کالے خانے کا تو کھیل کا وہ نقشہ نہیں ہوسکتا۔ اور یہی ترکیب نبّن خاں نے اختیار کی۔ بازی کو اس انداز سے کھولا کہ مخالف کا کالا فیل لڑ گیا۔ اب مہرے برابر تھے۔ لیکن فیل کی جوڑی ٹوٹنے سے مرزا حکیم وہ نقشہ نہیں جما سکے۔ نبّن خاں گھوڑوں سے بہت اچھا کھیلتے تھے گھوڑے کی چال شطرنج کی بساط پر بیک وقت آٹھ خانوں پر زد ہوتی ہے۔ نبّن خاں نے اپنے نقشہ میں پھانس کر بادشاہ کے سامنے کے دو پیدل پیٹ لئے اور فرزیں سے رُخ پیٹ کر اپنا فرزیں کٹا دیا۔ دوسری چال پر گھوڑے کی شہ سے مات دی۔ مات دینا تھی کہ تمام کھلاڑیوں نے واہ واہ اور سبحان اللہ کے شور سے چھت سر پر اٹھالی۔ نبّن خاں بولے "مرزا حکیم صاحب ایک بازی اور ہوجائے تاکہ آپ کو مات کہنے کا موقع ملے۔" مرزا حکیم کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا، کچھ نہیں بولے اور دوسری بازی جم گئی۔ تمام شائقین اور کھلاڑی ایک جوش اور جذبے سے دوسری بازی دیکھنے لگے نبّن خاں نے اس مرتبہ بھی اسی قسم کا نقشہ جمایا بلکہ اس مرتبہ مرزا حکیم کے دونوں فیل پیٹ لئے اور بدلے میں اپنا ایک گھوڑا اور رُخ دے دیا پیدلوں کو جما کر کھیل کو آگے بڑھاتے رہے اس مرتبہ حکیم فیل نہ ہونے کے سبب کسی بھی مہرے سے خاطرخواہ کام نہ لے سکے اور داؤں میں آتے گئے۔ زد میں آتے ہی نبّن خاں نے پھر فرزیں سے ان کا رُخ پیٹا، فیل سے بادشاہ کا گھر روکا اور گھوڑے کی شہ سے مات دے دی۔

بازی ختم ہوتے ہی نبّن خاں اُٹھ گئے کہ بندے کو ذرا نخاس کے کام کے سلسلے میں جانا ہے۔ نبّن خاں کا اٹھنا تھا کہ محفل برخاست ہوگئی۔ نبّن خاں نے مرزا حکیم سے ہاتھ ملایا، ان کے کھیل کی تعریف کی۔ لکھنؤ کی تہذیب کو مدِنظر رکھتے ہوئے کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے ان کو شرمندگی ہو۔ ڈیوڑھی سے باہر نکل کر ابھی وہ نخاس کی طرف چلنے کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ نواب اچھے مرزا نے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا اور اپنا تعارف کرایا۔ ساتھ ہی اصرار کیا کہ زحمت نہ ہو تو خاکسار کی ڈیوڑھی کو بھی رونق بخشیے نبّن خاں کے کھیل کی بہت تعریف کی کہ آج آپ نے لکھنؤ کی عزت رکھ لی۔

یہ تھی نواب اچھے مرزا اور نبّن خاں کی دوستی کی ابتداء پھر تو یہ حال ہوگیا کہ روزانہ صبح نواب صاحب کی بگھی کوچہ میر انیس پہنچ جاتی جہاں نبّن خاں کا ایک اور چھوٹا سا مکان تھا اور وہ اپنے والد، والدہ اور بڑے بھائی اور بھاوج کے ساتھ رہتے تھے والد کی نخاس میں ململ کے کرتوں اور دوپلی ٹوپی کی دکان تھی بڑا بیٹا بھی ساتھ کام کرتا تھا۔ لیکن نبّن خاں نے کبھی کسی کام میں دلچسپی نہیں لی۔ سارا دن دوستوں کے ساتھ چائے خانے میں بیٹھنا یا شاگردوں کے ساتھ شطرنج

کے اڈوں پر جاتا۔ خود بہت کم کھیلتے تھے۔ شاگردوں کو چالیں بتاتے رہتے تھے۔ شاگرد اُن کے ساتھ سلوک کرتے رہتے تھے اور ان کا جیب خرچ پورا ہو جاتا۔ جس دن زیادہ رقم مل گئی کسی شاگرد کے ساتھ "چوک" گانا سننے چلے گئے۔ باپ کی نظر میں آوارہ اور نکھٹو تھے لیکن ان کا خیال تھا کہ قبلہ والد صاحب مبالغے سے کام لے رہے ہیں۔ وہ مطمئن تھے کہ وہ کوئی ایسا کام نہیں کرتے جس سے خاندانی شرافت پر حرف آئے۔ گانا سننا کوئی معیوب کام نہیں رہا۔ آمدنی شاگردوں نے رقم باندھ رکھی تھی، وہ ان کے خیال میں کافی تھی۔

ببن خاں کی عمر (۲۵) سال کے قریب تھی گٹھا ہوا جسم لاٹھی چلانا، چاقو کے داؤ پیچ خوب آتے تھے۔ لوہے والے پل کے نزدیک پیراکی بھی استاد سرور سے دریائے گومتی میں سیکھی تھی۔ ملنسار اور خوش اخلاق آدمی تھے، اس لئے سب سے دوستی تھی۔

اب ببن خاں کا زیادہ وقت نواب اچھے مرزا کی مصاحبت میں گزرتا۔ ناشتے کے بعد آ جاتے دوپہر کا اور رات کا کھانا نواب صاحب کے دسترخوان پر ہوتا۔ نواب اچھے مرزا اور ببن خاں سارے دن شطرنج کھیلتے رہتے۔ یہ دوستی ایسی راس آئی کہ اب نواب صاحب کو ببن خاں کے بغیر چین نہیں تھا۔ نواب صاحب شکار پر جاتے تو ببن خاں ساتھ ہوتے۔ رفتہ رفتہ نواب صاحب نے اپنی جائداد کے دیگر کام ببن خاں کے سپرد کر دیے۔ مکانوں کا اور دکانوں کا کرایہ وصول کرنا، باغات کی فصل ٹھیکے پر دینا، کاشت کاری کی دیکھ بھال وغیرہ۔ ببن خاں اس حد تک بڑھے تھے کہ یہ تمام کام اچھی طرح انجام دیتے۔ نواب صاحب ہر ماہ اچھی خاصی رقم مختلف حیلوں سے ببن خاں کو دیتے رہتے۔ اب ببن خاں ماں باپ کو بھی خرچ کے لئے روپیہ دینے لگے کیوں کہ ان کے تمام اخراجات نواب صاحب پورے کرتے رہتے تھے۔

چراغ جلے دسترخوان بچھتا کھانے سے فراغت کے بعد نواب صاحب بگھی کسواتے اور ببن خاں کے ساتھ "چوک" تفریح کے لئے پہنچتے۔ ببن خاں چوک کے دادا سے معلوم کرتے رہتے کہ کون کونسی طوائفیں نئی آئی ہیں، کون اچھا مجرا پیش کرتی ہے۔ اور کون گائیکی کے فن میں ماہر ہے۔

انہیں دنوں معلوم ہوا ایک طوائف بدرِ منیر بدایوں سے آئی ہے، ۱۸ سال کی عمر ہوگی رنگ تو سانولا ہے لیکن بہت پرکشش چہرہ ہے۔ مجرا بھی اچھا پیش کرتی ہے اور آواز تو غضب کی ہے۔ گائیکی کے فن میں استادوں سے اچھی تربیت حاصل کی ہے۔ نرت اور بھاؤ ایسا بتاتی ہے کہ دل لوٹ جائے۔

خاص طور سے ایک گیت کی شہرت تو بہت زیادہ ہے:

اندھیریا ہے رات سجن رہیو کہ جائی ہو

کیا غضب کا گاتی ہے ساری رات سنتے جائیں اور طبیعت سیر نہ ہو۔

ببن خاں یہ خبر لائے تو دوسرے دن رات گیارہ بجے نواب اچھے مرزا ببن خاں کے ساتھ بدرِ منیر کے کوٹھے پہنچ گئے دیر سے اس لئے گئے تھے کہ شائقین اب کم ہو گئے ہوں گے لیکن وہاں تو شام کا عالم تھا۔ عام تماشبین نہیں تھے لیکن مخصوص شائقین کی تعداد اتنی تھی کہ کمرے میں جگہ نہیں تھی۔ رائے بہادر کشن پرشاد، لالہ شیام سندر، میر فراز علی، نواب حشمت الدولہ لکھنؤ کے تمام رئیس اور شرفاء موجود تھے۔ نواب اچھے مرزا اور ببن خاں بھی نواب حشمت الدولہ سے صاحب سلامت کے بعد ان کے نزدیک بیٹھ گئے۔ اس وقت بدرِ منیر یہ غزل سنا رہی تھی:

بھوئیں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں
کسی سے آج بگڑی ہے کہ وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں

چاروں طرف سے روپیوں کا نذرانہ پیش ہو رہا تھا۔ اس کے بعد پھر فرمائش ہوئی اور بدرِ منیر نے مجرا پیش کرتے ہوئے سنایا :

اندھیرا ہا ہے رات ....

اب یہ عجب بے خودی اور کیف و مستی کا عالم طاری تھا۔ نائکہ کے اصرار پر کہ بچی اب بہت تھک گئی ہے' ایک بجے رات یہ محفل برخاست ہوئی۔

نواب اچھے مرزا مسلسل پندرہ دن بدرِ منیر کا گانا سنتے جاتے رہے

حالانکہ ان کا اصول تھا کہ کسی طوائف کے یہاں ایک یا دو مرتبہ سے زیادہ نہیں جاتے زندگی کے شب و روز اسی طرح چلتے رہے۔ ایک روز ننّھے خاں نے بتایا کہ بنارس کی ایک ڈیرہ دارنی چند روز کے لئے آئی ہے چوک پر کوٹھا کرایہ پر لیا ہے' زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ ٹھیرے گی۔ اس کے پاس ایک نوچی ہے۔ پندرہ سولہ برس کی عمر ہوگی۔ بہت حسین بلکہ حسنِ معصوم ہے۔ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ طوائف ہے۔ بڑی بڑی آنکھیں' بوٹا سا قد' گورا رنگ نازک نازک ہاتھ پیر' بڑی صاف اور شستہ گفتگو' آواز ایسی سریلی جیسے کوئل کوک رہی ہے۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ ابھی مسند بھی نہیں اتری اس لئے صرف گانا سناتی ہے۔ پڑھی لکھی ہے خود بھی شعر کہتی ہے۔ نواب اچھے مرزا نے شگفتگی سے کہا "اچھا تو اب آپ اکیلے ہی اکیلے جانے لگے۔" ننّھے خاں نے کہا "نہیں حضور یہ بات نہیں' دراصل میں چوک کے دادا سے نئی دریافت کرنے گیا تھا اس نے یہ باتیں بتائیں اور اسی کے کوٹھے کے نیچے یہ گفتگو ہوئی دراصل نائکہ گلزار بائی نے اس سے التجا کی تھی کہ میری رانی ابھی بچی ہے اور میں یہاں پہلی مرتبہ آئی ہوں' بہت سے نمائش بین سر پھرے بھی ہوتے ہیں' یہ پریشان نہ کریں' اس لئے ذرا خیال رکھنا بندے نے سوچا کہ ایک نظر دیکھ لیں اور آپ کے معیار کے مطابق ہو تو شام حضور کو زحمت دیں' رات دس بجے وقت مقرر کر لیا ہے۔ اس وقت کوئی نہیں آئے گا۔" اسی دن رات نواب اچھے مرزا اور ننّھے خاں' گلزار بائی کے کوٹھے پر پہنچے داد لولا اور بیگ کی مٹھی پہلے ہی گرم کر دی تھی اور ننّھے خاں نے خاص طور سے کہہ دیا تھا کہ دس بجے تک سب کو رخصت کر دینا۔

نواب اچھے مرزا جب پہنچے' گلزار بائی نے لبِ فرش تعظیم پیش کی۔ نواب صاحب گاؤ تکیہ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ ننّھے خاں نے بھی برابر کی دوسری مسند سنبھالی' گلزار بائی نے خاصدان میں پان کی گلوریاں' الائچی' زردہ قوام پیش کیا۔ نواب صاحب نے ایک گلوری اٹھائی اور ایک سو کا نوٹ نذر کیا۔

سازندوں نے اپنے اپنے ساز دیکھے بھالے۔ میر صاحب نے سارنگی کی تاروں کو رواں کیا۔ طبلہ نواز نے چھوٹی سی ہتھوڑی سے ہلکی ہلکی ٹھوک دے کر طبلے کے سُر درست کئے سامنے کا پردہ اٹھا اور رانی ہلکے ہلکے قدم اٹھاتی ہوئی آئی۔ ہلکا گلابی کامدانی کا دوپٹہ جس پر جوڑا اڑ دہی لچکا لگا ہوا۔ اسی رنگ کی پوری آستین کا لمبا فراک اور گلابی ریشمی چوڑی دار پائجامہ' پورے پیر میں مہندی رچی ہوئی۔ نواب اچھے مرزا اس وقفے میں سڑک کی طرف کھلنے والے دروازے سے جس پر چلمن پڑی ہوئی تھی' سامنے بازار چوک کا نظارہ کر رہے تھے۔ رانی نے نزدیک آکر کسی قدر جھک کر "بندی تسلیم عرض کرتی ہے" کہا تو نواب نے اچانک مڑ کر دیکھا۔ اب جو اس کے چہرے پہ نظر گئی تو پلک جھپکائے بغیر مسلسل اس کو دیکھتے رہے۔ رانی نے دوبارہ تسلیم عرض کی تب بھی نواب صاحب نے کچھ یوں ہی ہوں ہاں کر دی لیکن ان کی محویت میں کمی نہیں آئی جس میں

حیرت کا عنصر بھی غالب تھا۔ منیؔ خاں کو بھی تعجب ہوا کہ نـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ واب صاحب کو یہ کیا ہو گیا ایسی کونسی اچنبھے کی بات تھی۔ نواب صاحب اس میدان کے پرانے کھلاڑی تھے۔ ان کے لئے کوئی بھی نئی لڑکی کتنی ہی حسین کیوں نہ ہو کوئی خاص بات نہیں تھی۔

رانی تسلیم کر کے سامنے بیٹھ گئی۔ گلزار بائی نے سازندوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے گت بجانا شروع کی۔ گلزار بائی نے نواب صاحب سے اجازت مانگی کہ حکم ہو تو گانا شروع کیا جائے نواب صاحب نے گلزار بائی کی طرف دیکھا کچھ بولے نہیں منیؔ خاں نے کہا جی ہاں نواب صاحب کی طرف سے اجازت ہے

رانی نے غزل کا مطلع راگ مالکوس میں شروع کیا۔ اس راگ کا وقت ویسے تو رات ۱۲ بجے کے بعد ہوتا ہے جب ہر طرف مکمل خاموشی ہو اس وقت اس کی پُرسوز اور پُردرد دُھن دل پر اثر کرتی ہے لیکن اس وقت ساڑھے گیارہ کا وقت ہو گیا تھا اور اس محفل میں ایک پُرسکون ماحول تھا اس لئے اس تأثر کی فضا تھی۔

ایک تو رانی کی پُرسوز آواز اور پھر وقت کی مناسبت غزل کا انتخاب معلوم ہوا جیسے دل کے ایک ایک تار کو الفاظ کے مضراب نے چھیڑ دیا۔ غزل کا مطلع تھا:

لطف ہے باغِ جہاں میں صورتِ شبنم رہے
ایک ہی شب کو رہے لیکن گلوں میں ہم رہے

مطلع ختم کر کے ابھی دُہرا تے جا رہی تھی کہ نواب صاحب جیسے خواب سے بیدار ہو گئے۔ ہاتھ اٹھا کر غزل سُنانے سے روک دیا اب وہ پوری طرح پہلے جیسے باہوش انسان تھے۔ گلزار بائی کو پانچ سو روپے نذر کئے اور بولے آپ کے وقت کی قیمت حاضر ہے۔ گانا نہیں سنوں گا۔

"کیا حضور نے ناپسند فرمایا" گلزار بائی نے بے یقینی کے عالم میں پوچھا۔ "نہیں اس نظریے کے تحت نہیں بلکہ بلکہ....

آپ سے ملاقات کا اشتیاق تھا۔ آپ بنارس سے تشریف لائے ہیں، وہیں مستقل قیام ہے۔ سُنا ہے لکھنؤ میں صرف ایک ہفتہ ٹھہرنے کا ارادہ ہے۔ اب کہاں جانے کا خیال ہے؟"

نواب صاحب نے ایک ساتھ ایک اضطراب کے عالم میں کئی سوالات کر ڈالے گلزار بائی نے بڑی شائستگی سے جواب دیا۔

"بندی کا قیام مستقل دال منڈی، سبزی منڈی بنارس ہے لیکن آپ جیسے قدر دانوں کے حضور حاضری دینا میری خوش قسمتی ہے۔ میرا تعلق ڈیرہ داریوں سے ہے۔ مختلف شہروں سے سال میں ایک مرتبہ رئیسوں اور قدر دانوں کی خدمت میں حاضری دیتی ہوں اب یہاں سے کانپور، الہ آباد، کلکتہ ہوتی ہوئی بنارس واپس ہو جاؤں گی۔"

"آپ ایک ہفتہ تو ابھی یہاں ہیں، آپ کو ایک دو دن میں اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ایک شب میں کتنی رقم آجاتی ہے۔ جو آپ فرمائیں اس کی دُگنی رقم حاضر ہے۔ اور اب یہ گانا نہیں سنائے گی نہ اس کو مجھے یہ ہمارے علاوہ کوئی سُنے گا۔ اس کے علاوہ بھی اگر آپ کی کوئی شرط ہو تو وہ بھی میں مان لوں گا۔ آپ اطمینان رکھیں۔ یہاں آپ کو کوئی پریشان نہیں کرے گا۔ چونکہ میرا اب کسی کو ہمت نہیں ہوگی جو اس کو مجھے پر قدم رکھے۔"

"گلزار بائی اتنی باتیں سُن کر جیسے اس کے خیال میں بھی نہیں تھیں، پریشان ہو گئیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا جواب دیں۔ نوابوں کے قصے اور ان کے مزاج کا تو ان سُنا تھا۔ ان کا ہزاروں روپیہ ایک نظر التفات پر قربان کر دینا بھی دیکھا تھا۔ تو غصہ میں جان لینے اور جان دینے کے واقعات بھی اس کے ذہن میں آ رہے تھے لیکن تھی گھاگ، ساری عمر اسی کوچے میں اور ایسے ہی صاحبان میں گزری تھی۔ ذرا ٹھہر کر بڑے سکون سے جواب دیا" حضور نے تو ایسی

بات کہہ دی کہ سمجھ میں نہیں آرہا کیا جواب دوں کچھ سوچنے کا موقع دیں۔"

"جی ہاں ضرور آپ سوچ لیں میں تمہیں ایسی کوئی بات نہیں کہی جس سے آپ کو پریشانی ہو یا مالی نقصان ہو، لیکن بہتر ہوگا کہ ابھی فیصلہ کرلیں، گھنٹہ آدھ گھنٹہ کافی ہے۔"

گلزار بائی تو اس نئی پریشانی کا حل سوچنے لگیں اور نواب صاحب کے مزاج کا تجزیہ کہ آخر ایسی کیا خاص بات ہے اگر نواب صاحب صرف یہ کہتے کہ آپ جب تک یہاں ہیں ہمارے علاوہ کوئی گانا سننے نہیں آئے گا، صرف ہم گانا سنیں گے تو کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ اکثر نواب اور رئیس جو طوائف پسند آجائے اسے کچھ عرصے کے لئے اپنا پابند کرلیتے ہیں۔ لیکن یہاں تو بات ہی نرالی تھی کہ نواب صاحب خود بھی گانا نہیں سنیں گے تو کیا صرف بیٹھے دیکھتے رہیں گے، یہ تو پاگل پن ہوا۔ بہرحال کچھ بھی ہو ہمیں نقصان تو پہنچا نہیں رہے ہیں ایک ہی ہفتہ کی تو بات ہے۔ اچھا ہے بدقماش اور لفنگے تماش بینوں سے بچے رہیں گے جو ہر جگہ ہوتے ہیں اور بلاوجہ کوٹھوں پر ہنگامے کرتے رہتے ہیں۔

نواب اس تمام عرصے میں خاموش رہے۔ رانی کی طرف یا تو مسلسل دیکھتے رہے تھے یا نظریں ہٹائیں تو اس تمام وقت میں ایک مرتبہ بھی اس کی طرف نہیں دیکھا۔ ننھّن خاں سے ادھر ادھر کی غیر متعلق باتیں کیں یا نگاہیں نیچی کئے کچھ سوچتے رہے چہرے پر ایک ہیجان اور اضطراب کی کیفیت تھی جیسے ذہن کسی سخت کشمکش میں ہو۔

نواب صاحب نے کئی مرتبہ گلزار بائی کی طرف دیکھا وہ بھی نواب صاحب کی طرف دیکھ رہی تھی لیکن دماغ اس کا الجھن کا حل سوچ رہا تھا تقریباً آدھ گھنٹہ اسی خاموشی اور اضطراب میں گزر گیا۔

"حضور جیسا آپ فرماتے ہیں اسی طرح عمل ہوگا، اب آمدنی کا اندازہ میں کیا عرض کروں، یہ تو ہوائی روزی ہے۔"

نواب صاحب نے ہزار ہزار نوٹوں کی چار پانچ گڈیاں گلزار بائی کی طرف بڑھائیں۔ "اس وقت تو یہ رقم حاضر ہے۔ ہم آپ کی توقع سے زیادہ آپ کو دیں گے۔ اچھا اب چلتے ہیں، ہاں ایک بات اور رانی کو اس قسم کے ریشمی اور بھڑکیلے لباس پہننے کی ضرورت نہیں۔ ہم عام اور سادہ لباس میں دیکھنا پسند کرتے ہیں۔"

نیچے اتر کر نواب صاحب نے ننھّن خاں سے کہا "یہاں کے دادا دلاور خاں کو بتادو کہ ہمارے علاوہ اب کوئی یہاں نہیں آئے گا۔"

ننھّن خاں نے دلاور خاں کو اچھی طرح سمجھا دیا اور اس کی جیب کو بھی بھاری کر دیا تاکہ اس کے بوجھ سے اس کو اپنی ذمہ داری کا احساس رہے۔

نواب اچھے مرزا اور ننھّن خاں اکبری دروازے تک پیدل آئے کیوں کہ چوک بازار میں کوئی سواری نہیں آسکتی۔ اکبری دروازے پر بگھی موجود تھی خاموشی سے سوار ہوئے۔ راستے میں بھی نواب صاحب خاموش رہے ننھّن خاں مزاج شناس آدمی، سمجھ گئے کہ یہ کوئی خاص معاملہ ہے ورنہ اتنے عرصے کے تعلقات میں نواب صاحب ہر معاملہ میں ننھّن خاں سے ضرور مشورہ کرتے تھے۔ رات کے ایک بجے کا وقت تھا، نواب صاحب نے کوچوان سے کہا کہ ننھّن خاں کو ان کے مکان پہنچا دے۔ ننھّن خاں نے اتر کر خدا حافظ کہا اور واپس بگھی میں بیٹھ کر گئے۔

دوسرے دن حسبِ معمول دن کے دس بجے بگھی آئی اور ننھّن خاں نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوگئے۔ نواب اچھے مرزا حسبِ معمول بڑے تپاک اور خوش اخلاقی سے ملے رات کی وہ ہیجانی اور اضطرابی کیفیت نواب صاحب کے چہرے پر نہیں تھی، لیکن باتیں کرتے کرتے گم صم ہوجاتے۔

شطرنج بھی ہوتی لیکن وہ خوش دلی اور دل جمعی نہیں تھی معلوم ہوتا تھا کہ وقت گزار رہے ہیں۔ شام ہوتے ہی نواب صاحب تیار ہوئے اور گلزار بائی بڑے تپاک سے ملی شربت اور پان سے تواضع کی رانی سادہ کپڑوں میں دوپٹے سے سر چھپائے ہوئے آئی اور تسلیم عرض کر کے بیٹھ گئی۔ نواب صاحب نے سلام کا جواب دیا اور گلزار بائی سے باتیں کرنے لگے۔

"گلزار بائی اگر ناگوارِ خاطر نہ ہو تو کچھ باتیں آپ سے ذاتی نوعیت کی پوچھوں۔"

"حضور ناگواری کی کیا بات ہے، آپ شوق سے جو چاہیں معلوم کریں۔ رانی آپ کی بیٹی ہے۔ بیٹی ہی سمجھ لیجئے۔ میری کوکھ سے تو پیدا نہیں ہوئی لیکن سگی بیٹی سے بڑھ کر ہے۔"

"کچھ تفصیل سے بتانا پسند کریں گی؟"

"حضور پانچ برس کی ننھی سی جان کو ایک ظالم بردہ فروش نہ معلوم کس کی کوکھ اجاڑ کر بنارس لے آیا۔ یہ سوچ کر ظالم نہ جانے کس کے ہاتھ بیچ ڈالے، ہزار روپے اس کے ہاتھ پر رکھے۔ بچی کو گود لے لیا۔ بچی اتنی معصوم اور سہمی ہوئی تھی کہ اس سے رویا بھی نہیں جا رہا تھا، تب سے جان کے برابر اس کو سمجھا، اب خیر سے ۱۵ سال کی ہے اب گیارہ ہوئے سے سولہواں لگ جائے گا۔ استاد رکھ کر اردو، فارسی پڑھوائی، گانا ضرور سکھایا کہ یہ ہماری روزی ہے لیکن اب تک کسی غیر مرد نے اس کو نہیں چھوا۔"

چلتے وقت نواب نے کچھ رقم اور دی اور رخصت ہو کر چلے آئے۔ روزانہ نہ ہوتا۔ شام نواب صاحب آتے تھوڑی دیر بیٹھتے اور باتیں کر کے چلے آتے۔ ہفتہ ختم ہونے میں ایک دن باقی تھا ـــ چھٹے دن حسبِ معمول منج خاں کے ساتھ شام کو پہنچے ـــ تو پھر وہی ہیجانی کیفیت اور چہرے پر اضطراب کا عالم تھا حسبِ دستور مزاج پرسی کے بعد نواب صاحب نے پوچھا "گلزار بائی آپ اس زندگی سے خوش ہیں؟"

"حضور قبلہ نواب صاحب ہماری خوشی ناخوشی کیا، ہم لوگوں کی زندگی تو اسی طرح گزرتی ہے مگر کسی کی زندگی ہنسی خوشی گزرتی ہے، کسی کی روتے ہوئے۔ دوسروں کے لئے ہم ہنستے ہیں لیکن دل روتا ہی رہتا ہے۔"

"آپ اگر واقعی اس زندگی سے نفرت کرتی ہیں تو ہم ہر طرح مدد کرنے کو تیار ہیں، کل ہی اس جگہ کو چھوڑ دیجئے۔ ہم ایک اچھے علاقے میں دوسرے مکان کا انتظام کر دیں گے ہماری دلی خواہش ہے کہ آپ اور رانی اچھی اور باعزت زندگی گزاریں۔"

"تو کیا آپ .... آپ ..... رانی ..."

"ہم رانی کے لئے جو بہتر سے بہتر سلوک کریں گے وہ آپ کو معلوم ہو جائے گا۔"

سازندوں کو رخصت کر دیا گیا اور دوسرے دن گلزار بیگم (نواب صاحب نے "بائی" کے لفظ کو چوک ہی میں دفن کر دیا) مولوی گنج ایک مختصر لیکن اچھے مکان میں منتقل ہو گئیں۔

نواب صاحب کی خواہش کے مطابق منج خاں نے مکان تمام ضروری سامان سے آراستہ کرا دیا۔ نواب صاحب نے ایک استانی کو مقرر کر دیا جو مزید تعلیم دینے لگی اور ایک مغلانی سینا پرونا سکھاتی اور ایک ماما اصیل جو ہر قسم کے کھانے تیار کرنا بتاتی۔

نواب صاحب روزانہ گھنٹے آدھ گھنٹے کے لئے آتے، خیریت معلوم کرتے، گلزار بیگم سے باتیں کرتے رہتے، ایک دو باتیں رانی سے کر لیتے۔

[illegible] اور معمول کے

[illegible] ہوتا رہا۔

[illegible] بیگم کو یقین تھا کہ نواب اچھے مرزا نے یہ

سب کچھ کیا ہے اس کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ

رانی انہیں پسند آ گئی ہے اور اس کو اپنے نکاح میں لانا چاہتے

وہ انتظار کرتی رہی کہ کب نواب صاحب اس سلسلے میں بات

چھیڑیں۔

اب چھ ماہ گزر جانے کے بعد بھی نواب صاحب کی

طرف سے کوئی اشارہ نہ ملا تو اسے وسوسوں نے گھیرا الجھن

اور پریشانی ہونے لگی اور یہ تمام نئی زندگی ایک خواب

محسوس ہونے لگی جیسے اب یہ خواب ٹوٹ جائے گا اور

زندگی بکھر [illegible] کی طرح بکھر کر رہ جائے گی۔

"کچھ کہیے تم بھلا جو تمہت دے جواب۔"

نواب اچھے مرزا (نیچ خاں) کے ساتھ حسب معمول تشریف

لائے، تھوڑی دیر بیٹھے، باتیں کیں، رخصت ہونے لگے۔

گلزار بیگم کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا تھا۔

"نواب صاحب اگر گستاخی معاف اگر جلدی نہ ہو

تو ذرا دیر اور تشریف رکھیں، بندی کچھ عرض کرنا چاہتی

ہے۔" [illegible]

"ضرور ضرور ایسی کوئی خاص جلدی نہیں وقت ہمارا پابند

ہے، ہم وقت کے پابند نہیں۔"

"حضور اب تو کافی دن ہو گئے۔ آپ کی خواہش کے

مطابق ہر کام بخوبی ہو رہا ہے۔ رانی ماشاء اللہ خاصی پڑھ

لکھ گئی، سلائی کڑھائی اور ہر قسم کے کھانے تیار کرنے میں

مہارت حاصل کر لی جیسا آپ چاہتے تھے ایک گھر میں

شریف زادی کا جو روپ ہونا چاہیے وہ آپ کے سامنے ہے۔"

[illegible] بہت خوشی ہے جیسا ہم چاہتے تھے

ویسا [illegible]

[illegible] کس بات کی [illegible]

[illegible] کی [illegible]؟"

"کیا مطلب ...؟"

"اسے حضور قبلہ نواب صاحب [illegible]

[illegible] تو نہیں کہ یہ سب کچھ آپ نے اس لیے تو کیا ہے کہ

ہر طرح آپ کے معیار کے مطابق ہو جائے تو آپ [illegible]

لے جائیں۔"

"لاحول ولا قوۃ، یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں [illegible]

بھی ہمارے لیے [illegible] ہے۔" "گستاخی معاف، حضرت

پھر یہ سب کیا مذاق تھا۔"

"ہم امیروں کی زندگی تو دھوکے اور فریب [illegible]

گزرتی ہے۔ آپ حضرات ایک سہانا خواب [illegible]

ہیں۔ آنکھ کھلنے پر وہی زندگی کا جلتا ہوا صحرا ہمارے

نصیب میں ہوتا ہے۔ لیکن بد نام ہم امیروں کی ذات

دھوکہ دیتے ہیں فریب کرتے ہیں۔"

"آپ نے کہہ دیا جو کچھ کہنا تھا اب ذرا توجہ سے

ہماری بات بھی سن لیجئے۔ آپ نے جو سوچا تھا اس میں

بات تو ٹھیک ہے کہ "نکاح کے دو بول" لیکن اس کے

طریقہ کار میں اختلاف ہے۔ ہم آپ کو ان تمام باتوں کا

پس منظر بتاتے ہیں۔ پہلے دن رانی کو دیکھ کر جو ہم

ہو گئے تھے اس کا سبب یہ تھا کہ ہماری مرحومہ بہن جو

جوانی میں جنت نشاں ہو گئی، ان سے رانی کا [illegible]

قامت اس قدر مشابہت رکھتا ہے کہ مرحومہ بہن کی تصویر

ہماری آنکھوں کے سامنے آ گئی۔"

"ہماری غیرت نے یہ گوارا نہیں کیا کہ مرحومہ کی ہم شکل

ایسے ماحول میں رہے اور ایسی زندگی گزارے

رانی کا [illegible] ضرور ہو گا لیکن نیچ خاں کے ساتھ

آپ کے [illegible]

[illegible] کے چشم و چراغ ایک شریف [illegible] ہیں— [illegible] سے" اگلے جمعہ کو انشاءاللہ رانی کا نکاح اور [illegible] منّن خاں کے ساتھ ہو جائے گی۔"

منّن خاں پہلے ہی دن سے رانی سے بے انتہا متاثر [تھ]ے۔ حالات کے اس نئے رخ سے ان کے روئیں روئیں [میں خوشی] و مسرت کا بے پایاں طوفان رقص کرنے لگا۔

لکھنؤ میں اس ۔ بڑا نہ شان و شوکت کی شادی اپنی [مث]ال آپ تھی۔ نواب صاحب نے شادی کی رنگینیوں میں اضافہ [ک]رتے ہوئے "مجرے" کا انتظام بھی کیا تھا۔ بدایوں سے [خ]اص طور پر مشہور طوائف بدر منیر کو بلوایا گیا۔

نواب اچھے مرزا نے اس کے بعد کسی طوائف کا گانا سنا نہ کسی مجرے کی محفل میں شرکت۔ "چوک" بازار کا جانا اور وہاں کی محفلیں خواب و خیال ہو گئیں، نواب اچھے مرزا کا اب واحد شوق شطرنج کھیلنا رہ گیا۔

منّن خاں حسب معمول آجاتے اگر کسی دن نہ آتے کیوں کہ اب ان کی گھریلو ذمہ داریاں بھی ہو گئی تھیں، تو نواب شطرنج کی بساط بچھا کر سامنے آئینہ رکھ کرتا کہ معلوم ہو کہ مقابل کھلاڑی موجود ہے، اکیلے ہی شطرنج کھیلتے رہتے۔

بشیر وارثی

غزل

ہر قدم پہ گناہ کی ترغیب .:. ہے نئے دور کی نئی تہذیب
آجکل زعمِ خود نمائی میں .:. کر رہے ہیں اپنی خود تکذیب
اب وہ رسمِ ادب کہاں باقی .:. اک امرِ محال ہے تادیب
راہبر رہبری کا دینے فریب .:. سوچتے ہیں نئی نئی ترکیب
ذوقِ تعمیر کے پسِ پردہ .:. کارفرما ہے خواہشِ تخریب
فصل کہئے کہ وصل اسے .:. دور رہ کر بھی ہیں وہ دل کے قریب
خون آلود ہے ہر جگہ ہے زمیں .:. پھر چمنِ امن ہو کہاں تنصیب
اپنے دل میں انہیں چھپالیں چلے .:. ان کے پانے کی ہے یہی ترکیب

یادِ عہدِ شباب آج بشیر
کیا قصیدہ کی ہے کوئی تشبیب

”ہولی“ یکجہتی کی علامت

سیدہ شان [illegible]
تاریینا تکلی
ضلع شاہجہانپور

ہندوستان رنگوں زبانوں اور ثقافتوں کا ایک وسیع و عریض نگار خانہ ہے جس میں مختلف رنگ و نسل کے لوگ مختلف بولیاں بولتے ہیں۔ مختلف مذاہب کی پیروی کرتے ہیں اور مختلف النوع تہذیبی روایتوں کے علمبردار ہیں۔ لیکن اس رنگارنگی کے باوجود ہندوستان مشترکہ تہذیب کا ایک بے مثال گلشن ہے اور یہاں کے رہنے والے مختلف راستوں پر گامزن ہونے کے باوجود ایک ہی منزل کے راہی ہیں۔ یکجہتی اور ہم آہنگی کی ڈور کو ہم سب مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہیں۔ ہندوستان اور ہندوستانیوں کی اس منفرد خصوصیت کے دنیا کے بڑے مورخ اور دانشور قائل بھی ہیں اور مداح بھی ہے۔

ہندوستان کی تاریخ میں ہر دور میں قومی یکجہتی کی مختلف علامتیں رہی ہیں۔ اگر وادیٔ سندھ کی تہذیب کے زمانے میں لباس رہن سہن معاشرہ اور دیوتاؤں کی پرستش قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی تھیں اور قومی یکجہتی کی علامت تھیں تو آریاؤں کے عہد میں یہ علامت زبان اور باضابطہ مذہب کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ اشوک کے زمانے میں بھی قومی یکجہتی کی علامت مذہب، تیوہار اور کچھ بنیادی اصول تھے۔ مسلمانوں کی آمد کے بعد سے بارہویں صدی سے اٹھارہویں صدی کے اواخر تک تقریباً چھ سو برس کا عرصہ قومی یکجہتی کے عناصر رکھتا ہے۔ شادی بیاہ یا غم کے موقع پر رسومات کی ادائیگی موسم خصوصاً ”بسنت“ پر خوشی کا اظہار کرنا ایک مشترک قومی تہذیب کے بنیادی عنصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور جن کی بنیاد پر [illegible] کا شعور وسیع ہوتا ہے۔

تیوہار انسانی ثقافت کے فطری اظہار کا وسیلہ ہیں۔ عام طور سے تمام تیوہار مذہب کے ساتھ ساتھ ہمارے تہذیب و تمدن کی دین بھی ہوتے ہیں۔ ہولی کا پس منظر بھی دسہرہ دیوالی اور شبرات کی طرح مذہبی بھی ہے۔ اور ایک مخصوص جغرافیائی اور تمدنی روایات کا عکاس بھی۔ ”پرہلاد“ اور ”ہولیکا“ کی روایت سے کون ہندوستانی واقف نہ ہوگا اس کے ساتھ یہ بھی ہر شخص جانتا ہے کہ ”ہولی“ آمدِ گرما سے متعلق سرخوشی اور کیف و سرور کا خوبصورت اعلان بھی ہے۔

مذہبی حیثیت سے قطع نظر ہولی کا سماجی اور موسمی پس منظر بڑا قدیم اور رنگارنگ ہے۔ ہندوستانی روایات اور اساطیر میں اسے سب سے زیادہ رنگین تیوہار مانا گیا ہے۔ تمام ہندوستانی تیوہاروں میں اسے اپنی موسمی مناسبت اور عوامی آہنگ کی بنا پر سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہے اس کی سماجی مقبولیت اور کشش کا سبب یہ ہے کہ اسے ہر عقائد و مشرب کے لحاظ کے بغیر سبھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں اور کم و بیش اس کی مسرتوں اور رنگینیوں میں شریک بھی ہوتے ہیں۔ DISCOVERY OF INDIA میں جواہر لال نہرو لکھتے ہیں ——— ہندوؤں اور مسلمانوں نے ہندوستان میں مشترکہ خصوصیات عادات رہائش فن کارانہ ذوق اختیار کیا تھا خاص طور سے شمالی ہند میں موسیقی نقاشی تعمیرات کھانا پینا ملبوسات اور مشترکہ روایات تھیں وہ ایک ساتھ مل جل کر [illegible] رہتے تھے۔ ایک دوسرے کے تیوہاروں میں شرکت کرتے تھے۔ جیسے ہولی، دیوالی، نو[illegible]

وغیرہ ..... ایک زبان بولتے تھے۔ اور ایک طرح کے اقتصادی مسائل کا سامنا کرتے تھے۔ سماجی حالات نے قومی یکجہتی کے شعور کو پروان چڑھانے میں مدد دی۔ ہر ہندوستانی زبان میں ہولی کا ذکر موجود ہے۔ مختلف زبانوں کے شاعر اس کے رنگ سرشاری اور مستی سے چور نظر آتے ہیں۔ اردو شعراء نے بھی اس ہفت رنگ تیوہار کی رنگینیوں کی منظر کشی اور عکاسی کی ہے۔ ہندوستان میں پیدا ہونے والی دوسری زبانوں کی طرح اردو نے بھی ہولی کی رنگا رنگی خلوص و مسرت رقص و سرور محفل ساز و نغمہ کی جھنکاریں اپنے اندر کہیں شاعری کی شکل میں اور کہیں قصّوں اور افسانوں کے رنگ میں سموئی ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ میر انشاء۔ نظیر اکبر آبادی جیسے شاعروں نے جہاں اسلامی رسموں اور تیوہاروں پر لکھنے کے لئے قلم اٹھایا ہے وہاں اپنی شاعری کا زیادہ حصہ بھگتی کے شاعروں کی طرح کرشن جی کے لئے بھی وقف کیا ہے۔

محمد قلی قطب شاہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے۔ اس کے یہاں عید نوروز۔ بسنت۔ ہولی اور دوسرے تیوہاروں کی رنگا رنگی اور ہمہ رنگی نظر آتی ہے۔ اس کی شاعری کا غور سے مطالعہ کرنے پر سب سے پہلے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہندوستان اور ہندوستانیت کا سب سے بڑا پرستار ہے وہ نمائندہ شاعر ہے۔ جس کے کلام سے ہم اس وقت کی سماجی زندگی کا بہت کچھ مواد حاصل کر سکتے ہیں۔ سیرہ بر اور ان کے سید عبد اللہ خاں ہولی اور بسنت دونوں مناتے تھے۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی کے یہاں بھی بسنت اور ہولی کا تذکرہ موجود ہے۔ دلّی کے بادشاہ اور اردو کے مشہور شاعر۔ اور شاہ ظفر کی ہولی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

ہندوستانی شاعروں اور ادیبوں کے علاوہ مسلمان بادشاہوں اور اُمرا نے بھی اڑتے گلال سرشار جلسوں اور بھیگتے پیر اہنوں سے ... تیوہار کی ایک بہت پرانے ایرانی تیوہار" نوروز "سے مماثلت بخوبی محسوس کی ہے اور اسے اپنی مسرتوں میں شامل کیا ہے۔ حقیقت ہے کہ ان دونوں تیوہاروں میں بڑی حد تک مشترک قدریں پائی جاتی ہیں۔ دونوں تیوہاروں کے پس منظر میں موسم ہے۔ دونوں میں رنگ کی اہمیت ہے۔ دونوں خوشی و انبساط کے پیغامبر ہیں۔ دونوں شاہ و گدا کے فاصلے کم کرتے ہیں۔ دونوں میں اجتماعی مسرت اور بھائی چارے کی مہک پائی جاتی ہے۔

ہولی اپنی اسی اجتماعیت کی روح کی بنا پر اور یکجہتی کی علامت کی حیثیت سے بیجاپور، گولکنڈہ اور اودھ کے درباروں میں بلا تخصیص مذہب و ملت بڑی دھوم سے منائی جاتی رہی ہے۔ آصف الدولہ کے زمانے میں ہولی منانے کا عجیب عالم تھا۔ بادشاہ خود (؟) میں شریک ہوتا تھا۔ آصف الدولہ کے عہد میں وہ روایات مضبوط ہوتی گئیں جن کی بنیاد قومی یکجہتی پر تھی۔ بسنت کے پھول کھلے تو سب نے اپنے دل و دماغ دھوئے ہولی کے رنگ تقریباً یکساں بن گئے۔

ہولی کے تیوہار کی تہہ میں یہ جو اخلاص و محبت پنہاں ہے اس نے تصوّف کے حوالے سے ہماری صوفیانہ شاعری کو بھی متاثر کیا ہے۔ بے شمار مصروف اور نسبتاً کم معروف صوفی شاعروں کے یہاں " ہولی رنگ" والہانہ جذبات اور انسانی اخوت کے جوش کے ... ساتھ اپنے محبوب حقیقی کے روبرو اپنی اندرونی کیفیات کے اظہار کے ایک بے حد موثر وسیلے کے طور پر برتا گیا ہے۔

میر تقی میر نے "... " میں آصف الدولہ کی منائی جانے والی ہولی کا نقشہ بہت ہی دلچسپ اور خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے تمام جزئیات کا نقشہ آنکھوں میں گھوم جاتا ہے۔

[illegible]

... شک ہندوستاں

[illegible] جوال

زعفرانی رنگ سے دیکھیں لباس

تھمتے جو مارتے بھر بھر کے گلال

لکھنؤ آنے کے بعد بھی میر تقی میر نے اپنے شاعرانہ وقار اور کردار کو برقرار رکھا انہیں ہندوستانیت عزیز تھی اور اس ہندوستانی طرز فکر کی وجہ سے انہیں بھی یہاں کے تیوہاروں سے دلچسپی رہی اُن کی ہولی عام شعرا کی ہولی سے بالکل منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ اس لئے کہ اس کے ذریعہ لکھنؤ کا وہ مشترکہ کلچر سامنے آجاتا ہے جس میں سربراہ مملکت اپنے مذہب کا پابند رہتے ہوئے بھی دوسرے مذہبی فرقوں کے مذہبی تیوہار میں حصّہ لیتا ہے۔ ڈاکٹر عقیل لکھتے ہیں۔

جب کوئی تیوہار ہوتا تو ہندو مسلمان مل کر اسے مناتے نواب آصف الدولہ خود ہولی کھیلتے ہیں اور اُن کے ساتھ تمام رعایا ہولی کھیلتی ہے۔ جب یہ سماں طاری ہوتا ہے تو نواب کی نذر کے لئے اہل فرنگ آتش بازی لے کر آتے ہیں۔

نظیر اکبرآبادی نے ہولی کو ایک سیکولر تیوہار مانا ہے

"نظیر ہولی کا موسم جو جگ میں آتا ہے!"

وہ ایسا کون ہے ہولی نہیں مناتا ہے

کوئی تو رنگ چھڑکتا ہے کوئی گاتا ہے

جو خالی رہتا ہے وہ دیکھنے کو جاتا ہے

(نظیر اکبرآبادی)

ہر خاطر کو خورسند کیا ہر دل کو لبھایا ہولی نے!

دف رنگیں نقش سنہری کا جس وقت بجایا ہولی نے

بازار گلی اور کوچوں میں غل شور مچایا ہولی نے

[illegible] حسن جتایا ہولی کا

[illegible] شاہ تراب کاکوروی

وغیرہ کی بھی ہولی سے متعلق نظمیں ہیں ــــ

رنگ صحبت سے عجب ہیں خورد و پیر

بھی دولت خانہ رشک بوستاں

جیسے گلدستے تھے دریا پہ رواں

عطر مالی سے بھوں میں گل کی باس

جس کے لگتا آن کے بھر منہ ہے لال

وغیرہ کی بھی ہولی سے متعلق نظمیں ہیں۔

آج بھی ہندوستان میں ہندو مسلم سکھ عیسائی اور دیگر مذہبی فرقے کے لوگوں کے درمیان ہولی مجلسی رابطہ اور اتحاد کا حسین موقع فراہم کرتی ہے۔ ہولی کے موقع پر لوگ اپنے احباب کے یہاں جاتے ہیں میزبان اپنے مہمان کی حسب حیثیت تواضع کرتا ہے۔ لوگ ٹولیاں بنا کر ہولی ملنے جاتے ہیں جس چوپال پر جاتے ہیں صاحب خانہ ان کا منھ میٹھا کرتے [illegible] چند میں آج بھی ہمارے شہروں اور دیہاتوں میں [illegible] اور اس سے اجتماعی اخوت کی خوشبو آتی ہے۔ ملت و مذہب کی تفریق مٹ جاتی ہے۔ اور سب ہندوستانی نظر آتے ہیں یہی ہندوستان کی وہ حسین خصوصیت ہے کہ ہمارا ملک [illegible] مرکز بنا چاہتا ہے یکجہتی کا ترنگ اختیار کر لیتا ہے۔ [illegible] نسل زبان و مذہب کے تمام فرق اس کے سامنے [illegible] معدوم ہو جاتے ہیں۔

اس جذبے کو قائم رکھنے کا درج ذیل بند میں شعور دیا ہے۔

بھر بھر لال گلال لگاؤ

نینن کو نینوں سے ملاؤ

بیر بھول کر پریم بڑھاؤ

سب کو آتم گیان سکھاؤ

پیار کی بولی بولیں

ہولے ہولے ہولی کھیلیں



گولکنڈہ
سگریٹ

GOLCONDA



نئے پسندیدہ خوبصورت
پیکٹ میں

THE HYDERABAD DN.
CIGARETTE FACTORY (P) LTD
MUSHIRABAD HYDERABAD

پرائیوٹ لمیٹڈ
حیدرآباد دکن سگریٹ فیکٹری
مشیرآباد حیدرآباد

تیسری آنکھ

معین شاہد وارثی

اس نے کس گھر میں اور کب جنم لیا تھا!

اس کے ماں باپ کا کیا نام تھا؟ کسی کو یہ بات معلوم نہ تھی۔ خود شبراتن کو اس کا شجرہ معلوم نہ تھا۔ وہ شجرے کے مفہوم سے بھی واقف نہ تھی۔ ہاں البتہ آج وہ ایسے گھرانے میں پانچ سال سے رہ رہی تھی جہاں شجرہ ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا تھا۔ نواب احمد جعفر رضا بن نواب معظم علی بن حسن علی تراب علی، ابن فلاں بن فلاں۔ اور یہ شجرہ اس خاندان کی ایک مقدس کتاب کی شکل میں ایک رنگین جزدان میں لپٹا رہتا۔ جو ایک ورثہ کی طرح نسلاً بعد نسل محفوظ تھا۔ اور جو اس خاندان کی وجاہت، جاہ و حشمت اور اعلیٰ نسب کی امانت تھا۔ شبراتن کا اپنا کوئی شجرہ نہ تھا اس لیے وہ راہ گذر نام کے شجر کی ایک ایسی ثمر آور شاخ تھی جہاں سب کی دسترس تھی جب چاہا اس شاخ کو جھکایا اور جھول گئے۔ جس خاندان کا اپنا شجرہ ہوتا ہے تو اس سے اسی خاندان کی جڑوں کا پتہ چلتا ہے۔ اور نواب احمد جعفر رضا کے پاس چونکہ اپنا شجرہ تھا اس لئے ان کی اپنی بے داغ جڑیں اور اپنے نام و نسب کا سلسلہ ملتا تھا جو ایک ممتاز اور شریف خاندان کے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے شبراتن کے پاس چونکہ اپنے نام و نسب کا کوئی شجرہ نہ تھا۔ اس لئے اس کے خاندان کی جڑوں کا پتہ لگانا مشکل تھا۔ وہ اس سماج میں کسی حویلی کی کنیز تو بن سکتی تھی لیکن کسی خاندان اور شریف ۔ دکھ سہا کیں نہیں۔ سو وہ شہر کے پچھلی دروازے والی نواب صاحب کی حویلی" کی کنیز بن گئی۔ وہ صرف اتنا ہی جانتی تھی۔ ہاں اسے اتنا ضرور یاد تھا کہ وہ اس حویلی میں کس طرح آئی۔ پہلے آنے امام باڑے والی فقیر ٹولی کی گلی میں اس جیسی بے نام و نسب کی بہت سی کمسن لڑکیاں رہا کرتی تھیں جن کی دنیاں رشتے کی خالائیں، پھوپھیاں، دادیاں اور نانیوں کی حد تھی اور جن لڑکیوں کا کام تھا کہ وہ دن بھر یا تو گلیوں اور راستوں پر پھینکے ہوئے بکھراؤں خالی ڈبوں، ردی کاغذ اور ٹین کے ٹکڑوں کو اپنی ٹوکری میں جمع کریں یا پھر ریلوے لائنوں اور رشتہ اندھیرے بھٹوں میں بڑے بڑے ہوٹلوں کے سرد چولہوں سے نکلی ہوئی راکھ کے اندر چھپے ہوئے کوئلوں کو اکٹھا کریں۔ اس کام سے ان لڑکیوں کے رشتے کی خالائیں، بہنیں، دادیاں اور نانیاں بہت خوش رہتیں کیونکہ یہ کام بہت ہی نفع بخش تھا۔ ہر لڑکی دن بھر میں اتنا تو ضرور کما کر لاتی جس سے وہ خود اپنا پیٹ پالتی اور جس سے اس جھونپڑی میں رہنے والے افراد کا بھی بآسانی گذارا ہوتا۔ جو لڑکی جتنا زیادہ کوئلے اور کپڑے چن کر جمع کرتی وہ اتنا ہی زیادہ فقیر ٹولی کی گلی میں محبوب ہو تی اس گلی کی ہر عورت اور ہر مرد اسے اپنی بنانے کے لئے تیار رہتی۔ ہر کوئی اس بات کی تاک میں لگا رہتا کہ کس طرح ان لڑکیوں میں سے سب سے زیادہ ہوشیار اور لڑکی کو اپنا بنا لیا جائے بسا اوقات اس لڑکی کو کرنے والی خیمہ کو حاصل کرنے کے لئے گلی میں رنجش خاصی جنگ شروع ہو جاتی۔ اور روزانہ ہی کسی نہ کسی

[illegible] مذکورہ [illegible] ضرور پکھوا لیا جاتا۔ ہر لڑکی اس معنی میں خوش قسمت تھی کہ وہ اپنے آپ کو اس گلی میں بے سہارا نہیں سمجھتی تھی۔ ان لڑکیوں میں شبراتن بہت ہی زیادہ چالاک، چنچل اور چالاک تھی اس لئے وہ سب لڑکیوں سے زیادہ کو لے اور کپڑے اکٹھا کیا کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ گلی کے ہر شخص بوڑھے کی منہ بولی بیٹی تھی۔ گو کہ بچپن ہی سے وہ لاوارث تھی لیکن اسے اس گلی کی سب سے عمر رسیدہ عورت مجھن کی جھونپڑی میں اسے ایک ماں کی محبت اور ایک باپ کا پیار بھی حاصل تھا جسے وہ نانی کہہ کر پکارتی تھی۔

[illegible] عمر آزادانہ گولنے اور پکڑ دھکڑنے کی نہیں ہوتی۔ اس کے دل میں بسنت جیسی بہار جھول رہی تھی اور شگوفے جیسے کھل رہے تھے۔ وہ قدرت کی اس ستم ظریفی پر کیسے قابو پالیتی۔ ایک بے آسرا اور بے نام نسب لڑکی کے لئے قدرت کا یہ ظلم وستم ہی تو تھا کہ جوانی اسکی نوخیز عمر کی دہلیز پر دستک دے رہی تھی اور جسم چھپانے کے لئے اس کے پاس ایک میلی سی چادر بھی نہ تھی۔ سو وہ اس گلی سے اب کم نکلتی۔ اس عمر میں اس کی نانی بھی مر گئی اور اب گلی میں اس کا پرسان حال کوئی نہ تھا۔ کہ وہ ایک ایسی ہی دکان تھی جسے شروع ہی میں دیوالیہ قرار دے دیا گیا ہو۔

رمضان شریف کی بھی شروع ہو گئی تھی۔ اس نے روزے رکھے تھے۔ وہ ہر شام کو مغرب سے قبل المونیم کا کٹورا لے کر نواب صاحب کی حویلی میں افطار مانگنے چلی جایا کرتی۔ ایک روز نواب احمد جعفر رضا کے چھوٹے صاحبزادہ شاہزادہ خوش بخت کی نظر کرم اس پہ پڑ گئی۔ انہوں نے اس کے ہاتھ سے کٹورہ لیکر کہا۔ "تم آج یہیں افطار کرو" ــــ اور اس نے اس روز وہیں افطار کیا۔ پھر اس نے [illegible] کھایا۔

"تم شاید برانے امام باڑے میں رہتی ہو۔؟"

"ہاں!"

"وہاں تمہاری ماں رہتی ہے!"

"نہیں!"

"تمہارا باپ؟"

"نہیں!"

"تو تم صرف تنہا وہاں رہتی ہو؟"

"ہاں!"

"تو تم اس حویلی میں رہو۔ یہاں ایک کنیز اور خادمہ کی ضرورت ہے۔"

شبراتن شاہزادہ خوش بخت کی کنیز کی حیثیت سے اس حویلی میں داخل ہوئی۔ اسے اتنا ضرور یاد تھا۔ اس نے قادر مطلق کا شکریہ ادا کیا کہ رمضان کے بابرکت مہینے کے طفیل اسے دو وقت کی روٹی اور سر چھپانے کی جگہ مل گئی۔ اور چھوٹی بہو بیگم نے بھی قادر مطلق کا شکریہ ادا کیا کہ انہیں حویلی کی اور بہوؤں کی طرح ایک کنیز مل گئی۔ جن کے ساتھ وہ بازار ہاٹ اور شرفاء کے گھرانوں میں شادی بیاہ کے موقع پر آ جا سکتی تھیں۔ بغیر کنیز کے کسی بیگم کی اعلیٰ نسبی اور خاندانی شرافت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ مانگے چانگے کی کنیز سے کب تک کام چلاتیں۔ سو وہ بہت خوش ہوئیں اور انہوں نے معنی خیز نگاہوں سے شاہزادہ کو مبارکباد پیش کی۔

یہ دنیا پتھر سے نگینے تراشتی ہے اور ان نگینوں کو اپنے لئے ذریعہ عزت وعظمت قرار دیتی ہے کہ پتھر تو بے جان ہیں جب تک ان کو نگینہ بننے کا سلیقہ عطا نہ کیا جائے اس وقت تک انہیں کوئی پوچھتا تک نہیں۔ اور شبراتن جو ایک بے جان پتھر تھی، جب اس کے ہاتھوں کو بکر اللہ کو تلہ چننے کا سلیقہ اور شعور بخشا گیا تو [illegible] آدمیان کی۔ اور جب منہ زور گھوڑے [illegible]

ملبوس وقت نے اس کی خواہشات اور احساسات کو کچل دیا اور
اس کی حسن و عفت، شرم اور لاج نے اس کے پاؤں میں بیڑیاں
پہنا دیں تو وہ ٹھکرا دی گئی۔ اسے پڑنے اعلیٰ باڑے سے ولی
فقیر تلے میں کوئی پوچھتا نہ تھا۔ اس کی قدر و قیمت نہ تھی
۔ اور آج پھر جب شاہزادہ خوش بخت کی رنگینیوں کا مزہ، جیسوں نے
شبراتن کی نوخیز جوانی کی آدھ کھلی کلیوں کو قوت مجبوری اور
حرص و ہوس کی بھری ہوئی منڈی میں جب وہ دام لگانے
کے قابل ہوئی تو اسے ایک کنیز کا نام دے دیا گیا۔ اور
اسے حویلی کی شبستان میں سجا دیا گیا۔

پانچ سالوں تک وہ اس بڑی حویلی میں ایک خوش
رنگ تتلی کی طرح اِدھر اُدھر اُڑتی رہی۔ یہاں اس کی
عمر کی کئی کنیزیں اور بھی تھیں اور ہر کنیز حویلی کے کسی
نہ کسی شاہزادہ اور نواب کی محبوب نظر تھی۔ حویلی
کے شہزادوں اور نوابوں کی بیگمات اپنے شوہروں
کی رنگ رلیوں سے خوب واقف تھیں۔ ان بیگمات
کی رنگ میں ان کے شوہروں نے چونکہ سیندور بھرا تھا اس
لئے ان کا سہاگ محفوظ تھا۔ اور ان کنیزوں کی مانگیں برسہا
برس سے ایک چٹکی بھر سیندور کے لئے ترس رہی تھیں
اس لئے ان کے سہاگ کے تحفظ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا
ان کے سہاگ کے کنول جلانے سے پہلے ہی بجھا دیئے جاتے
جب کسی کنیز کا اونچا اور بے ڈھب پیٹ کسی شہزادے اور
نواب کے گناہ کی چغلی کھانے لگتا تو وہ حرم خانے سے
نکال دی جاتی ——— اور یہی حال پندرہ برس کی شبراتن
کا ہوا۔ کہ یہ عمر کسی لڑکی کے لئے ایک مکمل عورت بن
جانے اور اس کی گود میں ایک ننھا سا چاند اتر آنے کی
ہوتی ہے۔ جس کی اجازت شاہزادہ خوش بخت اپنی کنیز
کو نہیں دے سکتے تھے۔ شبراتن کی کشور عمر کی سرحدیں
اور سیاہیوں کا بھی عجیب حال تھا۔ ہر سرحد اور ہر سیاہ

کرتے وقت اسے زہر کا پیالہ پینا پڑا۔ [illegible]
سے لیکر نواب صاحب کی حویلی تک اس نے یہ وقار [illegible]
اتنا زہر پیا تھا کہ اس کے ہونٹ نیلے پڑ گئے تھے۔

ایک رات جب بہت گھپ اندھیرا تھا۔ آسمان ابر آلود
اور موسم کا تیور بگڑا ہوا تھا۔ شہزادہ خوش بخت نے اپنے
ایک ملازم سے کہا۔ "شبراتن کو یہاں سے ستر میل دور
شہر کے ایک آفٹر کیئر ہوم میں چھوڑ آؤ۔"

"آپ ایسا نہ کیجئے۔ میں آپ کی کنیز بن کر رہوں گی۔
مجھے حویلی کے ایک کونے میں رہنے دیجئے۔"

"تم اب یہاں نہیں رہ سکتیں۔ اس حویلی کا یہی قانون ہے۔"
شہزادہ نے تحکمانہ لہجہ میں کہا۔

"کم از کم اس بچے کی خاطر ایسا نہ کیجئے۔ جو میرے جسم و
جان میں پل رہا ہے۔"

"خاموش! ایسی بات زبان سے نکالی تو خیر نہیں۔"

"آپ کم از کم میری مانگ میں سیندور تو بھر دیں۔ اور
ایک مرتبہ آپ مجھے اسی طرح گہنے پہنا کر رخصت کر دیں جس
طرح آپ نے پہلی شب مجھے پہنائے تھے۔ تاکہ دنیا مجھے
بیاہتا کہے۔"

"نہیں نہیں... نہیں ہو سکتا۔ ہاں لو یہ بکس اس میں
تمہارے وہی زیورات ہیں جو تم نے اس رات پہنے تھے۔
تمہارے یہ کام آئیں گے۔"

اور پھر انہوں نے اپنے ملازم کو حکم دیا۔ "فجر کی اذان
سے پہلے اس حویلی کو چھوڑ دینا ہے۔"

اور وہ شہر ستمگر سے نکل آئی۔

ملازم نے اسے دوسرے شہر میں جا کر بے راہ رو
عورتوں کے ادارہ "آفٹر کیئر ہوم" میں داخل کرا دیا۔ [illegible]
ایسے نے [illegible] اس وقت اس کی آنکھوں میں [illegible]
[illegible] کچھ روز کے بعد اس کی آنکھوں کی بینائی [illegible]

باقی رہیں۔ اس قبرستان سے نکالی جانے والی تمام کنیزوں کے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا تاکہ ان کی آنکھیں چھین لی جائیں تاکہ وہ دوبارہ نواب صاحب کی حویلی میں واپس نہ جا سکیں۔

شام ہو گئی تھی۔ آفٹر کیئر ہوم کے کمرہ میں اندھیرا تھا۔ اپنے وجود کے اندھیرے کی قبر پر یادوں کے کچھ چراغ ابھی جل رہے تھے۔ اور وہ ذہن کے اس پیراہن کی رفوگری کر رہی تھی جس میں شہزادہ خوش بخت سے وابستہ یادوں کے کچھ دھاگے باقی رہ گئے تھے۔ اس نے اپنی نور آنکھوں کے بند دریچے سے شہزادہ کے بھرے بھرے تبسم کو دیکھا۔ اس کے ہاتھوں کے لمس کو محسوس کیا۔ اور پھر.... اب اس کی اندھی آنکھوں کے پاس تصورات کے آئینہ خانہ کے سوا اور کیا رکھا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اب جو نادیدہ منظر تھا وہ اس کی اپنی اساس تھا جسے وہ اپنی آنکھوں کے اندر ہر وقت بھر لے سکتی تھی۔ اور خیالوں ہی خیالوں میں اس دنیا کے رنگ و بو کو نئی رنگوں میں دیکھ سکتی تھی۔ اس نے زیورات کا بکس کھولا اور اس نے تمام زیورات پہن لئے ایک دلہن کی طرح مسکرائی۔ لیکن وہ اپنی دلفریب ادا اور زخمی مسکراہٹوں کو آئینہ میں کس طرح دیکھے کہ آئینہ بھی اس کی تھوڑی سی مسکراہٹ اور رونائی کے لئے ترس رہا تھا۔

شبراتن کے اب دن پورے تھے۔ اور اب آفٹر کیئر ہوم میں اسے ولادت ہونے والی تھی۔ اس کے پاس پیسے نہ تھے اور وہ کپڑوں کے لئے ترس رہی تھی۔ اس نے آفٹر کیئر ہوم کی لیڈی انچارج آفیسر سے کہا۔

"میرے پاس کچھ زیورات ہیں۔ میں انہیں بیچنا چاہتی ہوں۔ آپ مجھے کسی زیورات کی دکان پر لے چلئے۔"

لیڈی انچارج آفیسر شریف اور ہمدرد تھی۔ اور شبراتن کی اس قابلِ رحم حالت سے بہت ہی زیادہ متاثر اور دکھی تھی۔ وہ اسے زیورات کی ایک دکان پر لے گئی۔ جب اس کے بکس سے زیورات نکالے گئے اور دکاندار کو دکھلائے گئے تو دکاندار بہت زور سے ہنسا اور بولا ——

"تو اندھی ہے تو کیا؟ تو پوری دنیا کو اندھی سمجھتی ہے۔ ارے یہ تو پیتل کے نقلی گہنے ہیں —"

اس کے تصورات کا آئینہ خانہ چکنا چور ہو گیا۔ اور اس کی تیسری آنکھ بھی چھین لی گئی۔

▲ ▲

رُباعی

(خورشید جنیدی)

ایک ایک نظر کو آزما لیتا ہوں
کچھ زاویہ فکر بڑھا لیتا ہوں
شاعر ہوں کسی طرح کا ماحول سہی
محفل میں جگہ اپنی بنا لیتا ہوں

❁ ○ ❁

مبصر:۔ آمنہ بانو

تبصرہ ۔ تفسیر حافظ رح

[از: رشید الدین انصاری (مرحوم)]

"بلبلِ شیراز" لسان الغیب خواجہ شمس الدین حافظؒ شیرازی سے کون واقف نہیں۔ انھوں نے اپنی فارسی شاعری میں تخیل کی بلند پروازی کے ساتھ تصوف، فلسفہ، حکمت و معرفت کے وہ گل کھلائے ہیں کہ رہتی دنیا تک اہل علم کے مشام جان کو معطر کرتے رہیں گے۔ بڑے سے بڑے مسائل زندگی کو بیان کرتے ہوئے بھی انہوں نے عنانِ غزل کو ہاتھ سے نہ چھوڑا اور شانِ تغزل کو قائم رکھا۔

اس بلبل شیراز کی فارسی غزلیات کی اردو زبان میں منظوم ترجمانی رشید الدین انصاری حیدر آبادی نے جس محنت، دل سوزی اور سلیقہ کے ساتھ کی ہے اس کا کوئی جواب نہیں۔ نثر کا ترجمہ آسان ہے۔ مگر کسی نظم یا غزل کے دوسری زبان میں ترجمہ وہ بھی منظوم ترجمہ کے لئے بڑی فنکارانہ مہارت، صلاحیتِ شعری اور ذہنِ رسا کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اپنی فکری کاوشوں کو موصوف نے کتاب کے نام کے ساتھ حسبِ ذیل شعر سے ظاہر کیا ہے ؎

یہ ہے منظوم اردو ترجمہ دیوانِ حافظ کا
میری آنکھوں نے جس کو نذر کردی روشنی اپنی

کتاب کا نام موصوف نے "انتخاب از تفسیر حافظ رح" رکھا ہے جس کی ۱۹۷۹ء میں پہلی بار اشاعت عمل میں آئی از اعجاز پرنٹنگ پریس حیدر آباد۔

اس کتاب پر مشاہیر کی آرائیں قابلِ ذکر ہیں۔

ڈاکٹر رضیہ اکبر صدر شعبۂ فارسی عثمانیہ یونیورسٹی لکھتی ہیں:۔

"اردو زبان میں اب تک میری نظر سے ایسا قابلِ ذکر ترجمہ نہیں گزرا جیسا کہ رشید الدین انصاری صاحب مرحوم کا ہے۔ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنا آسان بات نہیں اس کے لئے بڑی مہارت اور فن کاری چاہیئے۔ بالخصوص شعر کا ترجمہ اور وہ بھی غزل کے اشعار کا کہ اس کے محدود الفاظ اور ترکیبوں میں مضمر وسیع لقلب اور معانی کو گرفت میں لانے کے لئے زبان و بیان پر قدرت کے ساتھ مترجم کا شدت سے شعر فہم ہونا ضروری ہے۔ اور رشید الدین انصاری صاحب بلاشبہ صرف ذوقِ شعری ہی نہیں رکھتے بلکہ خود بھی شاعر تھے اور شعر کا ترجمہ شعر میں ظاہر ہے کہ ایک شاعر جس خوبی سے کرسکتا ہے دوسرا نہیں کرسکتا۔"

رشید صاحب مرحوم نے انتہائی غیر شاعرانہ دفتری مصروفیتوں کے باوجود جس ان تھک محنت، شوق اور لگن سے بلبل شیراز لسان الغیب حافظؒ کی فارسی غزلوں کو اردو کا لباس پہنایا ہے وہ ہر لحاظ سے قابل ستائش ہے۔

ڈاکٹر حفیظ قتیل پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی کی رائے ہے کہ:

• ترجمہ ایک مشکل فن ہے اور پھر شعر کا ترجمہ مشکل ہی نہیں محال ہوتا ہے۔ اس لئے کہ شعر معانی و مفہوم اور صورت و آہنگ کا اجتماعی کرشمہ ہوتا ہے۔ رشید صاحب نے بحروں کی تبدیلی کے باوجود بڑی حد تک پابند ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس کوشش میں وہ کامیاب ہیں انہیں فارسی اور اردو دونوں زبانوں پر کافی قدرت حاصل ہے۔

ڈاکٹر میر طاہر علی خاں مسلّم رقمطراز ہیں :۔

"بزم سعدی" کے اختتام کے بعد شعر کا دور بزم میں سے ایک صاحب نے مجھ سے خواہش کی کہ میں کچھ دیر توقف کروں اور رشید انصاری صاحب کے ترجمۂ حافظؒ کی غزلیں سن لوں۔ رشید انصاری صاحب نے دو تین غزلیں سنائیں۔ اس کے بعد اپنا منظوم ترجمہ سنایا۔ مجھ پر جو کیفیت اس سماع نغمۂ دو آتشہ سے طاری ہوئی اس کو نہ میں اس وقت بیان کر سکتا تھا اور نہ اب اس قابل ہوں"

پروفیسر سید محمدؒ (مرحوم) نے فرمایا :۔

"رشید انصاری صاحب ایک خوش فکر، خوش گو اور قادر الکلام شاعر ہیں، زبان اور بیان پر اچھی قدرت رکھتے ہیں۔ میں بڑی مسرت سے یہ کہنے کے موقف میں ہوں کہ رشید صاحب نے حافظؒ کے کلام کی اصل روح کو بڑی کامیابی کے ساتھ اردو میں منتقل کیا ہے۔ ترجمہ، ترجمہ نہیں معلوم ہوتا بلکہ شاعر کا اصلی کلام معلوم ہوتا ہے۔ ہر غزل میں سلاست، روانی اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔ حقیقت میں کلام حافظؒ کی منظوم تفسیر ہے۔ اس کے ذریعہ وہ لوگ جو فارسی نہیں جانتے فارسی کے بین قومی بلکہ عالمگیر شہرت رکھنے والے شاعر حافظؒ شیرازی کے کلام کا اپنی زبان اردو میں پورا پورا لطف حاصل کر سکتے ہیں۔"

اب خود رشید انصاری صاحب کی زبانی فیض ترجمانؒ سنیئے

"عبد القادر سروری کشمیر سے جس وقت عارضی قیام کے لئے اپنے وطن مالوف حیدرآباد آئے۔ تو انہوں نے اپنے پاس ایک محفل شعر منعقد کی۔ جس میں میں نے حافظؒ کی ترجمہ والی غزلیں سنائیں۔ محفل چونکہ ثقہ اصحاب اور ارباب ذوق سے آراستہ تھی۔ اہل محفل نے خوب دل کھول کر داد دی۔

یہاں ایک بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ حافظؒ کے ترجمہ کے دوران شعرائے متقدمین کے بلند پایہ اشعار جو برسوں سے میرے حافظہ میں تھے، میں نے ان کا بھی ترجمہ کر ڈالا۔ جنھیں ارباب ذوق نے سن کر بے حد داد دی۔ مثلاً :۔

مرا دردیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد
وگر دم درکشم، ترسم کہ مغز استخواں سوزد

(ترجمہ) میرے دل میں ہے درد ایسا زباں جلتی ہے کہنے سے
مگر جلتا ہے مغزِ استخواں خاموش رہنے سے

اس زمین میں غزل موزوں کرتے وقت عرفیؔ کا ایک مشہور مقطع بیچ میں آگیا۔ میں نے کہا لاؤ اسے کیوں یوں ہی رہنے دیا جائے ؎

عرفیؔ اگر بہ گریہ میسر شدے وصال
صد سال می تواں، بہ تمنا گریستن

(ترجمہ) ہمارا کیا تھا، ہم تو عمر بھر آنسو بہا لیتے
اگر ہوتا میسر وصال یار، اشکوں کے بہنے سے

غنیؔ کاشمیری کا ایک شعر ہے ؎

سرو در فصل خزاں ماند بحال
راستی را نبود بیم زوال

(ترجمہ) درختِ سرو یک حالت پہ رہتا ہے خزاں میں بھی
نہیں خوفِ زوال راستی دونوں جہاں میں بھی

اسی طرح غالبؔ کے اردو اشعار کا فارسی میں ترجمہ کیا ہے :۔

بہت سہی غم گیتی، شراب کم کیا ہے
غلامِ ساقیٔ کوثر ہوں، مجھ کو غم کیا ہے

(ترجمہ) غمِ گیتی بسے دارم، ولے سے ہم نہ کم دارم
غلام ساقیٔ کوثر منم، اگرچہ غم دارم

غالب کا ایک اور شعر ہے —

مئے عشرت کی خواہش ساقیٔ گردوں سے کیا کیجے
لیے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

(اک، دو، چار، سات ہوتے ہیں کیا بلاغت ہے غالب کی!
آہ با نور)

(ترجمہ) تمنائے مئے عشرت چہ سود از ساقیٔ گردوں
تماشا ہیں: کہ آں ہم ہفت جامِ واژگوں دارد"

اب رشید الدین صاحب کی زیرِ بحث کتاب "تفسیرِ حافظ"
سے چند اشعار موصوف کے اردو ترجمہ کے ساتھ پیش ہیں۔

تو و طوبیٰ و ما و قامتِ یار
"فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست"

(ترجمہ) مثل مشہور ہے "ہمت ہے جتنی فکر ہے اتنی"
اِدھر میں اور قدِ جاناں، اُدھر زاہد ہے اور طوبیٰ"

بارے ایں نکتہ توان گفت کہ آں سنگین دل
کشت مارا و دمِ عیسیٰ مریم با اوست

(ترجمہ) مجھے مارا ہے سنگین دل نے کیا تماشا ہے
وہی قاتل بھی ہے کہتے ہیں جس کو ابنِ مریم ہے

غرض ز مسجد و میخانہ ام وصالِ شما
جز ایں خیال ندارم خدا گواہِ من است

(ترجمہ) مسجد سے میکدے سے غرض تیرا وصل ہے
اس کے سوا کچھ اور نہیں ہے، خدا گواہ!

کاشش در پئے آزار و ہر چہ خواہی کن
کہ در طریقتِ ما غیر ازیں گناہے نیست

(ترجمہ) کسی کا دل نہ دکھا دیکھ، جو چاہو کرو
ہمارے دین میں اس سے بڑا گناہ نہیں

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است
صراحیٔ مئے ناب و سفینۂ غزل است

(ترجمہ) صراحیٔ مئے گلفام اور بیاضِ غزل
یہی رفیق ہے اس دور میں بغیرِ خلل

صبحدم مرغِ چمن با گلِ نو خاستہ گفت
"ناز کم کن کہ دریں باغ بسے چوں تو شگفت"

(ترجمہ) صبح کو مرغِ چمن نے یہ کہا اک گل سے
"ناز کم کر کہ تری طرح بہت پھول لگے

گل بخندید کہ از راست نرنجیم ولے
ہیچ عاشق سخن تلخ بہ معشوق نہ گفت"

(ترجمہ) پھول نے ہنس کے کہا "خیر یہ سچ ہے لیکن
کبھی معشوق کو کیا تلخ کیا عاشق نے"

شبِ تنہائیم در قصدِ جاں بود
خیالش لطف ہائے بیکراں کرد

(ترجمہ) شبِ تنہائی میری جاں کے درپے تھی مگر اے دل
عنایت حال پر میرے خیالِ یار نے کی ہے

غیرتم گفت کہ محبوبِ جہانی، لیکن !
روز و شب عربدہ با خلقِ خدا نتواں کرد

(ترجمہ) تو ہو محبوبِ جہاں، رشک نے مجھ کو مارا
روز و شب سارے زمانے سے نہیں لڑ سکتا

دوش دیدم کہ ملائک درِ میخانہ زدند
گلِ آدم بسرشتند و بہ پیمانہ زدند

(ترجمہ) یہ دیکھا میں نے کل کہ قدسیوں نے کھولا مینا
گلِ آدم کو گوندھا اور بنایا اس کا پیمانہ

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

(ترجمہ) فلک بارِ امانت کو اٹھانے سے رہا قاصر
بالآخر فال میرے نام نکلی، میں ہوں دیوانہ

باصد خرمنِ پندار ازیں رہ چوں نہ رویم
چوں رہ آدمِ خاکی' بہ یکے دانہ زدند
نہ کیوں بے راہ ہوں' صد خرمنِ پندار سے ہم بھی
کہ جب آدم کو بھٹکا دے' فقط گیہوں کا اک دانہ
دست از طلب ندارم تا کام من بر آید
یا جاں رسد بہ جاناں' یا جاں ز تن برآید
طلب سے منہ نہ موڑوں گا حصولِ مقصدِ جاں تک !
گزر جاؤں گا جاں سے یا پہنچ جاؤں گا جاناں تک
دی عزیزے گفت حافظ می خورد پنہاں شراب
اے عزیزِ من! گنہ آں بہ کہ پنہانی بود
کہا اک دوست نے چھپ کر پیا کرتا ہے مے حافظ
اسے ناداں! گنہ بہتر وہی ہے جو ہو پنہانی

———— ❦ ————

رباعیات

(مرزا یاس یگانہ چنگیزی)

کس دھن میں کوہکن نے تیشہ باندھا
سر پھوڑ کے خود موت کا آنکا باندھا
قدموں سے لپٹ گئی حیاتِ ابدی
کیا عشق کے سر اجل نے سہرا باندھا

مشکل کوئی مشکل نہیں جینے کے سوا
خاموش لہو کا گھونٹ پینے کے سوا
کھلتے ہیں جبھی جوہرِ تسلیم و رضا
جب کوئی سپر ہی نہ ہو سینے کے سوا

بزمِ خیال

(اس عنوان کے تحت دو علمی اور ادبی سوالوں کے جواب دیئے جاتے ہیں)

س :۔ محمدؐ قلی قطب شاہ کے دربار کا ملک الشعراء کون تھا ۔ ؟

ج :۔ اسد اللہ وجہی دکن کا وہ مایہ ناز شاعر تھا جس نے چار قطب شاہی بادشاہوں کا دور پایا تھا۔ محمدؐ قلی قطب شاہ نے اس کی بلند پایا سخنوری دیکھ کر اُسے اپنے دربار کے ملک الشعراء کے عہدے پر فائز کیا۔ وجہی اپنی مثنوی "قطب مشتری" کی بنا پر ادب میں ایک بے نظیر مقام رکھتا ہے۔ یہ مثنوی اُس نے محمدؐ قلی کی وفات سے دو سال پہلے ۱۰۱۸ھ میں تصنیف کی تھی۔ جناب اختر حسن صاحب نے بڑی تحقیق سے وجہی کے بارے میں معلومات بہم پہونچائی ہیں۔ وجہی کے فارسی کلام کا سہرا بھی اختر حسن صاحب کے سر ہے وہ لکھتے ہیں کہ وجہی کا تعلق خراسان سے تھا گو کہ اس کی پیدائش ہندوستان میں ہوئی۔ فارسی میں اُس نے "وجہا ۔ وجیہہ اور وجہی" تینوں بطور تخلص استعمال کئے ہیں۔

س :۔ قطب شاہی سلطنت کے بانی کا تعلق کس ملک سے تھا ۔ ؟

ج :۔ قطب شاہی سلطنت کے بانی سلطان قلی کا تعلق ترکستان کے ایک ایسے قبیلے سے تھا جو "قراقوینلو" تھا۔ اس کے معنی ہیں "کالا مینڈھا" سلطان قلی کا باپ اویس قلی ایرانی شہر "ہمدان" کا حکمران تھا۔ والی ترکستان امیر یعقوب سلطان قلی کی بے پناہ ذہانت اور تدبر سے خائف تھا چنانچہ اُس نے قلی کے خاتمے کی سازش کی۔ پھر اعزہ و عائدین نے سلطان قلی کی جان بچانے کے لئے اپنے چچا اللہ قلی کے ہمراہ ہندوستان روانہ کر دیا۔ یہاں آکر وہ سیدھے محمود شاہ بہمنی کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ حالات ٹھیک ہو جانے کے بعد اللہ قلی نے واپسی کا فیصلہ کیا۔ سلطان قلی کو ہندوستان پسند آگیا تھا۔ لہٰذا اُس نے اللہ قلی کو تو روانہ کر دیا اور خود محمود شاہ بہمنی کے دربار سے وابستہ رہا۔ اپنی فوجی حکمت عملی اور ذہانت کی بنا پر سلطان قلی نے بہت جلد ترقی کی منزلیں طے کر لیں اور ایک مرتبہ تلوار کے وار سے محمود شاہ کی جان بھی بچائی چنانچہ محمود شاہ نے اُسے ۹۰۱ھ میں گولکنڈہ اور ورنگل کا حاکم بنا دیا اور قطب الملک کا خطاب دیا۔ محمود شاہ کی وفات کے بعد سلطان قلی نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا اور ۹۲۴ھ میں قطب شاہی سلطنت کی بنیاد رکھی۔

ماہنامہ

فون نمبر ۵۲۵۱۱

ذوقِ نظر

حیدرآباد

جلد (۲) شمارہ (۵، ۶)

مئی و جون [illegible]ء

زرِ تعاون

سالانہ پچاس ۵۰ روپے — فی شمارہ پانچ روپے

عرب ممالک سے فی شمارہ ۵ ریال

پرنٹر پبلشر : محمد بشیر الدین بشیر وارثی ★ مقام اشاعت : دائرہ الیکٹرک پریس چھتہ بازار

مقام اشاعت : دفتر ماہنامہ "ذوقِ نظر" ۲-۶۱۲-۸ چھتہ بازار حیدرآباد

ترتیب

حرفِ آغاز

ڈاکٹر یعقوب عمر

عبادتیں تین قسم کی ہوتی ہیں، جسمانی، مالی اور دلی۔ جسمانی عبادتوں میں سب سے زیادہ اہم نماز اور روزہ ہیں۔ مالی عبادتوں میں سرفہرست زکوٰۃ درج ہیں اور دلی عبادتوں کا جہاں تک تعلق ہے وہ جسمانی اور مالی عبادتوں کے ساتھ بھی اشتراک رکھتی ہیں اور اس سے ہٹ کر بھی ہیں۔ مطلب صرف اتنا ہے کہ حقوق العباد کا حتی الامکان خیال رکھنا اور کوئی بات ایسی نہ کرنا جس سے کسی کے دل کو ٹھیس پہونچے یہ دلی عبادت ہے۔ تمام جسمانی اور مالی عبادتوں کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ کہیں اس سلسلے میں کسی کے دل کو ٹھیس تو نہیں پہونچائی گئی۔ کسی کا حق تو نہیں مارا گیا۔ کسی پر زیادتی تو نہیں کی گئی۔ اسلام کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ ؎ دِل بدست آور کہ حج اکبر است۔

مگر ملت اسلام ہے کہ اسی بنیادی نقطہ کو فراموش کئے ہوئے ہے جسمانی اور مالی دونوں قسم کی عبادتیں صرف نمائشی ہوکر رہ گئی ہیں، ان سے روح نکل گئی ہے۔ زکوٰۃ بھی 'اشتہاری' نماز بھی اشتہاری یہاں تک کہ روزہ جو تزکیۂ نفس کے لئے ہے اس انداز سے رکھا جاتا ہے کہ نفس منکسر مزاج ہونے کے بجائے مغرور اور سرکش ہوتا چلا جاتا ہے۔ ماہِ رمضان میں جو اہتمام کئے جاتے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نفس کشی کے بجائے نفس پروری ہو رہی ہے۔

روزے کے بنیادی فلسفے سے یہ انحراف کوئی صحت مند رجحان نہیں ہے۔ آج سے آٹھ سو سال قبل سعدی شیرازیؒ نے یہ بانگ دہل یہ اعلان کردیا تھا کہ اس آدمی کا روزہ رکھنا بیکار ہے جو ایک وقت کا کھانا ترک کرتا ہے مگر اُسے خود ہی کھالیتا ہے۔ روزے کا بنیادی فلسفہ انکے نزدیک یہ ہے کہ اسطرح تیس دن تک جو ایک وقت کا کھانا بچتا ہے وہ اگر کسی مسکین کے نان شبینہ کا بندوبست نہ کرسکے تو اس شخص کا روزہ رکھنا رائیگاں گیا۔

اس موڈرن زمانے میں نمائشی روزہ کشائی کی محفلوں نے تو اور اسلامی اسپرٹ کو نقصان پہونچایا ہے۔ پیٹ بھرے متمول مسلم وغیر مسلم روزہ خوروں کو ہی ان میں زیادہ تر مدعو کیا جاتا ہے اور وہ مساکین جو سحر و افطار کا مناسب بندوبست کرنے سے بھی قاصر ہیں ان سے محروم رکھے جاتے ہیں ؎ برایں عقل و دانش بباید گریست۔

قرآن کی بہترین سے بہترین آواز میں ختمات کے جلسے منعقد کئے جاتے ہیں لیکن قرآن فہمی اور فہمائی کی مجلسیں شاذ ہی منعقد ہوتی ہیں۔ وہ کامن ترین ہستی جو غارِ حرا سے اتر کر اپنے ساتھ ایک نسخۂ کیمیا بھی لے آئی تھی کیا اس کا منشا یہی تھا کہ قرآن کو خوبصورت الحان کے ساتھ پڑھنے پر زور دیا جائے اور قرآن جو دعوت دیتا ہے اُسے یکسر فراموش کردیا جائے۔

مسلمانو! رمضان کے مقدس مہینے میں اپنے نفس کا احتساب کرو وہ قرآنِ مجید جس نے عرب کا کایا پلٹ دی تھی اسے صرف ایسی تلاوت تک محدود نہ رکھو نہ خود سمجھ سکو نہ اپنی اولاد کو اس کا مفہوم

سکو ۔ یاد رکھو اگر اب بھی تم نے قرآنِ مجید کی طرف سے یہی غفلت روا رکھی تو پھر کبھی وہ مقام حاصل نہ کر سکو گے جو عرب کے اُمیّوں نے قرآن سمجھ کر حاصل کر لیا تھا۔ اور دنیا کی امامت کے منصب پر فائز کر دیئے گئے تھے۔ آج اگر تم نے انہی کے نقشِ قدم کو اپنا لیا تو وہ دن دور نہیں کہ موجودہ دنیا کی امامت کا فریضہ بھی تمہارے سپرد کر دیا جائے گا۔۔

حمد

ترا ہی بحر، سفینہ رواں بھی تیرا ہے
بھنور بھی تیرے ہیں اور بادباں بھی تیرا ہے

ہے تیری بزم میں آخر کہاں جگہ میری
چراغ بھی ہیں ترے اور دھواں بھی تیرا ہے

مجھے تو نذر بھی کرنے کو کچھ نہیں اپنا
جبین کی خاک تری، آستاں بھی تیرا ہے

نقوشِ پا کو اٹھا کے کہاں کہاں جاؤں
کہ گردِ راہ بھی تیری، کارواں بھی تیرا ہے

دیا ہے کیوں مجھے لوح و قلم کا بارِ گراں
کہ گردشیں بھی تری، آسماں بھی تیرا ہے

بس اک کشاکشِ بے نام اور میں بے بس
نتیجہ بھی ہے ترا، امتحاں بھی تیرا ہے

میں تھک کے بیٹھ رہوں یا قدم بڑھا کے چلوں!
فنا بھی تری ہے، نام و نشاں بھی تیرا ہے

مظہر امام

اَلْحَمْدُ لِلّٰہ

ربِّ العالمین مالک یوم الدین سے

اول روز سے ہم کو یہ بتایا تھا کہ تم ہمیشہ ہر ایک حال اور اپنی ہر چال میں انبیاء علیہ السلام کے راستہ پر قائم رہنا اور مغضوب اور ضال قوموں سے بچے رہنا، مگر کیا یہ واقعہ نہیں کہ ہم نے اس کا الٹا کیا، یعنی انبیاء کے راستے کو چھوڑ کر مغضوب اور ضال قوموں کی راہوں کو اختیار کیا۔ اور آج بھی یہی حال ہے، آج مسلمانوں کی ہر جماعت خواہ وہ کسی ملک میں ہو اپنی ترقی و اصلاح اور سعادت کے لئے انبیاء علیہم السلام کی طرف نہیں بلکہ انہیں مغضوب اور ضال قوموں کی امامت کی اقتدار کے لئے بے قرار ہے

وضع قطع، تراش و خراش، صورت و سیرت، تعلیم و تربیت، تہذیب و تمدن، اخلاق و عادات، رفتار و گفتار تجارت و اقتصاد و معاملات، اور حکومت و سلطنت، غرض زندگی کے ہر شعبہ میں اس کا رخ انبیاء علیہم السلام کی طرف ہے؟ یا مغضوب و ضال قوموں کی طرف ہے؟ ہم زبان سے تو کہتے ہیں کہ منہ میرا طرف کعبہ شریف کے مگر رفتار کی سمت، لندن پیرس، ماسکو، برلن اور نیویارک ہے۔ زبان سے تو اپنی سعادت و ہدایت کو انبیاء علیہ السلام کی اور خصوصاً سرور کائنات احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں منحصر جانتے ہیں۔ مگر دل میں اپنی ترقی کا راز یورپ اور امریکہ کی پیروی میں منحصر مانتے ہیں۔ ہم میں سے بعضوں نے جو دانشمندی کے مدعی ہیں، دین اور دنیا کے دو حصے کر رکھے ہیں۔ اور دین پر انبیاء اور دنیا میں ان مغضوبوں اور گمراہوں کی پیروی کے داعی ہیں۔ لیکن دین و دنیا کی یہ تقسیم کی تاویل بھی انہی گمراہوں کی تعلیم کا اعادہ ہے، جنہوں نے اپنے آسمانی صحیفوں میں یہ لکھا پایا ہے کہ جو قیصر کا ہے قیصر کو دو، اور جو خدا کا ہے خدا کو دو، گویا وہ دو خداؤں کے قائل ہیں۔ قیصر جو دنیا پر حکومت کرتا ہے اور خدا جو آسمان پر فرمانروا ہے

علامہ سید سلیمان ندوی

اقبال اینڈ کمپنی جیولرس

فیشن ایبل باذوق خواتین کا اپنا پسندیدہ منفرد شوروم

دیدہ زیب • دلکش پائیدار طلائی، جڑاوی نقرئی زیورات کا واحد مرکز

آرڈر پر زیورات کی حسب دلخواہ تیاری کیلئے ہماری خدمات نہ بھولئے

یہاں سے زیورات واجبی داموں پر خرید فرمائیے

اقبال اینڈ کمپنی جیولرس

مصطفےٰ بازار

متصل دارالعلوم ہائی اسکول اندرون کالی کمان گلزار حوض حیدرآباد

فون نمبر دکان : 62186 فون نمبر مکان 24690

ہم قارئین "ذوقِ نظر" کی خدمت میں شب قدر کی پُرخلوص تہنیت پیش کرتے ہیں

میسرس
ایلورہ پائیل کارپٹ

پتلی بھون روڈ خیریت آباد حیدرآباد

فون نمبر: 87027

میسرس
ایلورہ پیسٹری

توپ کا سانچہ حیدرآباد

فون نمبر: 234872

سرورِ کونین کے حضور میں

آپؐ رونقِ عالم معدنِ صفا ہیں آپؐ — شمعِ بزمِ امکاں آپؐ روحِ ارتقا ہیں آپؐ
شاہِ دوسرا ہیں آپؐ صدرِ اصفیا ہیں آپؐ — آپؐ نازشِ ہستی فخرِ انبیاء ہیں آپؐ
آپؐ جانِ دو عالم جانِ کبریا ہیں آپؐ

مہرِ چرخِ اسریٰ آپؐ ماہِ تختِ ادنیٰ آپؐ — نقدِ گنجِ بے پایاں اور درِ یکتا آپؐ
شمعِ محفلِ ہستی صدرِ بزمِ عقبیٰ آپؐ — حرف و صوت ہے قرآن اور اسکے معنی آپؐ
خلقتِ دو عالم کا عینِ مدعا ہیں آپؐ

آپؐ انیسِ دل بھی ہیں اور جلیسِ جاں بھی ہیں — آپ سایۂ حق ہیں اور حق نشاں بھی ہیں
آپؐ فخرِ آدم ہیں آپؐ روحِ اعظم ہیں — سدرہ آپؐ کی منزل حق کے رازداں بھی ہیں
وجہِ کن فکاں ہیں آپؐ شاہِ ماسوا ہیں آپؐ

آپؐ کی محبت سے دل ہے میرا گنجینہ — آپؐ کی محبت میں خلد ہے میرا سینہ
آپؐ کے تصور میں کٹ رہے ہیں میرے دن — آپؐ کے تصور سے دل ہے میرا آئینہ
آپؐ واصلِ حق ہیں اور حق نما ہیں آپؐ

یاد آپؐ کی ایسی دل نواز و دلجو ہے — روح بھی شگفتہ ہے اور دل بھی اشک جو ہے
رخ دکھائیے اپنا دل اسیرِ گیسو ہے — چشمِ منتظر گویا میرا ہر بنِ مو ہے
اک جھلک ذرا دیکھوں حسنِ کبریا ہیں آپؐ

آپؐ کی عنایت ہی آخری سہارا ہے — اب تو آپؐ کا در ہے اور سر ہمارا ہے
جب تلک نہ سن لیں آپؐ اب یہ سر نہ اٹھے گا — لیے زبانِ دل رہ رہ کر آپؐ کو پکارا ہے
مدعائے ماہرؔ سے خوب آشنا ہیں آپؐ

محمد عبدالکریم ماہرؔ

قدیم شہر حیدرآباد کے میڈیکل شاپس میں ایک اور قابلِ اعتماد نام کا خوشگوار اضافہ

فرح میڈیکل ھال

کیمسٹس اینڈ ڈرگسٹ

جس کا افتتاح بحمداللہ ۸ رفروری ۱۹۱۷ء کو بدست عزت مآب عالیجناب یم۔ کے مبین میر عظیم تر حیدرآباد عمل میں آچکا ہے

ہماری اہم و نمایاں خصوصیات : ○ ملک کی مشہور و نیک نام کمپنیوں کا تازہ ترین اور قابلِ اطمینان ادویات کا اسٹاک ہر وقت دستیاب ہوسکتا ہے ○ واجبی دام پر ادویات کی فروخت ہمارا ماٹو ہے ○ ہر اتوار کو فرح میڈیکل ھال آپ کی خدمت

آپ کی سہولت کیلئے کھلا رہتا ہے

براہ کرم ہماری نیک نام خدمات سے استفادہ کرنا نہ بھولیئے

منجانب پروپرائٹر :
فرح میڈیکل ھال تالاب کٹہ میر محلہ حیدرآباد

بارگاہ نبوی کی مقبول و معروف ۱۱۵ سالہ قدیم و عظیم درس گاہ

جامعہ نظامیہ کی عطیات زکوٰۃ سے بھرپور اعانت کیجئے۔

جامعۂ ازہر کے بعد دنیا کی عظیم اور قدیم جامعہ جس سے ہزاروں علماء فضلاء اور صلحاء فارغ التحصیل ہو چکے ہیں۔ ہندوستان کی تمام ریاستوں اور دنیائے اسلام میں یہ اپنے علمائے دینی اور علمی کام انجام دے رہے ہیں۔ مستند علماء جید حفاظ اور دینی دعوتی کام کے مبلغین کا ایک تاریخ ساز ادارہ جامعہ نظامیہ اس کے مختلف پروگراموں کی تکمیل میں آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔ ذریعہ کارڈ یا فون ۲۱۷۷۲ ۵ پر آپ مطلع کریں تو کارکن گھر پر آکر وصولی کا کام انجام دیں گے۔ صدر مرکز جامعہ نظامیہ شبلی گنج میں ۹ تا ۶ بجے شام تک آپ عطیات جمع کرا سکتے ہیں۔ جامعہ نظامیہ شبلی گنج حیدرآباد ۲

تعلقہ نمبر 5 20772

سیرت النبیؐ بعد از وصال النبیؐ

اُن نیک بخت صاحب دل مسلمانوں کے خواب جنہوں نے حضور رحمت عالمؐ کی زیارت با برکت کی ہے!
حیات النبیؐ بعد از وصال النبیؐ" مرتبہ جناب محمد عبد المجید صاحب صدیقی ایڈوکیٹ ہائی کورٹ لاہور (پاکستان)
سے عوام الناس کے استفادہ کیلئے شکریہ کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔ امید کہ قارئین کرام اس سلسلہ کو پسند فرمائینگے۔

خواب نمبر (۲)

آپ نے عصائے مبارک سے خواب میں بنیاد کا نشان لگایا تاکہ مدرسہ کا صحن وسیع رہے صبح باقاعدہ نشان موجود تھا۔
آپ کی یہ دلچسپی سیرت النبیؐ بعد از وصال النبیؐ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

مدرسہ دارالعلوم دیوبند (بھارت) ایک الہامی مدرسہ ہے۔ ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۰ مئی ۱۸۶۶ء کو اس ادارے کا آغاز کیا گیا۔ زمین مل جانے کے بعد عمارت مدرسہ کے لئے بنیاد رکھدی گئی۔ جب وقت آیا کہ اُسے بھرا جائے اور اس پر عمارت تعمیر کی جائے تو مولانا رفیع الدینؒ مہتمم ثانی دارالعلوم دیوبند نے خواب دیکھا کہ اس زمین پر نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں۔ ہاتھ میں عصا ہے۔ آپ نے مولانا سے فرمایا یہ شمالی جانب جو بنیاد رکھدی گئی ہے۔ اس سے صحن مدرسہ چھوٹا اور تنگ رہیگا۔ اور آپؐ نے عصائے مبارک سے دس بیس گز شمال کی جانب ہٹ کر نشان لگایا۔ کہ بنیاد یہاں ہونا چاہیئے۔ تاکہ مدرسہ کا صحن وسیع رہے۔ (جہاں تک اب صحن کی لمبائی ہے) خواب دیکھنے کے بعد مولانا علی الصبح بنیادوں کے معائنہ کیلئے تشریف لے گئے تو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لگا ہوا نشان بدستور موجود پایا۔ اسی نشان پر بنیاد کھدوائی اور مدرسہ کی تعمیر شروع ہوگئی۔ (الہامی مدرسہ مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی مہتمم دارالعلوم دیوبند۔ یہ مضمون ماہنامہ "الرشید" لاہور کے دارالعلوم دیوبند نمبر۔ فروری۔ مارچ ۱۹۷۶ء جلد نمبر (۴) شمارہ نمبر (۲،۳) صفحہ ۱۳۸ تا ۱۳۹ پر موجود ہے)

شاعر انقلاب علامہ انور صابری نے اپنے ان اشعار میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

خواب میں جس کے بشر تھے شفیع دو جہاں ⁂ 'نودرہ' اس خواب ماضی کی حسین تعبیر ہے
اس کے دامن سے ابلتے ہیں وہ چشمے فیض کے ⁂ جن کا حاصل زندگی کی آخری تفسیر ہے

" اشرف عمارت " ۱۲۹۳ھ م ۱۸۷۶ء اس کی تعمیر کا مادہ تاریخ ہے اس عمارت کے دو درجے ہیں اور ہر ایک درجہ میں نو نو دروازے ہیں۔ اس لئے یہ عمارت "نودرہ" کے نام سے موسوم ہے۔

سید غوث الدین علیخان زاہد قادری

نعتِ شریف

راہِ نجات پائی ہے نورالہدیٰ کے ہاتھ
عرفانِ حق ملا ہے رسولِ خدا کے ہاتھ

وہ اولیاء کے ہاتھ ہوں یا انبیاء کے ہاتھ
پہنچا ہے سب کو فیض حبیبِ خدا کے ہاتھ

کیا شاہ کیا امیر کے اور کیا گدا کے ہاتھ
اُس کے نصیب جسکو وہ دے دیں اُٹھا کے ہاتھ

ہیں جبکہ سر پہ اُس شہِ مشکل کشا کے ہاتھ
کیا چھو سکیں گے اُسکو کسی بھی بلا کے ہاتھ

تخصیص ہے کوئی نہ ہے تفریق اِین و آں
سب کو نوازتے ہیں شہِ دوسرا کے ہاتھ

دشمن کے اور دوست کے حق میں ہیں یکساں
اُٹھے ہیں سب کے واسطے اُنکی دعا کے ہاتھ

پیروں میں پیر عرش کے مہمان کے ہیں پیر
ہاتھوں میں ہاتھ صاحبِ جود و سخا کے ہاتھ

زاہد خدا نصیب کرے وہ بھی دن مجھے
چوموں ادب سے ناز سے خیرالوریٰ کے ہاتھ

محترمہ رفیع رؤف
صدر شعبۂ اردو۔ نظام کالج
عثمانیہ یونیورسٹی

ماہِ رمضان ۔ اسلام کی فصلِ بہار

عصری علوم جس تیزی کے ساتھ انسان اور اس کے مقاصد کو نکتۂ ارتکاز پر لا رہے ہیں ۔ اسی شدت کے ساتھ ہمیں احساس ہوتا جا رہا ہے کہ قرآن مجید کو حکمت کی کتاب کیوں کہا گیا ہے ۔ اس کا ہر پیغام حکمت و فلسفہ سے لبریز ہے ۔ اسلام کے صرف بنیادی ارکان ہی پر غور کریں ۔ تو اندازہ ہوگا کہ عقیدۂ توحید، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج ان سب میں عالمی اجتماعیت، مرکزیت اور اخوت کی روح کارفرما ہے ۔

اسلام سے پہلے کی شریعتیں مقامی ہوتی تھیں جو چند قوموں اور قبائل تک محدود رہی ہیں ۔ مثلاً قوم عاد، قوم ثمود اور بنی اسرائیل وغیرہ ۔ قرآن مجید ایسے وقت میں بنی نوع آدم کی رہبری کے لئے آیا جب عمرانی تاریخ سن بلوغ کو پہنچ چکی تھی ۔ انسانی ذہن افہام و تفہیم کے لئے کسی پیکرِ محسوس کا خوگر نہیں رہا ۔ اس کی قوت تسخیرِ انفس و آفاق کی پہنائیوں کو اپنی گرفت میں لینے کے لیے پر تول رہی تھی ۔ ایسے آفاقی انسان کے منصب و مقام کے تعین کے لئے ایک ایسا لائحہ عمل بھی ضروری تھا ۔ جو یونیورسل نوعیت کا ہو ۔ یعنی اب ایسی شریعت اور ضابطۂ حیات کی ضرورت تھی جو جغرافیائی، نسلی اور قومی حد بندیوں سے ماورا ہو ۔

چنانچہ قرآنی احکام کچھ ایسی حکمت پر مبنی تھے جو ہر دور، ہر زمانے اور مقام کے تقاضوں کی قیامت تک تکمیل کرسکتے ہیں ۔ اور اسی بناء پر ہم کہہ سکتے ہیں ۔ کہ اسلام دنیا کا وہ آخری اور اکمل ترین مذہب ہے جس میں دنیا کی تمام الہامی کتابوں اور ان کی تعلیمات کا احاطہ کر لیا گیا ہے ۔ اس پر زبان سے اقرار کرنا اور دل سے ایمان لانا ہر مسلمان کا فرض ہے ۔ یقین محکم اور عمل پیہم ہی اسلام کی بنیادی تعلیم ہے ۔ اسلام میں تشکیک کے لئے کوئی گنجائش نہیں ۔ تشکیک صراطِ مستقیم سے ڈگمگا دیتی ہے ۔ قرآن کی اولین تعلیم یہی ہے ۔ کہ ایمان لاؤ اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر (ان تمام رسولوں پر جو حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آخر الزماں ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم تک دنیا کے ہر خطے میں وقتاً فوقتاً بھیجے گئے ہیں ۔

اسی قرآن میں ہدایت بھی ملتی ہے ان تمام عبادت گاہوں کا احترام کرو جہاں خدا کا ذکر کیا جاتا ہے ۔ اسی کے نام کی مالا جپی جاتی ہے

ان تعلیمات کی روشنی میں اسلام کے اولین رکن یعنی عقیدۂ توحید کے فلسفہ پر غور کیجئے تو اندازہ ہوگا کہ اگر آج کی منتشر و پارہ پارہ انسانیت کی شیرازہ بندی ہوسکتی ہے تو صرف اسی عقیدۂ توحید کی مدد سے ۔ یعنی اگر ساری

انسانیت کو بلا امتیاز رنگ و نسل طبقہ و قوم ایک رشتہ میں پروتا ہے تو اس کے لئے ایک خدا، ایک کتاب، ایک رشتہ ایک کنبہ برادری پیغام حق لانے والے پر ایمان سے بہتر اور کوئی تعلیم نہیں ہو سکتی۔

نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطبۂ حجۃ الوداع کے موقع پر کس بلاغت کے ساتھ ارشاد فرمایا تھا کہ۔ آج سے کسی گورے کو کسی کالے پر اور کسی کالے کو کسی گورے پر، کسی عجمی کو کسی عربی پر یا کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فوقیت نہیں تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔

عقیدہ توحید کے بعد اسلام کے چار اہم ارکان یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے احکام پر غور کیجئے۔ یہ صرف رسمی عبادتوں کے نام نہیں بلکہ ان کے ذریعہ عالمی سطح پر بنی نوع آدم کو سخت ڈسپلن کا پابند کیا گیا ہے۔ ان ارکان اربعہ میں سے ہر رکن ایک انفرادی فرض ہے مگر اجتماعی تقاضوں سے مربوط ہے نماز ہی کو لیجئے۔ طہارت، پاکیزگی، حضوری قلب کمال خشوع و خضوع، بے ریا عبادت، ذکر الٰہی، مناجات و دعا یہ سب انفرادی عمل ہیں۔ لیکن اجتماعی تقاضوں سے اس طرح مربوط ہیں۔ کہ ہر مسلمان مرد کے لئے مسجد کی حاضری لازمی ہے جہاں انسان اپنے پڑوسیوں اور محلہ والوں سے متعارف ہو سکتا ہے۔ ایک دوسرے کے درد و غم سے واقف ہو سکتا ہے۔ اور ایک دوسرے کی مدد کر سکتا ہے۔ صف بندی میں بھی ایک سپاہیانہ ڈسپلن کی شان نظر آتی ہے۔ جس طرح خدا کے حضور دوش بدوش اور شانہ بہ شانہ کھڑے ہوئے ہیں۔ اسی طرح ہم دنیاوی معاملات میں بھی اسی طرح ایک دوسرے سے کندھے سے کندھا ملا کر چلینگے۔ نفاق اور نفرت کو پاس بھی پھٹکنے نہ دیں گے۔ ایک امام کی قیادت کو دل سے تسلیم کرنے کی عادت یوں ڈالی جاتی ہے کہ اس کے رکوع کے ساتھ ہمارا رکوع اور اس کے سجدے کے ساتھ ہمارا سجدہ لازمی ہے۔ امام کی اتباع میں بھی اتحاد و اخوت کی روح کارفرما ہے۔ مناجات اور دعا میں بھی اجتماعی دعاؤں کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ ایسی سینکڑوں برکتیں اور رحمتیں ہیں جو اللہ کے بندوں کو مسجد کی نمازوں کے طفیل حاصل ہوتی ہیں۔

اسی طرح روزہ اور زکوٰۃ کو لیجئے۔ ضبط نفس، تزکیہ باطن، قوت برداشت، صبر و تحمل، ایثار و قربانی، رحم و کرم، جود و سخا، خوف الٰہی، خدا ترسی، خلوص و محبت بے لوث جذبہ خدمت خلق اور بے ریا عبادت جیسی اعلیٰ اخلاقی قدروں سے ان عبادات کو اس طرح مربوط کر دیا گیا ہے کہ ان میں اسلامی تعلیمات کی روح پوری جلوہ گر نظر آتی ہے زکوٰۃ اسلام کے معاشی نظام کا ایک اہم ستون ہے۔ تنگدستی، مفلسی اور ناداری جیسے عالمی نوعیت کے مسائل کا حل آج متمدن اور ترقی یافتہ ممالک بھی پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ اسلام نے ہر دولت مند اور مالدار شخص کی انفرادی ذمہ داری زکوٰۃ کی ادائی کی شکل میں قرار دے کر مسئلہ کو کس آسانی کے ساتھ حل کر دیا اگر آج معاشرہ کا ہر فرد پوری دیانت داری اور خلوص کے ساتھ سال میں ایک بار اپنے مال کی زکوٰۃ نکالے

اور اس کو غریبوں، ناداروں، محتاجوں، مسکینوں اور ضرورت مندوں میں تقسیم کرنے سے تہذیباً یا فتہ یہ کئی معاشی اور معاشرتی مسائل خود بخود حل ہو جائیں۔ پھر اسلام نے زکوٰۃ کے علاوہ صدقہ خیرات اور حسن سلوک کی بھی تعلیم دی ہے۔ یہ دراصل امداد باہمی کی مختلف صورتیں ہیں جن سے ایک ضرورت مند انسان اپنی عزت نفس کے احترام کے ساتھ فیض یاب ہو سکتا ہے۔ یہ ایسی اعلیٰ اخلاقی قدریں ہیں جن سے دینے والا اور لینے والا دونوں بارگاہ الٰہی میں معتبر، معزز اور خدا کے مقرب بندے قرار پاتے ہیں اور جس کا عمل ہو بے غرض اس کی جزا کچھ اور ہے۔

روزہ و حج تو وہ اہم اسلامی عبادات ہیں جو انسان کو احسن التقویم کے درجہ پر پہنچا دیتے ہیں۔ زکوٰۃ اور روزہ سال میں ایک بار فرض کیے گئے ہیں۔ جبکہ حج زندگی بھر میں ایک بار اگر استطاعت ہو تو ادا کرے۔ یہ وہ ارکان اسلام ہیں جن میں بندہ تسلیم رضا کا پیکر بن جاتا ہے۔ عبودیت و بندگی عشق کے درجہ کو حاصل کر لیتی ہے۔ روزہ اگر عشق کا امتحان ہے تو حج پیغام وصل ہے۔ اسلامی مرکزیت کی شان یہاں پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر نظر آئے گی۔ لبیک اللّٰھم لبیک کی گونج سے تمام ارض و سما کی فضاؤں کو وجد آفریں دیکھیے۔ کوسوں اس کی اور رکوع اور سجدہ ہر ہر گام کیا کی عملی تفسیر دیکھنا ہو تو عشاق کے ان قافلوں کو دیکھیے جو احرام باندھے ہوئے اللہ کے گھر کی طرف رواں دواں ہیں۔

یہ خانہ کعبہ دراصل ہدایت و ارشاد، روحانیت و للہیت، طمانیت و سکینت کا ایک مستقل و ابدی مرکز ہے۔

سارا عالم اسلام ہر سال یہاں جمع ہو کر اپنی محبت و اطاعت، تسلیم و انقیاد کا خراج ادا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس معبودیت اور اس رکن رکین کیساتھ اپنی گہری وابستگی کا ثبوت دیتا ہے۔ دنیا کے بڑے سے بڑے فضلاء علماء بادشاہ وامرا، اغنیاء و فقراء، سیاست داں اور حکمراں عشق و محبت اور جوش و وارفتگی کے ساتھ اس کا طواف کرتے ہیں لیکن فہم و بصیرت اور احساس و شعور کیساتھ اس کا عملی ثبوت بھی دیتے ہیں کہ وہ اختلاف کے باوجود متحد، تنوع کے باوجود ہم رنگ و ہم خیال، انتشار کے باوجود شانہ بشانہ اور صف بہ صف، فقر کے باوجود غنی اور ضعف کے باوجود قوی ہیں۔ مختلف نسلوں اور مختلف قوموں سے تعلق رکھتے ہیں اور متنوع تہذیبوں اور ثقافتوں سے وابستہ ہیں تاہم ایک خاص نقطہ پر پہنچ کر وہ سب ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔ اور ایک ہو جاتے ہیں۔

حج ملت کا ایک ایسا سالانہ اجتماع ہے۔ جس کی بدولت یہ عظیم اور لافانی امت اس ابراہیمی ذوق و مزاج کی اب بھی حامل ہے۔ جس کو ہم پرسوز و درد مند، مومنانہ و عاشقانہ جیسے الفاظ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس نے اس ورثہ کو اپنی آئندہ نسلوں تک بحفاظت پہنچانے کا کام ... رکھا ہے۔ اور اس لحاظ سے حج ایک ایسے زندہ طاقتور اور دھڑکتے ہوئے دل کی طرح ہے۔ جو امت کی رگوں میں برابر تازہ خون تقسیم کرتا رہتا ہے۔ پھر دیار حبیب کی زیارت اور مسجد نبوی کی عبادت اس حج کے طفیل میں نصیب ہوتی ہے۔

آج کی پستی نصیب قوم پر یہ خدا کا کرم رہا ہے کہ ... ایک بار ہی سہی، ماہ رمضان المبارک کی

برکتوں کے طفیل ان میں بھی ایمانی روح عود کر آتی ہے جو ہر مسلمان کا طرۂ امتیاز ہونا چاہئیے۔ ماہ رمضان ہی وہ مبارک مہینہ ہے۔ جس میں نماز، روزہ اور زکوٰۃ جیسے اہم اسلامی ارکان ایک ساتھ ادا کیے جاتے ہیں اور اسی مہینے کے دوران اسلامی تعلیمات کی برکتوں کے پرتو کو ہم بہ یک وقت روزہ دار مسلمانوں میں دیکھ سکتے ہیں۔

ماہِ رمضان المبارک اسلامی معاشرے میں کئی اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے یہی وہ مبارک مہینہ ہے۔ جس میں قرآن مجید نازل ہوا یہی وہ متبرک مہینہ ہے جس میں روزے فرض کیے گئے۔ اس مقدس مہینے کے آخری دہے میں شب قدر جیسی برکتوں والی رات تلاش کی جاتی ہے۔

اسی مہینے میں اسلام کے تین اہم فرائض یعنی نماز، روزہ اور زکوٰۃ کا ایک ساتھ صدقِ دل سے اہتمام کیا جاتا ہے۔ گویا رمضان کا مہینہ اسلامی ... ہے، موسم گل ہے۔ جہاں زیست کی ڈالی ڈالی پر رحمتوں کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔

دیکھنا تو یہ ہے کہ کون کون ان پھولوں سے اپنا دامن بھرتا ہے اور کون تہی دست اور تہی داماں رہ جاتا ہے ایسے موقع کے لئے اقبال کا مشورہ ہے کہ

"دل اگر میں ہو تو اور دامن دراز ہو جا"

روزہ نفس کی پاکیزگی ہے، زکوٰۃ مال کی پاکیزگی، تلاوت قرآن مجید روح کی غذا اور نماز مومن کی معراج — یعنی زہد و تقویٰ، خدمت خلق، ذکر و تلاوت اور عبادت ان تمام نیکیوں نے مل کر ماہِ رمضان کو اعمال صالح کا جشنِ عام کا زمانہ بنا دیا ہے۔

جس میں مشرق و مغرب کے تمام مسلمان، عالم و جاہل، امیر و فقیر ہر طبقہ اور ہر گروہ کے لوگ ایک دوسرے کے شریک و رفیق ہمدم و دمساز نظر آتے ہیں۔

ہر گاؤں اور ہر دیہات میں ماہِ رمضان کا چاند نیکیوں کی نوید بن کر آتا ہے۔ امیر کا محل ہو کہ غریب کی کٹیا اس کا جلوہ یکساں نظر آئے گا۔ ہر وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے نظر عطا کی ہو۔ عالم اسلام کے وسیع و عریض رقبہ میں ہر جگہ اس کے جلال و جمال کا مشاہدہ خود کر سکتا ہے۔ شب بیداری ہو کہ سحر خیزی، طعام سحری ہو کہ افطار روزہ، نماز تراویح ہو کہ گوشہ ... کی عبادتیں ہوں کہ شب کی ریاضتیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پورے اسلامی معاشرے پر نورانیت اور سکینت کا ایک وسیع شامیانہ سایہ فگن ہے۔ غرض اسی عالمی کیفیت کے سبب ایسی سازگار اور خوشگوار فضا پیدا ہو جاتی ہے۔

جس میں روزہ داروں کا ... معلوم ہوتا ہے ... بڑھ جاتے ہیں۔ کتنے فتنوں اور کدورتوں سے پاک ہو جاتے ہیں۔ نفس کی خباثتیں ... جاتی ہیں۔ طبیعت ... اور تواضع آجاتی ہے، گنہگار سے گنہگار کے دل میں بھی خوف خدا پیدا

ہوتا ہے ۔ سرکش سے سرکش انسان بھی خدا کی بارگاہ میں جھک جاتا ہے، توبہ و استغفار کرتا ہے ۔ گریہ وزاری کے ساتھ اپنی خطاؤں پر شرمسار ہوتا ہے ۔ غرض انسان کی بہیمانہ سرشت پر ملوکیت غلبہ پالیتی ہے اور روزہ دار عبودیت اور نیازمندی کے اس ارفع و اعلیٰ مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں وہ بڑے ناز سے کہہ سکتا ہے ؎

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزومندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

یہ ماہِ صیام ہی کا طفیل ہے کہ لوگ عبادتوں، طاعتوں، ہمدردی اور غمخواری کے مختلف کاموں کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ رمضان المبارک کے اختتام پر عید کا دن بھی ایثار و ہمدردی کے جذبہ اور عمل سے خالی نہیں رہتا ۔

کیونکہ عید کی نماز اور دعائیں مقبول بارگاہ ہو ہی نہیں سکتیں جب تک ہر مسکین محتاج کے خالی دامن گیہوں یا جَو سے نہ بھر دیئے جائیں جس کو شریعت کی اصطلاح میں فطرہ کہتے ہیں اور اسی مناسبت سے رمضان کی عید کو عیدالفطر کا نام دیا گیا ہے

اسلام کا اصلاحی کردار اسلامی تہواروں میں بھی ملتا ہے ۔ ملت اسلامیہ کے اصل تہوار تو صرف دو ہیں ایک عیدالفطر اور دوسرے عیدالاضحیٰ ۔ دنیا کی دیگر قوموں کے تہواروں سے موازنہ کیجیئے تو معلوم ہوگا کہ ان تہواروں میں بھی اسلامی اسپرٹ کو برقرار رکھا گیا ہے ۔ یعنی یہ تہوار خدا کی نعمتوں کا شکرانہ ہیں ۔ ناچ رنگ، لہو و لعب، شور و غل، شراب و کباب جیسی لغویات کی بالکل مناہی کردی گئی ہے ۔ ان کو شیطانی مشاغل کہہ کر گناہ قرار دیا گیا ہے ۔ اس طرح ان افعال کے نتیجے میں سرزد ہونے والی برائیوں کا سدباب کردیا گیا اور تقویٰ و پرہیزگاری کی تعلیم بھی دی گئی ۔

ظاہری شان و نمود و نمائش کو بھی ناپسندیدہ قرار دیا گیا تاکہ روزہ دار غرور و تکبر جیسی برائیوں سے محفوظ رہیں ۔

چنانچہ ان تہواروں میں سادگی، انکساری، متانت آمیز سنجیدگی کی ایک نرالی شان ہوتی ہے ۔ لوگ عیدگاہ جاتے ہوئے بھی راستے میں خدا کی حمد اور اس کی تسبیح و تحمید میں منہمک رہتے ۔ اس کی بزرگی اور بڑائی کے گن گاتے ہوئے بارگاہ الٰہی میں حاضر ہوتے ہیں ۔

اور ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں جمع ہونے کے باوجود ڈسپلن اور نظم و ضبط کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے ۔ ہر شخص کو اپنی استطاعت کے مطابق اچھے سے اچھا لباس پہننے کی اجاز [illegible] ہے ۔ اس لیے کہ یہ بھی اظہار نعمت اور شکرگزاری کا طریقہ ہے ۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس مہینہ کا ابتدائی حصہ رحمت، درمیانی حصہ باعث مغفرت اور آخری حصہ نار جہنم سے آزادی کا ہے ۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہے کہ "اَلصَّوْمُ جُنَّۃٌ" یعنی روزہ ڈھال ہے ۔ اس بلیغ حدیث کی تہہ میں معنی و مفہوم کا وسیع سمندر ہے ۔ صاحب بصیرت ہی اس کو خوب سمجھ سکتے ہیں ۔

روزے کا حکم ہجرت کے دوسرے سال سورۂ بقر کی آیت [illegible] میں آیا ہے اور حضور اکرم صلعم نے اس حکم سے

تشریف لے جانے تک کل نو رمضان کے روزے رکھے۔

حضرت ابوہریرہ رض سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس مہینہ میں ابنِ آدم کا ہر عمل کئی گناہ بڑھادیا جاتا ہے۔ اور نیکی دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک بڑھادی جاتی ہے۔ روزہ دار کے لیے دو خوشیاں ہیں۔ ایک افطار کے وقت اور ایک اپنے رب سے ملاقات کے وقت۔ یعنی وقت افطار کو دیدارِ الٰہی کے ہم رتبہ قرار دیا گیا ہے اس سے بڑھ کر روزہ دار کی خوش قسمتی کیا ہو سکتی ہے۔ روزہ دار کی دلجوئی خود خداوند کریم فرماتے ہیں۔ ارشاد ربانی ہے کہ روزہ دار کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے زیادہ اچھی ہے۔

زید بن خالد الجہنی سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلعم نے فرمایا کہ جو روزہ دار کو افطار کرائے اس کو روزے دار کے برابر اجر ملے گا۔ اور روزے دار کے اجر میں کمی نہ کی جائے گی۔

روزے کے آداب میں ایک یہ بھی ہے کہ افطار کے وقت حلال غذا میں بھی احتیاط سے کام لے۔ اور اتنا نہ کھائے کہ اس کے بعد گنجائش ہی باقی نہ رہے۔ اس لیے کہ حلق تک بھرے ہوئے پیٹ سے بڑھ کر مبغوض اللہ کے نزدیک کوئی بھری جانے والی چیز نہیں۔ اگر کوئی دن بھر کا حساب لگا کر ایک ہی وقت کھائے تو اس سے وہ تقویٰ حاصل نہ ہوگا۔ جو روزے کا مقصد ہے۔

سحری کرنا سنت رسول اکرم صلعم ہے۔ حضرت انس بن مالک رض نبی کریم صلعم سے روایت کرتے ہیں کہ "سحری کھاؤ اس لیے کہ سحری میں برکت ہے"۔ حضرت عمرو بن العاص حضور اکرم صلعم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا "ہمارے اور اہل کتاب کے روزے میں فرق صرف اسی سحری کا ہے"۔ سحری کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے غذا کے علاوہ میں شب بیداری اور سحر خیزی کی عادت بھی پیدا ہوتی جو خدا کو بہت محبوب ہے۔

نماز تراویح روزہ دار کے ذوقِ عبادت اور شوقِ حضوری کی علامت ہے۔ اسی طرح اعتکاف رمضان کے فوائد اور مقاصد کی تکمیل کے لیے ہے۔ اعتکاف دراصل حضوریٔ قلب کے ساتھ اللہ سے وابستگی کا ذریعہ ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رض سے مروی ہے کہ نبی کریم صلعم رمضان کے آخر عشرہ میں ضرور اعتکاف فرماتے تھے۔ اعتکاف یکسوئی کے ساتھ شبِ قدر کو پانے کا بھی ایک وسیلہ ہے۔ نبی کریم صلعم کا ارشاد ہے کہ شب قدر میں جو ایمان و احتساب کیساتھ عبادت کرے گا۔ اس کے پچھلے گناہ (بجز گناہ کبیرہ کے) معاف کر دیے جائینگے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رض سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ شب قدر رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں تلاش کرو۔ اور یہ بھی فرماتی ہیں کہ "جب رمضان کا آخری عشرہ شروع ہوتا تو رسول اکرم صلعم پوری رات بیدار رہتے اور اپنے گھر والوں کو بھی جگاتے تھے اور کمر کس لیتے تھے۔ شب قدر کی فضیلت کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ قرآن میں ایک سورۃ اسی نام سے ہے اور جس میں اس رات عبادت کو ہزار راتوں

کی عبادت کے مساوی قرار دیا گیا ۔ جبرئیل علیہ السلام اور دیگر فرشتوں کے نزول کی اور رحمتوں اور برکتوں کی بارش کی بھی بشارت دی گئی ہے غرض ان تمام عبادتوں نے روزہ دار کو تقدس ' پاکیزگی اور خدا کے ہاں بلند مرتبہ کی ایک خاص فضا سے گھیر دیا ہے ۔

روزہ اور قرآن کے درمیان بہت گہرا تعلق اور خصوصی مناسبت ہے ۔ اور اسی لیے نبی کریم صلعم رمضان میں تلاوت قرآن مجید کا زیادہ سے زیادہ اہتمام فرماتے تھے ۔ حضرت ابن عباس رض سے مروی ہے کہ جبرئیل علیہ السلام رمضان کی ہر رات آپ کے پاس آتے اور قرآن مجید کا دور کرتے اس وقت جب جبرئیل آپ سے ملتے تو آپ سخاوت وادودہش اور نیکی کے کاموں میں تیز نظر آتے ۔

یہاں یہ بات خاص طور پر غور کرنے کی ہے کہ روزے کے ساتھ قرآن مجید کی کثرت سے تلاوت کا مقصد کیا ہے ۔ مقصد یہ ہے کہ روزہ انسان کو تزکیہ نفس عطا کرتا ہے اور اس کے دل کو آلودگیوں سے پاک کرتا ہے ایسے عالم میں قرآن مجید کی تلاوت انسان کو عرفان و آگہی عطا کرتی ہے ۔

یہی عرفان و آگہی ، قربِ الٰہی کا باعث بن سکتی ہے ۔ لیکن مسلمان کو یہ مقام اسی وقت مل سکتا ہے جب وہ قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھے ۔

قرآن مجید خدائے تعالیٰ کی وہ آخری کتاب ہے جسے تمام صحف سماوی میں افضل ترین اور اکمل ترین قرار دیا گیا ہے جسے ام الکتاب کہا جاتا ہے جو حیات انسانی کے ہر شعبہ پر محیط ہے اور جس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لے رکھا ہے ۔ چنانچہ یہ فخر تمام اقوام عالم میں صرف مسلمانوں کو حاصل ہے کہ ان کی مقدس کتاب چودہ سو سال گزر جانے پر بھی اصلی حالت میں محفوظ ہے اور اب تک ایک لفظ تو درکنار ایک حرف ایک نقطے کی بھی تبدیلی نہیں ہوئی ۔ اس کی روشن اور واضح آیتوں کی بنا پر قرآن کو کتاب مبین ، قرآن العظیم ، قرآن الحکیم کے خطابات سے نوازا گیا ہے ۔ اس کی مخاطب یوں تو تمام اولاد آدم ہے لیکن اسلام قبول کر لینے کے بعد مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں سے خصوصی خطاب ہے ۔ موضوعات کے اعتبار سے بھی قرآن مجید مکمل ترین کتاب ہے یعنی مذہبی ، سماجی ، سیاسی ، معاشرتی ، معاشی غرض آداب بندگی سے لے کر آئینِ جہاں بانی و جہاں داری کے موضوعات بھی اس میں شامل ہیں ۔ حیات انسانی ہو کہ نظام کائنات ، ارض و سموات کا تمام علم اس کے احاطہ و بیان میں آگیا ہے ۔ دنیا کو اس بات پر حیرت ہے کہ تسخیر شمس و قمر کے امکانات سے انسان کو آج سے چودہ سو سال پہلے ہی واقف کروا دیا گیا ۔ معراج نبوی صلعم کا معجزہ عصر حاضر کے خلائی انسان کی تگ و دو کے لیے تقویت کا باعث ثابت ہوا ہے ۔

نماز اور روزے کی طرح قرآن مجید کی تلاوت کے بھی آداب ہیں اور ان میں اہم ترین یہ ہے کہ قرآن سمجھ کر پڑھیں اور اس بات پر غور کریں کہ قرآن نے جس انسان کا تصور پیش کیا ہے ۔ اس کی عملی صورت گری میں ہم کیا رول

ادا کرنا ہے ۔ قرآن اپنے قاری کو کس رنگ میں دیکھنا چاہتا ہے ۔ اس کا جواب قرآن مجید میں اس طرح ملے گا ۔

"صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ؕ

ترجمہ : کہدو ہم نے اللہ کا رنگ اختیار کر لیا ہے اور خدا سے بہتر رنگ کس کا ہو سکتا ہے ۔ اور ہم اسی کی عبادت کرنے والے ہیں ۔ اور اللہ کا رنگ اختیار کرنے کے لئے ماہِ صیام سے بہتر موقع اور کیا ہو سکتا ہے ۔ امام غزالی کے الفاظ میں " روزہ کا مقصد یہ ہے کہ آدمی اخلاق الٰہیہ میں سے ایک اخلاق کا پرتو اپنے اندر پیدا کرے جس کو صمدیت کہتے ہیں ۔ یہ بہت بڑا درجہ ہے جو کسی مسلمان اور مومن کو محض روزے کے وسیلے سے نصیب ہوتا ہے ۔

حضرت مجدد الف ثانی اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں " اگر اس مہینے کسی آدمی کو اعمال صالحہ کی توفیق مل جائے تو پورے سال یہ توفیق اس کے شامل حال رہیگی اور اگر یہ مہینہ بے دلی فکر و تردد اور انتشار کیساتھ گذرے تو پورا سال اسی حال میں گذرنے کا اندیشہ ہے ۔"

ارشاد نبوی صلعم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف وہ روزہ مقبول ہے جو ایمان و احتساب کے جذبہ کیساتھ رکھا جائے ۔ ایمان اور احتساب کی قوت بھی قرآن ہی سے مل سکتی ہے ۔ بقول اقبال ؎

قلب مومن را کتابش قوت است

حکمتش حبل الورید ملت است

قرآن مجید کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ تسکین دل بھی ہے ۔ قرآن مجید میں درد مند اور غمزدہ دل کی دلجوئی جس انداز سے کی گئی ہے اور اس کی مثال کسی اور مذہبی کتاب میں نہیں ملتی ۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کیلئے جو تسکین قلب و نظر بوئے پیرہن یوسف ؑ میں تھی وہی تسکین قلب امت محمدیؐ کے لیے تلاوت قرآن میں ہے صرف شرط اس بات کی ہے کہ ہم خود کو اس دامانِ رحمت سے صدقِ دل کیساتھ وابستہ کرلیں جس کو دامانِ رحمت اللعالمین ؐ کہا جاتا ہے خداوند کریم سے ہماری یہی دعا ہے کہ ملت اسلامیہ کا ہر فرد اپنے قول اور فعل میں ، گفتار اور کردار میں مجسم قرآن بن جائے یعنی خود کو خدا کے رنگ میں رنگ لے ۔ عہد رسالت ؐ کے مسلمانوں کا سچا نمونہ بن جائے تاکہ لوگ انھیں دیکھ کر بے اختیار ایمان لائیں کہ یہی مشیت ایزدی ہے ۔ ربِّ زِدنی علماً نافعاً رزقاً طیبہ وعمل مقبولاً ۔ آمین ثم آمین یارب العالمین ۔

کے مشہور و معروف ادیبوں اور شاعروں میں ہوتا ہے۔ ان کی اہم تصانیف میں گلِ رعنا، تذکرہ چمنستان شعراء [illegible] قابلِ ذکر ہے۔ شفیق کے کلام کا رنگ عاشقانہ تھا۔ نمونۂ کلام ملاحظہ کیجئے۔

شمع پر پروانہ جل کر راکھ ہو
عاشقی کا رنگ روشن کر گیا

جہاں میر کی غزلوں، سودا کے قصائد، خواجہ میر درد اور مصحفی کے صوفیانہ کلام، میر حسن کی مثنوی سحر البیان نے اردو شاعری میں ایک بانکپن پیدا کیا۔ وہیں سدا سکھ ستار لالہ کانجی مل صبا۔ راجہ جسونت سنگھ پروانہ۔ منشی موتی رام موجی نے نکھار پیدا کیا ہے۔ شیخ ناسخ اور آتش کے دور میں منشی خوب چند ذکا دہلوی۔ لکھنؤ میں پنڈت دیا شنکر نسیم حیدرآباد میں مہاراجہ چندو لال شادانؔ کی علمی خدمات قابلِ تحسین ہیں۔ ذکا نے اردو شاعری کا دامن عاشقانہ نصرت لطائف اور رعنائی سے بھر دیا ہے۔ پنڈت دیا شنکر نسیم آسمانِ ادب کے وہ درخشاں ستارے ہیں جس کی تابانی سے تاریخ اردو ادب ان کی مثنوی "گلزارِ نسیم" سے جگمگاتی رہے گی۔ نسیم کا یہ کارنامہ تاریخِ اردو ادب میں بلند مقام رکھتا ہے۔ ان کے زمانے میں لکھنؤ "پر بہار چمنستانِ سخن" بنا ہوا تھا۔ گلزارِ نسیم کی وجہ سے چمنستانِ نظم کو ایک شادابی اور بانکپن حاصل ہوا۔ مہاراجہ چندو لال شاداں نے حیدرآباد میں اردو شاعری کو پاکیزگی، متانت، تصوف اور معرفت کے موتیوں سے مالا مال کیا ہے۔ ان کے پوتے مہاراجہ سر کشن پرشاد شاد نے خصوصیت کے ساتھ اردو زبان و ادب کو پروان چڑھانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ایک ادیب کے خیال میں حیدرآباد میں اردو زبان و ادب کو سربلند کرنے میں جو عوامل کارفرما رہے ہیں اس میں بہت زیادہ طاقتور عامل مہاراجہ سر کشن پرشاد کی ادب نواز شخصیت ہے" ان کی اردو دوستی اور اردو نوازی کا یہ عالم تھا کہ ہندوستان کے مشہور و معروف ادیب شاعر و نقاد ان کے حلقہ احباب میں شامل تھے۔ مثال کے طور پر راجہ صاحب کے مراسم و تعلقات امیر مینائی۔ سرشار۔ داغ دہلوی۔ حالی۔ شبلی۔ اکبر الہ آبادی۔ شرر۔ نظم طباطبائی۔ علامہ اقبال۔ ماہر القادری، عبدالماجد دریاآبادی۔ اور مولوی عبدالحق سے تھے۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار اپنی تخلیق "فسانۂ آزاد" کی وجہ سے اردو ادب کی تاریخ میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ لیکن وہ ایک خوش گو شاعر بھی تھے۔ حیدرآباد دکن میں محی الدین زور نے راجہ گردھاری پرشاد باقی کے ادبی کارناموں کو سراہتے ہوئے فرمایا "ان کے [illegible] نے اردو شاعری کی ترقی میں اہم رول ادا کیا ہے"

جدید نظم نگاری کو رواج دینے میں جہاں آزاد اور حالی کا نام لیا جاتا ہے وہیں اہم منشی سورج نارائن مہر کو فراموش [illegible] مہر اردو کے ایک مایہ ناز شاعر تھے۔ ان کا [illegible] شہرت ہے۔ درگا سہائے سرور جہاں آبادی کا نام اردو شاعری میں ایک انفرادی شان کا حامل ہے۔ سرور کو شعر گوئی میں بڑا کمال حاصل تھا۔ انہوں نے اخلاقی، تاریخی، قومی، مذہبی اور نیچرل ہر طرح کی نظمیں لکھی ہیں۔ اردو ادب کے محسن رام بابو سکسینہ کے خیال میں "سرور کی شاعری جذبات نگاری [illegible] سے معمور ہے۔ پنڈت برج نارائن چکبست کا شمار اردو ادب کی ان مایہ ناز ہستیوں میں ہوتا ہے جن کے کارنامے سدا افق شاعری

محمد سرور علی افسر

اُردو زبان کے محسن غیر مسلم شعراء

"ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اُردو زبان کی تخلیق اور اس کی نشوونما ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی اتحاد و یکجہتی، خلوص و محبت کا نتیجہ ہے۔ اردو زبان کے خزانے کو مالا مال کرنے کا سہرا نہ صرف مسلمانوں بلکہ ہندوؤں کے سر بھی ہے چونکہ غیر مسلم شعراء اور ادیبوں نے چمنستانِ نظم کی آبیاری اور نثر کی گلکاری اپنے خون دجگر سے کی ہے۔

ڈاکٹر عبدالحق غیر مسلم شعراء کا ذکر فرماتے ہوئے کہتے ہیں کہ "ابتدائی زمانے میں اردو زبان اپنی ترقی و اشاعت کے لئے قریب قریب تمام تر غیر مسلم ادیبوں اور شاعروں کے مرہونِ منت رہی ہے" ان کے علاوہ متعدد ہندو راجاؤں اور رئیسوں نے بھی اپنی زندگی اُردو زبان کی سرپرستی اور آبیاری میں صرف کردی ہے۔ مثال کے طور پر مہاراجہ شتاب رائے ناظم بنگال و بہار کی اردو دوستی ضرب المثل ہے۔ اسی طرح حیدرآباد دکن میں مہاراجہ چندو لعل شاداںؔ اور مہاراجہ سرکشن پرشاد شادؔ اپنی علم دوستی، دریا دلی اور سخن پروری کے لئے مشہور ہے۔ اردو ادب کی اشاعت و تبلیغ میں منشی نول کشور کا نام نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور کی رائے میں "اردو کا پہلا ہوا باغ تنہا ایک باغبان کی محنت کا ثمرہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کی آبیاری مختلف مذہب والوں نے مل کر کی ہے" اس لئے اردو زبان ہندوستانیوں کا مشترکہ ورثہ ہے۔

اُردو ادب کی تاریخ میں جہاں مسلم ادیبوں شاعروں کے نام نظر آتے ہیں وہیں غیر مسلم شعراء کے نام بھی اپنی تابانی کا جلوہ دکھا رہے ہیں۔ گیان چند جین اپنی تحقیق کی روشنی میں اردو کے قدیم ترین ہندو شاعر چندر بھان برہمن کو قرار دیتے ہیں۔ ان کو نمایاں اہمیت حاصل ہے۔ کیوں کہ انہیں شہزادہ دارا شکوہ کے مشیر خاص بننے کا شرف حاصل تھا۔ آپ کو عربی فارسی اور ہندی میں کافی دسترس حاصل تھی۔ ان کے اشعار میں پہلا مصرع فارسی کا اور دوسرا مصرع اردو کا ہوا کرتا تھا۔ ان کے بعد رائے چند بھان برہمن کا نام آتا ہے جو مغلیہ سلطنت سے وابستہ تھے۔ اورنگ زیب کے زمانے تک نوازشاتِ شاہی سے فیض پاتے رہے دارا شکوہ کے قتل کے بعد بنارس چلے گئے اور وہیں سنہ ۱۶۶۲ء میں انتقال فرمایا۔ برہمن فارسی کے ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ مگر انہوں نے اردو میں بھی شاعری کی ہے۔ برہمن کے زمانے میں اردو غزل [illegible] اردو شاعری کو ابتدائی دور میں [illegible] لالہ ٹیک چند آفتاب [illegible] ہوا۔ مہاراجہ رام نارائن موزوںؔ، سیتا رام عمدہ، لالہ بالمکند حضورؔ، راجہ نول رائے وفاؔ، اور لچھمی نارائن شفیقؔ اورنگ آبادی کے ہے۔ شفیقؔ کا شمار سرزمین دکن

عابد قادری

نعتِ شریف

نہ جانے کب سے دل میں ہے ترے دیدار کی خواہش
کسی صورت نکل جائے دلِ بیمار کی خواہش

خدا ایسا کرے سرکارؐ مجھ کو یاد فرمالیں
مسلسل بس یہی ہے اس دلِ خوددار کی خواہش

صبا! تو روز جاتی ہے مدینہ کی زیارت کو
ذرا پہنچا دے آقاؐ تک اس دلِ بیمار کی خواہش

کہوں کیا کتنے سر جھکتے ہیں میرےؐ آستانے پر
نہ جانے اور کتنوں کو ہے اس دربار کی خواہش

"مری امت کی یا رب! مغفرت کا دے یقیں مجھ کو"
شبِ اسریٰ خدا سے تھی یہی سرکارؐ کی خواہش

"تری جنت کا کیا ہے کچھ نہیں، پہلے مدینہ دے"
خدایا! دیکھ تو اس طالعِ بیدار کی خواہش

دعا کیجے کہ عابد! خاتمہ بالخیر ہو اپنا
خدا پوری کرے سرکارؐ کے دیدار کی خواہش

پر آفتاب و مہتاب کی طرح جلوہ فگن رہیں گے۔ اُن کی نظم "خاکِ ھند" وطن کی محبت و عظمت کی ترجمان ہے۔

اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے
دریائے فیضِ الفت تیرے لیئے رواں ہے

تلوک چند محروم کا نام اُردو شاعری میں ایک نگینہ کی طرح جگمگا رہا ہے۔ "گنج معانی" محروم کا عظیم کارنامہ ہے۔ ہندو شعراء کی لکھی ہوئی مثنویوں میں گلزارِ نسیم کے بعد منشی جوالا پرشاد برق کی مثنوی "بہار" کو امتیاز حاصل ہے۔ سر سید احمد خاں ان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ "بوئے گل سے زیادہ دیمرباڑہ عہد"

صنفِ مرثیہ میں انیس اور دبیر کے دوش بدوش غیر مسلم شعرا منشی چھنو لال دلگیر، منشی کنور سین مضطر، راجہ الفت رائے وغیرہ نظر آتے ہیں۔ دلگیر نے انیس کی طرح مرثیہ گوئی میں انفرادی مقام حاصل کر لیا تھا۔ ان کے کلام کی خصوصیت سادگی اور روانی ہے۔ ایک شعر ملاحظہ کیجیئے:۔

کہنے لگی سکینہ۔ صغرا پکار کر
اٹھ کر پدر کے زانو سے آؤ ذرا ادھر

دورِ حاضر کے ہندو شعراء میں جوش ملسیانی، ہنس راج رہبر، عرش ملسیانی، ساحر ہوشیارپوری، گوپی ناتھ امن، پنڈت آنند نارائن مُلّا، بلراج کومل، کشمیری لال ذاکر، طالب شاہ آبادی، دینا ناتھ مست، منوہر لال ہادی، کرشن موہن، پرکاش تیواری، لبھت لعل لسنت، رگھوناتھ چودھری اوپندر ناتھ اشک، کالی چرن اثر، من موہن تلخ، دھرم پال عاقل، کنول پرشاد کنول اور نریش کمار شاد وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ فراق گورکھپوری کی شاعری میں بڑی رنگینی اور شادابی ہے ان کا کلام رعنائیت، جمالیت، سوز و گداز نغمگی اور رس سے بھرا ہوا ہے۔ انہوں نے اُردو شاعری کے بانکپن کو ہندی شاعری کے رس اور اس کی نرم آنچ کے حسین امتزاج سے معراجِ کمال پر پہنچا دیا ہے۔ اُردو شاعری سے ان کی وابستگی کا ثبوت ان کے ایک شعر سے لگایا جا سکتا ہے:

میری گھٹی میں پڑی ہے ہو کے حل اردو زباں
جو بھی میں کہتا گیا حسنِ بیاں بنتا گیا

منشی دیا نارائن نگم نے تقریباً ۴۰ سال سے اُردو زبان کے بے مثال رسالے "زمانہ" کے ذریعہ اردو شاعری کو تر و تازہ اور شاداب رکھا ہے۔

راجہ راجیشور راؤ اصغر بیک وقت شاعر، انشاء پرداز، مترجم، ماہرِ زبان اور نقاد بھی تھے۔ جن کی علم دوستی ناقابلِ فراموش ہے۔

جگن ناتھ آزاد کا شمار دورِ جدید کے نامور شعرا اور ادیبوں میں ہوتا ہے۔ ہند و پاک کے مقبول شاعر ہونے کے علاوہ انھوں نے نظم و نثر پر تقریباً (۲۵) کتابیں تصنیف کی ہیں۔ اُردو شاعری کے حُسن کو دوبالا کرنے کیلئے آپ نے مختلف ادبی جماعتوں کی دعوت پر بیرونِ ممالک کا سفر کیا ہے۔ "اقبالیات" آپ کا خاص موضوع ہے۔ زبان اُردو کے تعلق سے فرماتے ہیں:۔

میری زباں ہے نازشِ ہندوستان ہے تو
ثقافت کے ناز وال تمدن کی جان ہے تو

کالکتہ راجہ معانی کے عظیم شاعر کالیجی امیشور راؤ شاد دکنی جنھیں نظیر اکبرآبادی کی طرح عوامی رنگ تھا پسند ہے۔ آپکے کلام میں سادگی اور اثر آفرینی کے ساتھ ساتھ تہہ داری بھی ملتی ہے۔ آپکے تعلق سے ڈاکٹر مغنی تبسم فرماتے ہیں:۔ "آپکی ذات گنگا جمنی تہذیب کا مظہر ہے"۔ اردو شاعری کی نشو و نما و ارتقاء میں جہاں مُسلم شعرا کا بڑا معنوی حصہ رہا ہے وہیں غیر مسلم شعرا کی ادبی خدمت

غریباں کا درد لے کو محمدؐ مصطفیٰؐ آئے!

ایک ان پڑھ دیہاتی کا نذرانۂ عقیدت اپنے آقا کے حضور میں۔

کڑک ٹھرّے لگالے کو چلے آئے بڑے لوگاں
بڑا بڑپن کمالے کو چلے آئے بڑے لوگاں
سیچ دولت اُٹھالے کو چلے آئے بڑے لوگاں
نوی جنّت سجالے کو چلے آئے بڑے لوگاں

غریباں کا درد لے کو محمّدؐ مصطفےٰ آئے
ہمے بے آسرا تھے جی ہمارا آسرا آئے

تمہارا ناؤں میٹھا ہے میں میٹھے سب پکا دیوں گا
غریباں تمنّا پیارے تھے غریباں کو کھلا دیوں گا
تمہاری بھوک پو بچے مرے بھکے سلا دیوں گا

اندھارے گھپ اندھارے میں مرے بدرالدجیٰ آئے
لوے رستے ہوئے روشن چلو نورالہدیٰ آئے

چلے آؤ مرے مالک میں انکھیاں پو بٹھالیوں گا
یہ جلوہ کس کا جلوہ ہے زمانہ کو بتالیوں گا
کلیجہ چیرلے کو میں کلیجہ میں چھپالیوں گا
نبیؐ صاحب! میرے دل کو نبیؐ خانہ بنالیوں گا

تری صورت وہ صورت ہے کہ کرشن کو جیا آئے
ترا نقشہ وہ نقشہ ہے کہ بس یادِ خدا آئے

از سلیمان خطیب (مرحوم) گلبرگہ

مذہبِ اسلام میں عورت کا مقام

از: اطہر النسا بیگم
یم اے بی ایڈ.

مرد و زن وابستۂ یک دیگرند
کائنات شوق را صورت گرند

خدائے بزرگ و برتر کا لاکھ لاکھ شکر و احسان ہے کہ ہم مسلمان ہیں، ہمارا دین اسلام ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ہادی اور رہنما ہیں۔ قرآن پاک ہمارا دستورِ زندگی ہے۔ لیکن اِن تمام باتوں کو تسلیم کرنے کے بعد بھی ہماری زندگی اور ایک سچے مومن کی زندگی میں اتنا فرق کیوں ہے؟ ذرا سا غور کرنے کے بعد یہ حقیقت سمجھ میں آجاتی ہے کہ اس گراوٹ کے ذمہ دار ہمارے سماج اور رواج کی خامی ہے۔ جس طرح عورتیں روٹی اور کپڑے کا ذمہ دار مردوں کو سمجھتی ہیں اسی طرح دین کی پیروی کی ساری ذمہ داری بھی وہ صرف مردوں کے سر ڈالتی ہیں۔ وہ یہ فراموش کر بیٹھی ہیں کہ "دینِ حنیف" کے مخاطب جس طرح مرد ہیں بالکل اسی طرح عورتیں بھی ہیں۔ اگر کوئی عورت دین کو اختیار کرنے اور اس کو قائم کرنے میں کوتاہی کریگی تو خدا کے ہاں اس کی اسی طرح بازپرس ہوگی جس طرح مردوں سے ان کی کوتاہیوں پر ہوگی۔

قرآن شریف میں برابری کا تصور اتنا واضح ہے کہ جب بھی اللہ تعالیٰ نے ہدایتیں فرمائی ہیں اس کے مخاطب عورت اور مرد دونوں رہے ہیں۔ شروع سے آخر تک قرآن شریف میں طرزِ تخاطب دیکھیے تو ہمیشہ "یَا اَیُّھَا النَّاسُ" اے لوگوں! اور "یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا" اے لوگوں! جو ایمان لائے کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے۔ اسی طرح جہاں مسلمین کہا گیا ہے وہاں "مسلمات" "مومنین" کہا گیا تو "مومنات" کہا گیا۔ "صادقین" کہا گیا تو "صادقات" بھی کہا گیا، صالحین کے ساتھ صالحات وغیرہ وغیرہ۔

قرآن مجید کے اس طرزِ تخاطب کا ہم جب دوسرے مذاہب کے ساتھ موازنہ کرتے ہیں تو اس کی اہمیت اور بھی دوچند ہو جاتی ہے۔ اسلام کی یہی جمہوری اسپرٹ ہے جس نے عورت کو مرد کی غلامی سے نکالا اور اس کی قدر و منزلت بتائی۔ کمتری کا طوق نہیں پہنایا۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یورپی معاشرہ میں عورت کی حیثیت ہمارے مقابلے میں زیادہ ہے انھیں شاید یہ علم نہیں کہ رومن کیتھولک کلیساؤں کی عبادات میں اب تک صرف مرد کو مخاطب کیا جاتا تھا۔ لیکن ۱۹۷۵ء میں رومن کیتھولک چرچ کے بین الاقوامی

کمیشن کی مشاورتی کمیٹی نے ایک قرارداد منظور کی جس کے تحت پوپ سے درخواست کی گئی کہ وہ اس بات کی اجازت دیں کہ چرچ کی عبادت میں جہاں جہاں مرد کو مخاطب کیا گیا ہے وہاں مرد کے ساتھ ساتھ عورت کو بھی مخاطب کیا جائے۔ اس تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے ضروری ترمیم کی اجازت دی گئی۔ اور اب کلیساؤں میں مرد کے ساتھ ساتھ عورت کو بھی اس قابل سمجھا جائے گا کہ اسے بھی مخاطب کیا جائے۔ اسلام نے پہلے عورت کو یہ حیثیت آج سے زائد از چودہ سو سال پہلے بلا کسی جدوجہد کے عطا کردی تھی۔ بلکہ سچ پوچھئے تو اسلام نے جو حیثیت ہمیں روز اول سے عطا کی ہے یورپ کی عورت کو تو اس حیثیت کے حاصل کرنے کے لئے ابھی صدیوں اور جدوجہد کرنی ہوگی۔

سورۃ النساء کی ابتدائی آیات میں وہ مشہور آیات ہیں جو خطبۂ نکاح میں بھی پڑھی جاتی ہیں۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً ۚ

ارشادِ باری تعالیٰ ہے" اے لوگو! ڈرتے رہو اپنے رب سے جس نے پیدا کیا تم کو ایک جان سے اسی سے پیدا کیا اس کا جوڑا اور پھیلائے ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں"

مرد اور عورت دونوں کی تخلیق نفس واحد سے ہے اور دونوں کی اصل ایک ہے۔ تو پھر رتبہ میں فرق کیسا؟

اسی طرح بڑائی اور چھوٹائی کے لئے ہمیں سورہ حجرات کی تیرھویں آیات سے رجوع ہونا پڑے گا۔

اے لوگو! ہم نے تمہیں پیدا کیا ایک مرد اور ایک عورت سے تم کو مختلف قوموں اور خاندانوں میں تقسیم کیا تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرسکو"۔

بے شک اللہ کے نزدیک زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ بلند کردار ہے۔ جو جتنا صاحب کردار ہوگا اتنا ہی عزت کا مستحق ہوگا۔ اگر کوئی مرد کسی عورت سے زیادہ صاحب کردار ہو تو اس عورت سے افضل ہے۔ اسی طرح اگر کوئی عورت کسی مرد سے بلند کردار ہو تو قرآن کریم کی رو سے وہ عورت اس مرد سے یقیناً برتر ہے۔

جیسا کہ حضرت رابعہ بصریؒ اور حضرت بی بی فاطمہؓ خاتونِ جنت کا مرتبہ ہے۔ کہ وہ بڑے بڑے مردوں کو ارشاد و تلقین فرماتی تھیں۔

اب آپ ہی بتائیے کہ قرآن شریف کے اس واضح اور غیر مبہم معیارِ فضیلت کی موجودگی میں کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی مرد صرف اس بناء پر عورت سے افضل گردانا جائے کہ وہ مرد ہے؟ اور عورت صرف اس وجہ سے کمتر تصور کی جائے کہ وہ صرف عورت ہے۔ پس عدم مساوات کا تصور اسلام کی بنیادی فکر اور اس کی تعلیم کے مزاج ہی کے خلاف ہے

حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انتہائی واضح اور واشگاف الفاظ میں فرمایا ہے کہ " اسلام میں نہ تو کسی عربی کو عجمی پر فضیلت ہے نہ کسی گورے کو کالے پر بلکہ فضیلت کا معیار صرف اور صرف تقویٰ ہے۔"

ایک ایسے مذہب میں جہاں نہ رنگ نہ نسل نہ زبان نہ وطنیت اور نہ کوئی خصوصیت فضیلت کا باعث ہے اور جہاں صرف اعمال و کردار ہی انسان کی قدر و منزلت کا تعین کرتے ہیں۔ وہاں یہ کیسے ممکن ہے کہ جنس کی بنیاد پر تفریق روا ہو؟ ہاں اسلام سے قبل عرب معاشرے میں ایسی تفریق ضرور تھی۔ عورت کو مرد کے مقابلہ میں کمتر سمجھا جاتا تھا۔ بلکہ بیٹیوں کو زندہ دفنانے تک کی رسم تھی۔ صحیح بخاری میں حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل ہے کہ "مکہ میں ہم لوگ عورتوں کو بالکل ہیچ سمجھتے تھے۔ مدینہ میں نسبتاً ان کی قدر تھی۔ لیکن جب اسلام آیا اور خدا نے ان کے متعلق آیتیں نازل کیں تو ہم کو انکی قدر و منزلت معلوم ہوئی۔"

علامہ اقبالؒ نے قرآن مجید کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد کہا تھا۔

"نعوذ باللہ" اگر میں مسلمان نہ ہوتا اور قرآن کریم کو خدا کا کلام نہ سمجھتا تو اس کے پڑھنے کے بعد میں یہ کہتا کہ یہ کسی عظیم عورت کی تصنیف ہے۔ کیوں کہ اس میں جس قدر عورتوں کے حقوق کی بات کی گئی ہے دنیا کی کسی مذہبی کتاب میں نہیں کی گئی۔

علامہ اقبالؒ ہی پر کیا موقوف کوئی بھی شخص اگر قرآن مجید کا بغور مطالعہ کرے تو اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ قرآن نے عورت سے متعلق تمام متعصبانہ اور جاہلانہ نظریات کو یکسر مسترد کر کے ایک انقلابی فکر پیش کی ہے۔ یہاں تک کہ مغربی مفکرین نے سر چالس ایڈورڈ آرچیالڈ ہملٹن نے کہا ہے کہ "اسلام بتاتا ہے کہ انسان پیدائشی طور پر بے گناہ ہے وہ بتاتا ہے کہ مرد اور عورت دونوں ایک ہی جوہر سے پیدا ہوئے۔ دونوں کے اندر ایک ہی روح ہے۔ دونوں ذہنی، روحانی اور اخلاقی ترقی کی یکساں قابلیت رکھتے ہیں۔"

خداوند کریم نے قرآن پاک میں حکم دیا ہے کہ۔۔۔ "عورتوں کے حقوق مردوں پر ویسے ہی ہیں جیسے مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں۔" سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہی ارشاد فرمایا ہے جس کا خداوند قدوس نے حکم دیا ہے۔ آپؐ فرماتے ہیں۔

عورتیں مرد کا نصف ثانی ہیں۔ عورتوں کا حق ہر حال میں محترم ہے۔ نگرانی رکھو کہ عورتوں کو وہ ملتا رہے جو ان کو دیا گیا ہے۔ طلوع اسلام ...لوں کی یہ قدیم روایت بھی رد ہو چلی کہ وراثت کا حق دار وہی ہے جو برچھا چلاتا ہو۔ تلوار کے قبضہ کو پکڑنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو، کیوں کہ اسلام صنف نازک کا حمایتی بن کر ظاہر ... عورتوں کو یہ حق دیا کہ وہ اپنے سرپرستوں

آئیے! اب ذرا ہم دوسرے مذاہب اور دوسری قوموں کا ایک سرسری جائزہ لیں تو آپ کو بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ دوسرے مذاہب کی بہ نسبت ہمارے اسلام میں کتنی رعایت اور آزادی اور ان کے حقوق کا احترام ہے اور اُن کو کس قدر مقدس سمجھا گیا ہے۔

اسلام سے پہلے مختلف ادوار اور معاشروں میں عورت کو مختلف نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ مشرق میں عورت مرد کے دامنِ تقدس کا داغ رہی ہے۔ رُوما اس کو گھر کے اثاثے سے زیادہ حیثیت نہیں دیتا تھا۔ یونان اس کو شیطان سمجھتا رہا۔ یہود نے اسے لعنتِ ابدی کا مستحق گردانا اور نصاریٰ کے نزدیک یہ باغِ انسانیت کا کانٹا رہی ہے۔ بعض مذاہب نے عورتوں کے بارے میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ ان کا جسم انسانی روح سے خالی ہے۔ اس نقطہ نظر کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ اُسے انسانی حقوق سے محروم کر دیا گیا۔ ہندو مذہب میں عورت کی اپنی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔ وہ ایک ضمنی تخلیق ہے۔ جس کی ہمیشہ ایک ثانوی حیثیت رہی۔ حتیٰ کہ اس کی جان کی بھی یہ قیمت ہے کہ وہ کسی اور پر جان پر واری جائے۔ لیکن اسلام کا نقطۂ نظر ان سب سے جداگانہ اور انقلابی ہے۔

اسلام میں عورت مرد کی شریکِ کار ہے۔ مرد کی مساوی رتبہ کی تخلیق اور محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ میں "آبگینہ" ہے۔

اسلام میں عورت معاشرہ کی ایک فعال اور موثر قوت ہے عضوِ معطل ہرگز نہیں ہے۔

اگر ہم اسلاف کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہم کو معلوم ہو جائے گا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دعوتِ دین کا کام شروع فرمایا تو آپ کی دعوتِ دین پر "لبیک" کہنے والوں میں اولیت ایک خاتون کو حاصل ہے جو آپ کی عزیز اور محبوب بیوی تھیں جنہیں ہم حضرت خدیجۃ الکبریٰ رض کہتے ہیں۔ حالانکہ اس وقت اسلام پر لبیک کہنا اتنا آسان نہیں تھا۔ جیسا کہ آج ہمارے اور آپ کے لئے ہے۔ کیوں کہ ان دونوں اہلِ حق پر کونسی ایسی مصیبت نہ توڑی گئی ہوگی کہ سانٹوں پر گھسیٹے گئے تپتی ریت پر لٹائے گئے، گرم سلاخوں پر داغے گئے، ان تمام مصیبتوں کو مردوں کی طرح عورتوں نے بھی برداشت کیا لیکن ان کے پائے استقامت میں لغزش تک نہیں آئی

اسلامی تاریخ گواہ ہے کہ اسلام نے جتنی جنگیں لڑیں ان میں مردوں نے اگر تیر و خنجر چلائے اور زخم کھائے تو عورتوں نے پائینچے چڑھا کر زخمیوں کو پانی پلایا ان کی مرہم پٹی کی۔ اسلام کا اثر ان کے دلوں میں اس حد تک تھا کہ ان کی ساری محبت "لِلّٰہ" اور "فی اللہ" تھی۔ اُمہات المومنین رض اور صحابیات کرام رض نے وہ عظیم الشان کارنامے انجام دیئے ہیں۔ جو رہتی دنیا تک مسلمان عورت کے لیئے نہ صرف طمانیت و تقویت

سا باعث رہیں گے۔ بلکہ مسلسل ہدایات و رہنمائی کا
سرچشمہ بھی۔ ان عظیم مسلم خواتین نے میدان جنگ
میں زخمیوں کی تیمارداری اور مرہم پٹی ہی نہیں کی بلکہ
جنگ میں بھی بھرپور حصہ لیا۔ تلوار چلائی، وار روکے
زخم کھائے اور دشمنوں کو قتل کیا۔ اور یہ سب کچھ
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں ان
کی اجازت سے ہوا۔ حضرت اُم عمارہؓ نے جنگ
اُحد میں حضورؐ پر ابن قیمہ کا وار اپنی تلوار سے روکا اور
زخم کھایا۔ جنگ خندق میں حضرت صفیہؓ کا ایک
یہودی کو قتل کرنا، جنگ حنین میں حضرت اُم سلیمؓ
کا خنجر لے کر نکلنا اور جنگ یرموک میں حضرت
اسماء بنت ابوبکرؓ، حضرت ام اباںؓ، حضرت اُم حکیمؓ
حضرت خولہؓ، حضرت ہندؓ اور اُم المومنین حضرت
جویریہؓ کا بے جگری سے لڑنا ہماری تاریخ کا ایک
زرین باب ہے۔ تبلیغ دین سماجی خدمت اور درس
و تدریس کے علاوہ اس دور کی مسلم خواتین پیشہ ورانہ
میدان میں بھی بہت نمایاں رہیں۔

حضرت عمرؓ کی مشیر تجارت ایک خاتون
شفا بنت عبداللہؓ تھیں۔ حضرت علیؓ کی ہمشیرہ
اُم ہانیؓ نے فتح مکہ کے زمانے میں ایک مشرک
کو سیاسی پناہ دی تھی جسے حضورؐ نے منظور کیا۔
اس سے جہاں مسلمان عورت کی سماجی حیثیت
اور سیاسی اختیارات کا اندازہ ہوتا ہے وہاں
یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ نے خود عورت کے
سیاسی تدبر پر مہر تصدیق ثبت کی ہے۔

آئیے اب ہم اپنا منصفانہ جائزہ لیں کہ ہم
میں بھی اُن جیسی صفات پائی جاتی ہیں یا نہیں؟
اگر نہیں تو ایسا کیوں ہے؟ آخر وہ بھی تو ہماری
طرح عورتیں تھیں۔

ہماری حالت یہ ہے کہ ہم مسلمان عورتیں
وہ حیثیت اور آزادی کی خواہاں ہیں جو کہ یورپ
کی عورت کو حاصل ہے۔ حالانکہ اس بیچاری
کو تو حاصل ہی کیا ہے؟ جس کی ہم تمنا کریں۔ اُسے
تو اُس کے معاشرے نے ایک تماشہ بنا رکھا ہے
جب کہ ہمیں ہمارے مذہب نے وہ محترم اور
مقدس مقام عطا کیا ہے جس کا یورپ کی
عورتیں اور دوسرے مذاہب کی عورتیں تصور
بھی نہیں کر سکتیں۔ ہماری تو ساری کی ساری
جدوجہد یہ ہونی چاہیے کہ ہمیں وہ حیثیت اور
مقام عطا ہو۔ جو خدا اور اس کے رسول نے دیا
ہے۔ ہم تو صرف ان حقوق کو دوبارہ حاصل کرنے
کی سعی و کوشش کرتے ہیں جو غیر اسلامی معاشرے
اور تہذیب کے زیر اثر ہم سے چھن گئے ہیں۔
قرآن ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے اس کے
قانون پر معاشرے اور سوسائٹی میں عمل
درآمد ہونا چاہیے۔

اس کے لئے سب سے پہلے ہمیں مغربی
فیشن کو اپنے اذہان سے اتارنا ہوگا۔ اسلام کے
مطابق اپنی زندگی کو ڈھالنا ہوگا۔ وقت بڑا
بیش قیمت ہے نہیں معلوم کس وقت ہم اس

دنیا سے چلے جائیں۔ ہم مسلمان ہیں اور مسلمان ہونے کے ناطے ہم پر بہت سی ذمہ داریاں ہیں۔ اگر ہم نے ان ذمہ داریوں کو ادا نہیں کیا تو یقین جانیے کہ ہم ظالم ثابت ہوں گے۔ یعنی ہر مسلمان خواہ وہ مرد ہو یا عورت اس پر دین کی تبلیغ فرض ہے۔ خواہ وہ تحریر کے ذریعہ ہو یا تقریر کے ذریعہ لیکن ہمارے گھر اور خاندانوں میں بے دینی پھیلی ہوئی ہے۔ اور روز بروز بڑھتی جا رہی ہے اور ہم یہ سب دیکھتے ہوئے بھی چین کی زندگی گزار رہے ہیں۔ کل حشر کے میدان میں جب یہی ہمارے پڑوسی اور رشتہ دار خدا کے حضور ہماری شکایتیں کریں گے۔ کہ اے رب انہوں نے ہمیں دین کی تعلیم سے محروم رکھا۔ تو اس وقت ہم اور آپ ہی پکڑے جائیں گے۔ کیوں کہ ہم نے جانتے بوجھتے اس سے ان کو ناآشنا رکھا۔ اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ارشاد فرمایا ہے۔

"بلغوا عنی ولو آیۃ"

یعنی اگر تم کو ایک آیت کا بھی علم ہو تو اسے دوسروں تک پہنچا دو۔

دین کی راہ کوئی پھولوں کی سیج نہیں بلکہ کانٹوں کی رہگزر ہے ہم اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ دنیا کی جتنی قیمتی چیز حاصل کرنا ہوتی ہے۔ اتنی ہی زیادہ اس کے لئے جد و جہد کرنی پڑتی ہے۔ رب العالمین کی توجہ حاصل ... کیوں نہ ہم اپنے کو اس کا حقدار سمجھیں۔ ہماری

معاشرت رہن سہن لین دین سب کچھ اسلام اور اسلام کے مطابق ہو۔ اس کے لئے آپ کو اسلامی لٹریچر کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ قرآن شریف مع تفسیر پڑھنا ہوگا۔ قرآن پاک صرف تبرکاً پڑھنے کی چیز نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک قانون ہے جس کے مطابق ہمیں اپنی زندگی کو ڈھالنا ہے۔

اگر ہم انسانی نفسیات کا گہرا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ چاہے زندگی کا کوئی کلی اور ہمہ گیر انقلاب ہو یا کوئی جزئی اصلاح ہو تبدیلی ایک عزم اور ایک فیصلہ کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جب تک ایک مجاہدانہ عزم نہ باندھا جائے، ہمارے اندر کوئی تبدیلی واقع نہیں ہو سکتی۔ آیئے آج ہم عزم و حوصلہ کریں کہ ہمارا جینا اور مرنا صرف اسلام کے لئے ہوگا۔

یہی ہے راہ ترے عزم و شوق کی منزل
جہاں ہیں عائشہؓ و فاطمہؓ کے نقشِ قدم

اردو زبان سے متعلق چند معروضات

از ______ حبیب الرحمٰن

ساری دنیا کا ایک مسلمہ اصول ہے کہ بچے کی تعلیم کا فطری ذریعہ صرف اس کی مادری زبان ہے۔

اگر مادری زبان اختیار کرنے کے راستے میں کچھ دشواریاں ہیں تو انھیں دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے نہ کہ مادری زبان ہی کو ترک کر دیا جائے۔

دنیا کے مختلف حصے ایک دوسرے سے قریب آتے جا رہے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بعض لوگوں کے لئے معاشرتی زندگی میں صرف مادری زبان ہی پر اکتفا کرنا کافی نہیں ہوتا بلکہ حسب ضرورت دو ایک دوسری زبانیں بھی سیکھنا پڑتا ہے لیکن ان دوسری زبانوں میں اعلیٰ مہارت یا ان کے اعلیٰ ادب و شاعری پر عبور حاصل کرنا ضروری نہیں بلکہ انہیں صرف اس حد تک سیکھنا کافی ہے کہ ان میں روزمرہ کا معمولی کاروبار چلایا جا سکے مثلاً ہماری ریاست آندھرا پردیش کی حد تک تمام اردو بولنے والوں کو تلگو ضرور سیکھنی چاہیئے اور اعلیٰ تعلیم کے خواہشمندوں کو انگریزی بھی دوسری زبان کی حیثیت سے سیکھنا چاہیئے جہاں تک ہندی کا تعلق ہے، اگر ہم صرف دیوناگری رسم الخط سیکھ لیں اور اپنی بول چال کی اردو دیوناگری رسم الخط میں لکھ لیں تو کاروبار چلانے کے لئے بہت کافی ہے۔

بعض لوگ اردو کے راستے کی موجودہ عارضی مشکلات سے گھبرا کر یہ عجیب و غریب مشورہ دیتے ہیں کہ ہم اردو رسم الخط چھوڑ کر دیوناگری رسم الخط اختیار کر لیں یہ ایک انتہائی احمقانہ اور خطرناک تجویز ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ چند سال بعد خود اردو زبان ہی ایک علمی زبان کی حیثیت سے ختم ہو جائے گی۔ زبان اور رسم الخط کا تعلق جسم اور لباس کا نہیں ہے کہ جب چاہا ایک لباس پھینک کر دوسرا لباس پہن لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح ناخون کو گوشت سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح رسم الخط کو زبان سے علٰحدہ نہیں کیا جا سکتا ہاں یہ اور بات ہے کہ بعض چیدہ چیدہ اردو کتابوں کو زیادہ نفع کمانے کی خاطر دیوناگری رسم الخط میں بھی شائع کیا جائے ... ... تو یہ ہے کہ بعض پست قبائل کی بولیوں کو ... ... رسم الخط نہیں ہے۔ انہیں بھی رسم الخط دیا جائے ... ... ہم ہیں کہ اپنے اچھے خاصے ترقی یافتہ رسم الخط کو ٹھکرانے کی بات سوچتے ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ تحتانی یا وسطانی یا زیادہ سے زیادہ فوقانی تک تو ذریعہ تعلیم اردو ہے لیکن کالج کی سطح پر تو لازمی طور پر انگریزی ذریعہ تعلیم اختیار کرنا چاہیئے یہ محض خام خیالی ہے۔ اس میں بے شمار عملی دشواریاں ہے۔ مزید برآں

فوقانی مدرسہ کا طالب علم قدرتی طور پر سوچے گا کہ جب مجھے کالج میں انگریزی میں پڑھنا ضروری ہے تو کیوں نہ میں فوقانیہ ہی سے انگریزی ذریعہ تعلیم اختیار کرلوں۔ اسی طرح وسطانیہ اور تحتانیہ کے بچے بھی قدرتی طور پر یہی سوچیں گے اور اس طرح اردو سارے نظام تعلیم سے بہ حیثیت ذریعہ غائب ہو جائے گی۔ اس کا واحد علاج جیسا کہ اعلیٰ ماہرین تعلیم پر مشتمل ایجوکیشن کمیشن نے قطعیت کے ساتھ کہا ہے۔ یہ ہے کہ تعلیم کی ہر سطح پر ذریعہ تعلیم مادری زبان ہی رہے۔

انگریزی سامراج سے چھٹکارا ملے ہوئے چالیس سال گزر گئے۔ لیکن انگریزی زبان کے بے جا تسلط سے ہم ملک کو ابھی تک نکال نہیں سکے۔ البتہ اس کی کوششیں برابر جاری ہیں۔ خاص کر کوٹھاری کمیشن کی رپورٹ شائع ہونے کے بعد سے مختلف ریاستیں اپنی اپنی علاقائی زبانوں کو نہ صرف سرکاری کاروبار بلکہ تعلیمی میدان میں بھی برابر آگے بڑھا رہی ہیں اور یہ رجحان صاف دکھائی دے رہا ہے کہ آئندہ پندرہ بیس سال کے اندر کالجوں میں تمام علوم و فنون کی تعلیم کے لئے یہی علاقائی زبانیں اختیار کرلی جائیں گی۔ اس حالت میں ملک میں بسنے والے اردو مادری زبان والوں کی کیا کیفیت ہوگی۔ ان کا پورا ذریعہ تعلیم اردو کی بجائے تلگو، مرہٹی، کنڑی، ہندی اور دوسری ریاستی زبانیں بن جائیں گی اور اردو ثقافت و تہذیب نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہے گا۔ اردو کی حیثیت ہر جگہ محض ایک بول چال کی زبان کی ہو جائے گی۔ اردو بولنے والی آئندہ نسلیں اپنے ثقافتی اور تہذیبی ورثے سے محروم ہو جائیں گی۔ اور جہاں تک مسلمان اردو مادری زبان والوں کا تعلق ہے وہ اپنے دینی ورثے سے بھی بے بہرہ ہو جائیں گے۔ کیونکہ ان کے لئے دینی معلومات، اسلامی تاریخ اور اپنے اسلاف کے حالات سے واقفیت حاصل کرنے کا ذریعہ اب سوائے اردو کے کوئی اور زبان نہیں ہے۔

اس خوف ناک المیہ کو روکنے کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ اردو مادری زبان والے ابھی سے اپنے بچوں کے لئے ہر سطح پر اردو ذریعہ تعلیم اختیار کرلیں اور ساتھ میں جیسا کہ اوپر کہا جاچکا ہے۔ انھیں انگریزی اور ریاستی یا علاقائی زبان سکھانے کا طریقہ اختیار کریں اور تعلیم کے کسی مرحلے پر انہیں دیوناگری رسم الخط بھی سکھادیں۔

اردو زبان کے مخالفین اردو والوں کے سامنے اکثر معاش اور روزگار کا ہوا کھڑا کر دیتے ہیں۔ اور انہیں ڈراتے ہیں کہ اردو پڑھاؤ گے تو تمہارے بچوں کو نوکریاں نہیں ملیں گی۔ یہ ایک سراسر بے بنیاد اور انتہائی مبالغہ آمیز خوف ہے۔ کیا آج بے روزگاری صرف اردو والوں تک محدود ہے۔ کیا انگریزی ہندی اور دوسری زبانوں کے ذریعہ تعلیم پائے ہوئے ہزاروں نوجوان بے روزگاری سے پریشان نہیں ہیں۔ روزگار کا مسئلہ ایک بالکل علیحدہ مسئلہ ہے جس کی تفصیل یہاں

بے محل ہوگی اس اہم مسئلے کو زبان کے ساتھ جوڑنا بڑی نادانی بلکہ شرارت ہے۔

بھارت کو آزاد ہوئے ابھی صرف چالیس سال ہوئے ہیں اس دوران میں ملک نے جہاں بہت سی ترقیاں کی ہیں۔ وہیں بہت سے اہم مسائل ابھی حل طلب باقی ہیں۔ ان ہی میں تعلیم اور زبانوں کا مسئلہ ابھی ہے۔ اُردو والوں کو گھبراہٹ میں کوئی ایسا اقدام نہیں کرنا چاہیئے جو ان کے حق میں آگے چل کر خودکشی کے مترادف ہو۔ تاریخ میں ایسی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ کس طرح بعض قوموں نے انتہائی نامساعد حالات میں اپنی زبانوں کو بچایا ہے۔ آئرلینڈ، پولش اور الیانوی زبانوں پر غیر ملکی حاکموں نے سالہا سال تک سخت پابندیاں لگا دی تھیں۔ ان سے بھی بڑھ کر عبرانی زبان کی حالت زار تھی لیکن ان قوموں نے انتہائی شدید صعوبتیں اُٹھا کر اپنی زبانوں کی حفاظت کی اور انہیں اپنے سینوں سے لگائے رکھا یہاں تک کہ پھر حالات سازگار ہوئے اور یہ زبانیں اب تمام شعبوں میں ترقی کی راہ میں گامزن ہیں۔ اُردو بولنے والوں کو ان مثالوں سے سبق لینا چاہیئے۔ اور عزم و ہمت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیئے قوموں کی تاریخ میں تیس برس کی مدت کچھ زیادہ نہیں ہوتی۔ ذرا صبر و ایثار سے کام لیجیے تو یہ ساری دشواریاں آہستہ آہستہ رفع ہو جائیں گی۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ آپ صحیح فیصلہ کریں اور عملی جدوجہد میں کوتاہی سے کام نہ لیں۔

غزل

دُنیا کی نگاہوں میں کھٹکتا ہی رہا ہوں
صدیوں سے مصائب کے جہنم میں جلا ہوں

صدیقؓ و عمرؓ اور علیؓ بن کے اُٹھا ہوں
حق بات کی خاطر کبھی کربلا میں کٹا ہوں

مجھ پر کسی موسم کا اثر ہو نہیں سکتا
میں میل کا پتھر ہوں اکیلا ہی کھڑا ہوں

کہسار و شجر راہ میں آئے ہیں کئی بار
دریا ہوں بھلا کس کے میں رُوکے سے ہوں

اِک شعلۂ خورشید ہی ہے میری ہستی
میں برسرِ پیکار اندھیروں سے رہا ہوں

اے آرزوؔ تاریخ کے اوراق ہیں شاہد
میں صرفِ وفا صرفِ وفا صرفِ وفا ہوں

لطیف آرزو کوہیری

کہیں کچھ گم ہے

ڈی ایچ لارنس

ترجمہ: مظفر علی سید۔

جب میرے بدن پر کپڑے نہ تھے تب سے وہ میری دوست تھی۔ بعد میں وہ ایک لیڈی ڈاکٹر بنی اور میں فلسفے کے ایک ذہین پروفیسر کی گھریلو بیوی۔ ہم دونوں دوست جب ایک دوسرے سے ملتے تو ایک دوسرے کے جسم کو کپڑوں کے آرپار دیکھ کر یہ اچھی طرح محسوس کر لیتے کہ ہمارے سینے، پیٹ اور رانوں کے کھال کی رنگت اس وقت کیا ہوگی اور ہماری بغلوں میں کتنا پسینہ موجود ہوگا۔

اِس خوبصورت تندرست اور بھرے بھرے بدن والی لیڈی ڈاکٹر کا نام آپ کو بتاتی چلوں تو اچھا ہے۔ آج وہ لیڈی ڈاکٹر زندہ نہیں ہے۔ آج میں بھی زندہ نہیں ہوں۔

میں ـــ لاجونتی شرما۔ دوسروں کو چٹکیوں میں مسل کر پھینک دینے والی، گرمیوں کی راتوں میں چارپائی پر ڈھیر سارا پانی ڈال کر گیلے بازوؤں پر کروٹ بدل بدل کر سونے والا لاجونتی شرما اب زندہ نہیں ہے۔ اس کی جگہ ایک مری ہوئی بوڑھیا جیسی گول کمانی والا چشمہ لگا کر دھیرے دھیرے چھڑی کے سہارے چلنے والی یہ ایک عورت آپ کے سامنے بیٹھی ہے۔ ایک بے مصرف ناکارہ سنکی اور بد دماغ رانڈ عورت جو اپنی بہو سے صبح آدھی پیالی دلیا کا ناشتہ، دوپہر کو دو پھلکے اور رات ایک گلاس دودھ لے کر اُسے بھی ٹھیک سے ہضم نہیں کر پاتی۔

آج جو اہم بات میں آپ سے کرنے والی ہوں اس کا خلاصہ بس اتنا ہے کہ ہم سب ایک طرح سے دیکھا جائے تو زندگی برتنے میں CONDITIONING میں اور اس CONDITIONED کو نظر انداز کیا جانا تو کیمیاگر سے ممکن ہے اور نہ کیمیا داں سے اور انسان ایک ہی وقت میں کیمیاگر بھی ہے اور کیمیا داں بھی کبھی کبھی سیدھی سادھی سبھی کہانیاں ابھی باقی ہیں مگر کبھی ہوتی نکلتی ہیں۔ یہ شاید انھیں میں سے ایک ہے۔

مجھے گذرے ہوئے زندگی کے پل اس طرح یاد آئے جیسے بچوں کو پہاڑے یاد ہوتے ہیں۔ میری آنکھوں پر لوں تو آج موٹی سی عینک ہے لیکن اپنی یادداشت کے جھروکے میں جب بھی جھانکتی ہوں تو سب ویسے ہی صاف صاف دکھائی دیتا ہے۔

میری لیڈی ڈاکٹر دوست نے کہا تھا کہ میں سب کچھ بتادوں اس طرح شاید وہ میری مدد کرسکے۔ اس کا خیال تھا کہ آدمی کا جسم ایک بہت بڑا کباڑ خانہ ہے۔ اور دماغ تو کباڑ گودام اِس گودام کی صفائی ہوتی رہنا چاہیئے۔ پھر اس نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ مجھے اپنے مرد کو اچھی طرح سمجھنا چاہیئے۔ لیکن جہاں سمجھنے کو کچھ ہو ہی نہیں وہاں اچھی طرح کیا سمجھا جائے۔ آج [illegible] سے۔ آج جیسے میرے [illegible] کہ مرد کو [illegible] ہونا چاہیئے۔ عورت کو [illegible] چاہیئے۔

اب جب کہ سب ختم ہو چکا ہے۔ جوانی کا سونا راکھ بن کر بہہ چکا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تکلف نہیں کہ جوان ہونے کے دن سے بڑھاپے کے دن تک میں زندگی کی جس گرمی اور حرارت کو

پکڑنا چاہتی تھی وہ مجھ سے اوجھل رہی۔ یہ بوڑھی لاجونتی شرما کیسے بھول سکتی ہے اپنے ان دنوں کو جب وہ اپنے بدن سے چپکے ہوئے کسی کپڑے کو اتارتی تھی تو وہ کپڑا جاڑے کے دنوں میں بھی بدن سے اترنے کے بعد خاصی دیر تک میرے بدن کی گرمی کو اپنے اندر بسائے رکھتا تھا اور ہاتھ سے چھونے پر لگتا تھا کہ اب بھی میرا گرم گرم جوان جسم اس کے اندر کسمسا رہا ہے۔ اتنا تو آپ بھی سمجھ رہے ہوں گے کہ میں صرف جسم کی حرارتوں کی بات نہیں کر رہی ہوں بلکہ ان ان دیکھی گرماہٹوں کی بات کر رہی ہوں جنھیں زندگی ہزار رنگوں میں منکشف کرتی ہے۔

"مجھے مرد چاہیئے"۔

اور میری لیڈی ڈاکٹر دوست یہ سن کر سنجیدہ ہو گئی۔ پتہ نہیں کیوں اس نے میری اس بات کو دماغ کے کسی محفوظ خانہ میں رکھ لیا۔ پھر وہ ایک دن میری اس بات پر خوب ہنسی۔ تو میں نے اسے بتایا کہ مجھے اس مٹی کے مادھو جیسے پتی سے گھن آتا ہے اس لئے نہیں کہ جب وہ مجھے پیار کرتا ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے میرے ہونٹوں پر جمی ہوئی پھپھوندی چھڑا رہا ہو بلکہ اس لئے کہ اس کے ہونٹ گرم تو ہوتے ہیں مگر ان میں گرماہٹ نہیں ہوتی۔ ایسی گرماہٹ جو لمس کی گرمی نہیں کچھ اور ہے۔

میری دوست مجھ سے ایسی باتیں سن کر مجھ سے بہت سے سوالات کرتی۔ ان سوالوں کی کیفیت کچھ ایسی ہوتی جیسے وہ میرے پتی کی نامردی کا پتہ لگانا چاہ رہی ہو اور جب میں اسے بتاتی کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے اور اس میں ایسا کوئی نقص نہیں ہے کہ اس کو نامرد سمجھا جائے۔ اس طرح کی بیماری بھی اس کو نہیں ہے جس کا علاج ضروری ہو تو میری دوست کو پہلے یقین نہیں آتا پھر وہ مجھے اس طرح دیکھتی جیسے کوئی پراسرار چیز دیکھ رہی ہو۔

ایک دن میری دوست کاغذ پر لکھے ہوئے چند سوالات میرے پاس لے کر آئی اس روز میں صرف بلاؤز اور پیٹی کوٹ پہنے اور چھت کا پنکھا پوری رفتار سے کھولے پلنگ پر چت لیٹی تھی۔ اس نے سارے سوالات مجھ پر داغ دیئے۔

"کیا شرما جی تم پر کبھی غصہ نہیں کرتے۔"

غصہ مردوں کو آتا ہے"۔ میں نے جواب دیا۔

"کیا شرما جی خالی وقت میں انگوٹھا چباتے ہیں؟"

"نہیں ــــ"

"کیا چلنے میں وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنی رانوں سے الگ رکھنے کے بجائے ملا کر چلتے ہیں"؟

"نہیں ــــ"

"کیا وہ باتھ روم میں نہاتے وقت شور مچاتے ہیں"۔

"نہیں ــــ"

"کیا تمہارے ساتھ لیٹنے سے پہلے خود بتی بجھاتے ہیں یا یہ کام تمہیں کرنا پڑتا ہے"۔

مجھے اپنی دوست پر غصہ آگیا۔

یہ سب تم کیا اوٹ پٹانگ بک رہی ہو"! میں نے اس کو ڈانٹ دیا میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں نے اپنی دوست کو تھوڑا تھوڑا کرکے یہ سمجھا دیا کہ وہ جس نتیجے پر پہنچنا چاہتی ہے وہ سب بکواس ہے۔ کسی نفسیاتی گتھی کی تلاش بیکار ہے اور نہ یہ جنسی آسودگیوں سے جڑا ہوا کوئی مسئلہ ہے۔

"تو پھر تم کیا کہنا چاہتی ہو" لیڈی ڈاکٹر جھنجلا گئی۔

کیا مجھے واقعی یہ بات معلوم تھی کہ میں کیا کہنا چاہتی تھی۔ جب میں نے اپنے آپ سے یہ سوال کیا تو اور بھی الجھ گئی۔ لیکن میں نے اپنی دوست کو اتنا ضرور بتا دیا کہ میرا شوہر بہت کم بولتا

بہت کم کھاتا ہے۔ بہت کم لوگوں سے ملتا ہے۔ آج تک اس کے ہاتھوں سے کبھی ایک پیالی بھی نہ ٹوٹی، اس کا ایک شیونگ بلیڈ پندرہ دن چلتا ہے، اس کا ایک جوڑا جوتا پانچ سال میں بھی نہیں ٹوٹتا، اس کے بدن سے چوتھے دن بعد بھی کپڑا ذرا میلا نہیں ہوتا اور اس کے گلے میں کوئی ایسا پرزا فٹ ہے جو اس کی آواز کو کسی حالت میں بھی ذرا اونچا نہیں ہونے دیتا۔ اور سو بات کی ایک بات یہ بھی کہ ہمیشہ ہر صورت میں ہر موقع پر چاہے وہ خوشی ہو یا غم امید ہو یا نا امیدی، محبت ہو یا نفرت، صبر ہو یا بے صبری میرا شوہر بس ایک سُر میں اور ایک لے میں اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے جس میں کوئی اتار چڑھاؤ نہیں ہوتا کوئی رنگ نہیں ہوتا۔

آج جب میرے کان اونچا سننے لگتے ہیں اور کائنات میں بکھرنے والی تمام میٹھی اور سریلی آوازیں، کرخت اور کھردری آوازیں اونچی نیچی آوازیں اپنی رنگا رنگی، اپنی موسیقیت اور اپنے بولتے اور پکارتے اور سرگوشیاں کرتے ہیجان کو میرے لیے بے معنیٰ کر چکی ہے۔ تو ایک حقیقت کا مجھ پر شدت سے انکشاف ہوا ہے۔ اور وہ یہ کہ عورت کے اعصاب پر سب سے پہلے مرد کی آواز کا جادو بڑا کام کرتا ہے۔ عورت مرد کی نگاہ سے بھی زیادہ اس کی آواز سے اپنے میں ایک سرمستی کی کیفیت کو محسوس کرتی ہے۔

پھر میں نے اپنی سہیلی کو بتایا کہ مرد کا لہجہ اور اس کی آواز اور اس کی آواز کا زیر و بم اور اس زیر و بم کا گرم ارتعاش اور اس گرم ارتعاش کی برقی لہریں اور ان برقی لہروں کی ایک بے نام سی زندہ لذت کا ایک الگ ہی نشہ ہے۔ پھر مجھے یاد آیا کہ میرا شوہر میری جانب شاید ہی کبھی دیکھتا ہو، میرے پاس بیٹھ کر جب وہ مجھ سے ایسی کہتا، یہاں تک کہ براہِ راست کوئی سوال بھی کرتا تو اس کی آنکھیں میرے چہرے یا میرے جسم کے کسی دوسرے حصے پر ہوتیں بلکہ یا تو وہ میز پر رکھے خالی گلاس کو دیکھتا ہوتا یا آسمان کو یا اپنے ہی ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو تکتا ہوا ہوتا اور تب ہی میں نے اپنی سہیلی سے کہا تھا۔

"اگر مرد آنکھوں اور آواز سے عورت کو چھو نہیں پاتا تو پھر وہ اس کو چھو کر بھی اَن چھوا رکھتا ہے۔"

ایک دن بڑا غضب ہو گیا۔ اس دن ڈاکٹر جاویری آئی یعنی میری دوست جس کا نام بتانا میں بھول گئی تھی۔ ہم لوگ زندگی میں کب اور کس کو دوست بنا لیتے ہیں اس کا کوئی فارمولا نہیں ہے مگر یہ سچ ہے کہ ڈاکٹر جاویری کی عقل مجھے ہمیشہ سے بڑی لگتی تھی اور میں اس کی ہر بات کو سنجیدگی سے لیتی تھی۔ اس دن مجھ سے ڈاکٹر جاویری نے ذرا ڈٹ کر پوچھا تھا۔

"یہ بتا تو اپنے پتی سے چاہتی کیا ہے؟"

"ہنگامہ"۔ میں نے بس کچھ کہنے کے لیے کہہ دیا۔ لیکن کیا میں نے یہ بات بس کہنے کے لیے کہی تھی یا واقعی میں اپنے شوہر سے ہر دم اور ہر گھڑی کسی ہنگامے کی امید کیا کرتی تھی۔

"کیسا ہنگامہ چاہتی ہے تو۔"

"میں چاہتی ہوں وہ چیخے چلائے، گھر کا چھوٹا موٹا سامان اِدھر اُدھر پھینکے اور کبھی کبھی ایسی آواز میں ڈانٹ پھٹکار کرے جو برابر کے گھر تک سنائی دے، کم سے کم باہر تک سنائی دے، کچھ لگے تو کہ کوئی ہلچل ہے"۔

"کیا تو یہ چاہتی ہے کہ وہ تجھے گالیاں دے؟"

"پتہ نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "اگر گالیاں دے سکتا تو کبھی کبھی یہ بھی چل سکتا ہے۔"

"کیا تو یہ چاہتی ہے کہ وہ تیرے کپڑوں کو گھسیٹے اتنی زور

ہے کہ وہ تیرے بدن پر پہنچ جائیں۔"

میں کچھ دیر جواب دینے کے لئے سوچتی رہی اور پھر ایک دم مجھے یاد آگیا۔ وہ اپنے کپڑوں پر میرے کسی کپڑے کو برداشت نہیں کرپاتا تھا۔ ایک دن وہ میرے قریب بیٹھا تھا کہ میری ساڑی کا پلّو اس کی گود میں اس کے کرتے کے دامن پر جا گرا۔ اس وقت اس کے ہاتھ میں کربند ڈالنے والی نلکی تھی۔ میں نے دیکھا ساڑی کو ہاتھ لگائے بغیر اسی نلکی کے سہارے اس نے ساڑی کے پلّو کو اپنی گود سے نیچے گرا دیا۔

میں نے جاویری سے کہا۔

"کیا یہ ہوسکتا ہے کہ وہ کبھی کبھی میری ساری کے پلّو کو اپنی مٹھی میں لے کر اپنی طرف کھینچ سکے۔ زیادہ زور سے نہ سہی بس ہلکا سا" "کیوں ۔۔۔؟"

کپڑا کھینچنے سے بھی لمحہ بھر کو ایک گرماہٹ پیدا ہوتی ہے ایک سکھ دینے والی گرماہٹ۔"

پھر جاویری نے مجھے سوال کرنے سے منع کر دیا اور خود سوال کرنے لگی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ میرا جی یہ تو نہیں چاہتا کہ میرا شوہر مجھے چٹکیاں لے، بال نوچے اور میرے سینے پر اس طرح سوار ہوجائے کہ مجھے اس کے بوجھ کے نیچے کچل جانے کا احساس ہونے لگے۔ تب میری سمجھ میں آگیا کہ جاویری مجھے برابر ایک نفسیاتی مریض سمجھ کر میرا پوسٹ مارٹم کر رہی ہے۔ اور میرے جوابوں کی جنسی تاویلیں تلاش کر رہی ہے۔ وہ شاید یہ بھی سمجھ رہی تھی کہ میں اعصابی طور پر کوئی غیر معمولی عورت ہوں، ہماری شادی کو چند سال ہوئے تھے اور بچہ ہم دونوں نے نہیں چاہا تھا اس لئے نہیں ہوا تھا۔ پیسے کی اگر ریل پیل نہیں تھی تو کوئی کمی بھی نہ تھی۔ میں عام شادی شدہ عورتوں کی طرح مسکراتی ہنستی، گہری نیند سوتی، صبح بشاشت سے اٹھتی یا

موسموں یا راتوں کی مناسبت سے کپڑوں کے رنگ پہنتی اور ایک اسمارٹ عورت کے سارے آدھے دن کاٹ کر رات میں جب کبھی من کرتا اپنے پتی کے پہلو میں چلی جاتی۔ میں نے یونیورسٹی تک جب تعلیم حاصل کی تو کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ نوکری کروں گی۔ اس لئے گھر مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔ میں نے جاویری کو پھر پیار سے سمجھایا۔

"جاویری کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی جگہ کچھ کم ہے۔ ایک چپ سی ہے۔ شاید میرا شوہر بے حد فارمل ہے۔ یا پھر ہمارے درمیان کوئی ایک بے وجہ کی نقلی احتیاط ہے۔ جو بار بار مجھے ایک سناٹے کا احساس دلاتی رہتی ہے۔"

میں بولتی رہی اور جاویری سنتی رہی اور ایک بڑی واضح قسم کی جیسائی کیفیت کے ساتھ اپنی آخری انگلی کی سرخ پالش جلدی جلدی دوسرے ناخن سے کھرچتی رہی۔

"سناٹا" وہ بڑبڑائی "میں سمجھ گئی۔ یہ سناٹا ٹوٹے گا، دیکھ لینا میں توڑوں گی اس سناٹے کو ۔۔۔"

پھر جو کچھ ہوا اس کی ایک ایک تفصیل مجھے یاد ہے۔ اگر اس کو ٹی وی پر دکھایا جائے تو کچھ اس طرح کا سین بنے گا۔

میرے ڈرائنگ روم کی دیوار کی گھڑی ساڑھے چار بجا رہی ہے۔ (ابھی میرے شوہر کو دفتر سے گھر آنے میں ایک گھنٹہ باقی ہے) کہ جاویری ڈرائنگ روم میں داخل ہوتی ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے میں ہوں وہ اپنے بیگ سے ایک سگریٹ نکالتی ہے اس کو ہونٹوں میں دبا کر ماچس کی تیلی جلاتی ہے۔ اناڑیوں کی طرح سگریٹ سلگاتی ہے۔ سگریٹ سلگانے میں اس کو کھانسی آجاتی ہے۔ جس پر قابو پانے کے بعد وہ میز پر رکھی صاف ستھری ایش ٹرے کو دیکھتی ہے پھر چٹکی

سگریٹ کو ایش ٹرے پر رکھ دیتی ہے اور پلٹ کر میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتی ہے۔

"یہ کیا کر رہی ہو"۔؟ میں پوچھتی ہوں۔

وہ جواب دیتی ہے۔

"شرما جی سگریٹ نہیں پیتے۔ آدھا جلا یہ سگریٹ جب ان کو ایش ٹرے میں رکھا ہوا ملے گا تو وہ تم سے سوال کریں گے۔"

"کون آیا تھا ؟"

تم جواب دو گی۔؟

"کوئی نہیں آیا"۔

پھر وہ سگریٹ کی طرف اشارہ کر کے پوچھیں گے کہ یہ سگریٹ کون پی رہا تھا۔" تب تم اپنی حیرت کا اظہار کرو گی اور پھر گھبرا جاؤ گی جیسے چور پکڑا گیا ہو۔ لیکن تم اپنی لاعلمی ظاہر کرو گی اور وہ نہیں مانے گا۔ بات کو کریدے گا۔ تب اس کے زیادہ پوچھنے پر تم کہو گی مجھے نہیں پتہ یہ سگریٹ کس کا ہے۔' شاید جاویری نے پیا ہو۔ پھر وہ مجھ سے پوچھے گا کہ میں سگریٹ کب سے پینے لگی ہوں۔ تو میں صاف انکار کر دوں گی کہ میں سگریٹ نہیں پیتی۔

"لیکن اس سے ہوگا کیا۔" میں جاویری سے سوال کرتی ہوں۔

"ہنگامہ" وہ جواب دیتی ہے۔ "یہ ناٹک کا پہلا سین ہوگا۔"

پھر یہ ہوا کہ سگریٹ جلتے جلتے بجھ گئی۔ ساڑھے پانچ بجے میرا پتی آیا۔ کپڑے بدلنے کے بعد میں اس کو جان کر ڈرائنگ روم میں لائی اس کی نظر ایش ٹرے پر پڑی وہ بولا۔

"لاج (وہ مجھے لاج ہی پکارتا تھا) یہ سگریٹ کہاں سے آئی؟"
جواب میں میں نے سگریٹ کی طرف دیکھا اور پھر دیکھتی رہ گئی۔
"کیا کوئی آیا تھا ــــ؟"
"نہیں تو"۔

"اچھا" وہ بولا۔ مگر اس طرح کہ نہ تو اس میں حیرت تھی اور نہ تشویش

"جاویری آئی تھی کچھ دیر پہلے"۔ آخر مجھ کو کہنا پڑا۔

"کیا جاویری نے سگریٹ شروع کر دی ؟"

میں نے اس کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ یوں ظاہر کیا جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ لیکن اس نے بھی پھر دوبارہ اس سوال کو نہیں دہرایا۔ بلکہ کوئی کتاب کھول کر بیٹھ گیا۔ کتابیں اس کی پناہگاہیں تھیں۔ اس لئے نہیں کہ وہ ایک پروفیسر تھا بلکہ اس لئے کہ اس کی پہونچ کی چیزوں میں کتابیں سب سے قریب تھیں۔

کئی دن گذر گئے جاویری دوسرے تیسرے دن آتی' مجھ سے رپورٹ لیتی لیکن میرے پاس اسے بتانے کے لئے اپنے شوہر کی چپ کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ اس نے تو جیسے سگریٹ والی بات بھلا ہی دی تھی۔

ایک دن جاویری نے اپنے پرس سے کنجی کا ایک چھلا نکالا چھلے میں پلاسٹک کا ایک مونوگرام لٹک رہا تھا۔ جس پر انگریزی کے دو حروف ٹی اور پی بنے ہوئے تھے۔ چھلے میں ایک کنجی بھی پڑی ہوئی تھی۔

"یہ ایک بے کار کنجی ہے"۔ یہ کہہ کر جاویری نے وہ چھلا میرے پتی کے پلنگ کے سرہانے رکھ دیا۔ اور پھر اپنے پرس سے ایک گنجلا گنجلایا مردانہ رومال نکالا جس کو شاید اسپرٹ میں بھگو کر وہ لائی تھی۔ کیونکہ اس کے نکلتے ہی کمرے میں شراب جیسی ایک تیز بو پھیل گئی تھی۔ وہ رومال بھی اس نے میرے پتی کے سرہانے اسی چھلے کے پاس رکھ دیا کہ وہ [illegible] طرح کچھ تکیے کے نیچے اور کچھ باہر نکلا رہ گیا۔

"یہ کیا کر رہی ہو ۔؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"سین تیار کر رہی ہوں ۔"

"کیا مطلب" میں گھبرا گئی۔

تمہارا پتی رات کو بستر پر آئے گا۔ اس کی نظر چھلے پر پڑے گی۔ چھلا اٹھا ہی رہا ہوگا کہ تکیے سے جھانکتا ایک مردانہ رومال اسے نظر آئے گا۔ جو اس کا نہیں ہے۔ وہ رومال کو بھی اٹھائے گا کہ اس کی ناک میں ایک بو کا احساس ہوگا۔ وہ رومال سونگھے گا۔ وہ پھر تم کو پکارے گا۔ تم آؤ گی وہ سوال کرے گا: "یہ چھلا اور رومال کس کا ہے"۔ تم دونوں چیزوں کو دیکھتی رہو گی۔ دیکھتی رہو گی اور تمہارے حلق سے آواز نہیں نکلے گی۔ وہ پھر تم سے پوچھے گا تو لیکایک تم کو یاد آئے گا۔

اوہ ہاں جادیری آئی تھی۔

"جادیری۔ وہ میرے بستر پر کیا کر رہی تھی؟" تم جواب دو گی میں کچن میں تھی۔ تو جادیری تمہارے پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی۔

یہ کہہ کر جادیری میری آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ مجھے کسی سہمے ہوئے پرندے کی طرح دیکھ کر اسے بڑا مزہ آ رہا تھا میں نے جادیری کو یہ سب کرنے کو منع کیا اور سوال کیا۔

"یہ سب کرنے سے کیا ہوگا۔"

جواب ملا "ان کے دل میں شک بیٹھ جائے گا۔"

"کیسا شک" میں نے پوچھا تو مجھے بتایا گیا کہ چھلے میں لٹکتا ہوا مونوگرام جس کے حروف اجنبی مردانہ رومال جس میں شراب کی بو، جادیری کا نہیں ہو سکتا۔ تو پھر وہ کون ہے جو اس کے دفتر چلے جانے کے بعد اس کے بیڈ روم تک آتا ہے۔ اتنا سوچتے ہی اس کے اندر کا مرد جاگے گا۔ وہ چیخے گا چلائے گا۔ ورنہ وہ سب اگر کرے گا جو وہ نہیں کرتا اس کے حلق میں لگے سائلنسر کے چیتھڑے اُڑ جائیں گے۔ میرے ماتھے پر ٹھنڈا پسینہ دیکھ کر جادیری نے مجھے سمجھایا اور بتایا کہ عورت کی بے وفائی کی بو ایسی ہوتی ہے کہ ٹھنڈے سے ٹھنڈا مرد تڑپ کر رہ جاتا ہے۔

اگرچہ مجھے ڈاکٹر جادیری کی باتوں سے ڈر لگ رہا تھا۔ لیکن ساتھ ساتھ مجھے اپنے پتی کے بپھرے ہوئے تیوروں کو دیکھنے کا ایک شوق بھی جاگتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ جب میں نے جادیری کو اس خطرے سے آگاہ کیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ ناٹک کوئی خطرناک موڑ لے تو اس نے مجھے یقین دلایا کہ ایسا ہونے پر وہ خود ہی ساری حقیقت میرے شوہر کو بتا دے گی۔

آخر کو رات ہوئی۔ میرا پتی اپنے بستر پر پہونچا۔ اس نے چھلے اور رومال کو دیکھا۔ پھر ہمارے درمیان لگ بھگ وہی مکالمے ہوئے۔ اس دن بھی وہ اپنے معمول سے زیادہ نہیں بولا۔ اس کی آواز میں بھی کسی طرح کا زیر و بم نہیں پیدا ہوا۔

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ یقیناً میں نے اس کو رومال سونگھتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ جب میں نے اس کو بتایا کہ وہ دونوں چیزیں جادیری کی ہی ہو سکتی ہیں جنہیں شاید وہ وہاں بھول گئی تھی تو اس وقت میرے شوہر کی گود میں ایک کتاب کھلی ہوئی رکھی تھی۔ وہ صفحات پر نظریں ہٹائے بغیر بولا۔

"اچھا ہوگا یہ کتاب تم بھی پڑھ لو" سنو ڈی ایچ لارنس نے کیا اچھی بات کہی ہے۔ پھر وہ کتاب سے پڑھ کر سنانے لگا۔ جس کا ترجمہ کچھ اس طرح تھا۔

> ہمارے تمدن نے ابھی تک روح میں ہل جوتنے کی ضرورت کو محسوس نہیں کیا ہے۔ اس کے بعد وحشی بیج بونے کا مسئلہ ہے۔ مگر اب تک ہم نے قدیم وحشی جھاڑیوں کو جڑ سے اکھاڑنے اور جلانے کا کام کیا ہے اب ہمیں دوبارہ وحشی بیج بونے ہوں گے۔ اپنے محسوسات کی پرورش کرنی ہوگی۔ ہر دل عزیزی کی

کوشش بے کار ہے ۔"

جادیری دوسرے ہی دن آئی ۔

اور جب اس نے مجھ سے سارا ماجرا سنا تو بجائے اس کے کہ وہ اپنی حیرت اور تشویش کا اظہار کرتی اس نے پورے اعتماد کے ساتھ مجھے یقین دلایا کہ میرا شوہر زخمی ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ۔ تب ہی ایک دن میں نے جادیری کو بتایا کہ میرا پتی ایک دو بار خلاف معمول دفتر سے اچانک گھر آجایا کرتا ہے جس پر جادیری نے فوراً یہ کہا کہ وہ گھر آکر مجھ سے یہ بہانہ کرتا ہے کہ وہ کوئی چیز بھول گیا تھا ۔ جسے لینے آیا ہے ۔ اور مجھے حیرت تھی کہ جادیری نے یہ اندازہ کیسے لگایا جب کہ حقیقت بھی یہی تھی ۔ پھر جادیری نے مجھے بتایا کہ تیر اب نشانے پر بیٹھ رہا ہے ۔ فلیتہ جل چکا ہے اور بارود آگ پکڑنے والی ہے ۔

اس دن جادیری دیر تک مجھے یہ سمجھاتی رہی کہ آدمی کی زندگی میں یقین اور شک کے درمیان فاصلہ زیادہ لمبا نہیں ہوتا ۔ یقین کی دیواریں کتنی ہی پختہ کیوں نہ ہوں ۔ شک ایک لمحہ میں ان دیواروں میں دراڑیں ڈال دیتا ہے ۔ لیکن اس کے ساتھ ڈاکٹر جادیری نے اپنے شوہر کے مقابلہ میں میرے شوہر کی توہین نہیں کی ۔ اس نے بتایا کہ اس کا شوہر جو ایک ہونہار ڈاکٹر ہے اور جادیری سے طالب علمی کے زمانے سے ہی محبت کرتا ہے ۔ بنیادی طور پر بڑا شکی مرد ہے اگر اتنا کچھ اس کے ساتھ ہو گیا ہوتا تو اب تک ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوتا ۔

اگرچہ مجھے جادیری کی اس ناٹک بازی میں ایک طرح کا ایڈوینچر محسوس ہو رہا تھا ۔ مگر اس کے ساتھ وہ حرکتیں بچکانہ پن کی طرح بھی لگ رہی تھیں ۔ جب یہی بات میں نے ڈاکٹر جادیری کو سمجھائی تو وہ سنجیدہ ہو گئی اور بولی ۔

"دراصل مجھے تم سے ہمدردی ہے ۔ اس لئے نہیں کہ تم میری دوست ہو بلکہ مجھے [illegible]

جو کچھ جس طرح ہے اس کو تم اسی طرح قبول کر لینا نہیں چاہتی ہو میں سمجھتی ہوں کہ میرا شوہر ایک زندہ مرد ہے اور میرا خیال ہے کہ مرد اور عورت کے درمیان رفاقت کی گرم جوشی تب ہی قائم رہ سکتی ہے ۔ جب دونوں ایک دوسرے کو اپنے زندہ ہونے کا احساس دلاتے رہیں ۔ اور یہ احساس تب ہی دلایا جا سکتا ہے جب ہر صورت حال کو جوں کا توں قبول کر لینے کے بجائے اسے چیلنج کیا جا سکے ۔ میری ساری دلچسپیاں اس بات میں ہیں کہ تم اپنے شوہر کے ابلے ہوئے آلو جیسی شخصیت کو جوں کا توں قبول کر لینا نہیں چاہتیں ۔ اس کے خلاف احتجاج کرنا چاہتی ہو بلکہ سچ پوچھو تو تمہارا منشا یہ ہے کہ تمہارا شوہر بھی احتجاج کے اس حق کو پوری طاقت کے ساتھ تمہارے خلاف کبھی استعمال بھی کرتا رہے ۔"

یہ سن کر مجھے ڈاکٹر جادیری کی عقل مندی کا دل ہی دل میں ایک بار پھر اعتراف کرنا پڑا اور پھر میں نے طے کر لیا کہ جو کچھ وہ کر رہی ہے ویسا اس کو کر لینے دیا جائے ۔

میں نے ابھی یہ نہیں بتایا کہ ان دنوں میرا رنگ چمپئی تھا ۔ اور مجھے اپنے جوڑے میں پھولوں کا گجرا باندھنے کا بہت شوق تھا اس دن جب ڈاکٹر جادیری نے ایک نیا سین بنایا تو میں حیران رہ گئی ۔ پہلے تو ڈاکٹر جادیری نے اسٹیڈی روم میں میری میز کے سامنے رکھی کرسی کا منہ اس طرح موڑ دیا کہ اندر آنے والے کو سب سے پہلے وہی کرسی دکھائی دے ۔ کرسی پر سفید کشن تھا جادیری نے میرے جوڑے سے چند پھول نوچے اور کرسی کے گدے پر ڈال دیئے ۔ پھر اس نے کالے رنگ کا صرف ایک کف لنگ نکالا اور اس کو پھولوں کے پاس ہی اسی گدے پر ڈال دیا ۔ وہ [illegible]

بھی لائی تھی۔ ان پر اُس نے گیلی مٹی کا لیپ لگایا اور کمرے میں داخل ہونے والے راستے پر آگے پیچھے رکھ کر فرش پر ایسے نشانات بنا دیے جو جوتوں کے نشانات جیسے تھے میں سناٹے میں کھڑی اس سین کے ایک ایک چیز کو غور سے دیکھ رہی تھی

میرا شوہر اندر آئے گا اور دیکھے گا دو اجنبی جوتوں کے نشان، میز سے گھومی ہوئی کرسی، کرسی پر میرے جوڑے کے چند پھول اور کسی مرد کی ایک آستین کا کف لنک۔ یعنی اس کی غیر موجودگی میں کوئی اجنبی آیا تھا۔ اور وہ اس کرسی تک گیا تھا جس پر اس کی بیوی بیٹھی تھی۔ پھر وہ کرسی موڑی گئی تھی، پھر وہ مرد اس کی بیوی کے اتنے پاس آگیا تھا کہ جوڑے کے پھول اس ملاپ میں ٹوٹ کر کرسی پر گر گئے تھے۔ اور اس مرد کے ہاتھ اس کی بیوی سے اتنے الجھ گئے تھے کہ مرد کی آستین کا کوئی ڈھیلا ڈھالا کف لنک آستین کے سوراخ سے پھسل کر کرسی پر آرہا تھا۔

"مائی گاڈ" میں چیخ پڑی۔

ڈاکٹر جاویری بڑے پُر اثر انداز میں اس پلان کا اثر میرے اوپر دیکھ رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔

"بتاؤ اس پلان کا تمہارے شوہر پر کیا اثر ہوگا۔"

"مجھے نہیں معلوم" میں اندر ہی اندر کانپ رہی تھی۔

"لیکن مجھے معلوم ہے۔"

"کیا" میں نے سوال کیا۔

"وہ پاگل ہو جائے گا۔ اس کی راتوں کی نیند غائب ہو جائے گی وہ تم سے بار بار دیوانوں کی طرح سوال کرے گا کہ بتاؤں وہ کون ہے جو اس کے پیچھے تم سے ملنے آتا ہے کون ہے وہ عیاش شرابی۔؟"

پھر ڈاکٹر جاویری کے سازشی دماغ کے تحت بنے پلان کے مطابق کہانی ملٹی ہوئی۔ اس کے بعد اپنے شوہر کو یہ بتانا ہوگا کہ میں ہاتھ دھو رہی تھی اور ڈاکٹر جاویری اندر کرسی پر بیٹھی ہوئی ...

پڑھ رہی تھی۔ تب ہی میں نے کسی کے اندر آنے کی آواز سنی تھی۔ اور جب میرا شوہر اس بات کی تصدیق جاویری سے کرنا چاہے گا تو وہ اس کو یہ کہہ کر دن میں تارے دکھا دے گی کہ وہ تو کئی دنوں سے اس کے گھر گئی ہی نہیں۔

ممکن ہے کہ میرا شوہر آستین کے بٹن کو نہ دیکھ پاتا لیکن فرش پر جوتوں کے نشانات اس قدر غیر معمولی طور پر واضح تھے کہ انھوں نے میرے شوہر کو متوجہ کر لیا اور پھر سب چیزیں اس کی نگاہوں سے چڑتی چلی گئیں۔ وہ اس بٹن کو کچھ دیر الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے سے اس کی الجھن نمایاں تھی۔ میں آس پاس ہی اپنے کام میں مشغول رہ کر اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو کنکھیوں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ پلٹا تو میں انجان بن گئی پھر اس نے مجھ سے سوال کیا۔ سوال جس نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیے۔ اس نے پوچھا۔

"کیا آج تمہاری ڈاکٹر جاویری آئی تھی؟"

"جاویری"۔ میری آواز لڑکھڑا گئی۔ "ہاں آئی تو تھی۔"

"ساتھ میں کون تھا۔" یہ اس کا دوسرا سوال تھا۔

پھر میں نے اس کو ویسا ہی بتا دیا جیسا جاویری سے طے ہوا تھا۔ میرا بیان سن کر میرا شوہر پھر کچھ نہ بولا۔ میں مسلسل اُسے دیکھتی رہی۔ لیکن نہ تو اس کی آنکھیں ہی کچھ بتا سکیں اور نہ اس کی بے جان اور سپاٹ آواز ہی اس کے دل کا راز کھول سکی۔ لیکن اس شام ... معمولاً کپڑے تبدیل کر کے اپنے کسی دوست سے ملاقات کرنے چلا ... میرے دل کی دھڑکنیں بتا رہی تھیں کہ ... ڈاکٹر جاویری سے ملنے گیا ہے۔

کئی دن ہو گئے جاویری مجھ سے ملنے نہیں آئی۔ پھر ایک دن ایک خوشگوار دن ... جو کچھ سنا وہ میرے لیے ناقابل

بیان تھا۔ ڈاکٹر جادیری نے اپنے گھر میں چھت کے پنکھے میں لٹک کر خودکشی کرلی تھی۔ لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا اس نے مجھے کچل کر رکھ دیا۔ ڈاکٹر جادیری کی خودکشی کے تیسرے دن، میرا پتی شام کی چائے پیتے ہوئے مجھ سے کہنے لگا

"پولیس کا شک کچھ زیادہ غلط نہیں لگتا۔"

"کیسا شک" میں چونک پڑی۔

"یہی کہ ڈاکٹر جادیری کا قتل ہوا ہے"۔

"کیا۔؟" میں اچھل پڑی۔

"ہاں۔ فیملی وائلنس"۔

"کیا مطلب" میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ وہ جواب میں منمنایا۔

"مجھے اس کے شوہر پر ترس آرہا ہے۔" یہ کہہ کر وہ اپنی گود میں رکھی کتاب کا صفحہ پلٹنے لگا۔ مجھے لگا کہ اگر وہ کچھ دیر اور چپ رہا تو میرا دم گھٹ جائے گا۔ آخر وہ بولا۔

"وہ ہمیشہ سے اپنی بیوی کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھتا تھا۔ اور الجھن میں مبتلا تھا۔ لیکن میری اطلاعات نے شاید اس کو پاگل کردیا۔"

"تمہاری اطلاعات" میں نے ٹوکا۔

"میں ہرگز اس کے شوہر سے ان باتوں کا ذکر نہ کرتا جس کے نتیجے میں وہ اکثر پریشان رہا کرتا تھا۔"

"کیا۔؟" میں اچھل پڑی کیا تم ڈاکٹر جادیری کے شوہر سے ملے تھے۔؟ کن باتوں کا ذکر کیا ہے تم نے اُن سے"۔

"انھیں باتوں کا"۔ اس نے سپاٹ آواز میں جواب دیا۔ "جن نامناسب باتوں کے لیے ڈاکٹر جادیری میرے گھر کو استعمال کرتی تھی مجھے دکھ ہو رہا ہے بیچارہ شوہر"!

پھر وہ اپنی کتاب میں کھو گیا۔ میں پورے بدن سے کانپ رہی تھی۔ میرے ہاتھ چائے کے برتنوں کو سنبھال نہیں پا رہے تھے اور ماتھے پر پسینے کی بوندیں ابھر آئی تھیں کہ اسی درمیان مجھ سے آنکھیں ملائے بغیر وہ دھیرے سے بولا۔

"ڈی۔ ایچ لارنس کا یہ مضمون ضرور پڑھنا وہ کہتا ہے"۔

آپ جتنی کامیابیاں چاہیں حاصل کرسکتے ہیں مگر آپ کے اندر ایک افریقہ موجود رہے گا جہاں سے چیخیں اور دھاڑیں بلند ہوتی رہیں گی"۔

آج جب میں بوڑھی ہوچکی ہوں تو شاید ایک بات یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ لوگ جو روح پر یقین کرکے مادّے پر شک کرتے تھے۔ اتنے ہی بیچارے تھے جتنے آج مادّے پر یقین کرکے روح پر شک کرتے ہیں ہمیشہ کہیں ... دل رہتا ہے ؟ —— ••

غزلیں

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

بہارِ باغِ امکاں کے نظارے کم نہیں ہوں گے
نظارے دیکھنے والوں میں لیکن ہم نہیں ہوں گے

جہاں میں جب ترے جلووں کی زد پہ ہم نہیں ہوں گے
ترے جلوے تو ہوں گے اس طرح پیہم نہیں ہوں گے

تم اپنی بزم میں اب ہم کو پہچانو نہ پہچانو
کمی محسوس ہوگی بزم میں جب ہم نہیں ہوں گے

جہاں جھلکی تمہارے اک تبسم کی پڑی ہوگی
وہاں ہوگی مسرت رقص فرما ہم نہیں ہوں گے

کلیم و طور کی باتیں پرانی ہی سہی لیکن
ترے جلوے نہیں ہوں گے یہاں جب ہم نہیں ہوں گے

ہزاروں انقلاب آئیں ہزاروں آندھیاں آئیں
ترے شعلے غمِ جاناں! کبھی مدھم نہیں ہوں گے

یہ ناقدری زمانے کی جو ہم پر آج ہنستی ہے
ہمیں اُس وقت روئے گی یہاں جب ہم نہیں ہوں گے

○

غمِ دوراں غمِ جاناں کا بدل ہے کہ نہیں
اس میں بھی تاب و تبِ سوزِ ازل ہے کہ نہیں

محفلِ شعر میں کل تک جو رہی ہے ممنوع
آج اس تلخ کلامی کا محل ہے کہ نہیں

جو حدودِ غمِ جاناں سے پرے جا نہ سکے
آج اس ذہن میں اے دوست خلل ہے کہ نہیں

علمِ افکار زمانے میں بڑا علم سہی
علم ہر دور میں محتاجِ عمل ہے کہ نہیں

جس نے اس دور میں محتاج کا توں کر دیا
وہ [illegible] کا حل ہے کہ نہیں

اُڑ سکے عرشِ سخن پہ جو خاک پہ جو چل نہ سکے
آج اس فکر میں تقصیرِ وکسل ہے کہ نہیں

موت اور اس کے عواقب سے ڈرانے والے!
موت کی طرح غمِ زیست اٹل ہے کہ نہیں

جس کو تو زہر سمجھتا ہے ادب کے حق میں
وہ مرے شعر میں تریاق و عسل ہے کہ نہیں

اے غزل کو غمِ محبوب سمجھنے والے!
یہ جو اب میں نے سنائی ہے غزل ہے کہ نہیں

رو میں ہے رخشِ عمر

میمن شاہد وارثی

آج سے بیس سال قبل جب اس نے اس گھر میں آنکھیں کھولی تھیں تو اس کے گھر کا عجیب ہی ماحول تھا۔ خاندانی وجاہت، شرافت اور قدیم روایات کی ایک موٹی چادر اس کے پورے خاندان کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے تھی۔ کیا مجال کہ اس چادر کو ذرا سا بھی سرکانے کی کوئی ہمت کرے۔ گو کہ اس چادر کے تاگے اب تار تار ہوئے جا رہے تھے اور نئے زمانے اور وقت کی ایک دبیز گرد اس پر جم گئی تھی۔ لیکن اس چادر کا ایک ایک تاگا، ایک ایک سوت اس خاندان کو اتنا عزیز اور پیارا تھا کہ وہ اسے اپنے وجود سے الگ کرنا نہیں چاہتا تھا۔

ذرا سا لڑکیوں کے سر پر سے دوپٹہ کھسکا اور امی جان چیخیں "اری لونڈیو! ذرا شرم کے گھونٹ لو۔ اس طرح ہونق بنی کیوں پھر رہی ہو۔ آخر گھر کی عزت کو خاک میں ملانے پر کیوں تلی ہوئی ہو"

بغیر برقعہ پہنے لڑکیاں گھر سے کہیں جانے کے لئے نکلتیں تو ابا کے غصہ کا پارہ آسمان کو پہنچ جاتا۔ اور زمین پر پاؤں پٹکتے ہوئے گھر میں داخل ہوتے۔ "بغیر برقعہ اوڑھے یہ لڑکیاں کہاں جا رہی ہیں؟ اگر کسی نے پہچان لیا کہ مولوی نعیم اللہ کی لڑکیاں اب گھر سے بے پردہ نکلنے لگیں تو خاندان کی عزت خاک میں مل جائیگی۔ ان سے شادی کون کرے گا۔"

ایک بار چوری چھپے اس کی بڑی بہن اور پھوپھی زاد بہن سلمیٰ آپا نے اپنے ہونٹوں کو لپ اسٹک سے رنگ لیا اب کیا تھا گھر میں قیامت آگئی۔ دادی، امی جان، خالہ اور پھوپھی جان سب اپنے اپنے سر کو پیٹنے لگیں، جیسے گھر میں کوئی بڑا حادثہ ہو گیا ہو۔ ان دو لڑکیوں کی وہ پٹائی ہوئی کہ نانی یاد آگئی۔

اس نے ایکبار اپنی امی جان سے ڈرتے ڈرتے کہا۔ گھر میں مولوی صاحب تو پڑھانے آتے ہی ہیں لیکن اب وہ اسکول میں اپنا نام لکھوانا چاہتی ہے۔

کیوں؟" امی جان نے سوال کیا۔

اس لئے کہ اب میں نے قرآن شریف اور نور نامہ کے علاوہ اردو کی چوتھی کتاب بھی ختم کر ڈالی ہے۔ ذرا انگریزی بھی پڑھنی چاہیئے۔ محلے کی اور لڑکیاں تو اسکول جاتی ہیں۔

خبردار مُردار! جو آج سے اسکول کا نام لیا۔ کیا تجھے آفس میں کام کرنا ہے اور سرٹیفکیٹ کا تمغہ لٹکانا ہے؟ کی بیٹی فردوسیہ کیطرح کسی غیر برادری کے لونڈے کا ہاتھ پکڑنا ہے۔؟ اس کے بعد اس کی امی جان نے اسے وہ

پھٹکار سنائی کہ الٰہی توبہ۔

اس کے خاندان میں اعلیٰ تعلیم بس قرآن شریف نور نامہ' اور اردو کی چوتھی کتاب کا تی ا تھا۔ اس کے ابّی جان مولوی نعیم اللہ کا خیال تھا کہ گھر کی چار دیواری میں رہ کر ہی لڑکیوں کی تعلیم دلوانا بہتر ہے انگریزی کی اعلیٰ تعلیم لڑکیوں کے اخلاق کو بگاڑتی ہے۔ لڑکیوں کی بے شرمی اور بے حیائی میں بے پردگی اور انگریزی تعلیم کو بڑا دخل ہے سو انہوں نے آج تک اپنے خاندان کی لڑکیوں کو اسکول یا کالج نہیں بھیجا۔

لیکن آج ۲۰ سال کے بعد جب اس کے ابّی جان مولوی نعیم اللہ کا انتقال ہوگیا تھا۔ اور اس کی بوڑھی امّی جان زمانے کی ستم ظریفیاں سہنے کیلئے زندہ رہ گئی تھیں۔ اسکول اور کالج میں تعلیم کا حاصل نہ کیا جانا اس کے لئے ایک وبال جان بن گیا تھا۔ اور اس کی شادی نہیں ہو رہی تھی۔ آج اس کی خاندانی شرافت اور وجاہت کو کوئی نہیں پوچھ رہا تھا۔ حسنِ سیرت اور حسنِ صورت نام کی کوئی چیز اس دنیا میں باقی نہیں رہ گئی تھی یہ تمام سکے کھوٹے تھے جن کی قدر وقیمت نہیں تھی کہیں بھی رشتہ کی بات چلائی جاتی تو پہلا سوال یہی ہوتا " لڑکی میٹرک پاس ہے؟

اور اس کے پاس میٹریکولیشن کی کوئی سرٹیفکیٹ نہیں تھی۔

رات اندھیری ہے۔ حویلی میں پُر اسرار سناٹا چھایا ہوا ہے۔ حویلی کے ایک کمرے سے سسکنے کی آواز آرہی ہے۔ کوئی لڑکی بارگاہِ رب العزت میں سربسجود ہو کر گڑگڑا رہی ہے۔

اے مالکِ بے نیاز! میرے پاس میٹریکولیشن کی سرٹیفکیٹ نہیں ہے۔ اس سرٹیفکیٹ کو حاصل کرنے کے لئے تو میری عمر کم از کم پانچ سال کم کر دے۔ تاکہ میں میٹریکولیشن کی تیاری کر سکوں اور امتحان دے سکوں۔" لوگ میری مذہبی تعلیم حسنِ سیرت اور میری سلیقہ مندی کو نہیں دیکھتے لیکن تو تو جانتا ہے کہ مجھ میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں۔ جو کسی نئے گھر کو آباد کرنے کے لئے درکار ہیں۔ تو میرے رخشِ عمر کی باگ کو کس دے کہ مجھ پر اکیسواں سال نہ چڑھ سکے۔

حویلی سے یہ آواز رات کی تاریکی میں ہمیشہ سنائی دیتی ہے —

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

برکتوں کا مہینہ

(ادارہ)

روزے کو عربی زبان میں صَوم کہتے ہیں جس کے معنی بات چیت یا کھانے پینے سے رک جانے کے ہیں اور شریعت میں صبح صادق سے سورج ڈوبنے تک کھانا پینا چھوڑنے، عورتوں سے الگ رہنے اور بُری باتوں سے بچنے کو صَوم یا روزہ کہتے ہیں۔

قرآن و حدیث میں روزے کی اہمیت اور فضیلت بہت آئی ہے۔ قرآن میں ہے کہ ــــ

"مسلمانوں تمہارے اوپر روزے اسی طرح فرض کئے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے دوسری امتوں پر فرض کئے گئے تھے۔" (سورۃ بقرہ)

اس سے معلوم ہوا کہ نماز کی طرح روزہ کا حکم بھی خدا نے دوسری امتوں کو دیا تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جتنے نبی اور رسول اس دُنیا میں گزرے ہیں ان سب نے اس کی تاکید کی ہے۔ قرآن مجید جو اس دُنیا میں خدا کی سب سے بڑی نعمت اور دولت ہے اس کا نزول اسی مُبارک مہینے رمضان سے شروع ہوا تھا جس میں روزے رکھنے کا حکم ہے۔

قرآن مجید میں ہے کہ روزے کے ذریعے آدمی میں شکر اور پرہیزگاری پیدا ہوتی ہے اور حدیث میں اس کی بے شمار فضیلت و اہمیت بیان کی گئی ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ــــ ہر نیکی کا ثواب بندوں کے اعمال میں دس گُنے سے سات سو گُنے تک لکھا جاتا ہے۔ لیکن روزہ خاص میرے لئے ہے اور میں خود ہی اس کا بدلہ دوں گا۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے اجر کی کوئی مقدار مقرر نہیں ہے۔ لیکن یہ اجر و ثواب اُس وقت ملے گا جب روزہ مقبول ہو اور کسی عبادت کے مقبول ہونے کے لیئے سب سے ضروری چیز خلوص ہے۔ یعنی وہ عبادت جو صرف خدا کے لیئے کی گئی ہو۔

روزہ ایک ایسی عبادت ہے جس میں خلوص دوسری عبادتوں کے مقابلہ میں زیادہ ہوتا ہے۔ ایک آدمی اگر چاہے تو چھپ کر کھا پی سکتا ہے۔ یا خواہش نفس پوری کر سکتا ہے۔ اور یہ سب کرتے ہوئے اُسے خدا کے علاوہ کوئی اور نہیں دیکھ سکتا۔ مگر اس [illegible] نہ تو وہ کھاتا پیتا ہے اور نہ اپنی خواہش نفس پوری کرتا ہے۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خدا ہی کے لئے روزہ رکھتا ہے۔ اس بنا پر پروردگار عالم نے ارشاد فرمایا ہے کہ "روزہ کا بدلہ میں دوں گا۔" [illegible] اس خلوص کے باوجود بعض اعمال ایسے

ہیں جو روزہ کے خلوص کو خراب کر دیتے ہیں اور روزہ دار اس کے ثواب سے محروم رہ جاتا ہے۔ مثلاً روزہ میں لڑائی جھگڑا کرنا۔ گالی بکنا۔ پیٹھ پیچھے کسی کی برائی کرنا۔ چغلی کرنا۔ مالِ حرام کھانا وغیرہ وغیرہ۔ جو لوگ ان باتوں سے نہیں بچتے ان کے بارے میں حضورؐ کا ارشاد ہے کہ ـــ

"جو شخص غلط کام، جھوٹ اور گناہ کی بات نہ چھوڑے تو اللہ کو اس کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔"

غلط بات اور غلط عمل میں زبان اور جسم کا ہر برا اور غلط کام شامل ہے۔ آپ نے ایک اور موقعے پر فرمایا

"کتنے روزہ دار ہیں جن کو پیاسا رہنے کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہے"۔

ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ ـــ "روزے سے گناہ ضرور معاف ہو جاتے ہیں مگر اس کے لئے دو شرطیں ہیں ایک ـــ ایمان ـــ اور دوسرے ـــ احتساب۔" ایمان تو یہ ہے کہ اس کو خدا، رسالت اور آخرت پر یقین ہو اور احتساب یہ ہے کہ روزہ خدا ہی کے لیئے رکھا گیا ہو اور اس کو تمام برائیوں سے محفوظ رکھا گیا ہو۔

روزے کی فرضیت

حضورؐ اور صحابہؓ کرام جب تک مکے میں رہے برابر نفل روزے رکھتے تھے۔ رمضان کے روزے فرض نہیں ہوئے تھے جب آپؐ مکے سے ہجرت کرکے مدینہ تشریف لے گئے تو وہاں جانے کے ڈیڑھ برس بعد ۲ھ میں روزہ فرض ہوا اور رمضان پورے مہینے کے روزے رکھنے کا حکم دیا گیا۔ ہر عاقل بالغ مرد اور عورت پر پورے رمضان کے روزے فرض ہیں۔ بغیر کسی عذرِ شرعی اس کا چھوڑنے والا سخت گنہگار اور فاسق ہوگا۔

رمضان کا چاند

حضورؐ کا ارشاد ہے کہ۔ "چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر روزہ ختم کرو" اسی حکم کی بنا پر شعبان کی ۲۹ تاریخ کو رمضان کا چاند دیکھنے کی کوشش کرنا مسلمانوں پر واجب ہے۔ اگر مطلع صاف نہ ہو اور عام لوگوں کو چاند نظر نہ آیا ہو لیکن اگر ایک نمازی پرہیزگار اور سچا مسلمان چاہے مرد ہو یا عورت یہ گواہی دے کہ میں نے چاند دیکھا ہے تو اس کی گواہی مان لینی چاہیئے۔ اور دوسرے روز سے روزہ شروع کر دینا چاہیئے۔ (فتاوی ہندیہ ج ا ص ۱۹۷) اگر مطلع صاف ہو تو پھر ایک دو آدمیوں کی گواہی سے کچھ نہیں ہوتا۔ اس صورت میں اتنے آدمیوں کا دیکھنا ضروری ہے۔ کہ جن کا جھٹلانا آسان نہ ہو۔

روزہ کا وقت

روزہ کا وقت صبح صادق سے غروب آفتاب تک ہے

روزے کے صحیح ہونے کے لیئے نیت ضروری ہے اگر بغیر نیت کے روزہ رکھا جائے تو درست نہ ہوگا۔ زبان سے نیت کرنا ضروری نہیں دل میں ارادہ کر لینا بھی کافی ہے۔ نیت کے لئے ضروری نہیں کہ عربی میں کریں بلکہ جس زبان میں نیت کرے گا ہو جائے گی۔

عربی کی نیت یہ ہے۔ نَوَیْتُ بِصَوْمِ الْیَوْمِ۔

سحری روزہ رکھنے کی نیت سے جو کھانا یا پانی صبح صادق سے پہلے کھایا یا پیا جاتا ہے اُسے سحری کہتے ہیں۔ سحری کھانا سنت ہے۔ اور اس کے کھانے میں ثواب ہے۔

افطار سورج ڈوبنے کے بعد روزہ ختم کرنے کے خیال سے جو کچھ کھایا پیا جاتا ہے اس کو شریعت میں افطار کہتے ہیں۔ جس طرح سحری میں تاخیر کرنا ثواب ہے۔ اس طرح افطار میں جلدی کرنا ثواب ہے۔ جلدی کا مطلب یہ ہے کہ جوں ہی اس بات کا یقین ہو جائے کہ سورج غروب ہو گیا فوراً روزہ افطار کرلینا چاہیئے۔ انتظار نہ کرنا چاہیئے کہ ذرا اندھیرا ہو جائے۔ حضورؐ کا ارشاد ہے میری امت اس وقت تک بھلائی پر رہے گی جب تک افطار میں جلدی کرتی رہے گی۔ دیر کرنا مکروہ ہے۔ افطار کی دعا یہ ہے۔ اللّٰھُمَّ لَکَ صُمْتُ وَعَلٰی رِزْقِکَ اَفْطَرْتُ۔ (اے اللہ میں نے تیرے لئے روزہ رکھا اور تیری دی ہوئی روزی سے افطار کیا)

روزے میں اپنا کوئی وقت بے کار کاموں اور فضول باتوں میں نہ گنوانا چاہیئے بلکہ جو وقت روزی کمانے سے بچے اسے قرآن کی تلاوت۔ نفل نماز یا کسی اور نیک کام میں صرف کرنا چاہیئے۔

مکروہات روزے میں کھانا پینا اور مباشرت ترک کرنا فرض ہے ان کے کرنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ لیکن بعض چیزیں ایسی ہیں جن سے روزہ ٹوٹتا تو نہیں مگر مکروہ ہو جاتا ہے۔ اور ثواب کم ہو جاتا ہے۔ (۱) کسی کی عدم موجودگی میں اس کی برائی کرنا (۲) چغلی کھانا گالی بکنا لڑائی جھگڑا کرنا۔ فضول باتیں کرنا (۳) کسی چیز کا منہ میں ڈالے رکھنا یا چبانا چاہے وہ کھانے کی چیز ہو یا نہ ہو (۴) کوئی کھانے کی چیز چکھنا۔ اگر کسی عورت کا شوہر یا کسی نوکر کا مالک چڑچڑا ہو تو نمک چکھ لینے کی اجازت ہے۔ (۵) کلی اس طرح کرنا کہ حلق تک پانی پہونچ جائے (۶) نہانے کی ضرورت ہو اور اس میں تاخیر کرنا (۷) تھوک نگل جانا — وغیرہ وغیرہ

جن باتوں سے روزہ مکروہ یا فاسد نہیں ہوتا

سر پر تیل ڈالنا۔ بدن پر تیل ملنا۔ سرمہ لگانا۔ مسواک کرنا۔ خوشبو لگانا یا سونگھنا۔ بھولے سے کھا پی لینا یا مباشرت کرلینا۔ خود بخود قے ہو جانا گرمی کی شدت سے بار بار کلی کرنا یا بدن پر پانی ڈالنا یا کپڑا تر کرکے بدن پر رکھنا۔

سفر اگر کوئی شخص ۴۸ میل (۷۷ کلومیٹر) سے زیادہ سفر کا ارادہ رکھتا ہو خواہ پیدل ہو ریل سے ہو یا ہوائی جہاز سے اسے روزہ چھوڑ دینے کی اجازت ہے لیکن اگر سفر میں تکلیف نہ ہو تو روزہ رکھنا بہتر ہے۔

مرض اگر کوئی اتنا بیمار ہو کہ روزہ رکھنے سے شدت کا ڈر ہو یا کسی نئی بیماری

پیدا ہونے کا اندیشہ ہو جائے۔ یا اچھا ہونے میں دیر لگے گی۔ تو اس کو روزہ چھوڑنے کی اجازت ہے۔

حاملہ اور دودھ پلانے والی عورتیں جو عورت حاملہ ہو یا بچے کو دودھ پلاتی ہو اس کو اگر اپنی یا اپنے بچے کی جان کو ضرر پہونچنے کا اندیشہ ہو تو روزہ چھوڑ سکتی ہے۔

احترام روزہ

اگر کسی کو روزہ رکھ کر توڑ دینے یا چھوڑ دینے کی ضرورت ہی پیش آجائے تو جہاں تک ممکن ہو اس کو چھپائے اور کسی کے سامنے کچھ کھائے پیئے نہیں اور نہ روزہ دار عورتوں کو پکانے کی زحمت دے۔ جب تک کہ بالکل مجبور نہ ہو۔ نہ کوئی مسلمان بے وجہ کسی مسلمان سے یہ دریافت کرے کہ وہ روزہ سے ہے یا نہیں۔ روزے کی تلقین ضروری ہے۔ مگر بے سبب تجسس نہیں کرنا چاہیئے۔ روزے کا ظاہری احترام بہرحال ضروری ہے موجودہ دور میں روزہ نہ رکھنے والوں کو کوئی سزا دینے والا تو نہیں ہے مگر مسلمانوں کو یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ آخرت کی سزا دنیا کی سزا سے ہزاروں گنا سخت ہے۔

نمازِ تراویح

رمضان کے مہینے میں عشاء کی فرض اور سنت نماز کے بعد اور وتر سے پہلے جو نماز پڑھی جاتی ہے اس کو شریعت میں نماز تراویح کہتے ہیں۔ تمام بالغ مردوں اور عورتوں کے لیئے نمازِ تراویح کا پڑھنا سنت موکدہ ہے البتہ عورتوں کو گھر میں پڑھنا چاہیئے۔

آخری عشرہ

یوں تو رمضان کا پورا مہینہ خیر و برکت کا ہے مگر اس کے آخری دس دن بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں اس میں دو اہم اور ضروری کام ہیں ایک تو اعتکاف کرنا اور دوسرے شب قدر کو تلاش کرنا۔

اعتکاف

اعتکاف کے لفظی معنی ٹھہرنے اور کسی جگہ بند ہونے کے ہیں۔ شریعت میں رمضان کے آخری دس دنوں میں یا دوسرے دنوں میں دنیوی کاروبار اور بیوی بچوں سے الگ ہوکر اور کٹ کر مسجد یا گھر میں نماز کی جگہ ٹھہرنے کو اعتکاف کہتے ہیں۔ اعتکاف کا طریقہ یہ ہے کہ مسجد کے ایک گوشہ میں اپنے لئے جگہ مقرر کرلے اور وہاں دس دن تک رہے وہیں کھائے پیئے اور سوئے اور وہاں سے بے ضرورت باہر نہ نکلے۔ بیس تاریخ کی عصر کو اعتکاف میں بیٹھے اور عید کا چاند دیکھ کر ختم کرے۔ عورتوں کو اپنے گھر میں نماز پڑھنے کی جگہ پر اعتکاف کرنا چاہیئے۔

شب قدر

رمضان کے دس دنوں میں سب سے ضروری کام طاق راتوں میں شب قدر کی تلاش کرنا ہے

رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں ایک بہت ہی با عظمت اور متبرک رات ہوتی ہے اسی کو قرآن میں اور حدیث میں لیلۃ القدر

ہوگیا ہے۔ اس کے معنی قدر او ر اندازے کی رات ہیں اس رات کو لیلۃ القدر اس لئے کہتے ہیں کہ سال بھر میں جو کچھ ہونے والا ہوتا ہے اس کا پورا خاکہ اسی رات کو تیار ہو جاتا ہے۔ بندوں کی روزی مقرر ہوتی ہے زندگی موت اور ان کے کاموں کے بارے میں فیصلہ ہوتا ہے اور جو اس رات کی عبادت میں مشغول رہتا ہے اس کی خدا کے یہاں بڑی عزت و قدر ہوتی ہے۔ فرشتے اس کے لئے دعا کرتے ہیں قرآن میں ہے کہ یہ رات ایک ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے۔

اس رات یہ دعا کثرت سے پڑھنی چاہیئے۔

اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّیْ۔

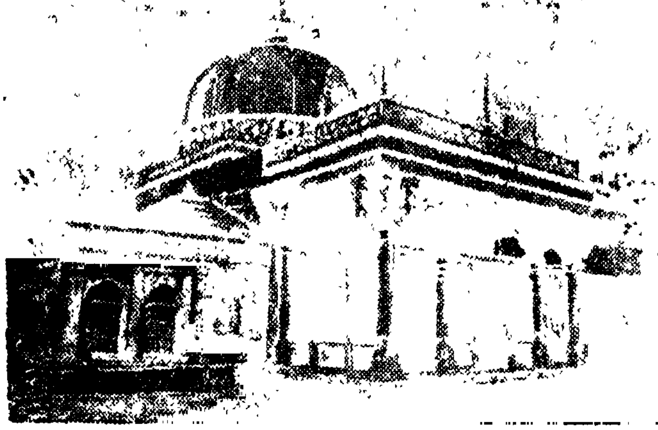
(اے اللہ تو سراپا عفو و درگزر کرنے والا ہے تو مجھے بھی معاف کر اور بخش دے۔)

صدقات وخیرات اس مہینے میں صدقات وخیرات کا ثواب بھی بہت زیادہ ہے۔ عام صدقہ اور خیرات کے علاوہ آنحضرتؐ نے ہر مسلمان کے لئے اس مہینے میں ایک صدقہ ضروری بھی قرار دیا ہے

صدقۂ فطر اس کو شریعت میں صدقۂ فطر کہتے ہیں۔ یعنی روزہ ختم کرنے کا صدقہ حدیث ہے کہ —— حضورؐ نے صدقۂ فطر اس لئے ضروری قرار دیا ہے کہ روزے میں جو غلطی سے بیکار باتیں ہو جاتی ہیں اور بے خیالی میں جو برے خیالات پیدا ہو جاتے ہیں ان سے روزہ پاک ہو جائے اور اس کے ذریعہ غریبوں کی روزی کا بھی سامان ہو جائے

صدقۂ فطر ہر اس مسلمان پر واجب ہے چاہے مرد ہو یا عورت جس کے پاس سوا پانچ تولے سونا یا ساڑھے چھتیس تولے چاندی یا اس کے برابر نقد روپے ضرورت سے زیادہ موجود ہوں۔ صدقۂ فطر میں پونے دو سیر گیہوں یا اس کا آٹا یا ساڑھے تین سیر جَو یا اس کا آٹا دینا چاہیئے۔ اور یہ عید کی نماز سے پہلے دے دینا چاہیئے۔

صدقۂ فطر کی مقدار کے حساب سے اس کی قیمت بھی دی جا سکتی ہے اور فی زمانہ یہ مناسب بھی ہے۔



روضۂ حضرت خواجۂ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ

زائرینِ اجمیر شریف سے گذارش

حیدرآباد و بیرونِ حیدرآباد سے زیارت کیلئے اجمیر شریف جانے والوں کو توجہ دلائی جاتی ہے کہ اجمیر شریف میں حیدرآباد ہاؤز کے نام سے ایک قیام گاہ کا انتظام کیا گیا ہے جہاں ہر قسم کی سہولت ہے۔ سید مہتاب احمد نیازی و سید افتخار احمد نیازی و سید فرخ احمد نیازی اس قیام گاہ کے بہترین منتظمین میں سے ہیں اور آنے والے زائرین کا اچھی طرح سے خیال فرماتے ہیں اور جو لوگ قیام کے ساتھ طعام کی خواہش کرتے ہیں۔ ماشاء اللہ اس کا بھی انتظام ہو جاتا ہے۔ اگر آپ جانا چاہیں تو جانے سے قبل مندرجہ ذیل پتہ پر اطلاع دیں:

سید مہتاب احمد چشتی نیازی

حیدرآباد ہاؤز

محلہ چاہ ارہٹ۔ پوسٹ بکس ۱۲۵ اجمیر شریف (انڈیا)

تار کا پتہ: "آفتاب" اجمیر

المشتہر:

حاجی محمد عثمان میاں حیدرآبادی۔ ایس، ایم، قربان علی جنرل مرچنٹ سدی عنبر بازار حیدرآباد

نوٹ: اگر اطلاع نہ دے سکیں تو ریلوے اسٹیشن اجمیر شریف پر پتہ دریافت کریں۔

مبصر: رؤف خیر

"پیام اقبال"

از: محمد بدیع الزماںؒ (ریٹائرڈ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ)

سمندر کے کنارے سیپیاں چننے والے بچے بھی ہوتے ہیں اور بڑے بڑے غواص بھی ہوتے ہیں جو بیٹھے کر کے ڈوبتے ہیں کہ اب جو سر ابھاریں گے تو خالی ہاتھ نہ نکلیں گے۔ بلکہ موتی لائیں گے — اب قطرۂ آب سے اس کی فاختہ سیراب ہو جاتی ہے تو جنگی جہاز بھی اس میں پڑاؤ ڈالے پڑے رہتے ہیں۔ کوئی سمندر میں رہ کر بھی پیاسا رہ جاتا ہے۔ اور کوئی آتش دیگ سے شاداں و فرحاں — اور سمندر ان سب سے بے نیاز اپنے مدوجزر میں مست ہے — اسے تو بس اپنے وجود کا احساس دلانا تھا — اب اپنے اپنے ظرف کے مطابق اس سمندر سے فیض اٹھانے والے فیض اٹھا رہے ہیں اور کوسنے والے بھی ہیں جو اسی سمندر کے ساحل پر کھڑے ہو کر ہی کوس سکتے ہیں۔ سمندر میں اترنے کی جسارت نہیں کر پاتے، قبول کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔

اقبال ایک ایسا ہی سمندر ہے۔ اقبال وہ کسوٹی ہے جس پر ہمارا سونا کھرا یا کھوٹا ثابت ہوتا ہے۔ ہمارا سونا کھرا ہے تو ظاہر ہے کسوٹی اسے کھوٹا نہیں کر سکتی اور سونے میں کھوٹ ہو تو وہ اقبال کی کسوٹی پر آکر کھرا نہیں رہ جاتا بلکہ تائید میں خزف ریزے تک بول اٹھتے ہیں۔

اقبال کا پیام کوئی راز کی بات نہیں — علم سینہ بہ سینہ نہیں — صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے۔

محمد بدیع الزماں صاحب نے بڑی محنت سے بعض اہم موضوعات پر معلومات جمع کر دی ہے۔ جیسے اقبال کا نظریۂ شاعری اقبال کا تصورِ خودی، اقبال اور وطنیت، اقبال کا ساقی، اقبال کے انقلابی تصورات، معاملاتِ حسن و عشق، ترغیبِ عمل کے رجحانات، تشبیہات واستعارات، مناجات، طنز، اقبال کے ذہن میں خواتین کا درجہ، اقبال کا شاہین اور اقبال اور تصوف — اس طرح اقبال کی ایک اچھی خاصی تصویر کھینچ کے رکھ دی ہے۔ اور اس کے لئے پیٹنٹ رنگ دینے بجائے رنگ کا استعمال ہوا ہے۔ یعنے بیشتر نقادوں کی آرا کو کوٹ کیا گیا ہے۔ اور یہ سب کام فاضل مجسٹریٹ صاحب نے نہایت انکساری سے کیا ہے کوئی لمبا چوڑا دعویٰ نہیں کیا۔ ورنہ لوگ اقبال فہمی تو کجا قد چار کتابیں پڑھ کر ایک نئی تفسیر قرآن لکھنے تک بیٹھ جاتے ہیں — بدیع الزماں صاحب نے بڑی محنت کی ہے اور اپنے موضوعات پر خاصا مواد اکھٹا کر کے قلم اٹھایا ہے اور "پیام اقبال" کو تالیف کے درجہ تک تو پہنچا ہی دیا — اقبال پر کسی نئے کا اضافہ کرنا یوں بھی بہت دقت طلب امر ہے۔ بدیع الزماں صاحب نے ایسا کوئی دعویٰ بھی نہیں فرمایا — مگر اقبالیات کے طلبہ کے لئے اس کتاب میں خاصا مواد مل جاتا ہے۔ یہی کیا کم ہے کتاب کی قیمت چالیس روپیہ ہے جو حکومتی اداروں اور پبلک سیلاریز کے حساب سے تو خیر ٹھیک ہے مگر عوام کی قوتِ خرید کے لئے ایک چیلنج —

قطبِ اردو

وقار خلیل

آسمانِ شعر کے اے اوّلین ماہِ تمام — تیرے فکر و فن میں ہے کیفیتِ رنگِ دوام
کوہ نورِ شہرِ دل، اردو کے پہلے تاجدار — حیدرآبادِ دکن تیری محبت کا دیار
سجدہ گاہِ نازنینانِ دکن بالا حصار — چار مینارہ ترے عہدِ وفا کی یادگار
آج بھی جیسے بہ اندازِ وفائے مستقل — ذرہ ذرہ میں دھڑکتا ہے اک تیرا ہی دل
جیسے ساون رت میں نکلے آسمانوں پر دھنک — یا سمٹ جائے کسی مرکز پہ تاروں کی چمک
نام سے اردو کے جب تک یہ زمیں ہے آسماں — فن کے مہر و ماہ کا ہے قافلہ جب تک رواں

روح پر چھاتا رہے گا تیرے گیتوں کا شباب
یاد تیری دل میں ٹھہرے گی مثالِ آفتاب

تیرا دورِ سلطنت تھا وہ اجالوں کی کتاب — جس سے روشن ہو گئے تاریخِ انسانی کے خواب
قطبِ اردو کا وطن، گہوارۂ علم و ہنر — حیدرآبادِ دکن ہے مرکزِ شمس و قمر

اے معانی سخن! اے دیدہ ور! اے رازداں
ناز کرتی ہے ترے اخلاص پر اردو زباں
تیرے فیضانِ سخن کی مشعلیں جلتی رہیں
باغِ اردو میں سدا کلیاں نئی کھلتی رہیں

قطعہ

ہوئی جو قوم فسردہ تو زندگی کم ہے
شعور مُردہ ہے احساس آگہی کم ہے

بجھا دیا ہے خرابات نے چراغِ خودی
نئے چراغ جلاؤ کہ روشنی کم ہے

غزل

بشیر وارثی

دیارِ ظلم سے سوغاتِ چشمِ تر لے جا
یہی بچا ہے میرے پاس اک ہنر لے جا

انانیت نہیں تیرے ضمیر کا جوہر
مٹا کے اپنی خودی آہِ پُراثر لے جا

دعا شعار نگاہوں کو روشنی دینے
مرا گداز، مرا دل، مری نظر لے جا

یہ تیرا ساتھ ہی ہے عشق معتبر اب تو
جدھر بھی چاہے مجھے میرے ہمسفر لے جا

تیرا خیال ہی کافی ہے زندگی کے لئے
قسم ہے تجھکو محبت کی گھر کا گھر لے جا

جنوں کے حد سے پرے ہے یہ آخری سجدہ
سرِ نیاز نہ اٹھیگا کاٹ کر لے جا

بشیر اشکِ ندامت کو رائیگاں نہ سمجھ
ہے نذرِ عشق کے قابل یہی گہر لے جا

بوچھار

گرین کارڈ

گرین کارڈ کی اصطلاح سنتے ہی ذہن رنگین خیالوں میں کھو جاتا تھا، تصورات سمندر پار پہونچ جاتا تھا۔ امنگوں اور آرزوؤں کے منہ سے رال ٹپکنے لگتی تھی۔ اور دل کی دھڑکن کی وہی کیفیت ہو جاتی تھی جو کسی خوبصورت حسینہ کو تن تنہا بے نقاب دیکھ کر ہوتی ہے۔ ایک زمانہ تھا "گرین کارڈ" شجر ممنوعہ تھا۔ آج سے ۲۵، ۳۰ سال پہلے شاذ و نادر ہی کسی کو گرین کارڈ ملتا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ جنت شداد امریکہ نے کچھ رعایتیں دینی شروع کیں اور اہل حیدرآباد بھی اس سے فیضیاب ہونے شروع ہوئے۔ رفتہ رفتہ "گرین کارڈ" دولت و ثروت اور عیش و عشرت کا مترادف بن گیا۔ بے روزگار نوجوانوں کی مصروفیتوں میں ایک اور مصروفیت کا اضافہ ہوگیا اور وہ یہ تھا کہ اخبار میں ایسے اشتہاروں کی تلاش جس میں "ضرورت رشتہ" کے تحت کسی ایسی لڑکی کے لئے رشتہ مطلوب ہو جو گرین کارڈ ہولڈر ہے۔

اس سلسلے میں کئی دلچسپ لطیفے بھی ہوئے۔ ضرورت رشتہ کا اشتہار دیکھ کر ایک آئی اے ایس آفیسر نے اپنی لڑکی کے بہترین مستقبل کیلئے سلسلہ جنبانی کی۔ اشتہار میں جلی حرفوں میں یہ تحریر تھا کہ لڑکا گرین کارڈ ہولڈر ہے۔ اس جملے نے ایسا مدہوش کیا کہ موصوف نے مزید کوئی تحقیق مناسب نہ سمجھی اور جب لڑکی وداع ہو کر امریکہ پہونچی تب انہیں پتہ چلا کہ اسکا شوہر کوئی اعلیٰ تعلیم یافتہ یا بہترین عہدے پر نہیں بلکہ امریکہ کی کسی فائیو اسٹار ہوٹل کا بٹلر ہے

اس گرین کارڈ نے عجیب عجیب گل کھلائے۔ تلاش روزگار جن نوجوانوں کو سات سمندر پار لے جا چکی تھی وہ ہندوستانی اور امریکی تہذیب کے درمیان حائل خلیج پاٹنے میں انتہائی ناکام ثابت ہوئے۔ وہ اور انکے نونہال امریکہ میں رہتے تھے اور انکے ضعیف والدین ہندوستان میں۔ رفتہ رفتہ دونوں تنہائی کا شکار ہونے لگے اس کا آسان علاج یہ تھا کہ والدین بھی امریکہ چلے جائیں۔ بزرگوں نے یہ سوچا کہ چلو اپنی آل اولاد کیساتھ رہ کر سکھ بھوگنے کا اچھا موقع ہے لیکن وہاں جاکر پتہ چلا کہ وہاں نئی نسل نے انہیں خدمت کرنے کیلئے نہیں بلکہ ان سے خدمت لینے کیلئے بلایا تھا۔ گھریلو ملازم، باورچی، ملما اور آیا کی خدمات امریکہ میں حا،

کرنا جو ان کے سے سیر لانے سے کم نہ تھا اس کا علاج نئی نسل نے یہ نکالا کہ ہندوستان سے اپنے والدین ہی کو لا کر رکھ لیا جائے تاکہ ہینگ لگے نہ پھٹکری رنگ چوکھا آئے۔

ہندوستان سے روانہ ہوتے وقت ان بزرگوں نے خواب میں بھی یہ نہ سوچا ہوگا وہاں جا کر یہ کیفیت ہوگی کہ نہ خدا ہی ملے گا نہ وصال صنم بہرحال ٹھہر درویش بجانِ درویش سات سمندر پار آ کر واپس جانا بھی کوئی بچوں کا کھیل تو تھا نہیں چنانچہ بچوں کے بڑے ہو جانے تک انہوں نے یہ سوچ کر رہنا گوارا کر لیا کہ پھر تو آرام سے گزرے گی لیکن جب کماؤ پوت کے بچے بڑے ہو گئے تو چڑیا کے بچوں کی طرح گھونسلوں سے بھاگ نکلنے کی تیاری اور آزاد زندگی گزارنے کی سوچنے لگے۔ بوڑھے والدین کی صحت بھی اب مسلسل خراب رہنے لگی تھی۔ لہٰذا کماؤ پوت اور بہو نے اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کا آسان نسخہ ڈھونڈ نکالا۔ کچھ دن تک توان کی تیمار داری کی پھر آہستہ سے کہنے لگے۔ پاپا آپ اور ممی کے لئے یہی بہتر ہے۔ کہ گرین کارڈ کی رعایتوں سے فائدہ اٹھائیں۔ آپ لوگوں کی بہتر نگہداشت کے لئے حکومت امریکہ نے ایسے "بزرگ خانے" کھول رکھے ہیں جہاں ضعیف والدین کی بہترین دیکھ بھال ہوتی ہے اور امریکی شہریوں سے اس کے لئے کوئی معاوضہ نہیں لیا جاتا۔ مفت کھانا، مفت علاج اور مفت تفریح تمام آسائشیں حاصل ہیں۔ جب ہمارے پاس گرین کارڈ موجود ہے تو ہم اور آپ کیوں تکلیف اٹھائیں۔ یہ سن کر ممی اور پاپا بس دیکھتے ہی رہ گئے۔ کماؤ پوت نے دیکھا کہ والدین پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہے تو فوراً سنبھالنے کی غرض سے کہا کہ آپ گھبرائیں نہیں ہم دونوں مہینے دو مہینے میں ایک آدھ شام آپ کے ساتھ ضرور گذاریں گے۔ اور عید یا تہوار کے موقع پر بالالتزام عید کارڈ وغیرہ روانہ کرتے رہیں گے۔

پاپا نے انتہائی ہمت کر کے کچھ پوچھنا چاہا۔ مگر یہ نہ پوچھ سکے کہ بیٹا ہم مر گئے تو کیا کرو گے کیا گرین کارڈ والوں کے کفن دفن کا انتظام بھی سرکاری اخراجات پر ہو جائے گا !!!

غزلیں

٥

کیسے افلاک پہ پہنچے گی دہائی میری — خاک تک بھی تو نہیں آج رسائی میری
صرف ایک بار یہ کہنے کی اجازت دے دے — یہ جہاں میرا زمیں میری خدائی میری
خارِ گلشن میں سجائے تھے اس امید کے ساتھ — رنگ لائے گی کبھی آبلہ پائی میری
ہر نظر روزنِ زنداں نظر آئی مجھ کو — کون صیاد سے مانگے گا رہائی میری

اے خدا میرا کبھی یوں صبر سے دامن بھر دے
جیسے سہہ لیتے ہیں سب لوگ جدائی میری

فاروق عابدی

٥

میرے اپنوں نے یہ تحفہ دیا ہے
صلیب و دار پر لٹکا دیا ہے
یقیناً بھوک بے چینی غریبی
بدلتے موسموں نے کیا دیا ہے
مناسب تم کوئی تجویز رکھنا
مرا تو مشورہ ٹھکرا دیا ہے
نہ جانے کون تھا کس کی نظر نے
بساطِ شہر کو الٹا دیا ہے
یہی انصاری کی ہے کامرانی
غزل نے آپ کو چونکا دیا ہے

[illegible] انصاری

٥

یہ کیسے موڑ پہ آئی ہے داستاں میری
بیاں ہوئی ہیں بہت کچھ برائیاں میری
وہ روح وہ تپشِ دل پلٹ کے پھر آئے
زمانہ بھول گیا کج کلاہیاں میری
وہ مجھ سے سوئے ظن ان کا سمجھ سے باہر ہے
پکڑ رہے ہیں اب ہر بات پر زباں میری
مرے سکوت کی تاثیر رنگ لائے گی
اسی خیال سے چپ ہو گئی فغاں میری
نہ علم ہے نہ عمل ہے کہاں ہیں دل والے
صدا بہ صحرا ہے آوازِ ناتواں میری

[illegible]

بزمِ خیال

اس عنوان کے تحت دو علمی ادبی سوالوں کے جواب دیئے جاتے ہیں

س ۔ روزوں میں غذا کی کمی سے کوئی نقصان تو نہیں پہنچتا ۔

ج ۔ حیات انسانی کیلئے چند تولے غذا کافی ہے ۔ طبی قاعدے یہ ہے کہ دو حصہ غذا کھائی جائے اور ایک حصہ معدے میں جگہ رکھی جائے ۔ غذا معدے میں جاکر پھیلتی ہے اور معدے کے خالی حصے کو پر کر دیتی ہے اگر غذا دو تہائی سے زیادہ کھائی جائے گی تو نہ صرف بے کار ہوگی بلکہ بیماریوں کا باعث بھی ہوگی ۔ فارسی کا ایک شاعر کہتا ہے ۔

سخن آنگہ کند حکیم آغاز —— یا سر انگشت سوئے لقمہ دراز
کہ زنا گفتنش خلل زاید —— یا زنا خوردنش بجاں آید
لاجرم حکمتش بود گفتار —— خوردنش تندرستی آرد بار

"یعنی عقلمند اس وقت بات کہتے ہیں کہ نہ کہنے سے خلل کا اندیشہ ہو اور کھانا اس وقت کھاتے ہیں جب جان تک نوبت پہنچ جائے ایسا کلام حکمت اور ایسی غذا تندرستی کا باعث ہوتی ہے "

حکما کے نزدیک ۵ تولے غذا انسان کی زندگی کیلئے کافی ہے اور ۲۹ تولے غذا کی وہ مقدار ہے کہ اس سے زیادہ انسان کو نہ کھانا چاہیئے ۔ اتنی مقدار غذا کی انسان کی تاب و تواں کیلئے کافی ہے اور اس کو اچھی طرح اٹھا سکتی ہے اگر اس سے زیادہ ہوئی تو اس کا بوجھ انسان کو اٹھانا پڑے گا ۔ یعنی ۲۹ تولے غذا اس خدمت کا پورا بار اٹھا سکتی ہے جو انسان کو انجام دینا پڑتی ہے اگر اس سے زیادہ ہوئی تو انسان کو اس کے ہضم کرنے کا بوجھ اٹھانا پڑے گا یعنی چورن کھانا پڑے گی یا ورزش کرنا پڑے گی ۔

خلاصہ یہ کہ کم کھانا صحت جسمانی اور دماغی ترقی کے لئے ضروری ہے اور یہی نتیجہ روزے سے حاصل ہوتا ہے ۔ روزے میں دو غذاؤں کے درمیان زیادہ فاصلہ ہو جاتا ہے اس سے جسم کو دہرا فائدہ ہوتا ہے ۔ دیر میں غذا کھانے سے حرکت ہضم کو سکون رہتا ہے معدے کو آرام ملتا ہے ۔ افطار میں کھانے کا ایک نظم ہونا چاہیئے کھانا فوراً زیادہ نہ کھانا چاہیئے ۔ پہلے کچھ کھا کر تامل کریں اس کے بعد اور کھائیں ۔ گرم مزاج والوں کو پانی یا شربت کا افطار کرنا بہتر ہے ۔ اور سرد مزاج والوں کے لئے خرما افضل ہے ۔

س - کھجور کے کیا فائدے ہیں ۔

ج ۔ کھجور یا چھوہارا کمر اور دوسرے جوڑوں کو مضبوط اور بدن کو قوی و گرم رکھتی ہے ۔ فالج، لقوہ اور جگر کے گرمیں فائدہ بخش ہے ۔ جوڑوں کو کھولتی ہے ۔ اور جسمانی درد دور کرتی ہے ۔ سرد مزاج والوں کے سینے اور پھیپھڑوں کے لئے اچھی ہے جن کے گردے لاغر ہوگئے ہوں ایسے حضرات کے لئے اس کا استعمال مناسب ہے ۔ ضعیفوں میں دوبارہ جوانی کے آثار پیدا کرتی ہے ۔ اگر پنیر کے ساتھ تازہ کھجور کا استعمال ہو تو چہرے کا رنگ صاف ہوتا ہے ۔ سیلانِ رحم و رطوبتِ رحم کو بند کرتی ہے ۔

...ن نمبر ۱۱۷

[illegible] العصر حیدرآباد

جلد (۳) شمارہ (۴)

جولائی ۱۹۸۷ عیسوی

مدیر اعلیٰ، محمد بشیر الدین بشیر وارثی

مدیر انتظامی، خورشید جنیدی

ناظم نشر و اشاعت، عابد قادری

مشیر قانونی، محمد شمیم

زرِ تعاون: سالانہ پچاس روپے — فی شمارہ پانچ روپے

عرب ممالک سے فی شمارہ ۵ ریال

[illegible]

ڈاکٹر یعقوب عمر

حرفِ آغاز

آج کل یونیورسٹیوں میں جو تحقیقی کام ہو رہے ہیں ان کا معیار دیکھ کر ڈر لگتا ہے کہ رفتہ رفتہ یہ ملت کس گہری کھائی کی طرف بڑھ رہی ہے۔ خصوصاً یونیورسٹیوں کے وہ شعبے جہاں مشرقی زبانوں کی تدریس ہوتی ہے ریسرچ کے نام پر وہ گل کھلا رہے ہیں کہ بے ساختہ علامہ اقبال کا مصرعہ زبان پر آجاتا ہے ؎ یہ اُمت خرافات میں کھو گئی۔

حیدرآباد فرخندہ بنیاد جہاں گزشتہ صدی میں سیکڑوں کی تعداد میں علماً، دانشور، شاعر و ادیب موجود تھے۔ اور جن میں اکثر جامع الکمال تھے۔ انھیں چھوڑ کر ایسی بے نام شخصیتوں پر ریسرچ ہو رہی ہے جنھیں دنیا میں کوئی نہیں جانتا' برصغیر ہند و پاک جن کے نام اور کارناموں (اگر ان کے طبع زاد تحریروں کو یہی نام دیا جا سکتا ہے تو یہی سہی) سے کوئی واقف نہیں۔ ہندوستان میں جن کا نام تک کسی کو معلوم نہیں خود اپنی ریاست میں جو نہیں جانے جاتے' اور تو سب جانے دیجیے خود حیدرآباد شہر میں ان کی شہرت کا یہ عالم ہے کہ کئی سالوں سے خشک رودِ موسی کے اس پار نہیں جا سکی! اور پرانے شہر میں بھی خال خال لوگ ہی ان سے یا ان کی ادبی تک بندیوں سے واقف ہیں ایسی مجہول ترین شخصیتیں ہی ریسرچ اور تحقیق کا ہدف ٹھہریں تو آنے والی نسل کے ادبی مورخین یہی لکھیں گے کہ وہ حیدرآباد فرخندہ بنیاد جہاں ۱۹۲۷ء تک اردو شعر و ادب کا آفتاب نصف النہار پر تھا اچانک غروب ہو گیا۔ اور ایسے تک بندوں کو علامہ کا نام دے کر ان پر ریسرچ کی گئی جنھوں نے اُردو کا بیڑہ غرق کرنے اور اس کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے میں کوئی کسر و کوتاہی روا نہ رکھی۔

وہ ادارے یونیورسٹیاں اور کالج جہاں اس قسم کی تحقیق نہ صرف ہو رہی ہے بلکہ اس پر فخر بھی محسوس کیا جا رہا ہے ان پر صرف یہی شعر صادق آسکتا ہے ؎

گر ہمیں مکتب و ہمیں ملا
کارِ طفلاں تمام خواہد شد

کاہلی سستی اور سہل انگاری نے اردو والوں کو کہیں کا نہ رکھا۔ وہ ہستیاں جن سے حیدرآباد کا نام بین الاقوامی شہرت اختیار کر گیا ان کے کارناموں کے مسودات گرد و خاک میں مختلف لائبریریوں اور کتب خانوں میں اب بھی محفوظ ہیں مگر ہمارے رہنما اور راہرو دونوں محنت اور جستجو سے کترانے لگے ہیں کہ کون ان کتب خانوں کی خاک چھانے اور اپنے ان اسلاف کے کارناموں کو عنوانِ تحقیق قرار دے جن کے دم سے شہر حیدرآباد کے اُردو شعر و ادب کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی۔ اس میں نہایت دیانت اور جانکاہی درکار ہوگی لہٰذا وہ بازارِ شعر و ادب میں بقید حیات ایسے ٹھیکروں اور حزف ریزوں کی تلاش کرتے ہیں۔ (یہاں بھی اتنی سہل پسندی کہ گوہرِ نایاب کو تلاش نہیں کرتے) جنکے مجموعے اردو اکیڈمیوں کی خیرات سے روز روشن دیکھ لیتے ہیں۔ کیونکہ انکے بارے میں جو کچھ غلط سلط وہ لکھیں گے اسکے لئے انھیں گھر بیٹھے داد مل جائے گا اور ڈھینگ لگے نہ پھٹکری رنگ چوکھا۔

کاش میرے عہد کے نوجوان محقق اور انکے رہنما تھوڑی سی زحمت برداشت کریں اور اگر ہوسکے تو یہ بھی لاسکیں تو کم سے کم ہوئے ادب لکھنے آئیں اگر وہ اس میں بھی ناکام ہو جاتے ہیں تو وہ یاد رکھیں کہ آنے والی نسل کے ادبی مورخ انھیں نہیں بخشیں گے بلکہ نظیر ... کے ہر چھوٹا اور بڑے چند قرار دینے میں ان مورخین کو نیا وہ دیر نہیں لگے گی کہ حیدرآباد فرخندہ بنیاد میں با استعداد اور با صلاحیت افراد کی ... رہنما کی ہے ۔
فراہم ہو تو یہ بھی بہت زرخیز ...

رباعیات

مناجات

یارب نہ عیاں کر مری فردِ عصیاں
ہے فضل سے تیرے ہی نجاتِ انساں
مجھ کو تو نہ دے میرے عمل کا بدلہ
وہ دے کہ جو ہے تیرے کرم کے شایاں

○

رحم ان پہ بھی یا رب جو ہیں دشمن میرے
کچھ لذتِ درد ان کے بھی دل کو دے دے
اور دوست جو میرے ہیں انہیں اے مولا!
لے اپنا کر آلِ نبیؐ کے صدقے

نعت

صدقے میں بھی جن کے بساطِ کونین
وابستہ انہیں سے ہے امیدِ دارین
کب آتشِ دوزخ سے رہائی ملتی
ہوتے نہ شفیع اگر رسول الثقلینؐ

○

ہاتھ آیا نہ کچھ زیست سے غفلت کے سوا
حاصل نہیں دنیا میں مصیبت کے سوا
ہونے کو نہ ہونے پہ فضیلت جو ملی
پایا نہ سبب کچھ تیری نسبت کے سوا

○

سو جان سے ہم اپنے نبیؐ کے صدقے
اک آن بھی امت کو نہ اپنی بھولے
لب ہلتے تھے فرماتے تھے وہ بعدِ وصال
یارب مری امت کو تو مجھ کو دے دے

ڈاکٹر سید وحید اشرف

سیرت النبیؐ بعد از وصال النبیؐ

ان نیک بخت صاحبِ دل مسلمانوں کے خواب جنہوں نے حضور رحمت عالمؐ کی زیارت بابرکت کی ہے۔ حیات النبیؐ بعد از وصال النبیؐ مرتبہ جناب محمد عبدالمجید صاحب صدیقی ایڈوکیٹ ہائی کورٹ لاہور (پاکستان) سے عوام الناس کے استفادہ کے لئے شکریہ کے ساتھ پیش کیا جارہا ہے۔ اُمید کہ قارئینِ کرام اس سلسلہ کو پسند فرمائیں گے۔

خواب نمبر (۳)

حضرت مولانا رفیع الدین دیوبندی قدسرہٗ مہتمم ثانی دارالعلوم دیوبند ایک دن دارالعلوم دیوبند کے صحن میں کھڑے تھے کہ دورۂ حدیث کا ایک طالبِ علم مطبخ سے کھانا لے کر آیا اور شوربہ کا پیالہ مولانا کے سامنے زمین پر دے مارا اور نہایت گستاخانہ انداز میں کہا یہ ہے آپ کا اہتمام و انتظام کہ شوربے میں مسالہ ہے نہ گھی۔ اور بھی سخت سُست الفاظ کہے۔ اس گستاخی پر طلباؔ جوش میں آگئے۔ مگر مولانا پوری متانت کے ساتھ خاموش رہے۔ اور گستاخ طالبِ علم پر تین مرتبہ سر سے پیر تک نگاہ ڈالی۔ جب وہ چلا گیا تو اپنے طلباؔ سے فرمایا کہ کیا یہ مدرسہ دیوبند کا طالبِ علم ہے۔ طلباء نے اثبات میں جواب دیا۔ آپ نے اس پر فرمایا نہیں یہ مدرسہ کا طالبِ علم نہیں ہے۔ اس کا ہم نام دوسرا ایک طالبِ علم ہے اس نے دھوکہ سے محض نام کے اشتراک کی وجہ سے کھانا پینا شروع کردیا ہے۔ ورنہ اس کا اندراج سرے سے رجسٹر میں نہیں ہے۔ بات ظاہر ہو جانے پر طلباؔ نے مولانا سے عرض کیا کہ حضرت نے اپنے اس وثوق سے کس بنا پر اس کے طالبِ علم ہونے کی نفی فرمائی۔ فرمایا میں نے خواب میں دیکھا کہ احاطۂ مولسری میں دارالعلوم کا کنواں دودھ سے بھرا ہوا ہے اور اس کی منڈیر پر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں اور دودھ تقسیم فرمارہے ہیں لینے والے آرہے ہیں اور دودھ لے جارہے ہیں۔ خواب کے بعد مجھ پر منکشف ہوا کہ کنواں صورتِ مثال دارالعلوم کی ہے اور دودھ صورتِ مثال علم کی ہے اور قاسم العلوم تقسیم کنندہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور یہ آ آکر لے جانے والے طلباؔ ہیں جو حسبِ ظرف علم لے لے کر جارہے ہیں۔ اس کے بعد فرمایا کہ مدرسہ دیوبند میں جب داخلہ ہوتا ہے اور طلباؔ آتے ہیں تو میں ہر ایک کو پہچان لیتا ہوں کہ یہ بھی اس مجمع میں تھا اور یہ بھی لیکن اس گستاخ طالبِ علم پر میں نے سر سے پاؤں تک تین بار نظر ڈالی یہ اس مجمع میں سے نہ تھا۔ اس لئے میں نے وثوق سے کہہ دیا کہ یہ مدرسہ دیوبند کا طالبِ علم نہیں ہے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ اس مدرسہ کے لئے طلبا کا انتخاب بھی منجانب اللہ ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ یہاں نہ اشتہار ہے نہ پروپگنڈہ نہ ترغیبی پمفلٹ کہ طلباؔ داخل ہوں بلکہ من جانب اللہ جس کے قلب میں داخلہ کا داعیہ پیدا ہوتا ہے وہ خود ہی کشاں کشاں چلا آتا ہے۔ (تاریخ دیوبند از سید محبوب رضوی)

(تفسیر رضوی صفحہ ۱۶۲) (ماہنامہ "الرشید" کا دارالعلوم دیوبند نمبر صفحہ نمبر ۱۳۹ تا ۱۴۰ ۔ الہامی مدرسہ از حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی مہتمم دارالعلوم دیوبند)

حضرت مولانا رفیع الدینؒ قریب انیس برس دارالعلوم دیوبند کے مہتمم رہے ۱۳۰۸ھ م ۱۸۹۰ء میں مدینہ منورہ میں وصال فرمایا۔ جنت البقیع میں مدفون ہیں۔ اُمّی محض تھے۔ نہ لکھنا جانتے تھے نہ پڑھنا۔ صاحب کشف دوارِ دات اور صاحب کرامات تھے۔ حضرت شاہ عبدالغنی مجددی محدث دہلویؒ کے خلیفہ تھے جو جانشین تھے حضرت اسحاق محدث دہلوی مہاجر مکیؒ کے جو نواسے اور جانشین تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے جو بڑے بیٹے تھے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے آپ کے جانشین تھے۔

منقبت حضرت خواجہ بندہ نوازؒ

دل، منزلِ محبتِ بندہ نوازؒ ہے
سرچشمۂ بصیرتِ بندہ نوازؒ ہے

نظروں میں حسنِ صورتِ بندہ نوازؒ ہے
سانسوں میں کیفِ قربتِ بندہ نوازؒ ہے

کیسے کہوں کہ مجھ سے گنہگار کی زباں
شایانِ شانِ مدحتِ بندہ نوازؒ ہے

الفاظ کو ملا جو ذرا معنوی لباس
دراصل اک عنایتِ بندہ نوازؒ ہے

پردے حجابِ ذات کے اٹھتے چلے گئے
جب سے نظر میں صورتِ بندہ نوازؒ ہے

احساسِ لا الٰہ کی روشن فضاؤں میں
ہر ذہن پر حکومتِ بندہ نوازؒ ہے

رحمت کی طرح آپ کی اے رحمتِ تمامؐ!
مشہور آج رحمتِ بندہ نوازؒ ہے

سب پر نوازشات بقدرِ خلوص ہیں
سب کو نصیب دولتِ بندہ نوازؒ ہے

ٹکرا کے دیکھ لیں ذرا اب مجھ سے حادثے
اب میرے دل کو ہمتِ بندہ نوازؒ ہے

نیچے سے اس گھرانے کے دیوار چل پڑی
وہ اعتبارِ عظمتِ بندہ نوازؒ ہے

ہر بندۂ خدا کو، مقامِ سلوک میں
ہر گام پر ضرورتِ بندہ نوازؒ ہے

آئے نہ شرع بیچ میں، کعبہ سمجھ کے دل
محوِ طوافِ تربتِ بندہ نوازؒ ہے

دنیا مری بلا سے کرے مال و زر پہ ناز
مجھ کو تو نازِ نسبتِ بندہ نوازؒ ہے

خورشید میرے دل میں بزرگوں کے فیض سے
روشن چراغِ الفتِ بندہ نوازؒ ہے

خورشید جنیدی

شاذ تمکنت کی نظم نگاری

عارف مجاہد
ایم اے ۔ ایم فل

شاذ تمکنت اردو شاعری کے اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جب کہ شاعری عرش سے فرش پر اتر آئی تھی۔ ترقی پسندی نے اردو شاعری کو غلو سے آزاد کیا تھا۔ گردش لیل و نہار سے مسائل زمانہ در آئے تھے۔ غزل کا محبوب زمانے کے ستم سہنے کے قابل ہوگیا تھا۔ نئے تفکرات و موضوعات کو نئی نسل کے شعرا نئے اسالیب میں بیان کر رہے تھے۔ اردو شاعری کے اس دور میں غم عشق اور غم روزگار سے بڑھ کر انسانیت کا درد سمیٹنے کی کوششیں ہو رہی تھیں۔ اردو شاعری کے چند ایک شعرا کو چھوڑ کر سب ہی اجتماعیت کے نام پر نعرہ بازی کر رہے تھے۔ ہر حق کہنے والا قدامت پرست اور ہر روایت پسند برادری باہر کیا جانے لگا تھا۔ نئے ذہن کے حلقہ بگوش ہر قدم کو بوڑھی مشاطہ کی طرح کبھی شک کی نظر سے کبھی حسرت و امید کی نظر سے دیکھتے تھے۔

جامعہ عثمانیہ کے طلبا میں بھی نئے خیالات تیزی سے در آئے۔ ان میں صاحبزادہ محمد علی میکش سکندر علی وجد اور مخدوم محی الدین صف اول میں تھے صاحبزادہ میکش اپنی تمام ناکامیوں و محرومیوں کے باوجود نئی غزل و نظم کے پاسباں و وارث بنے رہے۔ مخدوم محی الدین کے ابتدائی کلام میں (چاہے غزل ہو یا نظم) تازگی پائی جاتی ہے لیکن کمیونسٹ تحریک سے وابستگی اور ترقی پسند نظریات نے ان کی شاعری کو نعرہ بازی اور پروپیگنڈہ میں تبدیل کر دیا۔ ایسے تحریکی ماحول میں قدیم روایات کی نگہبانی ان کے معاصرین خورشید احمد جامی، شاہد صدیقی اور سلیمان اریب بھی جاری نہ رکھ پائے۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ [illegible] ان میں صف اول کے شعرا کے علمبرداروں میں وحید اختر، شاذ تمکنت مغنی تبسم اور راشد آذر قابل ذکر ہیں۔ ان میں شاذ تمکنت وہ واحد شاعر ہیں جنھوں نے باوجود جدید وجدیت کے نظریات کی اپنے رفقا و معاصرین کی علمبرداری کرتے ہوئے محسوس کرنے کے قدیم روایت کی پاسبانی کا ارادہ کرلیا۔ ان کی شاعری میں قدیم اسالیب ولب ولہجہ کی بازگشت ملتی ہے۔ ان کی شاعری (غزل و نظم) میں اسلوب بیان کی انفرادیت بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ شاذ کے یہاں پابند، معرا اور آزاد تینوں قسم کی نظمیں ملتی ہیں۔ اظہار خیال کے لئے وہ کسی ایک کے پابند نہیں ہوئے۔ بلکہ اظہار کے پیمانے شاذ کے پابند ہوگئے۔ شاذ نے اظہار

کے لئے نئے موضوعات اور نئے پیرایۂ بیان کو ترجیح دی ہے۔

انیسویں صدی کے نصف آخر کے آغاز میں آزاد اور حالی نئے موضوعات پر تجربات کرتے نظر آتے ہیں اس قدیم ماحول میں موضوعاتی شاعری کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ آزاد اور حالی کے بعد شرر، طباطبائی اور اسمٰعیل نظر آتے ہیں۔ اس دور میں معرا نظموں کو باقاعدہ استعمال کیا جانے لگا اور قافیہ کی پابندی سے بغاوت کی گئی۔ لیکن قدیم ماحول کے دیرپا اثرات کی وجہ سے نئی کوششیں اور تجربات آنکھ دان کی نظر ہو گئے۔ شاید معرا نظمیں پھر سے کبھی نہ لکھی جا سکتیں۔ اگر ... نظموں کا دور نہ آتا۔ آزاد نظم نے اپنے ابتدائی زمانے میں ہی کافی ترقی حاصل کر لی تھی۔ بلکہ آزاد نظم نے معرا نظموں کو سنبھالا دیا۔ آزاد نظم کو بطور فن اردو میں متعارف کرنے والے تصدق حسین خالد ہیں جنھوں نے سنہ ۱۹۲۵ء میں آزاد نظم لکھی تھی۔ بعد ازاں اس کو ترقی دینے والوں میں ن۔م۔ راشد اور میراجی ہیں۔ آزاد نظم کو ایک طبقہ آج بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔ عام خیال یہ ہے کہ آزاد نظم لکھنے والے پابند نظم کی مشکل قافیہ بندی سے دور بھاگتے ہیں اور وہ مخصوص اوزان و بحور کے پابند ہو کر اظہار خیال سے قاصر ہیں۔ آزاد نظم کے موئیدین اس کی تردید کرتے ہوئے اس کو نئے حالات میں مغربی ادب سے استفادہ کی شعوری کوشش اور وقت و حالات کی عین ضرورت قرار دیتے ہیں۔

شاذ تمکنت نظم نگاری کے تمام اصولوں اور سانچوں کا گہرا مطالعہ کر چکے ہیں۔ انہوں نے پابند نظم، معرا نظم اور آزاد نظم تینوں کو پڑھا لکھا اور برتا ہے۔ ان کی نظموں کی تکنیک کے مختلف پہلو اس بات کے غماز ہیں کہ شاذ نے اردو اور انگریزی دونوں ادب کا مطالعہ کیا ہے اور ان کے گہرے اثرات قبول کئے ہیں۔ ان کی نظموں کی تعمیر اور آہنگ اردو شاعروں سے بہت مختلف نظر آتا ہے۔ جہاں تک ان کی نظموں کے مصرعوں کی ... کا سوال ہے اگر تجزیہ کریں تو شاذ کی نظموں میں طویل مصرعوں کی تعداد سب سے کم اور مختصر مصرعوں کی تعداد سب سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ طویل بحر کی نظم کے دو شعر درج ہیں

بدلتی ہوئی رات لرزیدہ لمحے
تھوتی کی پلکیں جھکی جا رہی ہیں
فصیل فراموش گاری سے دیکھو
کرشمے کہیں اور تھرا رہے ہیں

وہ یادیں کہ جن پر نقابیں پڑی ہیں
نقابوں کو الٹو تو چہرے ملیں گے
وہ رنگ اب جو مدھم نظر آ رہے ہیں
قریب آ کے دیکھو تو گہرے ملیں گے

طویل بحروں میں شاذ نے پابندی قافیہ و اوزان کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے۔ شاذ لفظیات کے بازی گر تھے۔ الفاظ کا استعمال کرنے میں وہ ایک مصور اور صناع تھے۔ اسلوب کا منفرد رنگ اس بحر میں دیکھئے۔

سیب کی پوریں، ہتھیلی کی صفا چاندی
پاؤں میں چھاگلیں، تاروں کی جبیں پر مہتاب
زلفیں بل کھائی ہوئی کی مچلی ہوئی
صندلیں باہوں کا بلوا مژۂ بارہ خواب

مختصر نظموں میں شاذ کے یہاں غزل کا آہنگ انداز بیان اور شگفتگی ملتی ہے۔ ان کی نظموں میں آہنگ و اسلوب کا تنوع بھی پایا جاتا ہے

کچھ اور سرخ ہوئے ناخنوں کے شوخ ہلال
انگوٹھیوں کی جھکا جھک کہیں انگلیوں کی پھبن
کہ جیسے نور سا مرمر کی جالیوں سے چھنے
سجل بدن کی گلابی مئے حیا سے گداز

شاذ ہندی الفاظ کے بھی مزاج داں تھے ان کی نظموں میں ہندی کے الفاظ اپنی تمام تر شگفتگی و حلاوت کے ساتھ موجود ہیں۔ ان کی غزلوں اور نظموں میں یہی بین فرق ہے کہ جہاں انہوں نے غزلوں میں قدیم آہنگ کو بڑی حد تک قدیم تراکیب و الفاظ کی نشست و برخواست کے ساتھ برتا ہے۔ وہیں نظموں کو ہلکے پھلکے ہندی لفظوں سے سنوارا ہے۔ "نظم" میں اور "تو" میں ہندی الفاظ بہت ہی خوبصورت آہنگ سے استعمال کئے گئے ہیں۔

کون ہے تو بگلی لگتی ہے — کوری گاگر، ہلکی پیاری
کبھی کونپل ابھری ڈالی — بولتا گھنگھرو بجتی تالی
برکھا رت کی پہلی بدلی — مدماتی، شرمیلی، گرسم
بن چھوٹی مدرا کی پیالی — پھول کے منہ پر اوس کی جالی

ایک اور قدرے طویل بحر میں ہندی کا استعمال کرتے ہیں

سطح گرداب پر شمع روشن کرے
یا کوئی ناز مندر کا پٹ کھول کر
یوں چلے یوں قدم دھیرے دھیرے دھرے
کوئی گھنگھرو نہ بولے کہ گھونگٹ کھلے
اپنی جھانجھن کی جھن جھن سے جگ جگمگے

شاذ کے یہاں مخدوم جیسی کاٹ نہیں ملتی۔ کیونکہ وہ کسی قسم کی سیاست سے وابستہ نہ تھے اور نہ ہی وہ جعفری کے انداز میں وار کرتے نظر کرتے ہیں۔ وہ تو ایک حساس و نازک مزاج شاعر تھے جس نے ایک گھر کا خواب دیکھا تھا۔

پتھراؤ کی جو گھور برکھا میں — خوابوں کو بچاتا پھرتا ہوں۔
بے رحم حقیقت ملتی ہے — میں آنکھ چراتا پھرتا ہوں۔

زمانے کی بے رحمی اور انسان دشمنی شاذ کو ہمیشہ جھنجھوڑتی رہی۔ وہ زمانے کے خداؤں کے خلاف ہے۔ ہندو پاکستان کے سفارتی دورے پر انھوں نے لکھا۔

اب ان سے کیا کہیں جو شہ رگ شفق کاٹیں
اب ان سے کیا کہیں جو چاندنی میں بس لوٹیں
اتارتے ہیں جو خنجر گلوئے نغمہ میں
وہ پچھلی رات کا سنگیت سن کے کیوں اونگھیں
اب ان سے کیا کہیں علم و دروزہ) کیا شے ہے
بدلنے لگتے ہیں پل بھر میں کوکب و آفاق

ایک اور طویل نظم "طلوع آوارہ" میں لکھتے ہیں

کیا نہیں ممکن کہ زندہ آدمی کی قبر ہو
ننھی ننھی کتنی قبروں کے ہیں وارث سینکڑوں دل

چاند مرجھا جاتا ہے، سورج ٹوٹ کر نہیں آتا
اس طرح تاریکیوں میں قید ہو
سچ کی گردن جھوٹ کے زیور سے ہم آشنا
کج روی کے زیر سایہ نازکی کی قبر ہو

جہاں تک آزاد نظم کا سوال ہے۔ شاذ نے آزاد نظم کی روح کو اپنی نظموں میں جگہ دی۔ انہوں نے مصرعوں میں ربط و تسلسل پیدا کیا۔ لیکن نظم کو بند کی صورت میں اکائی کی صورت عطا کی۔ شاذ کا خیال تھا کہ آزاد نظم ہم عصر مغربی ادب کے تجربات کے زیر اثر معرض وجود میں آئی ہے۔ شاذ کے ہاں بھی آزاد نظم کا ابتدائی آہنگ ملتا ہے جو بحور کے جوڑ توڑ سے پیدا ہوا تھا۔

پھر وہی خط
دکھ بھرے لفظوں کی سانسیں تیز تیز
میرے شانے
تیری داسی
پیار
کب تک انتظار
امتحانی پرچے دھاگوں سے بندھے
انبار
ڈھیر
(پھر بھی کالج الیور آوارہ)

شاذ نے آزاد نظموں کے ذریعہ اپنے خیالات کا بھرپور اظہار نہیں کیا۔ وہ آزاد نظم نگاری میں ناکام رہے۔ ان کی آزاد نظموں کے مطالعے سے لگتا ہے کہ انہوں نے صرف تفریحاً آزاد نظمیں کہی ہیں۔ نئی اصطلاحات و المائیت پر وہ صرف تجربہ کرنا چاہتے تھے۔

ایک آزاد نظم میں بھرپور نئی اصطلاحیں برتتے نظر آتے ہیں۔

سمندر تجھے چھوڑ کر جا رہا ہوں۔
تو یہ مت سمجھنا
کہ میں تیری موجوں کی زنجیری چیخ سے بے خبر ہوں۔
(زنجیر کی چیخ)

شاذ مسلسل لکھتے رہے لیکن یہ بھی کہتے رہے
مسلسل جیتے جیتے کوئی تھکتا ہے مگر پھر بھی
کبھی یہ زندگی بیکار سی معلوم ہوتی ہے۔

شاذ کی نظم نگاری پر مکمل و جامع تحقیق کی ضرورت ہے۔ انہوں نے جیسا کہ ابتداء میں بیان کیا گیا ہے۔ پابند، معرا اور آزاد نظمیں لکھی ہیں۔ چند نظمیں ۱۲۔۱۵ صفحات طویل بھی ہیں۔ (ٹائم کیپسول) اپنے صاحبزادے نشاد کو مخاطب کر کے لکھا۔ شاہد صدیقی، مخدوم محی الدین کو خراج عقیدت پیش کیا۔ زندگی اور زندگی کی تلخ حقیقتوں کو بے نقاب کیا۔ وہ ایک مصور کی طرح کبھی بے رنگ زندگی میں رنگ بھرتے رہے۔ اور کبھی بگڑے معاشرے کی رنگا رنگی کو طنز کا نشانہ بنایا لیکن اکثر وہ غم ذات کی عکاسی کرتے رہے۔ دنیا بھر کے فنکار اپنے ماحول اور زمانے کے عکس میں اپنے آپ کو ڈھونڈتے ہیں۔ شاذ اپنے آپ ہی زمانہ ڈھونڈتے رہے۔ ان کے یہاں الفاظ کا اچھوتا اور انوکھا استعمال لب و لہجہ کی نرمی اور دھیما پن ملتا ہے۔ شاذ تمکنت نے زمانے کا اثر اس حد تک قبول کیا کہ پیرائے بیان میں نازکی و شگفتگی پیدا ہو سکے۔ وہ ہمیشہ نئے [illegible] نئے جہان کی تلاش کرتے رہے اور [illegible] ہو کہ نظم، معشوق سے دھیمے لہجے میں حسن و عشق کی واردات بیان کرتے تھے۔ شاذ کو گزرے ہوئے ایک سال ہو گیا۔ مخدوم کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے انہوں نے جو کچھ کہا تھا آج وہ ان ہی پر صادق آتا ہے۔ وہ طفل نو دمیدہ کون تھا۔

سنا ہے لکھتا تھا جو کتاب عہد نو ورق ورق	بیاض فرد لکھتے لکھتے ہاتھ کیوں اٹھا لیا
قلم کسی نے دیکھتے ہی دیکھتے چرا لیا	دوات چھن سے ٹوٹ کر بکھر گئی

غزل

علی احمد جلیلی

اجنبی بن کر شناسائی ملی — اپنی ہی بستی میں رسوائی ملی

جب بھی واپس آئے گھر ہم دیر سے — منتظر چوکھٹ پہ تنہائی ملی

وقت کی اس چلچلاتی دھوپ میں — چاندنی چہروں کی کجلائی ملی

کھڑکیاں کھلتی رہیں میرے لیئے — ہر گلی میری تماشائی ملی

ڈوبتی یادوں کے چہروں پر مجھے — سانولی شاموں کی رعنائی ملی

وہ نہ جانے کون سا بازار تھا — آبرو بیچی تو رسوائی ملی

جب بھی دیکھا مڑ کے پیچھے کی طرف — ٹوٹتے لمحوں کی انگڑائی ملی

کیا یہی تھا دیکھنے کے واسطے — کیوں مری آنکھوں کو بینائی ملی

جب بھی جھانکا تیرے شعروں میں علیؔ — درد کے رشتے کی گہرائی ملی

○

غزل

ڈاکٹر عقیل ہاشمی

شام کیسی ہے اور کیا سحر ان دنوں
دل کہیں ہے کہیں ہے نظر ان دنوں

صحنِ گلشن میں کیسی ہوا یہ چلی؟
منتشر گل ہیں لرزاں شجر ان دنوں

منزلیں کھو گئیں راستے لٹ گئے
خوش عقیدہ ہے کیوں راہبر ان دنوں

روح پیاسی ہے اور جسم بھی کھوکھلے
کتنے نادار ہیں اہلِ زر ان دنوں

طاعتوں میں بھی اخلاص ملتا نہیں
ہو گئی ہے دعا بے اثر ان دنوں

اب کہاں اہلِ دل اور وہ روشن ضمیر
کوئی ملتا نہیں دیدہ ور ان دنوں

راحتوں کا عقیل ہے تصور غلط
کیا بتائیں یہاں اپنا گھر ان دنوں


FAROOKY
FAROOKY
TOOTH POWDER
دن بھر کی
خوشگوار تازگی!
جڑی بوٹیوں سے یونانی طریقے پر تیار کیا گیا
منجن فاروقی دانتوں کی نہ صرف چمک دمک
بڑھاتا ہے بلکہ مسوڑھوں اور دانتوں
کی خرابی کو دور کرتا ہے
مناسب اور واجبی دام میں منجن فاروقی آپ
دندان و دہن یعنی
منہ کی مکمل حفاظت کیلئے
منجن فاروقی
تیار کردہ
کارخانہ زندہ طلسمات

کریم

مکتوباتی کہانی

جہیز کی لالچ

خدابخش لائبریری میں آمدہ رضوان رضوی صاحب کی ایک دستاویزی پیش کش کے بموجب جہیز کی وبا اور اس کے نتیجے میں رشتوں میں زہر گھولنے کے ذمہ دار خود نوجوان کم والدین زیادہ ہیں۔ لڑکی لڑکے والوں کے مابین جو خطوط کا تبادلہ ہوا وہ شاید گھر گھر کی کہانی ہے ——— رضوان رضوی صاحب نے اس کا مندرجہ ذیل متن دیا ہے۔

"کریم بھائی آپ کا خط ملا۔ آپ نے پہلے جہیز کی فرمائش کے بارے میں جانکاری چاہی ہے۔ یہ تو میں قبل ہی آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں شادی بیاہ کے بیسے رسم و رواج کو قطعی پسند نہیں کرتا۔ تلک یا جہیز کی فرمائش کو مذہبی نقطہ نگاہ سے گناہ اور سماجی نقطہ نگاہ سے لعنت سمجھتا ہوں۔ آپ میرے لڑکے یا اپنی لڑکی کو جو دینا چاہیں دیں یا نہ دیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ آپ کا یہ کہنا سو فیصد درست ہے کہ تلک جہیز کی لعنت نے کتنے ہی خاندانوں کو تباہ و برباد کر دیا ہے لیکن انشاء اللہ میرے یہاں رشتہ کرنے سے آپ اس لعنت سے محفوظ رہیں گے۔ آپ کی بچی کی پرورش بہت اعلیٰ ہے۔ آپ کی لڑکی صورت، سیرت صحت کے لحاظ سے ہزاروں میں ایک ہے۔ اس پر علم و عقل تہذیب و شائستگی، سب ہی کچھ ہے۔ ماشاء اللہ اور یہ آپ نے بہت اچھا کیا کہ قرآن پاک کی قرأت اور تفسیر بھی سکھا دی۔ ورنہ اس ماڈرن زمانہ کے مسلمان کہاں ان چیزوں کی طرف توجہ دیتے ہیں۔ چنانچہ اس ماڈرن زمانے میں بھی آپ کی بچی تمام خوبیوں کی ایک مجموعہ ہے۔ اور پھر آپ کا خاندان اور فیملی بیک گراؤنڈ۔ میری بیگم کو یہ رشتہ بہت پسند ہے انہوں نے برادری والوں کو بتانے کے لئے آپ سے دریافت کیا ہے کہ جہیز میں سونے کے کون کون سے زیورات آپ دے رہے ہیں؟

آپ کے جواب کا منتظر ——— شاکر علی

غریب پرور شاکر صاحب! نوازش نامہ ملا۔ رشتے کی پسندگی کا بہت بہت شکریہ! غریب والدین کی اولاد کی تعریف کی مستحق کہاں۔ میں نے تو دین و دنیا دونوں کو ملحوظ رکھ کر اپنی بچی کو تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا ہے آج تو ایسے مسلمانوں کی اکثریت ہے جو مذہب تک تفہیم کی اہمیت کو سمجھ ہی نہیں پائے ہیں۔ اور جو سمجھ بھی پائے ہیں

...زبانوں میں بہت سے ایسے ہیں جو عربی فارسی تو دور رہی اپنے بچوں کو بجائے اُردو میڈیم کے صرف ہندی میڈیم میں تعلیم دلوا رہے ہیں ۔ اُردو سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں ۔ ایسے حالات میں اُردو کیسے زندہ رہے گی اور پھر اُردو کے بغیر تہذیب کہاں ؟ بہرحال آپ کی بیگم نے جہیز میں سونے کے زیورات کے سلسلے میں دریافت کیا ہے تو ..... جیسا کہ آپ جانتے ہیں میں انتہائی غریب آدمی ہوں ۔ بس دو بھر سونے کی بالیاں دے دوں گا ۔ اور دعا بھی اس کی مرحومہ ماں کی ۔ کمترین ۔ محمد کریم

کریم بھائی ! خط ملا ۔ پڑھ کر مسرت ہوئی کہ آپ دو بھر سونے کے بالیاں دے رہے ہیں ۔ یہ کم نہیں ہے ۔ اب کہاں پرانے زمانے کی چیزیں نصیب ہوتی ہیں جب کہ سونا خالص ہوتا تھا ۔ اب تو ہر چیز میں ملاوٹ ہے ۔ اور ہاں یہ تو میں آپ کو قبل ہی بتا چکا ہوں کہ میں فرمائش کو ایک گناہ سمجھتا ہوں ۔ مگر کریم بھائی ! کانوں میں دو بھر سونے کے بالیاں اسی وقت رونق دیتی ہیں جب گلے میں دو بھر کا ہار بھی ہو ۔ آپ کوشش کریں ۔ ہمت اور حوصلہ بڑی چیزیں ہیں ۔ دنیا میں سب کچھ کوششوں ہی سے حاصل ہوتا ہے ۔ ہمت مرداں مدد خدا ۔ اور ہاں جب آپ ہار کے لئے کوشش کریں گے تو دو بھر کنگنوں کے لئے بھی لگے ہاتھ کوشش کر لیجئے ۔ اس میں آپ ہی کی عزت ، شہرت اور نیک نامی ہے ۔

مخلص ۔۔۔ شاکر علی

محترم نواز شاکر صاحب ! نوازش نامہ ملا ۔ میں سونے چاندی کے زیورات سے زیادہ اہم زیور تعلیم کو سمجھتا ہوں ۔ کیا میری بچی میں یہ زیور علم کم ہے

نیاز آگیں ۔۔۔ محمد کریم ۔

کریم بھائی آپ کا خط ملا ۔ میں آپ کے خیالات اور جذبات کی قدر کرتا ہوں ۔ لیکن یہ آپ ذہن نشین کر لیں کہ آج کل سماج میں سونے چاندی کی اہمیت زیادہ ہے ۔ زیور علم کی قدر کرنے والے آٹے میں نمک کے برابر ہیں لیکن میں بذات خود زیور علم کی قدر کرتا ہوں ۔ پھر بھی آج کے بدلتے ہوئے حالات میں اگر آپ اس ماڈرن سوسائٹی کو شکست دینا چاہتے ہیں تو زیور طلا سے دیجئے ۔ دو بھر کی بالیاں دو بھر کا ہار اور دو بھر کا کنگن بہت شاندار سٹ رہے گا ۔ اور یہ آپ کی ہمت مردانہ کے آگے کوئی مشکل نہیں ۔ اللہ پر بھروسہ کر کے آج ہی آرڈر دے دیجئے ۔ رقم کا انتظام کہیں نہ کہیں سے ہو ہی جائے گا ۔ انشاء اللہ اور ہاں فرنیچر میں آپ کیا دے رہے ہیں ۔

جواب کا منتظر ۔۔۔ شاکر علی

کرم فرما شاکر صاحب ! آپ نے فرنیچر کے بارے میں دریافت کیا ہے ۔ تو عرض ہے کسی بھی طرح ایک مسہری دے دوں گا ۔ بستر سمیت آپ کی نوازشوں کا غلام

محمد کریم

کریم بھائی ! یہ جان کر مسرت ہوئی کہ آپ بستر سمیت ایک مسہری دے رہے ہیں ۔ تو ذرا لگے ہاتھ یہ بھی بتا دیں کہ ڈائننگ ٹیبل کے ساتھ آپ کتنے کرسیاں دے رہے ہیں

نیک خواہشات کے ساتھ ۔۔۔ شاکر علی

غریب پرور شاکر صاحب! خلوص بیکراں! نوازش نامہ ملا۔ آپ نے ڈائننگ ٹیبل کا ذکر کیا ہے جس کے بارے میں کبھی میں نے سوچا بھی نہ تھا۔ اور نہ ابھی اس پر غور کرنے کے لئے میرے پاس وقت ہی ہے۔ میری حالت پر رحم کیجئے شاکر صاحب۔ عین نوازش ہوگی۔ خاکسار — محمد کریم

کریم بھائی! خط ملا۔ آپ کے علم میں اضافہ کے لئے عرض ہے کہ آج کل بیڈ روم اور ڈائننگ روم فرنیچروں کے درجنوں ڈیزائن نکل آئے ہیں۔ کوئی بات نہیں اگر آپ نے اپنی مصروفیات میں ابھی تک ڈیزائن کے انتخاب پر غور نہیں کیا ہے تو کسی دن وقت مقرر کر کے آپ میرے ساتھ پٹنہ چلیں۔ وہاں مختلف نمونے دیکھ کر ہم دونوں ایک رائے پر متفق ہو جائیں گے۔ اور ہاں پتہ نہیں آپ لڑکے کو کونسی گھڑی دے رہے ہیں۔ بہتر ہے ہم لوگ پٹنہ میں ہی لڑکے کے لئے سیکو فائیو گھڑی خرید لیں گے۔ کل ہی لڑکے نے میرے سامنے ٹی وی کا ذکر کیا تھا۔ لیکن میں نے آپ کی حالت کے پیش نظر فوراً ہی اسی ڈانٹ پلائی اس لئے کریم بھائی! آپ ٹی وی کے لئے فکرمند نہ ہوں۔ لیکن پٹنہ ہی میں ہم لوگ بجائے ٹی وی کے ایک عمدہ سا ٹیپ ریکارڈ خرید لیں گے۔ اسکوٹر کے لئے بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ بس ایک لونا کافی ہے انشاءاللہ میں لڑکے کو مطمئن کر لوں گا۔ مخلص — شاکر علی

میرے کرم فرما شاکر صاحب! سونے کے زیورات فرنیچر، سیکو فائیو گھڑی، لونا اور ٹی وی کے مطالبات تو مجھے ٹی بی میں مبتلا کرتے جا رہے ہیں۔ مجھے اس مہنگے مرض سے بچایئے شاکر صاحب، میری حالت پر رحم کیجئے۔ میں انتہائی غریب آدمی ہوں۔ احقر — محمد کریم

کریم بھائی! یہ تو میں قبل ہی کئی بار آپ کو یقین دلا چکا ہوں کہ میں جہیز کا قائل نہیں آپ کی پریشانیوں کا احساس ہے۔ بس جو چیزیں آج کے سماج میں رائج ہیں وہی تو آپ سے کہہ رہا ہوں۔ اب اگر آپ انہیں مطالبہ سمجھتے ہیں۔ تو یہ آپ کی حماقت ہے۔ مطالبات پر لعنت بھیجئے کریم بھائی۔ لیکن ہاں آج کل غریبوں کے لئے فرنیچر، گھڑی، ٹیپ ریکارڈ خریدنا بالکل آسان ہو گیا ہے ان دکانداروں سے میرے اچھے تعلقات ہیں۔ اگر آپ کے ساتھ کوئی مجبوری ہو تو میں قسط پر بات کرا دوں گا۔ آپ بروقت نصف قیمت ادا کر کے اسٹامپ کاغذ لکھ دیجئے گا۔ اور بس اللہ اللہ خیر صلا۔ آپ کے مکان پر بینک سے قرض بھی مل سکتا ہے۔ یا اگر آپ اپنی بچی کے بیاہ کے لئے اپنا مکان فروخت کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو بلا جھجک فرمائیں انشاءاللہ میں خریدار بھی مہیا کر دوں گا۔ خیر جو آپ بہتر سمجھیں میں آپ کی ہر خدمت کے لئے تیار ہوں لڑکے کی ماں نے دریافت کیا ہے کہ دولہا کے نکاحی جوڑے کے لئے آپ نے کتنی رقم رکھی ہے۔ مخلص — شاکر علی

میرے مہربان شاکر صاحب! نکاحی جوڑے کے لئے میں نے پانچ سو روپے الگ کر دیئے ہیں اگر آپ کی بیگم فرمائیں گی تو پھر کسی طرح ساڑھے پانچ سو کر دوں گا۔ اس سے زیادہ کی صلاحیت مجھ میں نہیں ہے۔

خاکسار — محمد کریم

کریم بھائی! السلام علیکم۔ تمہاری جوڑے کے لئے پانچ سو
بہت کم ہے۔ آج کل درزی ہی ایک سوٹ کی سلائی ڈھائی
تین سو روپے لے رہے ہیں۔ آپ کو نقد رقم دینے کی ضرورت
نہیں ہے۔ آپ کسی دن وقت مقرر کرکے خود لڑکے کو
اپنے ساتھ مارکٹ لے جائیں۔ جہاں وہ اپنی پسند کے
تمام ضروری سامان خرید لے گا۔ آپ بل ادا کیجئے گا۔ اس
سے زیادہ سہولت میں آپ کو اور کیا دے سکتا ہوں۔
نیاز آگیں ـــــ شاکر علی

غریب پرور شاکر صاحب! آپ کی فہرست کافی
موٹی ہوتی جا رہی ہے اور میں دبلا ہوتا جا رہا ہوں۔ ذرا
آپ اپنی فہرست کی صحت اور اس غریب کی صحت
میں موازنہ کیجئے تو یقیناً آپ کو مجھ پر ترس آئے گا۔ اس
لئے میری حالت پر رحم کیجئے شاکر صاحب۔ میں ایک
فقیر اور درویش آدمی ہوں۔ اور آپ سے درویش
نوازی کی امید رکھتا ہوں۔ کرم کا طالب ـــ محمد کریم

کریم بھائی! ہمارے آبا و اجداد بھی درویش
تھے۔ لیکن اب زمانے کے نئے نئے تقاضوں کے تحت
درویشی بھی رنگ بدل رہی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ
کہنے کی ضرورت نہیں۔ آپ تو خود ہی عقلمند ہیں اور
زمانے کی نبض کو پہچانتے ہیں اتنا تو درویش سے درویش
والدین بھی اپنی بیٹی کے لئے کیا کرتے ہیں۔ بہرحال لین
دین کی تمام باتیں طے پا جانے کے بعد اگلے ماہ کی پندرہ
تاریخ کو بعد نماز مغرب رسم منگنی کے لئے پچاس عورتیں
(علاوہ ان کے بچے) اور ایک سو مرد آپ کے یہاں
جائیں گے۔ خاطر تواضع میں کوئی کمی نہ رہے اس بات کا
خاص خیال رکھیں گے۔ کیوں کہ یہ تمام حضرات قوم کے
بہی خواہ اور ہمدرد ہوں گے۔ یعنی خادم قوم۔ ان کی ہر
طرح کی عزت افزائی ضروری ہے۔ شادی کی تاریخ بعد
میں طے کی جائے گی۔ جس کے لئے صرف پچیس مرد جائیں گے
اور اس بات کو بھی قبل از وقت ذہن نشین کر لیں کریم
بھائی کہ باراتی تقریباً تین سو ہوں گے۔ علاوہ نو سے
عورتیں ویسے ہمارے تعلقات کے ہزاروں آدمی ہیں لیکن
آپ چوں کہ غریب آدمی ہیں اس لئے آپ پر زیادہ بوجھ
ڈالنا میں مناسب نہیں سمجھتا۔ اور یہ مختصر تعداد قبل
از وقت بتا دینا اس لئے ضروری سمجھا تاکہ آپ کو انتظام
کرنے میں سہولت ہو۔ اور ہاں لڑکے کی ماں نے دریافت
کیا ہے کہ آپ لڑکے کو کتنی سلامی دے رہے ہیں؟ آپ
کے جواب کا سخت انتظار رہے گا۔
مخلص ـــــ شاکر علی

اپنی پریشان اور بدحال قوم کے ہمدرد شاکر صاحب!
سن لیں۔ میں علم و عقل اور شرافت کا رسیا ہوں اور
اپنی قوم کو جہالت کی تاریکی سے نکال کر علم عقل اور شرافت
کی روشنی سے منور دیکھنا چاہتا ہوں۔ کہنے سے زیادہ
عمل پر یقین رکھتا ہوں۔ آپ یقین کریں یا نہ کریں لیکن
یہ حقیقت ہے کہ ہر باپ اپنی بیٹی کو اپنی حیثیت سے
کہیں زیادہ ہی سامان دیتا ہے لیکن من مانا مطالبہ
قوم اور سماج کے نام پر ایک کلنک ہے ایک ناسور
ہے۔ میں جہالت اور جہیز کی لعنت کو ختم کرنے کا

غزل

کل سویرے سے جو دروازے سے باہر نکلے
اپنا گھر اپنے ہی ہاتھوں سے جلا کر نکلے

لوگ الف اپنی جبینوں پہ بنا کر نکلے
اوڑھ کر ہم بھی ترے نام کی چادر نکلے

صرف آنکھیں نہیں معیارِ نظر بھی رکھیے
پھر جو قطرے کو پرکھیے تو سمندر نکلے

امن کے بت تھے بہت شہر کے چوراہوں پر
موسم آیا تو فسادوں کے پیمبر نکلے

روشنی اس کی دو عالم پہ برستی ہو مگر
وہ اندھیرے بھی ہیں جو چاند کے اندر نکلے

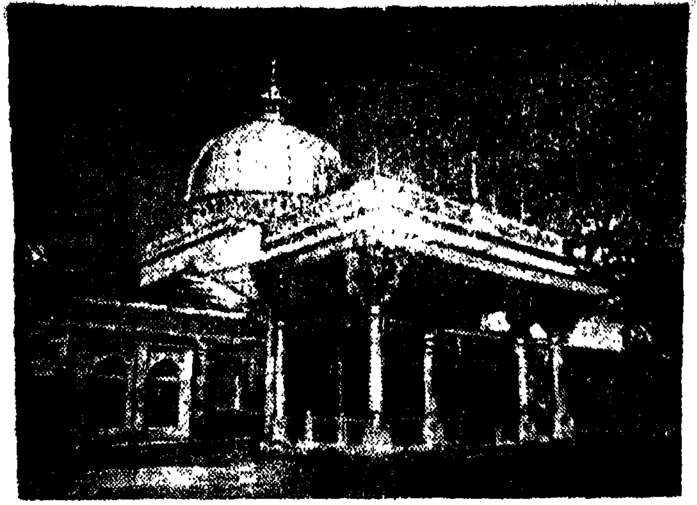
جو مجھے ہار پہنانے کے لیے آئے تھے
مٹھیاں کھولی گئیں اُن کی تو پتھر نکلے

یہ جو ہر رند کی اصلاح کو آجاتے ہیں
دیکھا جائے تو ابھی جیب سے ساغر نکلے

دیکھنا ہے تو کسی اُگتے ہوئے کھیت کو دیکھ
دانے دانے کی یہ خواہش ہے کہ باہر نکلے!

پاؤں آہستہ سے تسنیم زمین پر رکھیے
یہ بھی ممکن ہے کہ ٹھوکر میں کوئی سر نکلے

تسنیم فاروقی



روضۂ حضرت خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ

زائرینِ اجمیر شریف سے گذارش

حیدرآباد و بیرونِ حیدرآباد سے زیارت کیلئے اجمیر شریف جانے والوں کو توجہ دلائی جاتی ہیکہ اجمیر شریف میں حیدرآباد ہاؤز کے نام سے ایک قیام گاہ کا انتظام کیا گیا ہے، جہاں ہر قسم کی سہولت ہے۔ سید مہتاب احمد نیازی و سید افتخار احمد نیازی و سید فروغ احمد نیازی اس قیام گاہ کے بہترین منتظمین میں سے ہیں اور آنے والے زائرین کا اچھی طرح سے خیال فرماتے ہیں اور جو لوگ قیام کے ساتھ طعام کی خواہش کرتے ہیں۔ ماشاء اللہ اس کا بھی انتظام ہو جاتا ہے۔ اگر آپ جانا چاہیں تو جانے سے قبل مندرجہ ذیل پتہ پر اطلاع دیں:

سید مہتاب احمد چشتی نیازی

حیدرآباد ہاؤز

محلہ چاہ ابرہٹ۔ پوسٹ بکس ۱۲۰ اجمیر شریف (انڈیا)

تار کا پتہ:
"آفتاب" اجمیر

المشتہر

حاجی محمد عثمان میاں حیدرآبادی۔ ایس ایم قربان علی جنرل مرچنٹ، سدی عنبر بازار حیدرآباد

نوٹ: اگر اطلاع نہ دے سکیں تو ریلوے اسٹیشن اجمیر شریف پر پتہ دریافت کرلیں۔

ماں

اقبال متین

ڈاکٹر شہلا انجم سے میری ملاقات کو ایک سو نوے دن گذر گئے یعنی چھ مہینے آٹھ دن۔ یکم ستمبر کو میں اس سے پہلی بار اسی کے کلینک پر تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں کچھ یوں لگا تھا جیسے میں اس کی کسی امانت کو اپنے پاس چھپا رہا ہوں اور وہ ہاتھ بڑھا کر مجھ سے کچھ اس طرح کوئی چیز لے رہی ہے کہ جس سے خود اس کا دوسرا ہاتھ واقف نہیں ہے۔ اور آج اس حقیقت سے نہ وہ انکار کر سکتی ہے نہ میں منکر ہوں کہ وہ خوبصورت بوجھ سا جو وہ اٹھائے ہوئے ہے، وہ بلا شرکت غیرے میری اور اس کی محبتوں کا نتیجہ ہے۔

اس حمل کا اسقاط اس کے لئے بہت آسان تھا اس لئے بھی کہ وہ خود ڈاکٹر تھی ـــــ لیکن میں جانتا تھا کہ یہ آسان کام اس کے لئے مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ اس کے مزاج میں جو گھلاوٹ تھی وہ کچھ اتنی شفاف سی تھی کہ لگتا تھا وہ کسی غیر انسانی آمیزش کو گوارا ہی نہیں کر سکتی ـــــ جو لڑکی چھونے ہی سے محض دھوپ کا احساس دلاتی ہو اس میں کھردرا پن تلاش کرنا جذبے کی اہانت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس کے مزاج کی نرمی، اس کی ملائمت، اس کا گندھا گندھا سا وجود، اس کے اپنے پیشے سے خائف سے نظر آتے تھے۔ اس کو میں جب کبھی کسی سیریس بچے کا علاج کرتا ہوا دیکھتا تو مجھے محسوس ہوتا کہ وہ رو رہی ہے۔ اس کو اس حالت میں دیکھ کر مجھے عجیب سی تسلی ہوتی۔ اس پر اتنا پیار آتا جی چاہتا کہ کلینک کی پابندیوں کو نظر انداز کر دوں اور ان آنکھوں کو ہزار بار چوم لوں جو بچے کی ماں کے ساتھ ساتھ سوکھے نہ دکھائی دینے والے آنسو اس طرح بہاتی ہیں جنہیں میں صاف دیکھ سکتا ہوں۔ ایسے مواقع پر کبھی اس کو تنہا پا کر میں اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتا اور دھیرج بندھاتا۔ وہ کچھ اس طرح جھینپ جاتی جیسے اپنے پیشے کی تمکنت کو سنبھال سنبھال کر دامن مجروح عورت ہی کو مجھ سے چھپا رہی ہے جس کی جراحتیں کوئی لیڈی ڈاکٹر نہیں صرف ممتا کی آنکھ دیکھ سکتی ہے اور اس کی انہیں آنکھوں نے عمر کے تفاوت کے باوجود مجھے خرید رکھا تھا۔ میری اشتاقی میری تجربہ کاری اس کی عصمت سے ٹکرا کر اس حد تک پرسکون ہو جاتی کی زندگی کی خوبصورت کے سوا سب کچھ میری آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے میری ہو کر مجھ سے اجنبیت اپنا سب کچھ سونپ کر لمحاتی گریز اس کے مزاج کی انہیں رنگ برنگی نزاکتوں نے ایک ایسا سما باندھ رکھا تھا جو گھر گھر کی چھائی بدلیوں سے ٹکی ہلکی بجلیوں کی بے آواز چمک پیدا ہوتا ہے۔

اس کا منگیتر ہر اتوار کو کلینک آتا تھا پہلے وہ مہینے میں ایک بار اتوار ہی کو آیا کرتا ـــــ وہ صرف اس کی پذیرائی کے لئے بڑھتی مگر مریضانہ [illegible]

میں ہوتے تو وہ باہر ہی بیٹھ کر اس کا انتظار کرتا۔

باسط الطاف شہر کے سربرآوردہ کنٹراکٹر احمد الطاف کا بیٹا تھا۔ کاروبار میں نہ صرف باپ کا ہاتھ بٹا رہا تھا بلکہ احمد کے اثر و رسوخ سے راست باسط کو بھی ٹھیکے ملنے لگے تھے۔

یہ نوجوان شہلا کا ہم عمر ہوگا۔ سال چھ ماہ ادھر ادھر ہو سکتا خوب رو تو نہیں تھا مقبول صورت فرد تھا ـــ ذہانت میں شہلا سے کم تھا۔ وفاؤں میں شہلا سے زیادہ ـــ اس کے یہ معنی نہیں کہ شہلا کے جذبہ وفا پر مجھے شک و شبہ تھا۔ میں نے شہلا کے تعلق سے اس وقت جو بات کی ہے باسط الطاف کو سامنے رکھ کر کی ہے۔ شہلا کی سنجیدہ شخصیت دو خانوں میں بٹ گئی تھی۔ مجھ میں اور باسط میں تاہم دونوں ہی اس کے دل میں رہتے ہیں۔ اور خاموش نہیں رہتے۔ ہمیشہ ہی ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے ہیں۔ اس کے سینے میں جو اتھل پتھل ہے۔ جو واویلا ہے اس کا ہم تینوں میں آخر ذمہ دار کون ہے۔ مجھے تو نہ میں قصور وار لگتا ہوں نہ باسط الطاف۔ لے دے کر ایسے میں نظر صرف شہلا پر ٹھہرتی تھی۔ اس نے اپنے جسم کو میرے جسم سے باندھ رکھا تھا اور اپنی روح کو باسط الطاف کی روح سے۔ ویسے میں میں جانتا تھا کہ شکست یقینی طور پر میری ہے۔ آج نہیں تو کل میں ہار جاؤں گا اور شہلا اپنی روح کی ساری توانا بالیدگی کے ساتھ اس معصوم کی ہو رہے گی۔ جس کا نام باسط الطاف ہے۔ لیکن میرے اندازے تیزی سے غلط ثابت ہونے لگے۔ درمیان میں جو ایک ننھا منا سا وجود آپڑا تھا۔ اس نے پانسہ ہی پلٹ کر رکھ دیا۔ آفسانہ خاطر میں میرے وہم و گمان میں بھی آئی نہیں تھی۔ کہ ڈاکٹر شہلا انجم مجھ سا دوسرا

نام ہے۔ جب وہ ایسا سب کچھ کر ہی نہیں سکتی جو احمد کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا تو اس نے مجھے [illegible] کے ساتھ کس طرح اپنا رکھا تھا۔ آخر یہ اتفاقاً تو پہلی ہی تھی پہلے سے ہم نے کوئی احتیاط سرے سے برتی ہی نہیں تھی۔

میں اپنے تئیں یہی سوچ کر دکھی تھا کہ ہر اس وجود کا جو میرے اور شہلا کے درمیان ہمارے ہی خون اور جسم کا حصہ بن کر ابھرے گا۔ وہی حشر ہوگا جو وجود اور عدم وجود کے فرق مٹا دیتا ہے۔ میں اپنے مزاج کے اعتبار سے بھی کسی وجود کو جس کا خالق خدا کے بعد میں ہی تھا۔ اس طرح ضائع کر دینے کو اپنے ہی ضمیر کے لئے ایک سوالیہ علامت سمجھتا تھا لیکن ایسی ہر سوالیہ علامت کو شہلا کے سپرد کر دینے کے سوا میرے بس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ کہ وہ ہر لحاظ سے میرے لئے اولین اہمیت رکھتی تھی۔

○ میں حیران ہو گیا جب کہ ایک رات شہلا نے میرے بالوں سے بھرے ننگے سینے پر سر رکھ کر اپنی مخروطی انگلیوں سے بالوں سے بل دیتے ہوئے کہا۔

" میں یہ بچہ جنوں گی اور تم اسے چھپا چھپا کر پرورش کرو گے۔ اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا، تمہارا کوئی عذر نہیں سنوں گی۔

میری آنکھیں ڈھلکی چھپی مسرت سے پھیل گئیں۔

اس نے مجھے بغور دیکھا آنکھیں بند کر کے اپنا سر پھر میرے سینے پر رکھ دیا۔ میں نے چادر برابر کر کے اس کو [illegible] تو اس نے سر اٹھا کر پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گھڑی دو گھڑی اتنی محبت بھری نظروں سے دیکھا جس کا میں نے آج تک تصور نہیں کیا تھا ـــ [illegible]

"کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تمہاری آنکھیں مسکرا رہی ہیں۔ میں کچھ غلط تو نہیں سمجھ رہی ہوں نا؟"

میں ہنس پڑا تو اس نے اپنا چہرہ میرے چہرے پر رکھ دیا۔ پھر بے تحاشہ مجھے چوما اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کے آنسوؤں سے میرا چہرہ بھیگتا رہا۔ ہم اس وقت جانے اپنے جسم نہ جانے کہاں گنوا آئے تھے۔ اس کے آنسوؤں کی دھار میں اپنے لبوں پر محسوس کر رہا تھا۔ لگتا تھا اس کا میرا رشتہ ایسا بھی ہے جو آنسوؤں سے ملتا ہے ۔۔۔ کچھ دیر بعد وہ ذرا پرسکون ہوئی۔ تو میں نے اس کے جسم کو جو مجھ پر پڑا تھا اپنے سینے پر دبا کر اور اس کی پشت کو سہلا سہلا کر کچھ اس طرح محسوس کیا جیسے کھوئے ہوئے خزانے پا رہا ہوں پھر ہم ایک دوسرے میں بہت گہرائی تک اتر گئے۔ اتنا گہرا کہ ہم نے اپنے جسموں کی اتنی گہرائیاں کبھی نہیں پائی تھیں۔ اتنی گہرائیاں جہاں جسم روح میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔

صبح کو جب وہ نہا دھو کر غسل خانے سے باہر نکلی تو بے حد ہشاش بشاش لگ رہی تھی۔ اس کی یہ بشاشت کسی ایسے جزیرے کی طرح تھی جس میں تیرنے والی چھوٹی چھوٹی کشتیاں کنارے سے لگی۔ بادبان کھلنے کی منتظر ہوں۔ لیکن جزیرے کا ساکت و ساکن پانی سب کے گرد گرنے سے موج موج ہلکورے لینے لگا ہو ۔۔۔ جیسے جزیرہ ابھی ابھی انگڑائی لے کر بیدار ہوا ہو اور نرم نرم لہریں سانس لیتے جزیرے کے تنفس کو تیز کر رہی ہوں۔

میں نے آئینے میں اس کے عکس کو نظروں سے چومنے کے انداز سے دیکھا تو اس نے آئینے میں میری چوری کو پکڑ کر کہا:

اس طرح پھر کیوں دیکھ رہے ہو؟"

"پھر" ۔۔۔ پر میں ہنس پڑا۔

میں نے کہا جانم تم وہی ہو لیکن آج پہچانی نہیں جا رہی ہو" وہ اٹھی کچھ کہے بغیر میرے قریب آگئی اپنی بانہیں میری گود میں حائل کر کے کہا۔

"تم نے کہا تھا نا کہ آج ہماری ملاقات کو ایک سال گزر گئے ہیں۔ تم نے کہا ہے تو سچ ہی کہا ہو گا۔ میں نے کبھی اپنی ملاقاتوں کو اپنے وقت کے پیمانے سے نہیں ناپا۔ آج خوش ہوں میں نے یہ سارے پیمانے تم سے چھین لیے ہیں۔"

میں دل ہی دل میں اس کی ذہانت پر خوش ہو کر رہ سکتا تھا۔ لیکن اس نے وقت کے پیمانے مجھ سے چھین کر جو اضطراب آمیز خوشی پیدا کی شب مجھے سونپ دی تھی اس کے آگے کچھ مجبور سا ہو گیا تھا ۔۔۔ وہ سب کچھ چھین شاید میرے بس میں نہ تھا۔ جو میں چھپانا چاہتا تھا میں بستر پر اٹھ بیٹھا۔ کمر میں بانہیں ڈال کر بڑی احتیاط سے اس کو قریب کیا ۔۔۔ چادر ہٹا کر اپنے ہونٹ اس کی پشت پر ثبت کر دیئے اور چوم چوم لیا۔

"شیلے دل کہتا ہے اس میں میرا [illegible] ہے۔"

اس نے اپنے [illegible] ہاتھوں کی نرم [illegible] پھول بھر لیے۔ [illegible] پر رکھے ہوئے [illegible] کی طرح چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں اٹھا لیا۔ آنکھوں میں ڈال کر جانے کیا کیا دیکھتی رہی۔ پھر جھک کر اس طرح سے [illegible] میری آنکھیں نم نم سی ہو گئی ہوں۔

میں اندازہ کر سکتا تھا کہ ہمارا رشتہ صرف جسم کا رشتہ نہیں ہے۔ اس رات کی صبح اتنی اجلی تھی کہ مستقبل کے سارے راستوں کا تعین ہو سکتا تھا۔ میرا پندار اجازت نہ دیتا کہ میں اس سے عقد کی بات کر دوں۔ ان مراحل سے گذرنے کی خواہش کرنے کا موقع میں کھو چکا تھا۔ تعجب اس بات پر تھا کہ شہلا نے خود ایسی بات کیوں نہیں کی۔ شہلا میری کفیل نہیں تھی۔ لیکن جس ڈھنگ سے ہم جی رہے ہیں اس میں نہ میں اس کا محسن تھا نہ وہ میری۔ اس کے مسلسل منت سماجت کرنے پر میں نے اس کا ہاتھ بٹانے کا وعدہ کر لیا تھا۔ اور جب سارے اکاؤنٹس کی جانچ کر کے دواؤں کا اسٹاک، نقد رقومات اور بنک کے حسابات میں نے اپنے ہاتھ میں لے لئے تو میں نے یہ مناسب سمجھا کہ کمپونڈر کی حیثیت سے کسی اور آدمی کا تقرر ضروری ہے۔ جو صاحب اس خدمت پر مامور تھے ان کے منہ کو تو لہو لگ چکا تھا۔ اب کسی نئے نظم و نسق کے ساتھ ان کا تعاون ناممکن تھا۔ چنانچہ شہلا نے میری بات مان لی۔ اور اخبار میں اشتہار دے کر انٹرویو کی تاریخ مقرر کر دی۔

امیدوار آئے تو انٹرویو لیتے وقت اس نے کچھ ایسا طریقۂ کار اپنایا کہ انٹرویو دینے والے ہر امیدوار کو مکمل طور پر یہ احساس ہو گیا کہ شہلا ڈاکٹر ہونے کے باوجود صاحب اقتدار میں ہی ہوں۔ چنانچہ انتخاب کے بعد اس نے جس شخص کو دوسرے دن آنے کے لئے کہا اس میں میری منظوری شامل تھی۔

چنانچہ دوسرے دن جب وہ آیا تو شہلا نے کہا۔

"اندر جا کر صاحب سے مل لو"

[illegible]

اب وہ میرے بتائے ہوئے طریقۂ کار پر اس طرح عمل کرتا کہ کلنک کے وقت شوکیس کی چابیاں جن میں دوائیں رہتیں مجھ سے حاصل کر لیتا۔ شہلا جو نسخے تحریر کرتی وہ لے کر مریض میرے پاس آتے میری دستخط کے بعد نسخہ کمپونڈر کو دیتے ہوئے دوا لے کر نسخے کے ساتھ میرے پاس آتے اور قیمت ادا [illegible] کسی مخصوص نسخے پر انجکشن وغیرہ کی فیس لکھنی ہوتی تو شہلا خود لکھ دیتی۔

اس طریقۂ کار سے ہم دونوں مطمئن تھے۔ شہلا کی پریکٹس کافی اچھی تھی۔ اس کو مجھ جیسے آدمی کی شدید ضرورت تھی جو اس کی یومیہ آمدنی سے اپنے جیب کا رشتہ نہ جوڑے میرے آنے کے بعد وہ اس معاملہ میں اس حد تک مطمئن ہو گئی۔ کہ اپنا بینک بیلنس اپنے سیف لا کر سب کے سب میرے حوالے کر دیئے۔

میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ اس کی حفاظت کرتے کرتے میں اس کو لے کر اتنی دور نکل جاؤں گا۔ اور قدم ملا کر اتنی دور میرے ساتھ چل آئے گی کہ لوٹ جانا ہم دونوں ہی کے بس میں نہ ہو گا۔ میں اس کی پائی پائی کا حساب اس کے نام سے جوڑتا رہا۔ اور وہ اپنے روپئے روپئے کر کے میرے نام سے جوڑتی رہی۔ میری جیب خالی رہی میرا دامن بھرا رہا۔ میں اپنے کام کا کوئی پیسہ شہلا سے نہیں لیتا تھا۔ مجھے اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔ ابھی ابا کی پنشن ہوئی تھی۔ اور میری ایک جان کے لئے روپئے کم نہ تھے۔ شہلا پہلے پہلے کہا کرتی تھی کہ [illegible]

[دیکھنا] چھوڑ دیا تھا۔ اب شاید دل ہی دل میں اس نے اپنے
[حقوق] مجھ پر تسلیم کر لئے تھے۔

[چیکنگ] کرتے کرتے جب اس کی نظریں میری طرف
[اٹھتیں] تو اس کی خوبصورت بڑی بڑی آنکھیں دیکھ کر
مجھے احساس ہوتا کہ وہ ایک ایسی گھائل ہرنی ہے جو چلچلاتی
دھوپ میں کسی تناور درخت کی چھاؤں کو حسرت سے تک
رہی ہے اس لئے اس کے زخمی پاؤں میں اتنی سکت نہیں ہے
وہ اس کو درخت کی ٹھنڈی گھنی چھاؤں میں لاسکے۔ اور وہ
درخت بلاشبہ میں ہوں۔ اور وہ گھنی چھاؤں ہماری زندگی ہے۔
وہ زندگی جو کلنک کے اوقات کے بعد ہم شروع کرتے ہیں
اور وہ زندگی جو کلنک کے اوقات کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی
ہے۔ تو کیا باسط الطاف شہلا کے پاؤں کا زخم بن گیا ہے۔

میرا کام تو صرف اتنا تھا کہ اس کی پائی پائی جوڑتا رہوں
شیشہ لگی اسکرین سے جتنے زاویوں سے اس کو اپنی آنکھوں
میں بھر سکتا ہوں بھرتا رہوں وہ بھی بچوں کا معائنہ کرتے کرتے
بھی کن آنکھوں سے مجھے دیکھتی تو ہمیشہ ہی خود میری نظروں کے
گھیرے میں پاتی۔ اس گھبراہٹ سے اس کے چہرے پر عجیب
قسم کی کشش سی آجاتی۔ جس کو نہ اس کی زیر لب مسکراہٹ
چھپا سکتی نہ اٹھتی جھکتی نظریں اور جس کو میں بھی صرف محسوس
کر سکتا تھا۔ اس کا اظہار کیسے کرتا۔ آپ نے کبھی "پولی سن"
کے پکے گلاس کے جار JAR میں پانی کو کھولتے ہوئے دیکھا
ہے۔ اور اسی کھولتے ہوئے پانی کی تہہ میں ہیٹر کے سرخ
تاروں کو اس طرح دمکتے دیکھا ہے جیسے سورج کسی شفاف
جزیرے پر اپنی شعاعیں اوپر سے نہیں اس کی تل میں سے بکھیر
رہا ہو اور ساری روشنیاں کرن کرن اندر سے پھوٹ رہی ہوں۔
آپ یقین کیجیے شہلا ایسے میں کرن کرن اندر سے
پھوٹنے والا جار بن جاتی اور اس کے سینے میں جو ابھل پتھل
رہتی وہ میری نظروں کے الیکٹرانک عمل کا ردعمل ہوتی
میں نظریں ہٹالیتا تو وہ اس طرح شانت ہو جاتی جیسے پولی
سن گلاس کے جار کو ہیٹر سے نیچے رکھ دیا گیا ہو۔ اس
شانتی کا حسن بھی دیدنی ہوتا جس کی زیریں رو محسوسات
کو چھوتی رہتی۔

باسط الطاف ملنے کے لئے آتا تو بلاشبہ یہ اتوار کا
دن ہوتا۔ دوسرے دنوں میں اس کو اپنے بزنس سے
فرصت ہی نہ ملتی۔ اتوار کو شہلا صرف صبح کا کلنک کرتی۔
اگر ہم کام میں بھولے ہوئے ہوں تو جیسے باسط الطاف
یاد دلا جاتا۔ دوپہر ہمیں چھٹی ہے۔ میں شیشہ لگی اسکرین کے پردے
ذرا سا ٹھیک کر کے اپنی الجھن کو چھپا لیتا۔ اور باسط الطاف
کو اپنے کیبن میں بٹھا کر بیرونی دروازے سے شہلا کو اطلاع
کرنے کے لئے چلا آتا۔ میری اپنی نشست سے شہلا کے
معائنے کی میز تک نظروں کو کبھی بھی کوئی رکاوٹ نہ ہوتی۔
شیشہ لگی اسکرین کے اس حصہ پر عارضی پردہ بھی نہ ہوتا جب
کو ضرورتاً حائل کر سکیں۔ اس لئے میں اپنی نشست چھوڑ
کر اس وقت کہیں اور بیٹھ رہتا جب مریضوں کے ختم
ہونے پر باسط الطاف شہلا کے پاس معائنے کے کمرے
میں ہوتا۔ دس پندرہ منٹ کی اس ملاقات کے دوران
شہلا کے حکم کے مطابق بیرونی دروازہ کھلا رکھا جاتا جس
کے چوکھٹے پر جھولتا ہوا اسپرنگ کا نصف دروازہ کرسیوں
پر بیٹھے ہوئے شہلا اور باسط الطاف کے پورٹریٹس
کو اس طرح چھپائے رکھتا کہ ان کی ٹانگیں اور پیر باہر سے

صاف دکھائی دیتے۔ چوکھٹے میں جڑی تصویروں کی طرح ڈاکٹر شہلا اور سیٹھ باسط الطاف کبھی ایک دوسرے کے مقابل ہوتے کبھی ذرا سا تڑپ کر ایک دوسرے کے برابر۔

کافی منگوانے کے لئے کال بل پر جب اسپرنگ لگا دروازہ کمپونڈر کی آمد ورفت سے جھول جاتا۔ اور لگتا ڈاکٹر شہلا اور باسط سیٹھ کی محبت کو ٹیلی وائز کیا جا رہا ہے۔ اور سوئچ کے گھوم جانے سے کبھی آواز بلند ہو جاتی ہے تو دونوں کے مکالمے اتنا تو سمجھا دیتے ہیں۔ کہ دونوں ہی اپنے کاروبار سے مطمئن ہیں۔ کافی پینے کے دوران شہلا یا باسط کبھی کبھی مجھے بلا لیتے تو میں کسی نا کسی طرح ٹال جاتا۔ کبھی سرے سے انکار ہی کر دیتا۔ کافی کبھی باہر منگوا لیتا۔ کافی پیالی میں ٹھنڈی ہوتی رہتی اور سینے میں سب کچھ جلتا رہتا۔ باسط سیٹھ چلا جاتا تو شہلا کار کی چابی والی چین میں اپنی انگلیاں پھنسائے میری نشست کو کھڑکی کھڑکی تکتی رہتی اور میں نشست پر پہنچنے سے پہلے ہی بہت آسانی سے اس کے اضطراب کو پردے کے دوسرے حصّوں سے دیکھ لیتا جو ایسے میں میری اور صرف میری نظروں کے لئے مختص تھے۔ لگتا کہ کچھ دیر اسی طرح گزر جائے تو شہلا کی انگلیاں چابی کی چین میں لہو لہو ہو جائیں گی۔ میں ایسے میں اپنے دل سے رستے ہوئے قطرہ قطرہ خون کو سینے میں کہیں چھپا کر اپنی نشست پر آ جاتا۔ اور شیشے میں سے ہماری نظریں چار ہوتیں تو لگتا ہم ایک دوسرے کو منہ سامنے دیکھ کر کہیں چھور نہیں ملتا۔ میں اکثر ایسے میں نامعلوم سے اپنی کرسی پر بیٹھ جاتا اور میز پر پڑے مکمل رجسٹروں کی اس طرح ورق گردانی کرتا جیسے خود اپنی تکمیل کر رہا ہوں۔ کچھ دیر انتظار کر کے اسکرین کے قریب آ جاتی اور شیشے کو کار کی چابی سے اس طرح بجاتا جیسے اپنی دھڑکنوں کو اس آواز کے نیچے دبا رہی ہو۔

میرا جی چاہتا اس کی گردن میں جھولتا ہوا اسٹیتھسکوپ اس کے سینے پر لگا کر پوچھوں کہ آخر یہ سب کچھ کیا ہے کیوں ہے؟ ہم اگر زندہ ہیں تو یہ کیسی زندگی ہے تم باسط سے جو کچھ چھپا رہی ہو وہ تم ہی نہیں میں بھی، جانتا ہوں لیکن وہ کیا راز ہے جو تم مجھ سے چھپا رہی ہو۔ کیا ہم صرف اسٹیتھسکوپ کے سہارے زندگی بھر ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنیں گنتے رہیں گے۔ میں جانتا ہوں کہ تم ڈاکٹر ہو۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ سینے میں دھڑکتا ہوا دل تمہارے پاس زندگی کی بس یہی ایک علامت ہے۔ لیکن تمہیں اس زندگی کے قدموں کی چاپ کیوں نہیں سنائی دیتی جب کہ ہمارے دل دھڑکتے رہے گے۔ اور ہم زندگی کو ترس ترس کر جیتے رہیں گے۔

میں شہلا سے اسی دن کہنا چاہتا تھا کہ شہلا ہم اپنی شناخت کھو رہے ہیں۔ وہ دن دور نہیں ہے جب ہم ایک دوسرے کی اجنبیت کا احساس بھی نہیں مٹا سکیں گے۔ اور ــــ اور اس دوغلی زندگی کی سزا اٹھانے والا میرا لخت جگر ہوگا۔ تمہارے ہی دل کا ایک ایسا ٹکڑا ہوگا جس کو تم آج اپنی کوکھ میں سو سو جتن سے پرورش کر رہی ہو اور کل جس کو تمہارا اسٹیتھسکوپ بھی نہیں پہچان سکے گا۔ لیکن میں نے اس سے ایسی کوئی بات نہیں کی بس اسی میں ڈوبتا ابھرتا رہا۔

آج کرسی چھوڑ کر میں جب کھڑا ہو گیا۔ تو میں نے طے کر لیا تھا کہ شہلا سے دوٹوک بات کر دوں گا۔ اس سے

[illegible] تم جو شہر بھر کے بچوں کی ڈاکٹر سے زیادہ
[illegible] دیتی ہو اپنے ہی بچے کی نہ ہی ڈاکٹر ہو نہ ماں اور
[illegible] ہے کہ تمہیں اس بات کا احساس بھی نہیں ہے۔
کار کا دروازہ کھولتے ہوئے شہلا نے مجھ سے کہا۔
"آج کار تم چلاؤ میں نہیں چلا سکوں گی"
میرا جی چاہا ایک طمانچہ اس کے منہ پر جڑ دوں۔ لیکن
ہم تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ ہم نے یونیورسٹی سے ڈگریاں لی تھیں۔
مرد کس طرح عورت پر ہاتھ اٹھا سکتا ہے۔ اس سے آسان
طریقہ تو یہ تھا کہ حمل ساقط کر دیا جائے۔ اتنی سی تو بات تھی کہ
میں باپ بننے والا تھا۔ اور شہلا ماں بننے والی تھی۔ ایک
معمولی سا انجکشن میرے اور شہلا کے اس مقدس رشتہ کو
ختم کر سکتا تھا۔ ہم یہ عمل آسانی سے کر سکتے تھے۔ لیکن اس
معمولی بات کے لئے میں تہذیب کی بلندی سے اس حد تک
گر گیا تھا کہ شہر کی سب سے زیادہ معروف لیڈی ڈاکٹر پر
سر بازار ہاتھ اٹھانے کا خیال میرے ذہن میں آ سکتا تھا۔
لہذا میں نے کچھ نہیں کہا۔ اسٹیرنگ سنبھال کر کار اسٹارٹ
کرنے سے پہلے میں نے شہلا کی طرف دیکھا جو میرے برابر
کار میں موجود تھی۔ لیکن شہلا کی آنکھوں میں شہلا نہیں ملی۔
میں نے کسی پیش بندی کے بغیر اس سے کہا
اگر تم سیٹھ باسط الطاف کے پاس سے لوٹ آئی ہو
تو میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں" اس نے بھی مجھ سے زیادہ
تڑپ کر مجھے دیکھا۔ کہنے لگی
تم جانتے ہو کہ میں باسط الطاف کے ساتھ کبھی کلنک
کی سیڑھیاں بھی نہیں اتری"
"پھر تم کار کیوں نہیں چلاتیں۔ جب تم اپنی دوغلی زندگی
کی گاڑی کو اتنی آسانی سے چلا سکتی ہو"
اس نے چھوٹتے ہوئے کہا۔
"اس کے معنی یہ ہیں کہ تم بے رحمی پر اتر آئے ہو"
"اس کے معنی یہ کیوں نہیں ہیں کہ میں تم سے رحم کا
طالب ہوں۔
"کس طرح بھلا"
"اس طرح کہ تم جانتی ہو کہ تم حاملہ ہو"
"ہاں وہ تو تم بھی جانتے ہو"
"تو پھر میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ بچہ کس کا ہے"
اس نے شیرنی کی طرح بپھر کر مجھے دیکھا۔
تم نے سوچا بھی کہ تم مجھ سے کیا پوچھ رہے ہو۔؟"
"بہت سوچا ہے' بہت سوچا ہے۔ اگر اس میں
سوچنے کے لئے کچھ ہے۔
"تو پھر تم ہی بتاؤ — میں تو نہیں جانتی کہ اس کا باپ
کون ہے مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ اپنا سب کچھ کھو
کر تمہیں یہ بھی جتاتی رہوں۔
میں نے تیزی سے کار بڑھاتے ہوئے کہا۔ تو پھر سنو
جس طرح تم اور صرف تم اس کی ماں ہو اسی طرح
میں اور صرف میں اس کا باپ ہوں' اس لئے مجھے اپنے
بچے کے ساتھ زندہ رہنے کا حق ہے جس حق کا تم گلا
گھونٹ رہی ہو — بتا سکتی ہو کہ کون کس پر رحم نہیں
کر رہا ہے۔
بے رحم ہوں جو تم سے اپنے ہی بچے کی پہچان کی
بھیک مانگ رہا ہوں"
وہ خاموش رہی

میں نے کچھ توقف کے بعد پھر کہا۔

"تمہاری یہ خاموشی میرے دکھ درد کا علاج نہیں ہے شہلا"

وہ پھر بھی خاموش رہی۔

اسٹیرنگ پر دائیں ہاتھ کی گرفت مضبوط کر کے میں نے جھک کر بائیں ہاتھ سے اس کو اپنے قریب گھسیٹ لیا۔ اور اس کو دیکھا تو اس کی آنکھوں میں کچھ دیئے سے دکھائی دیئے جس میں بھٹکنے کے لیئے میں خود تیار نہ تھا۔

آنسو ہر غم کا علاج نہیں ہیں شہلا۔ یہاں تک کہ ہر زخم کا مرہم بھی نہیں ہیں۔ میں نے پھر وار کیا۔

"میں کسی کا علاج نہیں کر رہی ہوں"

میں بپھر گیا

تم یہی تو غلط کر رہی ہو۔ اور میں یہی تو رو رہا ہوں۔ کہ تمہیں ہمارا علاج کرنا چاہیئے۔ میرا اور میرے بچے کا۔ شہر بھر کے بچے تمہاری کلنک پر آتے ہیں۔ تم سب کو اپنے قیمتی آنسوؤں کی سوغات بانٹ کر کیوں نہیں لوٹا دیتیں۔ تم تو ان کی بیماری سے لڑتی ہو۔ موت سے لڑتی ہو۔ پھر میرے بچے نے تمہارا کیا قصور کیا ہے"

میں نے بات زہر میں بجھائی تھی۔

"تو پھر میں تمہارا بچہ نہیں جنوں گی"؟

میں سن ہو کر رہ گیا۔ کار بھاگ رہی تھی۔ سارا بازار بھاگ رہا تھا۔ گھر، بنگلے، بستیاں سب بھاگ رہے تھے۔ اسٹیرنگ میرے ہاتھ میں تھا۔ لیکن کار کوئی اور چلا رہا تھا۔ تیز اور تیز، اور تیز — اور تیز —

ہر چیز پیچھے چھوٹ رہی تھی یہاں تک کہ شہلا کا بنگلہ بھی پیچھے رہ گیا۔ شہلا جو میرے برابر بیٹھی ہوئی بھبوت سی ہے وہ بھی تو پیچھے نہیں چھوٹ گئی؟

میں کہاں جا رہا ہوں؟ کیوں جا رہا ہوں؟

غزل

بشیر وارثی

خلد سے میری ہستی نکالی گئی!
یوں قیامت کی بنیاد ڈالی گئی

انکی نظروں سے نظریں ملی بھی نہ تھیں
بس عقیدت سے گردن جھکا لی گئی

وہ خلش جو محبت کا انعام ہے
بوالہوس کی نظر سے بچا لی گئی

میرے حالات جب سے سنبھلنے لگے
ملنے والوں کے رخ سے بحالی گئی

انکی یادوں کا ہے یہ تصدق کہ آج
سونی محفل بھی دل کی سجا لی گئی

کیا جلائے گا خالق اسے آگ میں
اپنی صورت پہ صورت جو ڈھالی گئی

آپ اپنی نظر سے چھپا کر بشیر
اُن کی تصویر دل میں چھپا لی گئی

غزل

عزیز وارثی

ساقی ہے بہت تلخ یہ دنیا مرے آگے
رہنے دے ابھی ساغر و صہبا مرے آگے

دنیا میں تو ممکن نہیں محشر میں ملیں گے
مدت سے ہے یہ وعدۂ فردا مرے آگے

دل میرا بھی ہو جاتا ہے یوسف کا خریدار
ہوتا ہے اگر ذکر زلیخا مرے آگے

تعبیر خدا خیر کرے دیکھئے کیا ہو!
تھا خواب میں اک خون کا دریا مرے آگے

پیغام اجل دے نہیں سکتا ہے فرشتہ
رہتا ہے کوئی رشکِ مسیحا مرے آگے!

جس شکل و شباہت کا پرستار ہے عالم
رہتی ہے وہی صورتِ زیبا مرے آگے

اشعار تو کہہ سکتا ہوں غالب کی طرح میں
گر ہوا نہ عزیز آگے بگولا مرے آگے

معین شاہد وارثی

درد کا شہر

جیسے ہی مرد اپنے کمرہ میں داخل ہونا چاہتا تھا کہ اسے ایسا محسوس ہوا کہ کوئی اس کے قدموں کو چوکھٹ کے باہر ہی کھینچ رہا ہو۔ اس کے اعضاء تھکن کے بوجھ سے شل ہو رہے تھے۔ اور اس کے قدم نہیں اُٹھ رہے تھے۔

اندر سے آواز آئی۔ "آ جاؤ! دروازے پر کیوں کھڑے ہو؟"

مرد کو اس نسوانی آواز نے جیسے اپنی طرف کھینچ لیا اور وہ تھکا ماندہ لرزیدہ لرزیدہ بوجھل قدموں کے ساتھ کمرہ میں داخل ہوا۔ مرد کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا کیوں کہ اسے معلوم تھا کہ آج بھی اور دنوں کی طرح اس سے یہی پوچھا جائے گا۔

"کہیں کام ملا؟"

وہ اس سوال کا کیا جواب دے کہ وہ ابھی ایک سوال کے جواب کے لئے شہر کی خاک چھانتا پھرا تھا۔ اور اس کے پاؤں میں چھالے پڑ گئے تھے۔ اس کی اس آبلہ پائی کی داستان کوئی سننے والا نہ تھا۔

لیکن آج عورت نے یہ سوال نہیں کیا۔ تو اسے بڑا اطمینان ہوا اور تھکن کی چادر اس کے جسم و جان سے سرکنے لگی۔ وہ بڑی ناآسودہ نگاہوں سے اسے غور سے دیکھنے لگا کہ اس سے قبل آج تک اس [illegible] اس شہر میں ایسی [illegible] دیکھا تھا۔

عورت نے اسے سہارا دیا اور اسے چارپائی پر بٹھاتے ہوئے بولی۔ "گلی کی شامو کی بیٹی بھاگ گئی ـــــ اور کل اس کی جوان بیٹی بھاگ گئی تھی۔"

"کیوں ـــ؟"

"دونوں کے شوہر کچھ نہیں کماتے تھے۔ دونوں شامو کے لئے بوجھ بنی ہوئی تھیں۔" ـــــ اس کا دل پھر زور زور سے دھڑکنے لگا اور آج ایک دوسرے سوال نے اسے رات بھر سونے نہیں دیا۔

"آخر یہ لڑکیاں اپنے بھائی، اپنے باپ اور اپنے شوہر کو چھوڑ کر کیوں بھاگ جاتی ہیں۔؟" یہ سوال اس کے دل و دماغ میں ایک خار کی طرح چبھنے لگا۔

رات کے کرب کو جب صبح کے سورج نے آہستہ آہستہ توڑنا شروع کر دیا تو وہ پھر اپنے کاندھے پہ دن کی صلیب اٹھائے شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔

اور جب وہ شام کو اپنے کمرہ کی طرف لوٹا تو وہ بلا ایک منٹ کی تاخیر کئے، کمرہ میں سیدھے داخل ہوا اور پُرمسرت لہجے میں بولا۔

"اجی سنتی ہو! مجھے کام مل گیا۔"

لیکن آج کمرہ سے کوئی آواز نہیں آئی۔ آج نہ تو چوڑی ہی کھنکی، نہ پلکوں پر آنسوؤں کے چراغ جھلملائے اور نہ ہی رات کے درد کو توڑنے والا پھر کوئی صبح کا سورج ہی طلوع ہوا۔

وہ درد کے شہر میں اکیلا تھا۔

● ●


نقالوں سے ہوشیار رہیئے
ہماری پیاکنگ کی ہو بہو نقل کر کے معزز گاہکوں کو دھوکہ دیا جا رہا ہے۔ ملیریا
اور ہیضے جیسے مرض کے لئے ہماری دوا زندہ طلسمات حاصل کیجئے
بوتل کے کارک پر المونیم فائل جس پر نیگرو کی تصویر ہے وہی ہماری دوا ہے
ہیضہ
ملیریا
ہیضہ کی علامات: پیٹ کے درد کے ساتھ دست اور قئے شروع ہو جاتے ہیں اور پیاس بڑھ جاتی ہے۔ یونانی دوا زندہ طلسمات کے آٹھ قطرے پانی یا سوڈا واٹر میں شامل کر کے آدھے آدھے گھنٹے سے آرام ہونے تک استعمال کروائیں۔
غذا میں آش یا ساگودانہ دیں
ملیریا کی علامت یعنی جاڑے سے بخار آتا ہے عموماً شام کے بعد بخار تیز ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں آزمائی ہوئی یونانی دوا زندہ طلسمات آٹھ آٹھ قطرے پانی کے ساتھ استعمال کروایئے۔
ZINDA TILISMATH
زندہ طلسمات
زندہ طلسمات
۵۰ سال سے زیادہ عرصہ سے یونانی طریقہ علاج میں مشہور و ممتاز
کارخانہ زندہ طلسمات
عنبرپیٹ۔ حیدرآباد۔ ۱۳۔۵۰۰۰

پُراسرار علوم کا ماہر

حکیم اصغر علی

جون کی کڑی دھوپ پودوں کو جھلسائے دے رہی تھی۔

گرم ہوا کے تھپیڑے یوں محسوس ہو رہے تھے جیسے آگ کی لپٹیں چاروں طرف بکھری ہوئی ہوں۔ بدن کے کھلے ہوئے حصوں میں شدید جلن ہو رہی تھی۔ حالانکہ میں نے تولیہ بھگو کر سر اور چہرے کے گرد لپیٹ لیا تھا۔ لیکن اس کی نمی صرف چند لمحات ساتھ دے سکتی تھی۔ اور اس کے بعد وہ خشک ہو گیا تھا۔ تاہم اب بھی وہ میرے چہرے کے گرد کسا ہوا تھا۔ اور کسی حد تک سکون دے رہا تھا۔ پیڈل اس طرح گرم ہو رہا تھا جیسے اسے آگ میں تپایا گیا ہو ربڑ کے پیڈ گویا پگھل رہے تھے مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میں زیادہ دیر سفر جاری نہ رکھ سکوں گا۔

یہ ناگہانی مجھ پر بس اچانک ہی آپڑی تھی۔ ملتان اور اس کے نواح کی گرمی ضرب المثل ہے۔ آفریدہ نے منع کیا تھا کہ موٹر سائیکل سے اتنا لمبا سفر نہ کروں لیکن قصور میرا بھی نہیں تھا۔ میں اتنی صبح گھر سے نکل آیا تھا کہ دھوپ تیز ہونے سے پہلے اپنی منزل پر پہنچ جاؤں اور دس ساڑھے دس بجے تک اپنا کام کروں پھر آرام کروں اور جب سورج ڈھل جائے تو واپسی کا سفر طے کروں۔ ملتان سے تقریباً بیس میل دور نکلا تھا کہ موٹر سائیکل گڑبڑ کر گئی۔ پتہ نہیں کمبخت میں کیا ہو گیا تھا۔ چاروں طرف جنگل بیابان۔ دور دور تک کسی انسان یا آبادی کا وجود نہیں تھا۔

فوراً ٹول بکس نکالا اور موٹر سائیکل ایک گھنے درخت کے نیچے کھڑی کر کے میں اس کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گیا۔ پلگ صاف کیے ہر وہ ممکن چیز دیکھ لی جس کی وجہ سے یہ گڑبڑ ہو سکتی تھی۔ لیکن موٹر سائیکل اسٹارٹ نہ ہوئی۔ سورج ابھرنے لگا اور میں نے اٹھنا ہی ایسا تھا کہ آنے والے وقت کا تصور کیا جا سکتا تھا۔

درحقیقت میں بہت پریشان ہو گیا۔ یہ عام راستہ نہیں تھی۔ سفر کو مختصر کرنے کے لیے میں نے ایک کچا راستہ اختیار کیا تھا۔ جو شاہراہ سے ہٹ کر تھا۔

لیکن یہی چیز میرے لئے مصیبت بن گئی تھی۔ پیدل چل کر اگر سڑک تک پہنچنے کی کوشش کرتا تو کئی گھنٹے لگ جاتے۔ کیونکہ چلتی ہوئی سڑک یہاں سے تقریباً آٹھ نو میل تھی۔

مجبوراً موٹر سائیکل میں لگا رہا اور اس پریشانی میں تقریباً تین گھنٹے لگ گئے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ تھوڑا سا پانی ساتھ لے لیا تھا۔ جو اس وقت میرا مونس میرا ہمدرد تھا۔ ایک ایک قطرہ سنبھال سنبھال کر خرچ کر دیا تھا۔ اس کے سوا کوئی اور چارہ کار نہیں تھا کہ اسی درخت کے نیچے آرام کروں اور جب دھوپ ڈھل جائے تو پیدل سڑک تک پہنچنے کی کوشش کروں موٹر سائیکل کو گھسیٹ کر لے چلنا تو میرے بس کی بات نہ تھی یوں بے یار و مددگار رہ گئے تھے۔ طبیعت میں شدید جھلاہٹ پیدا ہو رہی تھی۔ جی چاہ رہا تھا کہ موٹر سائیکل کو آگ لگا دوں۔ کافی دیر درخت کے نیچے بیٹھنے کے بعد میں نے ایک بار پھر دماغ ٹھنڈا کر کے ٹول بکس سنبھال لیا اور موٹر سائیکل کے قریب پہنچ گیا پٹرول کھول کر میں نے اسے کک لگائی اور اچھل پڑا۔ انجن اسٹارٹ

ہو چکا تھا۔

ناممکن ــــ یہ کیسے ہوا ـ خود بخود ـ دیر تک یقین نہیں آیا۔ انجن کو اسی طرح اسٹارٹ رہنے دیا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ موٹر سائیکل کا مذاق ہے۔ ابھی وہ دوبارہ بند ہو جائے گی لیکن انجن چلتا رہا۔ موٹر سائیکل بند نہیں ہوئی تھی۔

ایک بجنے میں بیس منٹ باقی تھے۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا کروں۔ بہرحال تولیہ بھگو کر سر کے گرد لپیٹا اور موٹر سائیکل پر بیٹھ کر چل پڑا۔ لیکن دوپہر ہو چکی تھی۔ اور آسمان سے آگ برس رہی تھی۔

اہلِ ملتان نے ایک بزرگ درویش کے ساتھ بدسلوکی کی تھی جس کا نتیجہ آج تک بھگتا جا رہا تھا۔ شمس مجذوب تھے بھوکے تھے۔ گوشت کا ایک ٹکڑا لے کر گھر گھر گئے لوگوں سے درخواست کی کہ انہیں یہ ٹکڑا بھوننے کی اجازت دی جائے لیکن کسی نے وہ نہ دی۔ بھوکے درویش نے آسمان پر چمکتے سورج کو دیکھا اور بولے۔

" تو نے دیکھا۔ یہ لوگ کتنے وحشی ہیں۔ کسی نے مجھے گوشت بھوننے کی اجازت نہیں دی۔ کیا تو بھی میرا ساتھ نہ دے گا۔ تو بھی شمس میں بھی شمس۔ کیا تو بھی گوشت بھوننے میں میری مدد نہیں کرے گا

اہلِ ملتان کا کہنا ہے کہ سورج اتنا نیچے جھک آیا کہ زمین ابلنے لگی کنوؤں کا پانی گرم ہو کر بھاپ دینے لگا۔ گوشت کا ٹکڑا بھن گیا اور مجذوب اسے کھا کے رخصت ہوئے۔ لیکن اہلِ ملتان آج تک بھگت رہے ہیں۔ انہیں اپنی بے حسی کا پورا پورا تاوان ادا کرنا پڑ رہا ہے گرم لو کے تھپیڑے مجھے نڈھال کئے دے رہے تھے۔ میری آنکھیں کسی ایسی پناہ کی تلاش میں بھٹک رہی تھیں جہاں تھوڑا سا سایہ ہو اور میں رک کر دم لے سکوں۔

مجھے یقین تھا اگر تھوڑی دیر تک اور چلتا رہا تو [illegible] ـــ کا شکار ہو جاؤں گا۔ ممکن ہے لو لگ جائے اور میرا بدن [illegible] کو برداشت نہ کر سکے آنکھیں چاروں طرف بھٹک رہی تھیں۔ پہلے بھی دو چار بار اس راستے سے گزر چکا تھا۔ لیکن کبھی اس بات پر توجہ نہیں دی تھی کہ راستے میں کیا کیا ہے۔ ہاں جو چیزیں خود بخود نظر آجاتی تھیں یا اس پگڈنڈی کے قرب و جوار میں تھیں ان کے بارے میں بس تھوڑی سی معلومات تھیں۔

زیادہ دور نہیں ہوں گا کہ دفعتاً بائیں سمت سیاہ سیاہ دھبے نظر آئے۔ غالباً درخت تھے۔ فاصلہ دو یا ڈھائی فرلانگ سے زیادہ نہ ہوگا۔ درختوں کا یہ جھنڈ اس لق و دق میدان میں تنہا کھڑا تھا۔ میں نے اس شدید گرمی اور دھوپ سے بچنے کے لئے یہی سوچا کہ تمام وسوسے اور خدشات ذہن سے نکال کر ان درختوں کے سائے میں پناہ لوں۔ جان ہے تو جہان ہے۔ دھوپ ڈھل جائے گی تو اپنی منزل پر پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ واپسی آج نہیں ہوئی تو کوئی حرج نہیں ہے۔ بچے پریشان ضرور ہوں گے۔ لیکن بہر طور میں ان کے درمیان زندہ واپس پہنچ جاؤں تو یہی میری اور ان کی خوش قسمتی اور خوش بختی ہوگی۔ چنانچہ خدا کا نام لے کر موٹر سائیکل پگڈنڈی سے اتار دی اور اونچے نیچے ناہموار راستے کو طے کرتا ہوا درختوں کے اس جھنڈ کی جانب چل پڑا۔

راستے میں خار دار جھاڑیاں بکھری ہوئی تھیں اور بعض جگہ درختوں کے اس جھنڈ تک پہنچنے کا راستہ بند ہی ہو گیا تھا۔

لیکن میں نے ہمت نہ ہاری جہاں سے کھلی جگہ ملی وہاں سے گزرتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ دل میں بہت سے خوف اور خدشات بھی تھے ایسی جھاڑیوں میں اڑنے والے سانپ بکثرت پائے جاتے ہیں۔ ملتان اور اس کے نواح میں ان سانپوں کی بہتات ہے۔ ہرچند کہ میرا چہرہ تولیے سے ڈھکا ہوا تھا۔ لیکن بہرطور آنکھیں کھلی تھیں اور پیشانی کا کچھ حصہ بھی کھلا ہوا تھا۔ ہاتھ کھلے ہوئے تھے۔ ان کھلے ہوئے حصوں میں سے کسی بھی حصے پر کوئی اڑن سانپ حملہ آور ہو سکتا تھا۔ بہرطور اب تو جو کچھ تقدیر میں لکھا تھا ہونا ہی تھا۔

میں ان خار دار کانٹوں کے درمیان سے گزرتا ہوا بالآخر

ان درختوں کے جھنڈ کے نزدیک پہنچ گیا اور پھر یہ دیکھ کر میرے دل میں مسرت کی لہریں بیدار ہونے لگیں کہ درختوں کا یہ جھنڈ تنہا نہیں تھا۔ بلکہ ان کے درمیان میں قدیم لکھوری اینٹوں کی بنی ہوئی ایک عمارت کھڑی ہوئی تھی۔

ایسی چند عمارتوں کو میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ یہ انگریزوں کے دور کی عمارتیں تھیں۔ غالباً گیسٹ ہاؤس ٹائپ عمارت تھی یہ بھی۔ اس سے پہلے میں نے کبھی اس کے بارے میں کچھ سنا تھا اور نہ ہی اسے دیکھا تھا۔

دور سے یہ عمارت چھوٹی دکھائی دی تھی۔ لیکن قریب پہنچنے پر پتہ چلا کہ عمارت خاصی بڑی ہے۔ اس کے بلند دروازے پر کچھ لکھا ہوا تھا جسے میں کوشش کے باوجود پڑھ نہیں سکا تھا۔ اونچے اونچے درختوں کے اس زبردست جھنڈ نے اس عمارت کو اپنے حلقے میں لے رکھا تھا۔ عمارت کے اطراف میں عجیب سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس کے بے شمار حصے ٹوٹے پھوٹے تھے لیکن پھر بھی وہ کچھ اس طرح محفوظ تھے کہ ان میں آسانی سے قیام کیا جا سکتا تھا پتہ نہیں اس عمارت میں کوئی موجود ہے یا نہیں بہرطور میں نے موٹر سائیکل عمارت کے نزدیک روک دی۔ اور خود نیچے اتر آیا

یہاں خاصی ٹھنڈک تھی۔ کم از کم اس گرمی میں درختوں کے نیچے بھی اتنی ٹھنڈک کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے زور زور سے دروازے پر دستک دی اور چند لمحے انتظار کیا کہ شاید دروازہ کھلے لیکن کوئی جواب نہ ملا میں نے کئی مرتبہ زور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا لیکن کوئی جواب نہ ملا تھا اس کا مقصد یہ تھا کہ عمارت میں کوئی موجود نہیں ہے

میں اس کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا تھا کہ یا تو کسی درخت کے نیچے ہی آرام کروں یا پھر اس دروازے کو کھولنے کی کوشش کروں۔ پتہ نہیں کوئی یہاں موجود تھا یا نہیں لیکن ابھی میں دروازے کے پاس سے پلٹا بھی نہیں تھا کہ دفعتاً میرے کانوں میں ایک ایسی آواز آئی جیسے مکان کے اندر کوئی حرکت ہوئی ہو

پھر دائیں جانب کی اونچی کھڑکی کے پٹ ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ کھلے غالباً کسی نے کھڑکی کھول کر مجھے دیکھا تھا اس کے بعد یہ کھڑکی بند ہو گئی۔

دیکھنے والا اب یقیناً دروازہ کھولنے کے لئے آ رہا ہوگا میں دروازے کے پاس کھڑا رہا۔ اور اندر پھر کسی کے ہولے ہولے چلنے کی آواز کانوں میں آئی۔ یہ آواز پیروں میں پہننے والے بھاری سلیپروں کے فرش پر گھسٹنے کی آواز سے ملتی جلتی تھی۔ پھر میں نے دروازے کی آہنی زنجیر کے کھڑکھڑاہٹ سنی اور لکڑی کا بنا ہوا مضبوط اور بلند دروازہ آہستہ آہستہ کھلنے لگا۔ دروازہ کھلا اور مجھے ۔ اپنے سامنے ایک آدمی کھڑا دکھائی دیا۔ لیکن اسے دیکھ کر میرے بدن میں خوف کی ایک جھرجھری سی دوڑ گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری ریڑھ کی ہڈی پر سرد انگلی رکھ دی ہو وہ ایک پستہ قامت اور چھوٹے شانوں والا مضبوط آدمی تھا۔ جس کا گول چہرہ بہت ہی عجیب لگ رہا تھا۔ کھوپڑی بالکل گنجی تھی۔ گردن سے لے کر ٹخنوں تک اس نے سیاہ رنگ کا موٹے کپڑے کا چغہ پہن رکھا تھا۔ لیکن ان تمام عجیب باتوں کے علاوہ جس نے میرے حواس پر لرزہ طاری کر دیا۔ وہ یہ تھی کہ اس شخص کے چہرے پر نہ تو بھنویں تھیں نہ آنکھیں اس عجیب و غریب شخص کی پشت پر میں نے ایک عورت کو دیکھا۔ دراز قامت اور خوب صورت تھی۔ مرد جتنا بد وضع اور بد صورت تھا عورت اتنی ہی حسین اور دلکش تھی۔ سڈول بدن کی مالک یہ عورت بھی مقامی لوگوں کے لباس میں نہیں تھی بلکہ اس کے بدن پر بھی کالے کپڑے کا ایک چغہ موجود تھا۔ لیکن سیاہ چغے میں اس کا چہرہ چودھویں کے چاند کی مانند چمک رہا تھا۔ لیکن اس خوب صورت اور دلکش چہرے پر بھی کوئی ایسی بات تھی جسے دیکھ کر میرے دل میں خوف کے جذبات بیدار ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس کے چہرہ پر ایک عجیب سی سفاکی تھی۔ ہونٹوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ

ـ یوں لگتا تھا جیسے کہ وہ ایسی بات سوچ رہی ہو جو بہت [illegible] ناک ہو۔ وہ مجھے ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہی تھی میں اس کی آنکھوں سے آنکھیں نہیں ملا سکا اور میں نے فوراً اس پر سے نگاہیں ہٹا لیں [illegible] دونوں کا جائزہ لینے میں مجھے ایک منٹ سے زیادہ نہیں [illegible] میں نے رک رک کر انہیں اپنا حال سنایا اور صرف تھوڑی دیر کے لئے مکان میں پناہ لینے کی درخواست کی۔

وہ خاموشی سے میری بات سنتے رہے تھے پھر حسین عورت نے جھک کر مرد کے کان میں کچھ کہا اور مرد بھاری لہجے میں بولا۔

" اندر آجاؤ" وہ دروازے کے پاس سے ہٹ گیا اور اور میں خوفزدہ ہونے کے باوجود بے اختیار اس [illegible] کی دہلیز کو پار کر گیا۔

اگرچہ اس مکان کی ہیئت اور اس میں رہنے والے دو پُراسرار افراد کی شکل و صورت لباس اور انداز گفتگو [illegible] مجھے قدرے سراسیمہ ہو گیا تھا۔ تاہم اب میرے لئے مکان میں داخل ہونے کے علاوہ کوئی اور چارہ کار نہیں رہا تھا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ میں خود کو شدید دھوپ اور لو کے تھپیڑوں میں چھوڑ دیتا اور یونہی کہیں میری لاش پڑی پائی جاتی۔ بہرطور مجھے نہیں معلوم کہ مرد کہاں چلا گیا البتہ عورت نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور مکان کی پہلی منزل کے ایک کمرے میں لے گئی۔ میں نے دیکھا کہ چلتے وقت اس کے پیروں میں ہلکی سی آہٹ بھی پیدا نہیں ہوتی تھی وہ مجھے جس کمرے میں لے گئی وہ شاید خوابگاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا کیونکہ میں نے ایک ہی نظر میں دیکھ لیا کہ کمرے کے ایک گوشے میں نہایت آرام دہ بستر موجود ہے اور وہ مسہری جس پر بستر بچھا تھا فرش سے بے حد اونچی تھی اور اتنی بڑی تھی کہ اس پر چار پانچ آدمی بیک وقت سو سکتے تھے۔

[illegible] کمرے میں داخل نہیں ہوئی بلکہ دروازے پر ہی رک گئی۔ [illegible] ایک پُراسرار مسکراہٹ [illegible] ہوئی تھی۔

پھر اس نے گردن کے اشارے سے مجھے رخصتی سلام کیا اور واپسی کے لئے مڑ گئی۔ پھر اس نے دروازہ شاید باہر سے بند کر دیا تھا۔

شاید تھکن کے باعث میرا سارا بدن بری طرح ٹوٹ رہا تھا اور میرے سارے کپڑے خاک اور دھول میں اٹ گئے تھے۔ میں نے سوچا کہ کاش اس وقت تھوڑا سا ٹھنڈا پانی مل جاتا تو کیا ہی اچھا ہوتا۔ لیکن مکان میں داخل ہونے کے بعد مکینوں کو زیادہ تکلیف دینا مناسب نہیں تھا۔

میں مسہری کی طرف بڑھ گیا۔ جوتے اتارے اور اس پر بیٹھ کر گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ تولیہ اتار کر میں نے ایک طرف رکھ دیا تھا۔

[illegible] یہ دونوں [illegible] یہ دونوں بغیر آنکھوں والا مرد اور [illegible] عورت اس ویران مکان میں کیا کر رہے ہیں۔ [illegible] دونوں [illegible] اس دنیا کی مخلوق ہی نہیں معلوم ہوتے تھے۔ کہیں میں بد روحوں کے چکر میں تو نہیں پھنس گیا۔ میرے بدن میں جھرجھری دوڑ گئی۔ ان دونوں کا انداز کچھ ایسا ہی تھا۔

ویران علاقے کا یہ مکان درختوں کے جھنڈ میں گھرا ہوا یقیناً انگریزوں کے زمانے کی کوئی یادگار عمارت تھی۔ لیکن کیا تھی مجھے اس سلسلے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ تھک کر میں بستر پر لیٹ گیا۔ بستر پر لیٹتے ہی ایک بار پھر میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کاش غسل کرنے کا کوئی بندوبست یہاں ہوتا۔ ویسے کچھ نہ کچھ ہوگا ضرور اگر تلاش کر لیا جائے تو کیا حرج ہے۔ اس خیال سے میں نے کمرے میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ ایک طرف ایک چھوٹا سا دروازہ بنا ہوا تھا جس میں کواڑ نہیں تھے۔

لکھوری اینٹوں کی دیواریں [illegible] رنگ و روغن تھیں جو کسی زمانے میں [illegible] روغن ہوگا۔ اب جگہ جگہ پلاستر [illegible] اور بدنما نشان [illegible] جھانک رہی تھیں۔ اور پر کافی بلندی پر ایک چھوٹا سا روشندان [illegible] تھا جس سے روشنی [illegible]

لیکن کمرے میں بے حد ٹھنڈا تھا۔ میں اٹھ کر دروازے کی جانب چل پڑا اور دروازے پر اندھیرا تھا۔ پتہ نہیں اس نے [illegible] پر کیا تھا۔ میں اس اندھیرے میں آگے بڑھ کر [illegible]۔ قدم پہنچا کہ دفعتاً میرے ہاتھ کسی کواڑ سے ٹکرائے میں نے اس پر دباؤ ڈالا تو دروازہ چٹخ ہوا کھل گیا۔ دروازہ کھلتے ہی جی خوش ہو گیا واقعی غسل خانہ تھا مگر بے حد غلیظ۔ نامعلوم کتنے عرصے سے اس کی صفائی نہیں کی گئی تھی۔

کمرے میں مدھم روشنی جو روشندان سے آ رہی تھی غسل خانہ تک پہنچنے کے قابل نہیں تھی۔ لیکن پھر بھی اتنی روشنی یہاں ضرور تھی کہ آنکھیں اس کا جائزہ لے سکیں۔

میں کچھ اور آگے بڑھ گیا۔ پھر میں نے ٹنکی میں لگی ہوئی ٹونٹی کھولی۔ نہایت مدھم سی روشنی میں میں نے دیکھا کہ ٹونٹی میں سے پانی کی پتلی سی دھار نکل کر غسل خانے کے فرش پر گرنے لگی مگر یہ پانی گندہ اور سیاہ رنگ کا پانی تھا۔ جیسے [illegible] سے رنگ کا ہو [illegible]۔ پھر پانی کی ٹنکی اور لوہے کے پائپ میں سے خرر خرر کی آوازیں نکلنے لگیں۔

مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ لوہے کی یہ ٹنکی طویل عرصے سے استعمال نہیں کی گئی۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ غلیظ پانی سے نہانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن پھر سوچا کہ کم سے کم ہاتھ پیر ہی صاف کر لوں جو بے حد گرد آلود ہو گئے تھے۔ میں نے پتلون اور جرابیں اتار دیں اور اپنے بستر پر رکھ کر واپس غسل خانے میں آیا۔ میرے [illegible] اب [illegible] مکان کی ویرانی اور بدروحوں کا [illegible] خوف [illegible] پہنچا تھا چنانچہ میں پانی کے پیچھے لگ گیا۔ [illegible] اس غلیظ [illegible] پانی سے ہاتھ نہیں دھو سکتا تھا۔ اس لئے [illegible] اپنے پیر آگے بڑھا دیے اور پانی کی پتلی دھار میرے پیروں پر گرنے لگی۔ مگر دفعتاً میرا سانس جہاں تھا وہیں رک گیا

خدا کی پناہ یہ کیا چیز تھی جو میرے بدن [illegible]

میں نے غور سے اپنے پیروں کو دیکھا [illegible] جیسے میری [illegible] کھچ کر حلق میں آ گئی۔

کیا دیکھتا ہوں [illegible] خون کی تہہ جمی [illegible]

اور میں اچھل کر غسل خانے [illegible] دروازے سے باہر آ گیا۔ باہر آ کر میں زمین پر گرا اور پھر بمشکل تمام اٹھ کر اپنی مسہری تک پہنچ گیا۔

میرا دل [illegible] طرح [illegible] رہا تھا۔ نل کی ٹونٹی سے خون کی دھار [illegible] واقعہ تھا کہ انسان کا دل دہل کر رہ جائے۔ میرے ہاتھوں اور پیروں پر خون جم کر آن کی آن میں سخت ہو گیا۔ مجھے احساس ہو گیا کہ یہ خون انسانی ہے۔ اس اچانک اور لرزہ خیز دریافت نے میرا ذہن ماؤف کر دیا تھا۔ چند لمحے تک میں سر پکڑے چکراتے ہوئے ذہن کو سنبھالنے کی کوشش کرتا رہا۔ ایک ویران سنسان مکان میں دوپہر کے وقت خون سے بھرے ہوئے پاؤں اور ہاتھ اتنا بھیانک اور دہشت انگیز منظر پیش کر رہے تھے کہ انہوں نے میری تمام ذہنی اور جسمانی قوتیں سلب کر لی تھیں۔ میں یقیناً [illegible] اہمیت نہیں دیتا اگر خون کے لگے ہوئے لوتھڑے میرے بدن پر نہ چپکے ہوتے یہ خون اس امر کی شہادت دے رہا تھا کہ حقیقتاً وہی واقعہ پیش آیا ہے جو میں دیکھ رہا ہوں۔

چند لمحات کے بعد جب میرے اعصاب کچھ پرسکون ہوئے تو میں اٹھا اور بھیگے ہوئے تولیے سے ہاتھ پیروں پر جما ہوا خون بمشکل تمام صاف کیا۔

[illegible] میرے بدن کا [illegible] ہو گیا تھا [illegible] رہا تھا جیسے حلق سے [illegible] پیشانی پر پسینے کے [illegible] چمکنے لگے [illegible] احساس ہوا

تھا۔ میں دروازے کی جانب دوڑا اس عمارت میں رکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مگر ـــ دروازے کو آزمایا تو ایک بار پھر میرا بدن دہشت سے سرد ہو گیا تھا۔

دروازہ باہر سے بند تھا۔ اب میں دروازے کے قریب کھڑا سوچ رہا تھا کہ میں ضرور کسی آفت کا شکار ہو گیا ہوں یہاں سے نکلنے کا کوئی طریقہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا دفعتاً مجھے دروازے کے قریب ہلکی سی آہٹ محسوس ہوئی اور میں پھرتی سے پیچھے ہٹ گیا۔ میں دہشت سے آنکھیں پھاڑے دروازے کی طرف دیکھ رہا پھر میں نے ایسی آواز سنی جیسے دروازے کے قفل میں چابی گھمائی جا رہی ہو۔ پھر میری طرف دروازے میں لگا ہوا گول ہینڈل آہستہ آہستہ گھومنے لگا۔ اور دروازہ بغیر کسی آہٹ کے دو تین انچ کے قریب کھل گیا۔

میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔ مفلوج بدن پسینے سے تر ہو رہا تھا۔ آہ وہ ہیبت ناک اور بھیانک خاموشی میں ساری عمر یاد رکھوں گا۔ میرے دانت بری طرح بج رہے تھے۔ اور ایک عجیب سی کیفیت میرے رگ و پے میں دوڑ رہی تھی۔

دفعتاً میرے حلق میں ایک دہشت زدہ سی چیخ نکلی الفاظ کچھ بھی نہیں تھے بس یہ غیر اختیاری سی چیخ تھی جو خوف کے عالم میں میرے منہ سے نکلی تھی۔ مجھے فوراً یوں محسوس ہوا جیسے کوئی پیچھے ہٹ گیا ہو۔ دروازہ جتنا کھلا تھا فوراً ہی بند ہو گیا میں چند لمحات اپنی جگہ کھڑا اپنے مفلوج بدن کو جنبش دینے کی کوشش کرتا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ کوئی ترکیب میرے ذہن میں نہیں آ رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میں اس عمارت میں موت کا شکار ہو جاؤں گا۔ میں کسی آسیبی جال میں پھنس گیا تھا۔

بمشکل تمام میں نے اپنے حواس کو کسی حد تک سنبھالا اور اس مصیبت سے بچنے کی ترکیبیں کرنے لگا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر میں نے پھر اسے کھولنے کی کوشش کی لیکن میرا

اندازہ درست تھا۔ دروازہ دوبارہ باہر سے مقفل کر دیا گیا تھا۔ کافی دیر تک میں سانس روکے دروازے سے کان لگائے کھڑا رہا۔ لیکن وہاں کوئی آواز نہیں تھی۔

میری نگاہیں پھر ادھر ادھر کا جائزہ لینے لگیں۔ فرار کے لئے کوئی راستہ نہیں تھا۔ دفعتاً مجھے وہ روشندان یاد آیا جو چھت کے قریب تھا۔ میں نے نگاہیں اٹھا کر اوپر دیکھا اور میرا دل پھر زور زور سے دھڑکنے لگا۔ روشندان میں سلاخیں وغیرہ نہیں تھیں۔ اگر کسی طرح اس تک پہنچا جا سکتا تو غالباً وہاں سے نکلا جا سکتا تھا۔ میں اس تک پہنچنے کے راستے تلاش کرنے لگا اس وقت اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ بندروں کی طرح بازیگری دکھاؤں۔

کافی دیر تک میں سوچتا رہا پھر میں نے اس بستر کی طرف دیکھا جس پر چادر وغیرہ بچھی ہوئی تھی۔ صرف ایک ترکیب تھی۔ صرف ایک ترکیب۔ میں نے چادر اٹھالی اور اس کی مضبوطی کا اندازہ کرنے کے بعد اس کا تقریباً آٹھ آٹھ انچ چوڑے ٹکڑے لمبائی میں پھاڑنے لگا۔ میں رسی تیار کر رہا تھا چادر کے ٹکڑے کرنے کے بعد میں نے ان تمام ٹکڑوں کے درمیان گرہیں لگائیں اور گرہیں لگانے کے بعد کوئی ایسی چیز تلاش کرنے لگا جس کے ذریعہ میں روشندان تک پہنچ سکوں کوئی ترکیب سمجھ میں نہ آئی تو ایک بار پھر غسل خانے کے نزدیک پہنچ گیا۔ غسل خانے میں قدیم طرز کی ایک ٹونٹی لگی ہوئی تھی جس میں ایک لمبا سا پائپ پھنسا ہوا تھا۔ اگر کسی طرح اس پائپ کو توڑ دیا جائے تو یہ ٹونٹی میرے لئے آنکڑے کا کام دے سکتی ہے دل میں خوف و دہشت کا شدید احساس تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس پائپ میں خون بھرا ہوا ہے اور یہ خون اسی ٹونٹی کے ذریعہ نیچے آیا تھا لیکن خوف و دہشت کے آخری لمحات میں آدمی کس قدر بے خوف ہو جاتا ہے چنانچہ میں اس پائپ پہ قوت صرف کرنے لگا اس پائپ کو موڑنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

پائپ کے نل کے ساتھ ساتھ نیچے تک مڑا اور اس کے بعد میں نے اسے اپنی پوری قوت سے اوپر کی جانب موڑا۔ پھر چار چھ بار اوپر نیچے کرنے سے پائپ کا سرا لچکنے لگا اور ذرا سا کے بعد وہ ٹوٹ کر میرے ہاتھ میں آگیا۔ میری خوشی کی انتہا نہیں رہی تھی۔

پائپ کے اس ٹکڑے کو لئے ہوئے میں باہر آیا اور میں نے چادر کے ایک سرے پر اسے مضبوطی سے باندھ دیا۔ اس کے بعد میں پائپ کے اس ٹکڑے کو تولنے لگا۔ میں اسے اس انداز میں روشندان تک پھینکنا چاہتا تھا کہ وہ اوپر جا کر پھنس جائے۔ اپنی اس کوشش میں تین چار دفعہ پائپ کا ٹکڑا پھینکنے کے بعد میں کامیاب ہوگیا۔ چنانچہ اس کی مضبوطی کا جائزہ لینے کے بعد میں چادر کی رسّی کے سہارے اوپر چڑھنے لگا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے بہت سی آنکھیں میرا جائزہ لے رہی ہوں۔ وہ بد روحیں یقیناً میری اس حرکت سے واقف ہوں گی۔ ممکن ہے جب میں اس روشندان سے سر باہر نکالوں تو مجھے کچھ نادیدہ ہاتھ گردن سے پکڑ کر کھینچ لیں اور اس کے بعد۔ اس کے بعد پتہ نہیں کیا ہو۔ پتہ نہیں کیا ہو۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ بہر حال میں کسی پھرتیلی بلّی کی طرح اس رسی کے سہارے چڑھ کر روشندان تک پہنچ گیا۔ روشندان اتنا بڑا تھا کہ میں اس میں سے نکل کر باہر پہنچ سکتا۔ اس شگاف تک پہنچنے میں میرا سانس بُری طرح سے پھول گیا تھا۔ میں ایک لمحے کے لئے رکا اور پھر روشندان سے میں نے سر ابھارا۔ مجھے روشندان کے اوپر درخت کی ایک شاخ نظر آئی۔ مضبوط شاخ۔ آہ اگر میں اس شاخ تک پہنچ جاؤں تو یقیناً درخت کے جھنڈ کے ذریعے میں باہر نکل سکتا ہوں۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ۔ دفعتاً مجھے نیچے دروازے پر آہٹ محسوس ہوئی۔ میرے کانوں نے یہ آہٹ محسوس کر لی تھی۔ پھر مجھے ایک چیخ سنائی دی۔ ایک دلخراش چیخ۔ بڑی وحشیانہ چیخ تھی۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس کی آواز ہے۔ لیکن میرا بدن ٹھنڈا سرد ہو رہا تھا۔ بار بار سرد لہریں میرے جسم میں دوڑ رہی تھیں اور میں اپنی پوری پوری قوت سے اوپر تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور نیچے وہ دونوں عفریت چیخ رہے تھے۔ ہاں وہ پستہ قامت شخص اور وہ خونخوار عورت جو چادر کی رسّی کے سروں کو پکڑ پکڑ کر ہلا دے رہی تھی۔ تاکہ رسّی میرے ہاتھ سے چھوٹ جائے اور میں نیچے گر پڑوں لیکن میں بھی اس وقت زندگی اور موت کی بازی لگائے ہوئے تھا۔ میرے ہاتھ میں جب روشندان کا سرا آیا تو میں نے خود کو پوری قوت سے اوپر پہنچانے کی کوشش کی میرے دونوں ہاتھ مضبوطی سے روشندان کے اوپری حصے پر جم گئے اور میں ان کے ذریعے اپنے بدن کو اوپر اٹھانے لگا۔

بڑا مشکل کا کام تھا۔ ایک بار میں نے پوری قوّت سے اپنے بدن کو اوپر اٹھایا۔ اور اس شاخ کو پکڑنے کی کوشش کی۔ یہ میری خوش بختی تھی کہ شاخ میرے ہاتھ میں آگئی۔ دوسرے لمحے میں اس شاخ کو پکڑا اور اوپر پہنچ گیا۔ درحقیقت یہ شاخ دور تک چلی گئی اور درخت پر جا کر ختم ہو گئی تھی۔ میں اسے پکڑے پکڑے آگے بڑھنے لگا۔ شاخ زیادہ مضبوط نہیں تھی۔ کسی بھی لمحے وہ ٹوٹ سکتی تھی۔ لیکن اس وقت زندگی اور موت کا مسئلہ تھا اور مجھے اپنی تمام تر مہارت سے کام لینا تھا۔ حالانکہ سچّی بات تو یہ تھی کہ اس وقت کی ان کوششوں میں میری مہارت شامل نہیں تھی۔ زندگی بچانے کا خوف میرے اعصاب کو متحرک کئے ہوئے تھا۔ میں دوسرے درخت پر پہنچا اور وہاں سے تیسرے درخت پر اور اس کے بعد میں نے اپنے آپ کو درختوں کے اُس جھنڈ میں پایا جو اس عمارت کے باہر تھا۔ میں اُس کے نیچے کود گیا یہی شکر تھا کہ موٹر سائیکل میں نے باہر کھڑی کی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے چاروں طرف سے نادیدہ روحیں مجھے پکڑنے کیلئے دوڑ رہی ہوں۔ میرے اعصاب قابو میں نہیں تھے

لیکن بس نجانے کون سی پوشیدہ قوت تھی جو کام کر رہی تھی موٹر سائیکل نے اس وقت دھوکہ نہیں دیا اور ایک ہی کک میں اسٹارٹ ہو گئی۔ اور میں اسے لئے ہوئے اس طرح بے تحاشہ دوڑا کہ کسی بھی لمحے کسی چھوٹے پتھر سے بھی ٹکرا جاتا تو یقیناً موٹر سائیکل سمیت چار یا پانچ قلابازیاں کھا جاتا۔ تھوڑی ہی دیر بعد میں نے اپنے آپ کو اس پگڈنڈی پر محسوس کیا جہاں سے میں نے اس منحوس مکان کی جانب رخ کیا تھا۔ یہ میری زندگی کا پہلا خوفناک واقعہ تھا۔ اس سے پہلے دوسروں کے معاملات دیکھے تھے یا کچھ بزرگوں سے اس قسم کے واقعات سنے تھے۔ اب نہ شدید گرمی کا احساس تھا نہ لو کا۔ بس موٹر سائیکل دوڑ رہی تھی اور [illegible] نا جانے کم ہو رہے تھے۔ یہاں تک [illegible] تھی۔

غوث شاہ [illegible] نے ٹھیکیداروں میں ہیں۔ [illegible] ان کی تیس سال [illegible] سرکاری اور غیر سرکاری عمارتیں ان کی بنائی ہوئی ہیں۔ ان کی بنائی ہوئی عمارتوں میں الیکٹرک فٹنگ میں نے ہی کرائی ہے سب سے پہلے وہ مجھ سے رابطہ کرتے ہیں۔ اور ان کی الیکٹرک فٹنگ اور سینیٹری فٹنگ کا ٹھیکہ مجھے ہی ملتا ہے۔ اس سفر کا مقصد بھی یہی تھا۔ مجھے ان کا پیغام ملا تھا۔ میں جانتا تھا کہ انہوں نے اس علاقے میں کچھ عمارتوں کا ٹھیکہ لیا ہوا ہے۔ لیکن میں انتظار کر رہا تھا کہ شاہ صاحب نے ابھی تک مجھ سے بات کیوں نہیں کی ہے۔

بہرحال ان خوفناک لمحات سے گزر کر میں بستی پہنچ گیا۔ شام ہو گئی تھی۔ سورج کا تھال معدوم ہو چکا تھا۔ بستی کے مکان سوگوار سوگوار محسوس ہو رہے تھے۔ دن بھر کی دھوپ میں تپتے ہوئے گھروں کی دیواریں اب بھی خوب گرم تھیں۔ لوگ کام دھندوں میں لگے ہوئے تھے۔ میں نے ایک شخص کو روک کر اس سے ٹھیکیدار غوث شاہ کے بارے میں پوچھا۔

"او ہو ٹھیکیدار جی۔ وہ بے چارے گھر پر ہی ہوں گے" اس شخص کے لہجے میں ہمدردی تھی۔

"کیوں۔ کیا بات ہے۔ وہ خیریت سے تو ہیں"؟

"کہاں جی۔ مصیبت میں پھنسے ہوئے ہیں بے چارے۔"

"کیوں کیا ہوا انہیں"؟

"ہم کچھ نہیں بولیں گے جی۔ کون جانے کون شکار ہو جائے۔"

"کیسا شکار"؟

"بابو جی خود جا کر معلوم کر لو۔ ہمیں کیوں مصیبت میں ڈال رہے ہو؟" اس نے منہ بنا کر کہا اور آگے بڑھنے لگا۔ میں نے ایک بار پھر لجاجت سے آواز دی۔

"بھائی رکو تو سہی کم سے کم ان کا پتہ تو بتا دو۔"

"سیدھے چلے جاؤ۔ آگے سے بائیں طرف مڑ جانا کھیا کا باغ آ جائے گا اسی باغ میں ٹھیکیدار کام کر رہے ہیں۔ وہیں کنارے پر ان کا مکان ہے۔" دیہاتی نے کہا اور تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا تھا۔

میں حیران پریشان کھڑا رہ گیا تھا۔ ٹھیکیدار کو ایسی کونسی پریشانی لاحق ہو گئی جو دوسرے لوگوں کو بھی معلوم ہے۔ بہرحال میں نے موٹر سائیکل آگے بڑھا دی اور چند منٹ کے بعد ان کے مکان پر پہنچ گیا۔

مکان بستی کے دوسرے مکانوں سے ذرا الگ تھلگ۔ پرانا بنا ہوا تھا۔ اس کے چند حصے مرمت شدہ تھے۔

دستک دی تو دروازہ کھل گیا۔ یہ ٹھیکیدار کا پرانا ملازم فقیر محمد۔

"سلام وقار بابو۔ آ گئے آپ"؟

"ہاں فقیر محمد کیسے ہو"؟

"ٹھیک ہوں بابو۔ گاڑی کھڑی کر دیں اندر آ جائیں" اس نے کہا اور میں نے موٹر سائیکل اسٹینڈ پر لگا دی فقیر محمد مکان کے مہمان خانے میں لے گیا جو ایک الگ حصے میں تھا۔

"شاہ جی موجود ہیں۔"؟

"آتے ہوں گے ڈاکٹر صاحب کے پاس گئے ہیں۔"

"کیوں خیریت؟"

"جی وہ سلیمہ بی بی بیمار ہیں۔" سلیمہ ٹھیکیدار کی بیٹی تھی پانچ بیٹے تھے اور بس ایک بیٹی تھی اس لئے بہت لاڈلی تھی۔ عمر تقریباً اٹھارہ سال تھی اور بہت پیاری شکل کی مالک تھی شاہ جی پرانے خیالات کے مالک تھے اس لئے بیٹی کو پڑھایا لکھایا نہیں تھا جبکہ بیٹے تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

"لیکن بیماری ہے سلیمہ کو۔" مجھے بھی اس بچی سے انسیت تھی۔

"بس جی اللہ جانے۔"

"کیا مطلب۔"؟

"سایہ ہو گیا ہے۔"

"کیا۔"؟ میرا دل دھڑک اٹھا۔ واقعات سنے بھی اور پڑھے بھی تھے لیکن اس سے پہلے کبھی اس بارے میں سنجیدہ نہیں ہوا تھا آج بھی اس بات کو وہم سمجھتا لیکن آج جن حالات سے گزرا تھا ان کے بعد شاید زندگی بھر انہیں جھوٹ نہ سمجھتا۔

"ہاں جی بہت بری حالت ہو گئی ہے ان کی تو۔"

"کب سے ہے یہ حالت۔"؟

"بیس بائیس دن ہو گئے وقار بابو جب سے ان کی یہ حالت ہے۔"

"ڈاکٹر وغیرہ کو دکھایا۔"

"ہاں جی یہاں بستی میں صرف ایک ہی ڈاکٹر صاحب ہیں وہی بے چارے علاج کر رہے ہیں مگر وہ خود بھی پریشان ہیں۔"

"ذرا تفصیل بتاؤ فقیر محمد یہ سب ہوا کیسے۔"؟ میں نے سوال کیا اور اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ غوث شاہ صاحب میرے والد کے دوستوں میں سے تھے ۔ ۔ ۔ ان کے گھر سے ہمارے انتہائی گہرے تعلقات تھے کہ اب دو گھروں کا تصور ہی ختم ہو گیا تھا۔ ملتان ہی میں رہتے تھے تب ہمیں دور دراز کا ٹھیکہ لیتے تھے تو وہاں چلے جاتے تھے اس لئے بہت دن سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ بے چارے کسی پریشانی کا شکار ہیں۔" فقیر محمد کے انداز میں ہچکچاہٹ پیدا ہو گئی تھی۔

"کیوں کیا بات ہے۔"؟ میں نے سوال کیا۔

"وہ صاحب وقار بابو منع کر دیا ہے ٹھیکیدار جی نے کہ کسی سے اس موضوع پر بات نہ کی جائے کچھ گڑبڑ بھی ہو گئی ہے ایک دفعہ انہی سے پوچھ لیں۔" فقیر محمد نے عاجزی سے کہا۔ اور میں خاموش ہو گیا مجھے دیہاتی کی بات یاد آ گئی تھی اس نے بھی اسی طرح جان بچانے کی کوشش کی تھی۔ تھوڑی دیر تک میں گردن جھکائے کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔

"یہاں گھر میں کون کون ہے۔"؟

"بس جی بی بی جی ہیں اور چھوٹے بابا جی بچے سب ملتان میں۔ یہاں میں ہوں بشیرن ہے اور بس۔"

"ہوں۔ کام ہو رہا ہے۔"؟ میں نے سوال کیا۔

"کہاں جی مزدور ہی بھاگ گئے۔ کوئی بھی کام کرنے کو راضی نہیں ہے پرانا ٹھیکیدار آیا تھا لڑ جھگڑ کر چلا گیا کہنے لگا وہ اپنے مزدوروں کو موت کے منہ میں نہیں دھکیل سکتا۔"

"کمال کی بات ہے بہرصورت تم کچھ نہیں بتا رہے اس لئے میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔ ہاں فقیر محمد ذرا میرے نہانے کا بندوبست کر دو۔" فقیر محمد نے گردن ہلا دی پھر وہ اندر چلا گیا۔ شاہ جی کی بیگم کو شاید میرے آنے کی اطلاع نہیں ہوئی تھی ورنہ شاید اس گھر میں پردہ وردہ نہیں کیا جاتا تھا حالانکہ بیگم صاحبہ پردہ کی پابند تھیں جب فقیر محمد نے جا کر بتایا تو وہ خود ہی میرے پاس آ گئیں میں نے ادب سے انہیں سلام کیا تھا۔ بیگم صاحبہ کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے ہی سے پریشانی کا اظہار ہوتا تھا سلام کرنے کے بعد میں ان سے ان کی خیریت معلوم کرنے لگا اور ان کی آنکھوں سے آنسو چھلک اٹھے۔

"بیٹے سلیمہ کی حالت خراب ہے بس اللہ سے دعا کرو

اللہ اُسے شفا دے۔"

"میں۔ میں مجبور ہوں بیٹے کچھ بتا نہیں سکتی تمہیں انہوں نے اسی لئے بلایا ہے۔ سلیمہ ہی کے لئے۔ انہوں نے تمہیں تکلیف بھی دی ہے۔"

"او اچھا اچھا۔ میں جس لائق بھی ہوں حاضر ہوں خدا اُسے شفا دے۔ خیر چچی جان میں آپ کو پریشان نہیں کروں گا۔"

"بیٹے فقیر محمد نہانے کا بندوبست کر رہا ہے۔ تم کپڑے وغیرہ تو لائے نہیں ہو گے تہمد دے دوں تمہیں شاہ جی کا۔"

دے دیں چچی جان واپس کر دوں گا ابھی۔"

"اچھا اچھا کوئی بات نہیں ہے۔" شاہ جی کی بیگم واپس چلی گئیں۔ چند منٹ بعد فقیر محمد آیا۔ اس نے غسل خانے میں پانی صابن وغیرہ رکھ دیا تھا۔ میں نہا یا نہاتے ہوئے مجھے اس منحوس غسل خانے کا خیال آگیا۔ جس کے نل سے خون کی دھار مجھ پر آپڑی تھی اگر یہ دھار میرے سر پر پڑتی تو پتہ نہیں میری حالت کیا ہو جاتی۔ شکر تھا کہ میں نے صرف ہاتھ پاؤں ہی دھونے کی کوشش کی تھی۔ نہاتے ہوئے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میرے پورے بدن پر رعشہ طاری ہو گیا تھا کسی کو یہ کہانی سناؤں گا تو پتہ نہیں کوئی یقین کرے یا نہ کرے لیکن جن حالات سے گزر رہا تھا وہ زندگی اور موت کے حالات تھے۔ میں نے اپنی ساری زندگی میں اس سے زیادہ بھیانک منظر اور کہیں نہیں دیکھا تھا۔ وہ دونوں منحوس شکلیں رہ رہ کر میری نگاہوں سے گزر رہی تھیں۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ اب اس راستے سے کبھی واپس نہیں جاؤں گا بلکہ اس راستے ہی کو ختم کر دوں گا۔"

نہاتے ہوئے میرے بدن میں پھریریاں سی دوڑتی رہیں حالانکہ گرمیوں کا موسم تھا اور اس وقت بھی اچھی خاصی گرمی تھی لیکن مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے دسمبر کی یخ بستہ رات میں پانی سے نہا رہا ہوں۔ خدا خدا کر کے غسل کیا اپنے وہی کپڑے پہن لیے اور تہمد اتار کر فقیر محمد کے حوالے کر دیا۔

دیوڑھی میں واپس آیا تو بے چاری بیگم صاحبہ نے میرے لئے کھانے پینے کا بندوبست کر دیا تھا۔ شاہ جی ابھی تک نہیں آئے تھے۔ میں کھانا کھا ہی رہا تھا کہ شاہ جی پہنچ گئے۔ ان کے چہرے سے شدید پریشانی کا اظہار ہوتا تھا۔ دھوپ میں تپتے ہوئے وہ پتہ نہیں کہاں سے آئے تھے۔ مجھے کھانا کھاتے دیکھ کر مطمئن انداز میں کہا تھا۔

"کھاؤ میاں کھانا کھاؤ۔ میں ذرا منہ ہاتھ دھو کر آتا ہوں۔"

"آپ بھی میرے ساتھ آیئے شاہ صاحب۔"

"نہیں میاں، تم کھاؤ میں ابھی آیا۔" وہ اندر چلے گئے تھوڑی دیر کے بعد وہ منہ ہاتھ وغیرہ سے فارغ ہو کر میرے پاس آ بیٹھے۔

"ان دنوں بھوک اڑ گئی ہے وقار میاں، بس خدا سے دعا کرو کہ خدا ہماری مصیبت دور کرے۔"

"ٹھیک ہے شاہ صاحب میں بڑا پریشان ہوں۔ بستی میں داخل ہوا تو ایک دیہاتی نے آپ کی پریشانی کے بارے میں بتایا پھر فقیر محمد نے بتایا اور پھر جب چچی جان سے پوچھا لیکن تینوں میں سے کسی نے تفصیل نہیں بتائی۔"

"منع کر دیا ہے میاں مولوی صاحب نے کہا ہے کہ کسی سے کچھ نہ کہنا بس جس قدر ممکن ہو سکے ان واقعات کو دوسروں کے سامنے دہرانے سے گریز کرنا مگر تمہاری اور بات ہے۔ میں یہ خطرہ مول لوں گا۔" شاہ صاحب نے کہا اور میں حیرت سے ان کی شکل دیکھنے لگا۔ شاہ جی کسی سوچ میں ڈوب گئے تھے بڑی ہمت والے آدمی تھے۔ ہر طرح کے حالات سے نپٹنے کی اہلیت رکھتے تھے، حالانکہ عمر اچھی خاصی تھی۔ لیکن صحت جوانوں کی سی تھی اس وقت وہ مجھے جتنا پریشان نظر آئے میں نے انہیں اتنا پریشان اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، چند لمحات وہ گہری سوچ میں رہے پھر بولے۔

"میں نے یہ ٹھیکہ لیا تھا اس کے بارے میں تم کو بھی معلوم ہو گا۔

"جی ہاں۔"

"بلڈنگیں بنائی ہیں وہاں ایک باغ کٹوانا پڑا ویسے بھی کافی پرانا باغ تھا اور بنجر ہی سا پڑا ہوا تھا۔ عام طور سے سوکھ گئے تھے۔ کیوں کہ یہاں ان کی کوئی دیکھ بھال نہیں کر سکتا۔"

"اس کی وجہ؟" میں نے سوال کیا۔

"وجہ یہی سنی تھی میں نے کہ باغ آسیب زدہ ہے بہت عرصے درختوں پر پھل ہی نہیں آتے تھے اس کا مالک اسے بیچنا چاہتا تھا گورنمنٹ کو یہاں کچھ کام کرنا تھا اس لیے اس نے رہائش کے لیے یہاں بلڈنگیں بنوانے کا ٹھیکہ دیا۔ مجھے یہاں ساٹھ مکانات بنوانے تھے جن کا نقشہ وغیرہ سب پاس ہو چکا تھا میں نے کھدوائی شروع کرادی۔ درخت کٹوانے میں بھی تقریباً دو یا ڈھائی مہینے لگ گئے تھے اور پھر وہ مسئلہ شروع ہو گیا جس نے آگے چل کر ایک پریشان کن شکل اختیار کر لی۔"

"کیا مسئلہ شاہ جی؟ وہی تو مجھے پوچھنا ہے۔" میں نے کہا۔

"ایک بہت پرانا درخت تھا وہاں کسانوں کا کہنا ہے کہ یہی درخت اصل میں آسیب زدہ تھا۔ کچھ ایسے آثار بھی مجھے ملے جن سے مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ لوگوں کا کہنا غلط نہیں ہے میاں تری لمبی عمر ہے۔ خدا نے طویل زندگی گزار چکا ہوں۔ اور اس طویل زندگی میں دنیا کے نہ معلوم کتنے سرد و گرم دیکھے ہیں لیکن جن واقعات سے اب سابقہ پڑا ہے ان سے کبھی نہیں پڑا تھا۔ میں نے درخت کو کٹوایا خود اپنی نگرانی میں۔ میں نے درخت کی کٹائی شروع کرائی تھی اس دن دوپہر کا وقت تھا مزدور درخت کی جڑیں کھود رہے تھے کہ درخت کی جڑ کے ایک حصے میں انہیں ایک قبر ملی یہ قبر عجیب و غریب تھی۔ کھدائی سے برآمد ہوئی تھی کتبہ اس کا کیا تھا کچھ لکھا ہوا نہیں تھا اس پر جب ہم نے کتبہ تڑوایا تو اس کے نیچے لوہے کا ایک ڈھکن برآمد ہوا مزدور بے چارے یہ ڈھکن دیکھ کر خوفزدہ ہو گئے تھے۔ اوّل تو درخت کی جڑ میں قبر دیکھ کر ہی چند مزدوروں کے ہاتھ پیر پھول گئے تھے اور انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ یہ کہیں کسی بزرگ وغیرہ کی قبر نہ ہو میں نے کہا کہ اب مجبوری ہے عمارتیں تیار کرنے کے لئے کھودنا ہی پڑے گا ویسے میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ اگر واقعی قبر ہی نکلی تو پھر حکومت سے رابطہ قائم کر کے کہوں گا کہ یہ جگہ چھوڑ دی جائے اور نقشے سے یہ مقام ہٹا دیا جائے۔ بہر طور لوہے کا ڈھکن دیکھ کر میرے ذہن میں ایک اور شبہ گزرا میں نے سوچا کہ کہیں اس درخت کی جڑ میں کوئی خزانہ وغیرہ دفن ہو انسان لالچ کا پتلا ہوتا ہے سچی بات یہ ہے کہ میرے دل میں لالچ آ گیا تھا۔ میں نے مزدوروں کو وہاں سے ہٹایا اور اس ڈھکن کی صفائی کرنے لگا خود میں نے اپنے ہاتھوں سے یہ کام کیا تھا صفائی کرنے کے بعد مجھے دفعتاً ایک اور چیز نظر آئی لوہے کے ڈھکن پر ایک سریا لگی ہوئی تھی۔ اور اس سریا میں ایک تالا پڑا ہوا تھا۔ تالا بند تھا وہ زنگ خوردہ ہو چکا تھا مجھے یقین ہو گیا تھا کہ کوئی خاص ہی بات ہے مزدوروں کو میں نے وہاں سے بالکل ہی دور ہٹا دیا تھا پھر میں نے ہتھوڑے مار مار کر وہ تالا توڑا اور قبر کا ڈھکن کھول دیا۔ تقریباً چار فٹ گہرا گڑھا تھا بالکل چوکور گڑھا جو اندر سے بالکل صاف و شفاف پڑا ہوا تھا۔ گڑھے میں سیاہ رنگ کا صرف ایک پتھر پڑا ہوا تھا۔ لیکن جیسے ہی میری نگاہ اس پتھر پر پڑی پتھر سے دھواں نکلنے لگا۔ عجیب و غریب سفید رنگ کا دھواں میں گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا تھا۔ دھواں تم یقین کرو تار اس انداز میں بلند ہوا تھا جیسے کوئی انسانی ھیولا ہو ہاں وہ دھواں بالکل ہی انسانی ھیولے کی شکل میں بلند ہوا اور چند ہی لمحات کے بعد قبر سے باہر نکل گیا۔ سیاہ رنگ کا پتھر اب وہاں موجود نہیں تھا یہ دیکھ کر میرے ہوش اڑ گئے میں نے ایسے پُراسرار واقعات

بھلا کہ بے کو دیکھے تھے بہر طور میں سوچ میں ڈوب گیا میں
نے ڈھکن اسی طرح بند کر دیا اور واپس گھر آگیا میرا ذہن
پریشان تھا، مزدوروں کو چونکہ صورتِ حال کا علم نہیں تھا اس
لئے تھوڑی دیر کے بعد وہ دوبارہ اپنے کام میں مصروف
ہوگئے۔ انہوں نے درخت کی جڑیں کھود کر اسے گرا دیا اس کے
بعد وہ درخت وہاں سے ہٹا دیا گیا تھا گڑھا بھی برابر کر دیا
گیا تھا لوہے کا ڈھکن وغیرہ نکال کر ایک طرف کباڑ خانے
میں ڈال دیا گیا پتہ نہیں کیوں میرے ذہن پر ایک خوف سا
طاری تھا مجھے وہ دھواں رہ رہ کر یاد آ رہا تھا میں نے اپنے
گھر میں بھی کسی سے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ لیکن یہ خیال بار بار
دل میں آتا تھا کہ کہیں واقعی وہ کسی بزرگ کی قبر نہ ہو کہیں
اس کی وجہ سے میرے سر پر پریشانیاں نازل نہ ہوں اور
وقار میاں اُس دن سے میری مصیبتوں کا آغاز ہو گیا۔ رات
کو میں سو رہا تھا کہ دفعتًا چھت پر مجھے قدموں کی آہٹیں سنائی
دیں یہ مکان میں تمہیں اس کے بارے میں بتاؤں بہت عرصے
سے بند پڑا ہوا تھا۔ کبھی کسی نے اسے بنوایا تھا لیکن سنا ہے
کہ اس مکان کا مالک کبھی اس مکان میں نہیں آیا یہ مکان کس کا
تھا اور کس کی ملکیت تھا۔ اس کے بارے میں آج تک کچھ بھی معلوم
نہیں ہو سکا۔ حکومت کے کاغذات میں بھی اس کا کوئی تذکرہ
نہیں ہے۔ میں کیونکہ یہاں باغ میں کام کرانے والا تھا اس
لئے مجھے کسی رہائش گاہ کی بھی ضرورت تھی میں نے حکومت کی
اجازت سے اس مکان میں اپنا قیام کر لیا بچے تو سب پڑھائی
لکھائی میں لگے ہوئے ہیں میں نے سوچا کہ اس گھر میں میں رہوں گا
میری بیوی نے مجھ سے کہا کہ لمبا کام ہے اس لئے وہ وہاں رہ کر
کیا کرے گی۔ سلیمہ بھی پیچھے پڑ گئی۔ چنانچہ میں ان دونوں کو بھی
یہاں ساتھ لے آیا تھا۔ مکان میں آئے ہوئے تقریبًا دو ڈھائی
مہینے ہو چکے تھے۔ مجھے اور ان دو ڈھائی مہینوں میں کوئی ایسی
بات نہیں ہوئی۔ جو میرے لئے شبہ کا باعث ہوتی اس لئے مجھے
کوئی پرواہ نہیں تھی۔ سلیمہ وغیرہ کو بھی یہاں کا ماحول بے حد
پسند تھا گرمی تو یہاں حسبِ معمول ہی ہوتی ہے۔ لیکن رات خوشگوار
ہو جاتی ہے تو میں تمہیں بتا رہا تھا کہ مجھے آہٹیں سنائی دیں
میں [illegible] میں نے سوچا کہیں کوئی چور وغیرہ نہ ہو لاٹھی
اور ٹارچ لے کر اوپر پہنچا لیکن چھت پر کسی انسان کا کوئی وجود
نہیں تھا۔ البتہ میں نے زمین پر ایک جگہ خون پڑا ہوا دیکھا
ٹارچ کی روشنی میں مجھے یہ خون صاف نظر آ رہا تھا مجھے بڑی
حیرت ہوئی میں نے چاروں طرف گھوم پھر کر دیکھا لیکن قرب و جوار
میں کوئی نہیں تھا۔ دفعتًا نیچے سے سلیمہ کے چیخنے کی آواز سنائی
دی وہ دہشت سے حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہی تھی۔ اور اس
کے چیخنے کی وجہ سے میری بیوی بھی خوف سے چیخ پڑی تھی
وہ سوتے سے جاگ گئی تھی۔ بہر طور میں نیچے کی طرف دوڑا نیچے
پہنچ کر میں نے سلیمہ کی حالت دیکھی۔ آہ۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتا
وقار کیا کیفیت تھی اس کی، اس کی زبان تقریبًا چھ انچ باہر
نکل آئی تھی اور آنکھوں کے ڈھیلے خوفناک انداز میں پھٹے
ہوئے تھے اور سرخ ہو رہے تھے اس کے دونوں ہاتھ پھیلے
ہوئے تھے اور اس کے حلق سے خوفزدہ سی چیخیں نکل رہی تھیں میری
بیوی اس کی شکل دیکھ کر خوف سے بے ہوش ہو گئی تھی پھر میں
نے سلیمہ کے سر کے بالوں کو ہوا میں اس طرح گھومتے ہوئے دیکھا
جیسے کوئی چکر کی پھر رہی ہو اس پر کسی آسیب کا سایہ ہو گیا
تھا۔ میرا دل خوف و دہشت سے دھڑکنے لگا، میری سمجھ میں
نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ تقریبًا آدھے گھنٹے تک سلیمہ کی
یہی کیفیت رہی وہ ایک جگہ کھڑی رہی اس نے اپنا ایک
پاؤں اٹھا رکھا تھا پھر آہستہ آہستہ اس نے پاؤں نیچے رکھ دیا
اس کے ہاتھ بھی لٹک گئے اور زبان اندر ہو گئی اور ڈھیلے
اپنی جگہ واپس آ گئے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ دھڑام سے
زمین پر آ رہی تھی۔ میں حیرت سے بت بنا اس کے سامنے
کھڑا ہوا تھا اس آدھے گھنٹے کا مجھے احساس بھی نہیں ہوا جب

جب اس کی یہ کیفیت ختم ہوگئی تو دفعتاً مجھے اس کی اس کیفیت کا احساس ہوا اور میں اس کی طرف دوڑ پڑا۔ میں نے اس کے بدن کو اٹھانے کی کوشش کی لیکن وقار میاں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس کا جسم منوں وزنی تھا میں نے اس کی گردن میں ہاتھ ڈالتے کے لئے اُسے سرکانے کی کوشش کی تو اسے نہ سرکا سکا۔ تم سلیمہ کو اچھی طرح جانتے ہو نرم و نازک سی لڑکی ہے۔ بھلا اس میں اتنا وزن کہاں تھا میرے مضبوط ہاتھوں سے ہل بھی نہ سکے لیکن میں اسے ہلا نہ سکا میں اب بری طرح بدحواس ہوگیا تھا اور ادھر بیوی بھی بے ہوش پڑی تھی بابا فقیر محمد کے ساتھ دو آدمی اور بھی تھے جنہیں سوتے سے جگایا اور اٹھا کر اندر لایا۔ صورتِ حال میں نے انہیں بتائی تھی۔ میں نے ان سے کہا کہ سلیمہ کو اٹھا کر بستر پر ڈالیں انہوں نے اسے اٹھایا تو آرام سے اٹھا کر بستر پر ڈال دیا ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اب سلیمہ کے بدن میں وہ وزن نہ رہا ہو رات بھر سلیمہ بے ہوش رہی بڑی مشکل سے اپنی بے ہوش بیوی کو ہوش میں لایا وہ بے چاری بری طرح بدحواس ہو کر رونے لگی تھی۔ میں نے اسے صورتِ حال بتائی اور کہا کہ ضرور ہم سے کوئی غلطی ہوگئی ہے اب کیا کیا جائے اس جگہ کو تو چھوڑ دیں گے۔ لیکن ہمیں وہ بزرگ معاف کیسے کریں گے جن بزرگ کی وہ قبر تھی کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی صبح آنکھوں ہی آنکھوں میں ہوگئی سلیمہ کو سخت بخار چڑھا ہوا تھا اور وہ بڑی تھکن محسوس کر رہی تھی بڑی مشکل سے اسے ایک پیالی چائے پلائی اور اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ بخار کی وجہ سے میں بستی کے ڈاکٹر سے ملا ڈاکٹر کریم خاں بہت اچھے آدمی ہیں۔ بس بے چارے ایسے ہی ڈاکٹر ہیں چھوٹے موٹے علاج کر لیا کرتے ہیں۔ بخار کی دوا دے کر چلے گئے۔ بخار کی وجہ ان کے سمجھ میں نہیں آئی تھی لیکن میں نے انہیں صورتِ حال بھی نہیں بتائی تھی، دن میں میں کام پر چلا گیا دل ہول رہا تھا مزدوروں سے میں نے کہا کہ اس جگہ کے گرد ... کر ایک احاطہ بنا دیا جائے

وہاں پہنچ کر میں نے دل ہی دل میں ان بزرگ سے بڑی معافیاں مانگیں۔ جنہیں میرے ہاتھوں سے تکلیف پہنچی تھی۔ یہ تقریباً کوئی دو بجے کی بات ہے جب اچانک مزدوروں میں ہنگامہ ہوگیا۔ اور دفعتاً کسی نے ایک مزدور کو اٹھا کر زمین پر دے مارا مزدور کے کافی چوٹ آئی تھی کسی کے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس مزدور کو کس نے اٹھا کر پٹخا ہے۔ بہرحال مزدور تھوڑی دیر بے ہوش رہا۔ ہوش میں آنے کے بعد اس نے بتایا کہ وہ خود نہیں سمجھ سکا تھا کہ اس کو کس نے پٹخا ہے۔ بس کسی نے اس کی ٹانگوں میں ہاتھ ڈالا اور اٹھا کر زمین پر دے مارا ٹانگوں میں ہاتھ ڈالنے والے کو وہ دیکھ نہیں سکا تھا۔ مزدوروں میں کچھ بے چینی پھیل گئی۔ رات کو وہ سب باغ کے ایک گوشے میں آرام کرتے تھے اس وقت وہ سب سونے کو لیٹ رہے تھے دفعتاً ایک مزدور نے ہنگامہ کر دیا۔ وہ منمناتی آواز میں چیخ رہا تھا اور عجیب وحشیانہ انداز میں اچھل اچھل کر گا رہا تھا۔ مزدوروں نے جب اس کی شکل دیکھی تو خوف سے ان کی گھگھی بندھ گئی ناچنے والے مزدور کی زبان باہر نکل آئی تھی آنکھیں خوفناک انداز میں چمک رہی تھیں۔ مزدوروں کا کہنا ہے کہ یہ آنکھیں روشن بتیوں کی طرح چمک رہی تھیں پھر اس مزدور نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا کہ سب بھاگ جائیں۔ ورنہ سب کو بھسم کر دے گا۔ چنانچہ بہت سے مزدور تو اس دن صبح کو چلے گئے تھے جو ذرا ہمت والے تھے انہوں نے مجھ سے رابطہ قائم کیا اور بتایا کہ یہ باغ آسیب زدہ ہے اور اب باغ کے آسیبوں نے ان کے لئے مصیبت کھڑا کر دی ہے دوسرے دن کام ہوتا رہا۔ مگر مزدور بہت تھوڑے رہ گئے تھے۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ شہر جا کر کچھ اور مزدور لے آؤں لیکن اس کا مجھے موقع ہی نہ مل سکا جو تک رات کو سلیمہ کی حالت پھر ویسی ہی ہوگئی تھی اس رات سلیمہ نے ایک بھیانک آواز میں ہم لوگوں سے بات چیت کی اور عجیب و غریب باتیں کرتی رہی بڑا خوفناک منظر

ہو گیا تھا، وقار میاں بس میں تمہیں کیا بتاؤں اور اس کے بعد سے تو سلیمہ پر مسلسل ایسے دورے پڑ رہے ہیں ذرا اس کی حالت تو دیکھو کیا ہو گئی ہے بہر طور مزدور آہستہ آہستہ کر کے سب بھاگ گئے اور کام رک گیا، میں بڑا پریشان تھا ڈاکٹر بے چارے سلیمہ کو دوائیں دے رہے تھے مگر میں جانتا ہوں کہ ان کی دوائیں بھی بے مقصد ہیں یہاں ایک دو احاطہ مسجد ہے میں اس کے مولوی صاحب سے ملا جو بزرگ آدمی ہیں وہ بے چارے گھر آئے۔ گھر آنے کے بعد انہوں نے سلیمہ کو دیکھا اُس کی ہتھیلیاں سونگھنے کے بعد انہوں نے پریشان لہجے میں کہا کہ وہ آسیبیت کا شکار ہے لیکن یہ آسیب اچھی روحیں نہیں ہیں۔ بلکہ تم انہیں گندی روحیں کہہ سکتے ہیں ان کی بات سن کر میں پریشان ہو گیا تھا اچھی روحوں کے سامنے تو معافی تلافی سے کام چل سکتا ہے لیکن یہ بھوت پریت جس کے پیچھے پڑ جائیں اس کی گلو خلاصی ذرا مشکل ہی سے ہوتی ہے۔ میں نے مولوی صاحب سے کہا کہ وہ خدا کے لئے کچھ کریں مولوی صاحب نے مجھے چند تعویذ دیئے لیکن یہ تعویذ کارگر نہ ہوئے بلکہ مولوی صاحب بھی پریشانی کا شکار ہو گئے۔ انہوں نے بتایا کہ رات کو مسجد کے گرد بے شمار لوگ دوڑتے بھاگتے اور گالیاں بکتے رہے ہیں وہ سب کے سب چھوٹے قد کے سیاہ فام بونے تھے اور عجیب و غریب آوازیں انہیں سنائی دیتی رہیں اگر یہ مسجد کے اندر نہ ہوتے تو یہ خبیث روحیں یقیناً انہیں بھی نقصان پہنچانے کی کوشش کرتیں۔ مولوی صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ کسی بڑے عامل سے رجوع کروں یہ ڈاکٹر وغیرہ کے بس کی بات نہیں ہے۔ مولوی صاحب نے خود بھی معذوری ظاہر کی تھی اور کہا تھا کہ وہ تھوڑا سا علم رکھتے ہیں اور یہ علم ان بھوتوں کے لئے ناکافی ہے البتہ انہوں نے مجھے ایک ہدایت کی تھی، انہوں نے کہا تھا کہ میں کسی سے اس کا تذکرہ نہ کروں لوگوں کو اگر خود معلوم ہو جائے تو دوسری بات ہے۔ بہر طور چند مزدوروں کی زبانی بستی میں یہ بات پھیل گئی اور لوگ اب تو اس عمارت کے پاس آتے ہوئے بھی کتراتے ہیں۔"

"آپ نے سلیمہ کو شہر کے کسی ڈاکٹر کو کیوں نہیں دکھلایا شاہ جی؟" میں نے متعجبانہ انداز میں پوچھا۔

"بس کیا بتاؤں جو بیت رہی ہے مجھ پر۔ میں جانتا ہوں میرا دل جانتا ہے۔ سلیمہ کو دوبارہ لے جانے کی کوشش کر چکا ہوں لیکن بتاؤں کیا ہوا"؟

"ایک دفعہ سلیمہ کو جیپ میں ڈال کر شہر کی طرف لے چلا تو تقریباً کوئی دو تین ہی میل گیا ہوں گا کہ ریڈی ایٹر میں آگ بھڑک اٹھی پانی بالکل خشک ہو گیا تھا حالانکہ ریڈی ایٹر بالکل ٹھیک ٹھاک تھا بڑی مشکل سے مٹی وغیرہ ڈال کر آگ بجھائی اور جیپ ناکارہ ہو گئی تھی اُسے چھوڑ چھاڑ کر بچی کو لے کر واپس آ گیا پھر اس کے بعد جیپ ٹھیک ٹھاک کرائی یہیں ایک دو مستری وغیرہ بھی رہتے ہیں ٹھیک کرانے کے تقریباً ایک ہفتے کے بعد میں نے پھر کوشش کی سلیمہ کو جیپ میں لے کر چلا۔ ابھی زیادہ دور چلا نہیں تھا کہ دفعتاً جیپ میں سانپوں کا ایک جوڑا پھنکارنے لگا بس یوں سمجھو کہ ایک خوفناک حادثہ ہوتے ہوتے بچا تھا بڑی مشکل سے کود کاد کر ہم نے جان بچائی، سانپ جیپ ہی میں تھے اس کے بعد میں نے لاکھ کوشش کی کہ انہیں تلاش کر لوں لیکن وہ نہ ملے دوبارہ میں نے سلیمہ کو جیپ میں بٹھا کر جیپ آگے بڑھائی کہ ایک بار پھر سانپوں کی پھنکار ہمیں سنائی دی اس بار وہ جیپ کے ہڈ پر رینگ رہے تھے پھر وہ ہڈ سے اترے اور جیپ کے آگے پھنکار کر کھڑے ہو گئے میں نے چاہا کہ انہیں کچلتا ہوا گزر جاؤں لیکن چند ہی قدم بڑھا تھا کہ جیپ کے ریڈی ایٹر سے پھر وہی شعلے بلند ہو گئے اور انجن میں آگ لگ گئی جیپ بالکل ناکارہ ہو گئی وہ دیکھو پیچھے کھڑی ہوئی ہے آج کل جیپ میرے استعمال میں نہیں ہے۔"

شاہ جی نے بتایا اور میں خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔

شاہ جی آہستہ بولے

"صاف ظاہر تھا کہ کوٹھی میں شہر جانے سے
روک رہا تھا اس کے بعد سلیمہ کو شہر لے جانے کی ہمت
نہ کر سکا۔ پھر ایک دفعہ میں شہر کے لئے چلا ارادہ یہی تھا
کہ کسی عامل کو تلاش کروں گا یا ڈاکٹر صاحب سے
ملوں گا تھوڑے ہی فاصلے پر چلا ہوں گا کہ ایک بار
پھر مجھے سانپوں نے گھیر لیا۔ یہ سانپ عجیب قسم کے
ہوتے ہیں۔ سیلے سیلے کوڑیالے سانپ جو سینکڑوں
کی تعداد میں مجھے نظر آتے ہیں لیکن اس وقت جب میں
شہر کسی ایسے ارادے سے جانے کے لئے نکلتا ہوں میں
ڈرپوک آدمی نہیں ہوں میاں تم تو نہیں سمجھتے لیکن آغا جان
مجھے اچھی طرح جانتے ہیں، جوانی میں بڑے بڑے ہنگامے
کر چکا ہوں لیکن سچی بات یہ ہے کہ اب ہمت ہار بیٹھا ہوں۔"

"ان سانپوں نے آپ کو کبھی کوئی نقصان پہنچایا۔"

"نہیں، لیکن وہ میرا راستہ روکتے ہیں سلیمہ کے
علاج کے لئے کہیں نہیں جانے دیتے۔"

"آپ نے کبھی انہیں ہلاک کرنے کی کوشش نہیں کی۔"

"ان حالات میں ہمت نہیں پڑی۔"

"وہ دوسرے لوگوں کو بھی نظر آتے ہیں؟"

"ہاں، اگر کوئی میرے ساتھ ہوتا ہے تو وہ بھی
ان سانپوں کو دیکھتا ہے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ
وہ صرف ہمارا راستہ روکنے کی کوشش کرتے ہیں اگر
اس کے باوجود ہم ان سے چھیڑ چھاڑ کرنے کی کوشش
کریں تو یقیناً وہ ہم پر حملہ کریں گے۔"

"بڑی پریشانی کی بات ہے آپ نے حکومت کو
اس بارے میں تفصیلات نہیں فراہم کیں۔"

صورت حال کی اطلاع بھجوا دی ہے مجھے خطرہ ہے
کہ کسی دوسرے کنٹریکٹر کو یہ ٹھیکہ نہ دیا جائے بہرحال
مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے، میں تو بس اپنی بیٹی کے لئے پریشان ہوں۔
مخلصی کی کوئی صورت مجھے نظر نہیں آ رہی ہے۔"

ٹھیکیدار غوث شاہ کے چہرے سے ان کی دلی کیفیت کا پتہ
چلتا تھا۔ بے چارا گھرانہ پریشانی کا شکار ہو گیا تھا میں آنکھیں بند کر کے
اُن کی باتوں پر ایمان لے آیا تھا۔ دل تو چاہا کہ انہیں اپنی بپتا سناؤں،
لیکن وہ خود عذاب کا شکار تھے میری کہانی سے اور بھی پریشان ہو جاتے،
اس لئے میں نے اُن سے کچھ نہ کہا۔

"تم سناؤ آغا جان کیسے ہیں؟"

"ٹھیک ہیں خدا کا شکر ہے۔ میں خود سوچ رہا تھا کہ آپ
نے ابھی تک مجھ سے بات نہیں کی ہے۔"

"سکون ملتا تو تم سے بات کرتا۔ تم نے حالات سن لئے ہیں اب بتاؤ۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔ خدا رحم کرے۔ آپ نے مجھے کسی خاص کام سے
بلایا تھا۔" میں نے سوال کیا۔

"ہاں۔"

"کہئے۔ مجھے آپ کی خدمت کر کے خوشی ہو گی۔"

"بہت دن پہلے کی بات ہے تم نے ایک دفعہ کچھ واقعات
سنائے تھے مجھے۔"

"کون سے واقعات؟"

"مجھے صحیح طور پر تو یاد نہیں تمہارے کسی دوست کے بھائی کی
کمر میں پھوڑا ہو گیا تھا اور کوئی ایوداؤد حسن تھا تم نے اس کا علاج
کسی حکیم اصغر علی سے کرایا تھا۔"

"وہ حکیم صاحب مجھے یاد ہیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"ملاقات ہوتی ہے ان سے۔"

"اس سلسلے میں بہت بدقسمت ہوں، یعنی اُن ہی دنوں ملاقاتیں
ہوئیں تھیں اس کے بعد نہیں جا سکا۔"

"ہاں بشرطیکہ وہ اسی جگہ ہوئے۔"

"وقار میاں اُن کے بارے میں معلوم کرو۔ اس وقت انہیں
جیسے کسی باکمال بزرگ کی ضرورت ہے۔ اگر وہ ازراہ کرم ہماری

اور خدانخواستہ وہ ماندہ ہو جائیں تو ممکن ہے سلیمہ بچ جائے میں خود تو اس کوشش میں ناکام رہا اس لئے میں نے تمہیں اطلاع بھیجی"۔ غوث شاہ نے رندھی آواز میں کہا۔

"میرے ذہن میں ایک چھناکہ سا ہوا جیسے بہت سے شیشے ٹوٹ گئے ہوں' دوپہر کے واقعات میرے ذہن کے پردے پر ثبت تھے۔ شاہ جی نے مجھے ایک ایسے کام کے لئے بلایا تھا جس کے سلسلہ میں ان کا راستہ ہمیشہ روکا گیا تھا گیا میرے ساتھ پیش آنے والے واقعات اس سلسلے کی کوئی کڑی نہیں ہو سکتے تھے اس وقت اگر شاہ جی کو اس بارے میں بتاتا تو ممکن ہے وہ اسے کوئی عذر لنگ سمجھتے۔ ممکن ہے سوچتے کہ میں نے خوفزدہ ہو کر اپنی جان بچانے کے لئے یہ کہانی سنا دی ہے۔ اس لئے میں خاموش رہا۔ شاہ جی نے کہا۔

"مجھے خود غرض مت سمجھنا وقار میاں' میں اپنے بیٹوں کو بھی بلا سکتا تھا' لیکن تمہارے بغیر کوئی کام نہیں ہو سکتا تھا پھر ان خبیث روحوں کو ہمارے خاندان سے دشمنی ہے تم میری مدد کر سکتے ہو وقار۔ میری سلیمہ کی جان بچاؤ۔"

شاہ جی کی سسکیاں نکل گئیں۔ میں نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "آپ نے بہت اچھا کیا شاہ جی جو مجھے بلا لیا۔ مجھے اجازت دیں میں ابھی جاتا ہوں حکیم صاحب مطب میں تو ملیں گے نہیں لیکن مجھے ان کا گھر بھی معلوم ہے۔"

"ابھی۔"؟

"ہاں جب حالات معلوم ہو گئے تو دیر کیسی۔" میں نے کہا۔ انسانی ہمدردی خوف پر غالب آگئی تھی ورنہ راستے میں جو کچھ ہوا تھا اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ کان دبا کر صبح کا انتظار کرتا۔ لیکن شاہ جی کو ڈھارس دینا بھی ضروری تھا۔ شاہ جی بولے۔

"تم تھکے ہوئے ہو بیٹے۔ صبح دن میں انہیں لے آنا۔"

"نہیں شاہ جی۔ میں ابھی جاؤں گا۔ اور اسی وقت میں انشاء اللہ حکیم صاحب کو لے آؤں گا۔" میں نے کہا۔ شاہ جی نے گردن جھکا لی۔ تب میں نے کہا۔ "بس مل جائے گی اس وقت۔"؟

ہاں کیوں نہیں۔ یہ ٹھیک ہے بس سے چلے جاؤ موٹر سائیکل یہیں چھوڑ دو۔"

چنانچہ میں خدا کا نام لے کر تیار ہو گیا۔ میں نے شاہ جی کو بس اڈے تک جانے سے روک دیا تھا۔ خود ہی میں بس اڈے تک آیا اور بس کا انتظار کرنے لگا۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد بس آئی تھی۔ سواریاں زیادہ نہیں تھیں میں بیٹھ گیا۔ دل ہی دل میں خوفزدہ تھا کہ کہیں بس کو کوئی حادثہ پیش نہ آ جائے۔ ہر لمحہ اس کا منتظر رہا۔ لیکن خدا کا شکر ہے ایسی کوئی بات نہیں ہوئی اور تقریباً گیارہ بجے میں ملتان پہنچ گیا۔ اس وقت تھکن اس طرح سوار تھی کہ ایک قدم چلنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ ایک تانگہ مل گیا۔ حکیم صاحب کے بارے میں یقین تھا کہ اب وہ گھر پر ہی ہوں گے چنانچہ میں نے تانگہ والے کو پتہ بتایا۔ سڑکیں اور گلیاں اس طرح سنسان تھیں جیسے آدھی رات گزر چکی ہو آوارہ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں ابھر رہی تھیں حکیم صاحب کے گھر میں اندھیرا تھا۔ ایک لمحے کے لئے دل میں ہچکچاہٹ ابھری۔ کیا اس وقت حکیم صاحب کو جگانا مناسب ہوگا۔ لیکن اس وقت اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ چنانچہ میں نے دروازے پر دستک دی۔

پہلی دستک پر اندر سے آواز سنائی دی۔ "آ رہا ہوں بھائی"۔ اور پھر دروازہ کھل گیا۔ حکیم صاحب بفضلِ تعالیٰ ویسے کے ویسے تھے۔ تعجب خیز بات یہ تھی کہ انہوں نے مجھے میرے نام سے مخاطب کیا۔

"اوہو وقار میاں۔ سب خیریت ہے نا۔"؟

"خدا کا احسان ہے۔ کچھ کام تھا آپ سے۔"؟

"تو میاں باہر کیوں کھڑے ہو۔ اندر آ ؤ " انہوں نے کہا مکان کی یہ دیوڑھی میرے لئے اجنبی نہیں تھی۔ حکیم صاحب نے ایک اور بلب جلا دیا تاکہ تیز روشنی ہو جائے

"کہیں دور سے آرہے ہو۔"؟

"جی ہاں۔"

"اہل خانہ تو خیریت ہیں۔"؟

"جی۔" میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ حکیم صاحب بھی بیٹھ گئے تھے۔ وہ بغور مجھے دیکھ رہے تھے۔ "حکیم صاحب آپ خود ہی اندازہ لگا لیجئے کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں۔" میں نے کہا اور وہ ہنسنے لگے۔

"میاں امتحان لے رہے ہو اس عاجز کا۔ بخدا میں روشن ضمیر نہیں ہوں بڑی معمولی ہستی ہے میری۔ تم خود مجھے بتاؤ۔"

"مجھے علم ہے حکیم صاحب آپ بندگان خدا کی مدد کرتے ہیں، ایک مسلمان کو آپ کی ضرورت ہے خدا کے نام پر"

"فقیر حاضر ہے۔ کہو کون ہے وہ۔"؟

"غوث شاہ نام ہے۔" میں نے کہا اور پھر میں نے حکیم صاحب کو شاہ جی کی بپتا سنادی۔ حکیم صاحب غور سے یہ داستان سن رہے تھے۔ میرے خاموش ہونے کے بعد بھی وہ دیر تک خاموش رہے پھر بولے۔

"ہاں۔ وہ ارواحِ خبیثہ ہیں۔ انہیں درخت کی جڑ میں قید کر دیا گیا تھا تالا کھولنا بہتر نہ ہوا۔"

"کوئی حل ہے حکیم صاحب۔"؟

"خدا بڑا ہے۔ بڑی بپتا ہے۔ وہ فنا ہوں گی۔ کل انشاءاللہ میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔"

"خدا آپ کو اجر دے۔ کس وقت چلیں گے حکیم صاحب۔"؟

بہتر ہوگا کہ علی الصبح چلیں۔ آٹھ بجے تک آجاؤ۔ بس مل جائے گی۔"

"ٹیکسی یا کار کا بندوبست کرلوں گا میں۔"

"فضول خرچی بری چیز ہے میاں۔ کل آٹھ بجے آجانا میرے پاس تم۔"

"میری اپنی بھی ایک کہانی ہے حکیم صاحب اگر سمع خراشی نہ ہو تو۔"

"دیکھو میاں۔ یہ دنیا عجائبات کا مسکن ہے ناپاک روحیں صحراؤں میں بھٹکتی ہوتی ہیں ویرانے ان کی عیش گاہ ہوتے ہیں۔ سنہرے جال پھیلاتے ہیں وہ بھولے بھالوں کے لئے۔ خدا کے فضل سے تم محفوظ رہے۔ اس معبود کا شکر ادا کرو۔ اب آرام کرو۔"

ان الفاظ میں میری کہانی چھپی ہوئی تھی۔ اس کے بعد کچھ کہنا فضول تھا۔ میں سلام کر کے وہاں سے نکل آیا۔ سوا بارہ بجے گھر پہنچا بچے سو چکے تھے صرف فریدہ جاگ رہی تھی وہ میرے لئے پریشان تھی۔

موٹر سائیکل کہاں ہے"؟ اس نے سوال کیا۔ میں نے راستے میں فیصلہ کر لیا تھا کہ گھر میں اس بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا ابھی تو مجھے بہت کام کرنا تھا۔ اگر صورتِ حال فریدہ کو معلوم ہو جاتی تو وہ پریشان ہوتی۔ میں نے بات بنادی۔" خراب ہوگئی تھی۔ میکنک کے ہاں چھوڑ دی ہے۔"

" او کیا خرابی ہوگئی ہے"؟

"بس بھئی یہ تو اب میکنک ہی جانتا ہوگا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"شاہ جی سے ملاقات ہوئی۔" میری بیوی نے سوال کیا۔

"ہاں ملاقات ہوگئی، ان کی بیٹی بیمار ہے بے چاری کافی طبیعت خراب ہے۔"

"کون سلمہ۔"؟ فریدہ نے سوال کیا۔

"ہاں۔ کافی طبیعت خراب ہے اس کی۔ کل صبح مجھے پھر جانا ہے۔"

"اوہ اچھا۔ اگر مجھے فرصت ہوتی تو میں بھی چلتی لیکن

ویرانوں میں بھٹکتی ہیں آبادیوں میں تو اب ان کا گزر نہیں ہے کیونکہ انسان ان سے کہیں زیادہ خبیث ثابت ہوتا ہے لیکن ویرانوں کے ان مسکنوں میں وہ انسانوں کو بھٹکانے کے لئے ہر کام کر لیتی ہیں۔ تم گرمی سے بری طرح پریشان ہو گئے تمہیں سی پناہ گاہ کی تلاش ہو گی۔ اس وقت تمہارے لئے کوئی پناہ گاہ دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہو گی۔ بس انہوں نے تمہارے دل کا حال جان لیا۔"

"گگ۔ کیا مطلب" ؟

"تمہارے لئے انہوں نے ایک نظری دھوکا تیار کیا نیم کے درختوں کا ایک جھنڈ اور ان کے درمیان ایک خیالی عمارت جو تمہارے لئے بہت عمدہ ثابت ہو سکتی تھی۔ چونکہ تمہیں اس وقت اس عمارت کی ضرورت تھی انہوں نے درختوں کا جھنڈ دکھا کر تمہیں اس کی طرف متوجہ کیا اس کی گھنی چھاؤں میں تمہیں سکون کے لمحات میسر کیے اور پھر اس مکان میں بلا لیا جہاں وہ اپنی شیطانی حرکتوں کو چھپائے ہوئے تھے اور اس کے بعد انہوں نے تمہارے لئے کچھ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن یہاں تقدیر کی بات ہوتی ہے بس کوئی نیکی ایک روشن سوراخ کی مانند ہو گی جس سے تمہیں باہر نکلنے کا موقع ملا۔"

"خدا کی قسم حکیم صاحب یہی سب کچھ ہوا تھا۔ یہی سب کچھ ہوا تھا۔ [illegible] سے خون کی پتلی سی دھار نکلی اور میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے۔"

"خدا کا شکر ہے کہ تمہارا سارا وجود گندا نہ ہوا اگر خون کی دھار تمہارے سر پر بہہ جاتی تو پھر خدا جانے کیا ہوتا۔" حکیم صاحب نے کہا۔

"اوہ اس کا مطلب ہے اس کا مطلب ہے۔"

"ہاں [illegible] پاؤں تک تمہیں اپنے گھیرے میں لے لیتیں [illegible] تمہارا [illegible] ممکن ہی نہیں تھی۔ بہتر یہی ہوا [illegible] تمہیں [illegible] کے نیچے بیٹھنے سے باز رکھا اور وہ غلیظ خون صرف تمہارے بدن کے تھوڑے سے حصے کو گندہ کر سکا۔"

"خدا کی پناہ۔ خدا کی پناہ۔ اس کا مطلب ہے میں بال بال بچا ہوں حکیم صاحب۔"

"بچانے والا وہ قادر مطلق ہے۔ حکیم صاحب نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا اور اس کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا ہے جیسے وہ مراقبے میں کھو گئے ہوں۔ اب میں نے ان سے بات کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ پتہ نہیں کون سے عالم میں پہنچ گئے تھے انہیں پریشان کرنا میرے لئے مناسب نہیں تھا۔

بس کا سفر جاری رہا۔ میرے ذہن میں شاہ جی اتر آئے تھے بے چارے کس بے چینی سے میری آمد کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ کیا حکیم صاحب واقعی ان کی پریشانی دور کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ میرے ذہن میں یوسف کا بھائی جھک آ گیا جنگل [illegible] حکیم صاحب نے [illegible] تھا جس کا [illegible] حکیم صاحب [illegible] کوشش کامیاب ہو جائیں گے مجھے بھرپور امید تھی۔

بس نے بالآخر ہمیں اس اڈے پر پہنچا دیا جو اس بستی کا تھا جس میں شاہ صاحب نے ٹھیک لیا تھا۔ ہم دونوں اتر کر پیدل چل پڑے۔ یہ دلچسپ بات تھی کہ ابھی ہم چند ہی قدم چلیں ہوں گے کہ شاہ جی ہمارے پاس پہنچ گئے وہ بس اڈے پر ہمارا انتظار کر رہے تھے انہیں دیکھ کر میں نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

"خیریت تو ہے شاہ جی۔"

"ہاں میاں اللہ کا احسان ہے سب خیریت ہے بس تمہارا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا" شاہ جی نے جواب دیا۔

"ان سے ملئے یہ حکیم اصغر علی صاحب ہیں۔" میں نے کہا اور شاہ جی دونوں ہاتھ بڑھا کر حکیم صاحب کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لینے لگے۔ انہوں نے حکیم صاحب کے ہاتھ کو بوسہ دینا

ظاہر ہے بچے اسکول جاتے ہیں، خاص طور سے آج کل تو بالکل ہی فرصت نہیں ہے۔"

کوئی بات نہیں پھر کبھی دیکھ آنا، ویسے کل صبح اگر ممکن ہو سکے تو مجھے چھ بجے تک جگا دینا۔" میں نے ہدایت کی اور سونے کے لئے لیٹ گیا۔

اگر میں خود گزرے ہوئے واقعات زبیدہ کو بتاتا تو اس کی راتوں کی نیندیں خراب ہو جاتیں، سکون کھو بیٹھتی وہ اپنا، کیوں کہ وہ ڈرپوک قسم کی لڑکی ہے۔ اس لئے میں نے اس سے اس بارے میں کچھ نہیں کہا۔ البتہ بستر پر لیٹنے کے بعد وہ ہولناک واقعات میرے ذہن پر کچھ زیادہ ہی اثر انداز ہونے لگے۔ مجھے وہ خوفناک چہرے یاد آگئے، بے آنکھوں والا سنڈ مسنڈ سا مرد، اور خوش شکل حسین عورت، اور پھر اس کی ٹوٹتی سے بہتا ہوا خون۔ یہ سب ایسی ہی دہشت ناک چیزیں تھیں، جنہوں نے مجھے بے کل کر رکھا تھا۔

حکیم اصغر علی صاحب نے کہا تھا کہ وہ روشن ضمیر نہیں ہیں بلکہ ایک بندہ عاصی ہیں، لیکن میری کہانی سننے سے پہلے ہی انہوں نے اس بارے میں جان لیا تھا۔ مجھے افسوس ہونے لگا کہ اس دوران میں حکیم صاحب سے ملاقاتیں کیوں نہ کرتا رہا، ان جیسے صاحب کمال بزرگوں سے تو ہمیشہ فیض ہی حاصل ہوتا ہے۔ میں نے عہد کر لیا تھا کہ آئندہ ان کی صحبت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کروں گا۔ بشرطیکہ وہ بے چارے شاہ جی کے مسئلے میں کامیاب ہو جائیں۔ سلیمہ بڑی اچھی لڑکی تھی، لیکن کسی طور پہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ غیر تعلیم یافتہ ہے۔ بہت ہی اچھی طبیعت کی مالک تھی، میرے دل سے دعائیں نکلیں کہ خداوند کریم اسے صحت یاب کرے۔ بہر طور بڑی ذمہ داری کے ساتھ دوسری صبح میں حکیم اصغر علی کے پاس پہنچ گیا، بے چارے تیار بیٹھے میرا انتظار کر رہے تھے۔

"مجھے دیر تو نہیں ہوئی؟"

"نہیں میاں، صحیح وقت پر آگئے ہو، چلیں؟" انہوں نے سوال کیا۔

"جی ہاں!"

"حکیم صاحب نے ایک چھوٹا سا بریف کیس ہاتھوں میں اٹھایا ہوا تھا، اس میں شاید کچھ دوائیں وغیرہ تھیں۔ میں نے ان کے ہاتھ سے بریف کیس لینا چاہا تو وہ مسکرانے لگے۔

"چلتے رہو میاں، چلتے رہو۔ احترام بڑی اچھی چیز ہے لیکن آخرت میں میرے گناہوں کا بوجھ کون اٹھائے گا۔ اپنا بوجھ خود ہی لے کر چلنے دو۔"

"میں خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم بس اڈے پہنچ گئے، حکیم صاحب ہی کی خواہش تھی کہ بس سے سفر کیا جائے، بہر طور بس میں بیٹھ کر ہم چل پڑے۔ میں نے بھی بس کے اس سفر کو بہتر خیال کیا تھا، حالانکہ میں جانتا تھا کہ حکیم صاحب کیا چیز ہیں، لیکن بس دل میں ایک ڈر ایک وحشت سی بیٹھی ہوئی تھی۔

بس میں سفر کرتے ہوئے ہم دونوں ہی خاموش تھے میرے ذہن میں ایک بار پھر اس پراسرار مکان کا تصور ابھرنے لگا اور میں نے کہا۔ "آپ کبھی اس پگڈنڈی سے گزرے ہیں حکیم صاحب جس سے گزرتے ہوئے ذیلی سڑک پر درختوں کے جھنڈ میں گھرا ہوا لکھوری اینٹوں کا بوسیدہ سا کھنڈر نما مکان نظر آتا ہے۔ حکیم صاحب مسکرانے لگے اور بولے۔

"نہیں میاں کبھی نہیں گزرا ادھر سے لیکن تھوڑے سے حالات کا تجزیہ میں نے رات کو کیا تھا۔"

"جی میں سمجھا نہیں۔" میں نے سوال کیا۔

"بس یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ کون تھے، جنہوں نے تمہارا راستہ روکنے کی کوشش کی تھی۔"

"پھر۔؟"

"پھر کیا ہے، میں نے پہلے ہی کہا تھا تم سے۔ اللہ بخشش

چاہا تو حکیم صاحب نے نہایت نرمی سے ان کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

"نہیں میاں، میں ہاتھ چومنے جیسی تمام چیزوں کا قائل نہیں ہوں بوسہ تو اہلِ تبرک اور عظیم شخصیتوں کو دیا جاتا ہے جنہوں نے ایسا کوئی مذہبی کام انجام دیا ہو جو عالمِ اسلام کے لیے رہنما ہو، میں تو ایک معمولی سا انسان ہوں، مجھے یہ عزت نہ بخشیے ورنہ بڑی شرمندگی اٹھانی پڑے گی مجھے، للہ اس شرمندگی سے مجھے بچائیے۔" حکیم صاحب نے نرم لہجے میں کہا۔

"اوہ" شاہ جی نے حکیم صاحب کے ہاتھ چھوڑ دیئے اور پھر بولے "حکیم صاحب وقار میاں نے آپ کی اتنی تعریف کی تھی کہ مجھے آپ سے ملنے کا بڑا ہی اشتیاق تھا، اب یہ بدقسمتی دیکھیے میری کہ ملاقات ایک ایسے سلسلے میں ہوئی جسے صرف غرض کہا جا سکتا ہے۔"

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے غرض تمہاری نہیں ہے بس خدا کے ایک بندے کی ہے جسے بدی کی قوتوں نے پریشان کر رکھا ہے۔" حکیم صاحب نے کہا اور اس کے بعد وہ خاموش ہو گئے۔

ہم شاہ جی کے ساتھ چلتے ہوئے بالآخر اس مکان پہنچ گئے، جہاں سلیمہ موجود تھی، میرے ذہن میں عجیب و غریب خیالات تھے۔ ڈیوڑھی میں پہنچ کر ہمیں کرسیوں پر بٹھا دیا گیا اور شاہ جی اندر چلے گئے۔ حکیم صاحب خاموشی سے کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے ان کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کچھ پڑھ رہے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد شاہ جی واپس آئے، تو ان کے ہاتھوں میں لسی کے گلاس تھے۔

"رکھ دیجیے یہاں رکھ دیجیے، ابھی ہم کچھ نہیں پئیں گے" حکیم صاحب نے کہا اور پھر کہنے لگے۔ "بچی کہاں ہے۔"

"اندر موجود ہے حکیم صاحب، اگر آپ کہیں تو لے کر آ دوں" "ہمیں اندر آنے کی اجازت دے دو۔" حکیم صاحب نے کہا اور شاہ جی جلدی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اس میں اجازت کی کیا بات ہے آئیے۔ آئیے... آپ کا اپنا گھر ہے۔"

"وقار میاں تم یہ دروازہ بند کر دو۔ باہر کے لوگوں کو پتہ نہیں چلنا چاہیئے، بلکہ شاہ جی اگر یہاں آپ کے کچھ ملازم وغیرہ ہیں تو ان سے بھی معذرت کر کے انہیں باہر بھجوا دیجیے"

"گھر میں کوئی نہیں ہے حکیم صاحب، ملازم باہر گئے ہوئے ہیں۔ میں دروازے کے باہر کسی کو بٹھا کر کہہ دیتا ہوں کہ اندر کوئی نہ آئے"

"نہیں نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے، آؤ۔ دروازہ تو بند کر ہی دیا ہے آؤ۔" حکیم صاحب نے کہا اور ہم سب اندر داخل ہو گئے۔

شاہ جی کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے، میں ذاتی طور اس وقت میں دل سے دعائیں مانگ رہا تھا کہ حکیم صاحب اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں۔

سلیمہ کی حالت اس وقت بالکل ٹھیک تھی۔ بے چاری کا چہرہ ستا ہوا تھا، رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا تھا، آنکھیں پریشان زدہ معلوم ہوتی تھیں، حالانکہ اس کے چہرے کی شگفتگی و شادابی دیکھنے کے قابل تھی۔ لیکن اب اسے دیکھ کر مجھے دلی رنج ہوا تھا اس نے میری طرف دیکھا، لیکن سلام نہیں کیا، حالانکہ وہ ہمیشہ مجھے دیکھ کر سلام کرتی تھی۔ شاہ صاحب کو بھی اس نے سلام نہیں کیا اور شاہ صاحب مسکرانے لگے

"کیسی ہو سلیمہ بیٹی سلام نہیں کیا تم نے ہمیں؟" انھوں نے پوچھا۔ لیکن سلیمہ نے کوئی جواب نہیں دیا اس کی آنکھوں کا رنگ تبدیل ہونے لگا تھا۔

"بیٹھ جاؤ۔ کرسی پر بیٹھ کر آرام سے باتیں کریں گے"

شاہ صاحب نے کہا۔ لیکن سلیمہ جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھ کر کمرے کی ایک دیوار کے پاس پہنچ گئی وہ دیوار سے لگی ہوئی حکیم صاحب کو گھور رہی تھی۔

"ہوں۔ تو میاں تعاون پر آمادہ نہیں ہو تم، خیر چھوڑو ان باتوں کو بتاؤ تو سہی ذرا کون ہو" حکیم صاحب بڑے دوستانہ انداز میں بولے۔ اور سلیمہ کا چہرہ بالکل ہی تبدیل ہوگیا۔ اس کی آنکھوں میں اب خون ہی خون جھلک رہا تھا ہونٹ اوپر مڑ گئے تھے دانت لمبے ہوگئے تھے شاہ جی نے اس کی شکل دیکھی تو بڑی مشکل سے اپنی چیخ روکی بیگم صاحبہ اس کمرے میں موجود نہیں تھیں۔

"دیکھو بھئی ہم لڑنے جھگڑنے نہیں آئے اچھا ہے کوئی سمجھوتہ ہو جائے ہمارے درمیان پتہ تو چلے کہ تم ہو کون؟"

"تو مسلا نکل جا یہاں سے یہاں سے نکل جا تیرا ہمارے بیچ کوئی کام نہیں ہے اگر تو نے کوئی گڑبڑ کی تو ان سب کو ہی بھسم کر دوں گا۔"

"دیکھو بھئی ہم نے تم سے کوئی لڑنا یا جھگڑنا نہیں کیا جو تمھیں ناگوار گزرے جب دوستی اور مصالحت کی بات ہے تو اچھا یہی ہے کہ ہم دوستی کر لیں۔ ورنہ خواہ مخواہ میں تمھیں بھی نقصان ہوگا اور ہمیں بھی ہوگا۔"

"میں میں تجھے جلا کر بھسم کر دوں گا۔"

"پاگل ہو تم سارے ہی یہ باتیں کہتے چلے آئے ہیں لیکن زندہ اور مُردوں میں فرق ہوتا ہے تم جو کوئی بھی ہو بس میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ یہاں سے دفعان ہو جاؤ اس پوری بستی کو چھوڑ دو اور ان دیرانوں میں پناہ لو جو تمھارے لئے بہتر ہوتے ہیں ورنہ کیا فائدہ ہم تمہارا نقصان کریں"

"جا۔ جا۔ بڑا آیا میرا نقصان کرنے والا۔ بچے کہیں کا"

سلیمہ کے منہ سے مردانہ آواز نکلی اور حکیم صاحب نے گردن جھٹکالی۔

"اچھا بھئی ٹھیک ہے ہم جا رہے ہیں آؤ بھئی تم لوگ بھی آجاؤ" حکیم صاحب اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے اور مجھے اور شاہ جی کو اشارہ کیا سلیمہ کی کیفیت دیکھ کر ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے واقعی مجھ میں ہمت نہیں تھی کہ یہاں تک آ سکتا چنانچہ میں شاہ جی کے ساتھ باہر آگیا۔ حکیم صاحب شاہ جی اور میں تینوں ڈیوڑھی میں پہنچ گئے۔ یہاں پہنچ کر حکیم صاحب کرسی پر بیٹھ گئے۔

"بھئی وہ مسلمان نہیں ہے گندی اور خبیث روح ہے۔ یقیناً گندی اور سفلی ہوگی بہتر یہ ہوگا شاہ جی کہ تم اپنی اہلیہ کو یہاں سے کہیں اور منتقل کر دو ہم آج ہی یہ معرکہ سر کرنے کی کوشش کرتے ہیں کل پر کیوں ٹالا جائے۔ لیکن بات ذرا زیادہ گڑبڑ ہو جائے گی اہلیہ کو تم بستی کے کسی مکان میں پہنچا دو اس کے بعد ان سے نمٹ لیتے ہیں" حکیم صاحب کے انداز میں اطمینان تھا پھر وہ میری طرف دیکھ کر بولے

"کیوں وقار میاں ڈر تو نہیں لگ رہا"

"خوفزدہ تو ہوں حکیم صاحب"

"نہ ہو میاں۔ لو یہ رکھو ذرا۔" انھوں نے اپنی جیب سے ایک سفید تعویذ نکال کر مجھے دیا۔ اور میں نے یہ تعویذ بڑے احترام سے ان کے ہاتھ سے لے لیا۔

"اسے اپنے سینے کے قریب والی جیب میں رکھ لو اور شاہ جی آپ کو ڈر نہیں لگے گا انھیں رکھنے سے اور انشاء اللہ تعالیٰ وہ پلید آپ کو نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔ ذرا میں یہ پتہ لگا لوں کہ وہ ہیں کون۔"

"ہم۔ میں بہتر ہے حکیم صاحب میں اپنی بیوی کو میرا مطلب ہے اپنی گھر والی کو پڑوس کے مکان میں چھوڑ آتا ہوں لیکن سلیمہ"

"اسے یہیں رہنے دو وہ کمرے میں بند ہو گئی ہے انشاء اللہ ہو گیا ہوگا اسے کہ کوئی غلط آدمی ٹکرا گیا ہے

اس سے حکیم صاحب نے کہا۔

شاہ جی جلدی سے اپنی بیوی کو تیار ہونے کے لئے گھر باہر نکل گئے اور پھر چند لمحات کے بعد وہ بیگم صاحبہ کے ساتھ کہیں چلے گئے حکیم صاحب میرے سامنے بیٹھے کچھ پڑھ رہے تھے تھوڑی دیر تک وہ پڑھتے رہے دفعتاً ادھر سے ایک ہولناک چیخ بر آمد ہوئی اور دوسرے لمحے سلیمہ نے ڈیوڑھی کے کمرے والے دروازے پر لات ماری وہ اندر گھس آئی لیکن اس کی شکل دیکھ کر میرے تو ہاتھ پاؤں سن ہو گئے تھے وہ گہرے سرخ رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی یوں لگتا تھا جیسے مکمل خون کی بنی ہوئی ہو۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں ہونٹ اسی طرح اوپر کو مڑے ہوئے تھے۔

"تو باز نہیں آئے گا۔" اس نے حکیم صاحب سے کہا۔

بھئی یہ چھوٹا سا گھر ہے سوچ رہے تھے کہ کھلے میدان میں تم سے مقابلہ ہو مگر خطرہ یہ ہے کہ دوسرے لوگ بھی جمع ہو جائیں گے، خواہ مخواہ تمہیں سب کے سامنے ذلت اٹھانا پڑے گی ایک بار پھر ہم تمہیں سمجھوتے کی درخواست کرتے ہیں۔"

سلیمہ کا سینہ پھول اور پچک رہا تھا اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی پھر اس نے غصیلے لہجے میں کہا۔

تو آخر کیا چاہتا ہے مسلا۔"

کیا نام ہے بھئی تمہارا۔"؟

"پتاموہ پتاموہ ہے ہمارا نام۔ اب بول کیا کرے گا تو بڈھے"

اس بچی کو کیوں پریشان کر رہے ہو بھئی۔ اگر تم پتاموہ ہو تو اپنے کسی سر گھٹے میں جا کر رہو۔"

مر گھٹی میں تو تھے ہم اس نے ہمیں کھول دیا ہمیں آزاد کر دیا اب ہم اس سنسار میں کللیں کریں گے۔"

"نہیں کر سکو گے

نہیں کر سکو گے دوست جاؤ میرا مشورہ ہے کہ یہاں سے بھاگ جاؤ۔"

"تو میرا کچھ نہیں کر سکے گا مسلا میں نے تجھ سے کہہ دیا کہ تو میرا کچھ نہیں کر سکے گا۔" اسی وقت شاہ جی واپس آ گئے اور اس تمام صورت حال کو دیکھتے ہوئے اندر آ کر انھوں نے دروازہ بند کر دیا لیکن سلیمہ کو اس حالت میں دیکھ کر ان کے حلق سے چیخ نکل گئی۔

دیکھو بھئی شاہ جی اپنے آپ کو حواس میں رکھو تمہارے اس دشمن کا نام پتاموہ ہے اور یہ تمہارے اس باغ کی زمین کے کسی سوراخ سے باہر نکلا ہے غالباً وہ سوراخ جس کا تالا تم نے کھول دیا تھا بھئی پتاموہ یہ تو بتاؤ کہ تمہیں بند کس نے کیا تھا؟"

"تیرے ہی جیسے ایک مسلا نے، مگر یہ سینکڑوں سال پرانی بات ہے۔"

"اوہو۔ اوہو۔ اچھا اچھا۔ تو سینکڑوں سال بعد تم آزاد ہوئے ہو کیا تم آزادی کی کچھ سانس نہیں لینا چاہتے کیا تم یہی چاہتے ہو کہ میں تمہیں یہیں فنا کر دوں۔"

"ہاں میں یہ چاہتا ہوں سنا تو نے میں یہ چاہتا ہوں دیکھو فنا کون کس کو کرتا ہے۔" اس نے کہا اور دفعتاً اس نے ایک مٹھی کو بند کر کے سر کے قریب کر لیا اس کی آنکھیں اس ہولناک انداز میں چمک رہی تھیں پھر اس نے دفعتاً مٹھی کھولی اور حلق سے ایک ہلکی سی آواز نکالی اس آواز کے ساتھ ہی بے شمار سانپ فضا میں اڑتے ہوئے آ گئے اور حکیم صاحب کی طرف دوڑ پڑے، حکیم صاحب نے آنکھیں بند کر کے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لیے اور اس کے بعد جو منظر ہماری آنکھوں کے سامنے آیا وہ حیرت انگیز تھا۔ ایک سفید سا دھواں فضا میں پھیل گیا اور چند لمحے کے اندر وہ سانپ غائب ہو گئے۔ پھر اس کے بعد ہم نے ڈیوڑھی کے کونوں کھدروں جیسے پرندے نکلتے دیکھے جو فضا میں چکر لگانے لگے تھے انھوں نے

بار سلیمہ بدن کو جو نچیں مار رہا ہم وہم بخود کھڑے یہ سب کچھ حیرت سے دیکھ رہے تھے لیکن دفعتاً سلیمہ کے زوردار قہقہے کی آواز سنائی دی وہ ڈیوڑھی کے دروازے کے باہر کھڑی قہقہے لگا رہی تھی۔ یہ قہقہے مرد کے تھے یکایک اس کے اطراف میں آگ کے شعلے بلند ہونے لگے اور پھر ان شعلوں میں سے ایک انتہائی کریہہ صورت باہر نکل آیا سلیمہ اب وہاں موجود نہیں تھی۔ ننگ دھڑنگ خوفناک شکل کا آدمی قہقہے لگا رہا تھا اور ہماری روح فنا ہوئے جا رہی تھی یہ سب کچھ دیکھنے کی سکت ہم میں نہیں تھی لیکن اب تو سب کچھ برداشت کرنا ہی تھا وہ خوفناک آدمی قہقہے لگاتا ہوا حکیم صاحب کی طرف بڑھا مست ہاتھی کی طرح جھوم رہا تھا وہ۔

"میں رستجھے، میں تجھے فنا کر دوں گا۔ بھسم کر رکھ دوں گا میں تجھے۔" اس نے کہا اور حکیم صاحب نے ایک بار پھر اپنے ہاتھ فضا میں بلند کئے۔ دوسرے لمحے لمبی لمبی پتلی چمکدار زنجیریں جو کسی عجیب سی دھات کی بنی ہوئی تھیں اس شخص کے چاروں طرف لپٹ گئیں، ہولناک آدمی ان زنجیروں میں بری طرح جکڑ گیا تھا۔ ایک لمحے کے لئے اس کے قہقہے رک گئے۔ اور پھر اس نے زنجیریں توڑنا شروع کر دیں۔ وہ بڑی عجیب و غریب آوازوں کے ساتھ ان زنجیروں کو توڑ رہا تھا اور زنجیریں ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے گرتی جا رہی تھیں اس کے علاوہ اطراف میں کچھ ایسی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ جیسے مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں ان میں سے کسی کے کراہنے کی آوازیں بھی ابھر رہی تھیں۔ وہ جب ان زنجیروں کو توڑ چکا تو ایک بار پھر اس کے چہرے پر خوشی کے آثار پھیل گئے۔

"بس۔" اس نے کہا۔ "بے ادب مجھے سنبھال۔" اس نے ایک بار پھر پیچھے ہٹ کر اپنی مٹھیاں بند کیں اور جب مٹھیاں کھولیں تو چمگادڑ جیسے بہت سے جانور حکیم صاحب کی طرف لپکے ایک قیامت سی آ گئی۔ چمگادڑوں کی آوازیں بھی بلند ہونے لگیں ایسا لگتا تھا جیسے ہزاروں ارواح خبیثہ مل کر بین کر رہی ہوں۔ میں اپنے کانوں کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ لیکن وہ منظر ایسا ہی بھیانک تھا کہ گوشت کے چھوٹے بڑے ٹکڑے چمگادڑوں کے پنجوں سے گر رہے تھے اور وہ انہیں کھانے کے لئے جھپٹ جھپٹ کر حملے کر رہی تھیں۔ وہ گوشت کو اپنے پنجوں میں پکڑتیں اور اس کے ساتھ خود ہی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر زمین پر گرنے لگتیں حکیم صاحب بڑے صبر و سکون سے یہ منظر دیکھ رہے تھے پھر انہوں نے اپنی ایک انگلی اٹھائی اور وہاں خاموشی چھا گئی اب وہاں نہ چمگادڑ تھیں اور نہ گوشت کا کوئی ٹکڑا البتہ سلیمہ ایک بار پھر اپنی اس ہولناک شکل میں ان کے سامنے کھڑی تھی پھر اس کی آواز ابھری۔

"دیکھ مسلا اگر تو نے زیادہ گڑبڑ کی تو میں اس لڑکی کو جان سے مار دوں گا۔"

نہیں یہ تیرے بس کی بات نہیں ہے پتا مہ اب تو تیار ہو جا ابھی تک تو میں نے تیرے ساتھ صرف اتنا ہی کیا کہ تو یہاں سے بھاگ جائے لیکن اگر اب تو نے زیادہ گڑبڑ کی تو پھر تیرے ساتھ بہتر سلوک نہیں ہو گا۔ چل آ جا صحن میں آ جا ذرا دیکھیں تو سہی تجھ میں کتنا دم خم ہے آؤ بھئی ذرا تم لوگ بھی دیکھ لو۔" حکیم صاحب نے ہم سے کہا اور اٹھ کر آگے بڑھنے لگے سلیمہ انہیں آگے بڑھتے دیکھ کر پھرتی سے ڈیوڑھی کے دروازے سے باہر نکل گئی تھی۔ دفعتاً حکیم صاحب نے دونوں ہاتھ آگے پھیلائے اور سلیمہ کی چیخیں صحن میں گونجنے لگیں۔ حکیم صاحب باہر نکل آئے تھے وہ مسکرا رہے تھے۔

"بھاگنے کی کوشش کیوں کر رہے ہو پتا مو اب جب مقابلہ ہی کی ٹھہری تو ذرا دل کھول کر مقابلہ کرو۔ پتا مو اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔ وہ سلیمہ کی شکل میں تھا۔ دفعتاً وہ زمین پر بیٹھ کر کچھ منتر و نتر پڑھنے لگا۔ اس کے بعد اس نے

جیب سے کوئی دھاردار سی چیز نکال کر اپنی ران میں بھونکی یک دم زمین پھٹی اور اس میں سے ایک بہت بڑا چہرہ نمودار ہوا۔ بہت بڑا خوفناک چہرہ تھا اس کے بعد وہ زمین پر بلند ہوتا چلا گیا۔ انسانوں سے ملتا جلتا ایک وجود باہر آ گیا جس کا قد ڈھائی تین فٹ سے زیادہ کا نہیں تھا لیکن اس کا پھیلاؤ چار آدمیوں جتنا تھا۔ باہر آ کر اس نے اپنا سر پتامو کے سامنے جھکا دیا پتامو نے جلدی سے اپنی ٹانگ کے گوشت کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا کاٹا جسے دیکھ کر اس ہولناک شکل والے بونے نے اپنی زبان باہر نکال دی پتامو نے وہ ٹکڑا اس کی زبان پر رکھ دیا گوشت کا مزہ پاتے ہی وہ اسے چپ چپ کر کے چبانے لگا اور پھر اتنے زور کی چیخ ماری کہ ہمارے دل دہل گئے وہ خونخوار نگاہوں سے ہماری جانب دیکھ رہا تھا۔

"یہ تمہارا دوپر ہے۔" حکیم صاحب نے سلیمہ کی طرف رخ کر کے کہا جو پتامو کی شکل میں تھی۔

"یہ تمہیں چبا کر پھینک دے گا مسلا ذرا تماشا تو دیکھو۔" اس نے کہا۔

"آؤ بھئی ہمیں چبا لو آ جاؤ۔" حکیم صاحب نے اپنے ہاتھ آگے بڑھا لئے اور خونخوار شکل کا تین فٹ کا بونا حکیم صاحب کی طرف بڑھنے لگا۔ حکیم صاحب نہایت سکون سے کھڑے ہوئے تھے۔ بونا حکیم صاحب کے پاس پہنچا تو حکیم صاحب نے اپنی ایک انگلی اس کی پیشانی سے چھوا دی۔ ایک بار پھر قیامت آ گئی تھی۔ بونا زمین پر لوٹ رہا تھا وہ قلابازیاں کھا رہا تھا وہ کئی بار پتامو پر گرتے گرتے بچا۔ پتامو نے دو تین بار لات ماری تھی لیکن بونے میں اب اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑا بھی ہو سکے۔ بڑی مضحکہ خیز کیفیت تھی اس کی، دیکھتے ہی دیکھتے وہ زمین پر لیٹ گیا اس کا بدن کسی گیند کی طرح زمین پر پھول پچک رہا تھا۔ اور آہستہ آہستہ اس کا بدن پچکنا شروع ہو گیا۔ اور اس کے بعد وہ زمین پر صرف ایک کاغذ کی شکل میں رہ گیا پھر یہ تصویر بھی مٹ گئی۔

ہاں بھئی پتامو اور کسی دیر کو بلاؤ ہمیں تمہارے ویروں سے مل کر بہت خوشی ہو رہی ہے۔" حکیم صاحب نے کہا۔

"دیکھ تو چلا جا یہاں سے، چلا جا اچھا نہیں ہوگا ورنہ میں اس پوری بستی کو تباہ کر دوں گا۔"

"تو اس مکان سے باہر نکل کر ہی دکھا دے پتامو بستی کو تباہ بعد میں کرنا۔"

کیا مطلب۔؟ تو یہاں سے مجھے بھاگنے بھی نہیں دے گا۔"

"نہیں۔" حکیم صاحب نے یکبارگی پھر مٹھی بند کی اور اس کے بعد اسے پتامو کی طرف پھینکا۔ دوسرے لمحے بے شمار زنجیریں پتامو کے بدن سے لپٹ گئیں۔ اب وہ ان زنجیروں کو توڑنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس بار زنجیریں ٹوٹنے والی نہیں تھیں۔ پہلی زنجیروں سے زیادہ مضبوط اور ٹھوس تھیں۔ پتامو ان کے درمیان جکڑا ہوا انہیں توڑنے کی کوشش کرتا رہا۔ حکیم صاحب دو قدم اور آگے بڑھے اور ایک بار پھر انہوں نے کچھ پڑھ کر پتامو پر پھونکا۔ پتامو بری طرح قلابازیاں کھانے لگا تھا اس کے بدن سے زنجیریں غائب ہو گئیں لیکن یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اب بھی وہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہو۔ دفعتاً اس کے بدن سے کھال اترنے لگی۔ یہ کھال سلیمہ کے بدن سے اتر رہی تھی۔ کھال اس طرح اترنے لگی جیسے کسی جانور کی کھال اتار دی گئی ہو۔ اندر سے گوشت نظر آ رہا تھا۔ سلیمہ کا چہرہ اور بدن اب گوشت کا ایک لوتھڑا تھا۔ لباس نام کی کوئی چیز اس کے بدن پر باقی نہیں رہی تھی۔ وہ اپنی اصلی خدوخال میں تھی۔ لیکن اب اندر سے گوشت ہی گوشت چمک رہا تھا۔ شاہ جی نے آنکھیں بند کر کے گھٹنوں میں منہ دے لیا۔ لیکن میں سحرزدہ نگاہوں سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا دفعتاً اس کے حلق سے ایک دلخراش سی چیخ نکلی۔

"او مسلا، او کیھتے باز آ جا چھوڑ دے مجھے دیکھ چھوڑ دے

دیکھ یہ سب کچھ نہ کریں ۔۔۔ میں۔"

"ہاں ہاں پتامو تم تو بہت بڑی چیز تھے، بہت بڑے ویروں کے مالک دیکھوں تو سہی تمہارے پاس کتنے ویر اور ہیں؟"

"میں جا رہا ہوں مجھے جانے دے مجھے نکل جانے دے یہاں سے"

"کہاں جاؤگے اب کہاں جاؤگے پتامو جانے کے تمام راستے تو تم نے خود ہی بند کر دیئے ہیں"۔

"مجھے، مجھے اس عذاب سے نجات دلا دے، دیکھ میں چلا جاؤں گا وعدہ کرتا ہوں چلا جاؤں گا، لے میں اس لڑکی کو چھوڑ دیتا ہوں، لے میں اس لڑکی کو چھوڑتا ہوں، لے میں چھوڑ رہا ہوں اور اسی لمحے میں نے ایک اور منظر دیکھا ایک ایسا منظر جو اس دور میں ناقابلِ یقین ہی کہا جا سکتا ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ اس دور میں یہ مناظر میری ہی آنکھوں کو دیکھنے کے لیئے رہ گئے تھے میں نے دیکھا کہ سلیمہ کا بدن درمیان سے دو ٹکڑے ہو گیا۔ سلیمہ اپنے طور پر زندہ سلامت تھی لیکن اس کے بدن کا ایک حصّہ اس سے ہٹ کر الگ ہو گیا تھا وہ اپنے پیروں سے چل پھر رہا تھا یہ حصّہ ایک مرد کا تھا ایک انتہائی بد تماشہ دبلے لمبے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے بدن اچھا خاصہ مضبوط توانا تھا لیکن چہرہ بڑا ہی بھیانک جھاڑ جھنکاڑ اس چہرے پر اُگے ہوئے تھے۔ آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔

"کہو پتامو۔ چھوڑ دیا اس بدن کو تم نے۔"

"چھوڑ دیا۔ چھوڑ دیا۔ میں نے دیکھ لیا کہ تو مجھ سے زیادہ بلوان ہے تو مجھ سے زیادہ طاقتور ہے۔ بس اب مجھے چھوڑ دے مجھے جانے دے میں چلا جاؤں گا۔"

"نہیں پتامو۔ تم زمین سے آزاد ہو گئے ہو، تمہارے لیے کوئی دکھ کوئی ایسا عمل ضرور ہونا چاہیئے جس کے بعد تم خدا کے بندوں کو پریشان نہ کر سکو"۔

چھوڑ دے چھوڑ دے، چھوڑ دے مجھے" اب پتامو کی طرح چیخے جا رہا تھا وہ اپنے بدن سے ان نادیدہ زنجیروں کو الگ کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن حکیم صاحب کسی اور ہی کام میں مصروف تھے۔ انھوں نے خود ہی آگے بڑھ کر قریب رکھی تپائی پر موجود مٹکے سے پانی نکالا اور اسے ایک کٹور ے میں بھر لیا کٹورے میں موجود پانی پر انھوں نے کچھ پڑھ کر پھونکا اور دفعتاً انھوں نے یہ پانی پتامو کی طرف اُچھال دیا۔ پتامو کے حلق سے ایک دلخراش چیخ نکلی اور پھر وہ پتھر کی طرح ساکت و جامد ہو گیا۔ لیکن دوسری طرف سلیمہ کی شکل بھی دیکھنے کی قابل تھی وہ اپنی اصل شکل میں آگئی تھی آنکھیں بند تھیں اور کسی پتھر کے بت کی طرح ساکت و جامد کھڑی تھی۔ پانی پتامو کے بدن پر بہہ رہا تھا اور جس جگہ سے پانی بہہ رہا تھا وہاں سے سفید سفید دھواں بلند ہو رہا تھا۔ دفعتاً پتامو کا بدن پگھلنے لگا اب وہ راکھ کی شکل میں نیچے گر رہا تھا اس کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخیں بلند ہو رہی تھیں اور راکھ کا ڈھیر زمین پر جمع ہوتا جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد سفید سفید راکھ کے ڈھیر کے علاوہ وہاں اور کچھ نہ تھا تب حکیم صاحب نے مٹکے سے تھوڑا سا پانی اور نکالا اور اسے کٹورے ہی میں لے کر سلیمہ کی طرف بڑھے پھر انھوں نے وہ پانی سلیمہ پر چھڑک دیا اور سلیمہ نے آنکھیں کھول دیں وہ ادھر اُدھر دیکھ رہی تھی پھر دفعتاً اس کے حلق سے ایک خوفناک چیخ نکلی اور وہ لہرا کر گر پڑی حکیم صاحب نے اسے اٹھانے کی کوشش نہیں کی بلکہ وہ شاہ جی کی طرف منہ کر کے بولے۔

"شاہ جی اپنی بچّی کو اٹھا کر کمرے میں لے جاؤ اور آرام سے لٹا دو اسے"۔

"ہوں"۔ شاہ جی دفعتاً لپک کر کھڑے ہو گئے۔

"ہاں۔ تمہاری بچّی خدا کے فضل و کرم سے ٹھیک ہو گئی ہے"۔ حکیم صاحب نے کہا اور شاہ جی بے اختیار سلیمہ کی جانب دوڑ پڑے انھوں نے بے ہوش سلیمہ کو اپنے بازوؤں میں اٹھایا اور کمرے کی طرف چل پڑے

" آجاؤ بھئی۔ تم بھی آجاؤ قادر میاں۔ مگر ٹھہرو ذرا آخری کام کرلیں۔" حکیم صاحب نے کہا اور اپنا بریف کیس کھول کر اس میں سے ایک ڈبہ نکال لیا ٹین کے اس چھوٹے سے ڈبے میں انہوں نے وہ راکھ اپنی مٹھی سے پکڑ پکڑ کر بھرنا شروع کردی جو زمین پر بکھری ہوئی تھی۔

اتنی ساری راکھ اس چھوٹے سے ڈبے میں سما گئی یہ بھی قابلِ تعجب بات تھی جب کہ عام حالات میں اس کا وزن تقریباً دس گیارہ سیر سے کم نہ ہوگا۔ راکھ کو ڈبے میں بھرنے کے بعد حکیم صاحب نے ڈبے کا ڈھکن مضبوطی سے بند کیا اور پھر اسے ایک کاغذ میں لپیٹ لیا۔

" یہ پتامو ہے ایک خبیث ارواح جو اس جگہ کسی عالم نے بند کردی تھی۔ صدیوں سے پہلے کی بات بتا نا ہے یقیناً کوئی بہت ہی بڑے جید عالم ہوں گے جنہوں نے اس شیطان کو زمین میں بند کردیا تھا۔ اور اس کے بعد اس میں تالا لگادیا تھا جو اس کے ہاتھوں کبھی نہیں کھل سکتا تھا لیکن وہ آزاد ہوگیا۔ بہرطور اب اس کا وجود ہی فنا ہوگیا ہے۔ برائیوں کو فنا ہونا ہی چاہیئے۔" حکیم صاحب نے کہا۔ اور پھر وہ میرے ساتھ اس کمرے میں پہنچ گئے جہاں سلیمہ بے ہوش پڑی تھی۔

"حکیم صاحب اب تو کوئی خطرہ نہیں ہے میری بیٹی کو۔" شاہ صاحب نے محبت بھرے انداز میں کہا اور سلیمہ کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگے۔

" نہیں بھئی اللہ کے فضل سے اب یہ ٹھیک ہوچکی ہے تھوڑی دیر کے بعد ہوش میں آجائے گی تو اسے یاد بھی نہ ہوگا کہ اس پر کیا گزری ہے۔ بہتر ہوگا کہ آپ بھی اسے کچھ بتانے کی کوشش نہ کریں۔"

" حکیم صاحب ہم اس مکان میں رہیں یا یہاں سے چلے جائیں۔"

" میاں وہ خطرہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا اللہ کا فضل ہے اب کوئی تمہیں پریشان نہیں کرے گا۔ میں اس راکھ کو بہتے ہوئے پانی میں ڈال دوں گا۔ جو میں نے اس ڈبے میں بند کرلی ہے اور اس کے بعد پتامو دوبارہ کبھی زندہ نہیں ہوگا۔"

حکیم صاحب نے باغ میں جو کنسٹرکشن کی جانے والی ہے اس کا آغاز کرایا جائے یا اس جگہ کو چھوڑ دیا جائے۔"

" میاں کام کرو۔ کام کرو۔ اللہ تمہارے کام میں برکت عطا فرمائے۔ حکیم صاحب نے کہا وہ بہت مطمئن و مسرور نظر آرہے تھے۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ تب حکیم صاحب نے مجھ سے کہا "وہ دونوں تعویذ میرے حوالے کردو کسی اور ضرورت مند کے بندے کے کام آئیں گے۔" ہم دونوں نے تعویذ نکال کر حکیم صاحب کو دے دیئے جنہیں انہوں نے احتیاط سے اپنی جیب میں رکھ لیا اس کے بعد انہوں نے شاہ جی سے کہا اپنی بیگم کو بلائیں بھوک لگ رہی ہے ہم کھانا وغیرہ یہیں کھائیں گے۔

شاہ جی تو دل و جان سے آمادہ ہوگئے حکیم صاحب کو پہلی بار انہوں نے کوئی فرمائش کرتے دیکھا تھا۔ شاہ جی اپنی بیگم کو بلا لائے وہ بڑے مسرور اور مطمئن نظر آرہے تھے ...ر کر انہوں نے کہا۔

" یہ یقین ہی نہیں آرہا ہے کہ ان کی بچی ٹھیک ہوگئی۔"

" بہن اللہ کے فضل سے تمہاری بچی اب بالکل ٹھیک ہوگئی ہے اگر ہوسکے تو ہمیں ماش کی دال کھلاؤ ماش کی دال ہمیں بہت پسند ہے۔" حکیم صاحب بہت مسرور نظر آرہے تھے فوراً ہی تیاریاں ہونے لگیں۔

دوپہر کو ہم نے شاہ جی کے ساتھ کھانا کھایا شاہ جی نے بہت سے لوازمات تیار کرلئے تھے لیکن حکیم صاحب نے مسکرا کر کہا۔

"میاں پیسہ ضائع کرنا فضول خرچی ہے ہمیں یہ سب کچھ پسند نہیں ہم نے خود ہی تم سے کھانے کی فرمائش کی تھی اس لیے کہ ہم تمھارے مہمان ہیں ہم صرف یہ ماش کی دال کھائیں گے بخدا بہت لذیذ پکی ہے۔" شاہ جی نے کوئی اعتراض نہیں کیا میں نے البتہ خوب ہاتھ صاف کیا تھا بڑا مطمئن اور مسرور تھا۔ شاہ جی کا کام ہو گیا تھا اور مجھے مسرت تھی کہ ان کی بچی کی زندگی اس عذاب سے نکل چکی تھی۔

حکیم اصغر علی سے مجھے بے پناہ عقیدت ہو گئی تھی یوسف والے معاملے میں میں نے انھیں دیکھ لیا تھا لیکن اب صورت حال ہی دوسری تھی۔ اس دور میں ایک ایسے سچے روحانی بزرگ سے ملاقات ہو گئی تھی جو عام پیروں سے بہت مختلف تھے۔

شاہ جی بھی حکیم صاحب کے عقیدت مندوں میں شامل ہو گئے تھے۔ میں حکیم صاحب سے روزانہ ملنے جاتا تھا ایک دن غوث شاہ میرے پاس پہنچے باہر جیپ میں بہت سامان لدا ہوا تھا۔ انھوں نے کہا یہ سامان حکیم صاحب کو پہنچانا ہے۔"

"بیکار ہے شاہ جی۔ وہ کبھی قبول نہیں کریں گے۔"

"میں خوشامد کروں گا۔"

"کوشش کر لیں وہ ان چیزوں کا کیا کرتے ہیں۔" میں نے کہا لیکن غوث شاہ صاحب کے اصرار پر میں ان کے ساتھ چل پڑا۔ یہ وقت دوپہر کا تھا اور اس وقت حکیم صاحب مطلب بند کرنے کے بعد گھر پر آرام کرنے آئے تھے۔ ناصر نے دروازہ کھولا اور ہمیں دیکھ کر بولا

"ابا نماز پڑھ رہے ہیں آپ بیٹھک میں بیٹھیں میں دروازہ کھولتا ہوں۔" ناصر نے دروازہ کھول دیا۔ اور اندر چلا گیا۔ شاہ جی نے کہا کہ سامان اندر لے آئیں اور ہم دونوں یہ سامان اندر لے آئے اس سامان میں کپڑوں کے تھان زنانہ مردانہ کچھ اور چیزیں بھی ایسی شامل تھیں۔

لیکن بیٹھک میں داخل ہو کر، ہم دنگ رہ گئے۔ بیٹھک میں بہت سامان بھرا ہوا تھا۔ ریشمی کپڑے جن میں پکی زرکاری کے تھان بھی تھے اور قیمتی ترین دوسرے کپڑے بھی خالص چاندی کے برتنوں کے سیٹ جگمگا رہے تھے۔ ایک طرف زیورات کے ڈبے پڑے ہوئے تھے، لاکھوں روپے کا قیمتی سامان وہاں اس طرح پڑا ہوا تھا جیسے اس کی حقیقت نہ ہو ہمارے منہ کھلے رہ گئے۔

"یہ سامان اس طرح" شاہ جی کے منہ سے نکلا میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اتنی دیر میں حکیم صاحب بھی اندرونی دروازہ کھول کر آ گئے۔ انھوں نے سلام کے بعد ہم سے مصافحہ کیا تھا۔

"حکیم صاحب یہ سامان کیسا ہے۔" میں نے پوچھا

"میاں ایک نادار بچی کی شادی کا معاملہ ہے۔ والدین عزت دار ہیں۔ کبھی بہت اچھے حالات تھے۔ لڑکے والے متوقع ہیں کہ بہت اعلیٰ جہیز ملے گا۔ لیکن وہ بے چارہ کچھ دینے کے قابل نہیں تھا۔ میں نے کہا میاں خدا پر بھروسہ رکھو وہ کچھ نہ کچھ بندوبست کر دے گا حقیر سی اشیاء اس بچی کی نذر کرنے کے لیے جمع کی ہیں میں نے۔"

شاہ جی کے ہوش اڑ گئے تھے وہ جو کچھ لائے تھے وہ اس کے سامنے بالکل بے حیثیت تھے۔

"کہئے غوث شاہ بچی کیسی ہے۔"؟ حکیم صاحب نے پوچھا۔

"بالکل ٹھیک ہے حکیم صاحب۔"

"کیسے آنا ہوا شاہ؟"

"یہ کچھ نذر لایا تھا۔" غوث شاہ صاحب نے کہا۔

"اوہ - اچھا اچھا۔ چلو میاں یہ بھی اچھا ہوا کچھ اور شامل ہو گیا اس بچی کے جہیز میں اسی میں رکھ دو اس سے بہترین مصرف ان چیزوں کا اور کیا ہو سکتا ہے۔" حکیم صاحب نے شان بے اعتنائی سے کہا۔ اور غوث شاہ نے لکھا ہوا سامان اس سامان میں شامل کر دیا۔

" وقار میاں تمہیں ایک زحمت دوں گا - ایک پتہ بتاتا ہوں یہ سامان غوث شاہ صاحب کی گاڑی میں لاد کر یہاں پہنچا دو۔ بڑی مہربانی ہوگی۔"

"میں تیار ہوں حکیم صاحب ۔"

ہم نے چائے وغیرہ پی۔ اور پھر سامان لے کر بتائے پتے پر چل پڑے۔ کشادہ مکان تھا اور خود شکل مکین۔ لیکن حسرت ٹپک رہی تھی۔ سامان دیکھ کر صاحب خانہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ کپکپانے لگے تھے۔ بہر حال سامان اندر پہنچا دیا گیا۔ واپسی میں غوث شاہ نے کہا۔

" عزت بچ گئی وقار میاں ' جو شخص دوسروں کو اتنا دے سکتا ہے اس کے لئے میرے لائے ہوئے تحائف کیا معنی رکھتے تھے ۔"

" میں نے تو آپ سے کہا تھا شاہ جی ۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

" مگر یہ حکیم صاحب ہیں کیا چیز۔ میرے دل میں بڑا تجسس جاگ اٹھا ہے ان کے بارے میں ؟"

" خود میری بھی یہی کیفیت ہے ۔" میں نے کہا۔

" کیوں نہ کسی دن ان سے ان کے بارے میں معلوم کر لیا۔"

" کوشش کریں گے ۔" میں نے کہا - اس کے بعد ہم نے رات کا وقت مقرر کر لیا۔ چند روز مسلسل گئے تو حکیم صاحب بھی ہماری طرف متوجہ ہو گئے۔ ہمارے درمیان ایک دوستانہ فضا پیدا ہو گئی تھی۔ اب وہ ہمارا انتظار کرتے تھے اور ہم ملاقات میں وقت کی پابندی کیا کرتے تھے۔ آندھی ہو یا طوفان ہمیں وقت مقررہ پر ان کے پاس پہنچنا ہوتا تھا اگر کبھی دیر ہو جاتی تو وہ متفکر ہو جاتے تھے۔

بالآخر ایک دن ہم نے ان کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کر ہی دیا۔

"ہم آپ کا ماضی جاننا چاہتے ہیں حکیم صاحب ۔"

" ماضی کی یادیں انسان کی اپنی ذات کا قیمتی سرمایہ ہوتی ہیں۔ میرا ماضی بھی گوناگوں عجیب و غریب واقعات کا مجموعہ ہے ۔"

ہمیں کچھ معلوم ہو سکے گا حکیم صاحب اس بارے میں ؟

" دوستی کا تقاضا تو یہی ہے کہ تم سے کچھ نہ چھپایا جائے۔ یوں سمجھو راز ہمیشہ راز ہے جب تک کوئی محرم نہ ہو۔"

" کھل گیا جب ادم تو محرم کے سوا کچھ بھی نہیں ۔

بزمِ خیال

(اس عنوان کے تحت وہ علمی و ادبی سوالوں کے جواب دیئے جاتے ہیں)

س : بددعا کے متعلق اسلامی تعلیمات کیا ہیں ؟

ج : اسلام میں بددعا کا طریقہ بے حد شاذ و نادر مواقع پر ملتا ہے۔ وہ بھی انتہائی ظالم اور سفاک کافروں کے لئے۔ اسلامی تعلیمات یہی ہیں کہ حتی الامکان کسی کے حق میں بددعا نہ کرنی چاہیئے۔ جب یہودی سرکارِ دو عالم کی خدمت میں آتے تھے تو "السام علیک" کہتے تھے۔ جس کا مطلب ہے کہ (تم پر موت آئے) ایک مرتبہ حضرت عائشہ نے سن لیا اور ان پر بہت برہم ہوئیں۔ آپ نے حضرت عائشہؓ کو روک دیا۔ یہ حقیقت ہے کہ آپ نے انتہائی مجبوری کی حالت میں اسلام کے دشمنوں کے حق میں بددعائیں کی ہیں مگر اپنے کسی ذاتی انتقام یا غصے کے لئے بددعا کا سہارا کبھی نہیں لیا۔ والدین کی بددعا جہاں بچوں کے لئے فال نیک ہے وہیں ان کی بددعا ان کے حق میں اچھی نہیں ہوتی۔ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ بات بات پر اپنے بال بچوں یا قریبی لوگوں کے لیئے جو منہ میں آیا بک دیتے ہیں۔ مثلاً خدا موت بھی نہیں دیتا۔ اللہ غارت کرے۔ کم بخت کو موت بھی نہیں آتی۔ خدا ایسی ذلیل و کم ظرف اولاد کسی کو نہ دے وغیرہ وغیرہ۔ یہ الفاظ خاص طور پر عورتوں کی زبان سے زیادہ نکلتے ہیں۔ اسی لئے حضور کا ارشاد ہے کہ

" نہ تم اپنے حق میں بددعا کرو اور نہ اپنی اولاد کو بددعا دو اور نہ اپنے مال و متاع اور ماتحت کے بارے میں برے الفاظ نکالو" ـــــ (صحیح مسلم)۔

یہ فرمانے کے بعد آپ نے ارشاد کیا کہ "تم کو کیا معلوم تم جس وقت بددعا کر رہے ہو وہ قبولیتِ دعا کا وقت ہو اور تمہاری بددعا سن لی جائے (اور غصہ ٹھنڈا ہو جانے کے بعد تم کو پچھتانا پڑے)۔

س : کیا دعا تقدیر اور توکل کے خلاف ہے ؟۔

ج : گو بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دعا تقدیر اور توکل کے خلاف ہے لیکن حقیقت میں دیکھا جائے تو ایسا نہیں ہے۔ دعا توکل سے انسان کو روکتی نہیں بلکہ اس کی ترغیب دلاتی ہے۔ حالات کے انتہائی ناسازگار ہو جانے کے باوجود خدا پر کامل بھروسہ کا نام توکل ہے۔ قرآن میں جن جلیل القدر لوگوں کی دعائیں منقول ہیں وہ توکل میں انتہائی اعلیٰ درجے پر فائز تھے اور حقیقت تو یہ ہے کہ توکل اور اللہ کی ذات پر مکمل بھروسہ ہی دعا کی پہلی شرط ہے اور اسی کی بنا پر دعا کی قبولیت کے زیادہ امکان ہو جاتے ہیں۔

ـ بیادگار حضرت بشیر وارثی مرحوم مؤسس مدیرِ اعلیٰ

ذوقِ نظر

بشیر وارثی نمبر

اگست، ستمبر، اکتوبر ۱۹۸۷ء

حیدرآباد — فون نمبر: 523117

جلد (۳) — شمارہ ۸،۹،۱۰

زرِ تعاون: سالانہ پچاس روپے فی شمارہ پانچ روپے۔ عرب ممالک سے فی شمارہ ۵ ریال۔

ظہیر الدین ایڈیٹر پرنٹر اور پبلشر نے [illegible] پریس میں چھپوا کر دفتر ذوقِ نظر ۶۱۳-۸-۲۲ چھتہ بازار حیدرآباد سے شائع کیا۔

فہرست

آہ!

بشیر وارثی

ہم کو رکھنا سنبھال کر اے قبر!
ہو نہ میلا کہیں کفن اپنا
(بشیر وارثی)

سوگوار: ادارہ

حرفِ آغاز / حرفِ آخر

قارئینِ "ذوقِ نظر" جو اس کی ابتداء سے صفحہ اوّل پر "حرفِ آغاز" پڑھتے آئے ہیں انہیں اس صفحہ پر "حرفِ آخر" دیکھ کر شاید یہ خیال ہو کہ کاتب صاحب سے غلطی ہو گئی ہے۔ اس سے زیادہ اہلِ اُردو کو نہ حیرت ہو گی نہ تعجب ہو گا۔ حیرت، تعجب، چوں کہ، پشیمانی، ندامت، غیرت، حمیت، تلافیِ مافات یہ تمام الفاظ اس قوم میں رائج ہوتے ہیں جو ہر لفظ کا مانی الضمیر رکھتی ہے۔ جس کے ضمیر اور شعور دونوں میں حیات رواں دواں ہوتی ہے اور یہ وہ صفت ہے جس سے اہلِ اردو زمانہ ہوا محروم ہو چکے ہیں۔ پونے تین سال تک ہزاروں روپیہ کا خسارہ برداشت کر کے حضرت بشیر وارثی اس دنیائے فانی سے چل بسے لیکن آخر تک انہیں یہ شدید آرزو رہی کہ یہ رسالہ کبھی نہ کبھی اہلِ اردو کے ضمیر کو بیدار کرے گا۔ اور نفع نہ سہی اپنی لاگت کے حصول میں کامیاب ہو جائے گا لیکن ع "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ" کے مصداق اہلِ اُردو کا ضمیر خواب سے تو کیا بیدار ہوتا نیند کی حالت میں کروٹ بھی نہ لے سکا۔ بہت سے لوگوں نے سمجھایا اور اونچ نیچ بتائی اپنی اردو رسالوں کا حشر بتایا کہ وہ دو تین مہینوں سے زیادہ نہ چل سکے اور اس میں بھی شمارے بروقت نہ شائع ہو سکے مگر یہ مردِ آہن ٹس سے مس نہ ہوا اور ڈھائی سال تک مسلسل شمارے بروقت شائع ہوتے رہے۔ لوگوں نے انہیں ہر طریقے سے اس رسالے کی اشاعت سے باز رکھنے کی کوشش کی مگر ارادے کا اٹل اور دھن کا پکا شخص گیسوئے اُردو کو سلجھانے اور اُسے مزید تابدار بنانے سے نہ رُکا۔ اور تادمِ آخر اُس کا یہ شغل جاری رہا چنانچہ وفات سے چند روز پہلے ہی جولائی کا شمارہ پوری آب و تاب سے شائع ہو چکا تھا۔

اس رسالے کو انھوں نے زعفران زار بنا رکھا تھا۔ ہر قسم کے قاری کے مطالبات کی تکمیل ایک ناممکن سی بات تھی مگر بشیر وارثی نے حتی المقدور اس رسالے میں اجتماعِ ضدین کو ممکن بنا دیا تھا۔ دانشورانِ اردو سے لیکر معمولی نوشت و خواند سے واقف قاری کیلئے بھی اس رسالے میں دلچسپی کا سامان انھوں نے مہیا کر دیا تھا اگر یہ کوئی غیر معمولی بات نہ سمجھی جائے تب بھی مشکل فرور تھی۔ انھوں نے بہت اونچے معیار ہی کو اپنا نصب العین کبھی نہیں بنایا بلکہ اہلِ اردو میں دانشوری سے لیکر کم عیاری تک جتنے بھی اسلوب تھے اُن سب کو اپنے رسالے میں جگہ دی ہے اور اس رسالہ کو تمام اُردو لکھنے پڑھنے والوں کا آئینہ بنا دیا کہ دانشوروں کو ایک طرف یہ معلوم ہو جائے کہ اُردو میں کیا کمی باقی ہے اور وہ اسکی تلافی کی فکر کریں اور دوسری طرف نئی نسل کے اردو ادیبوں کے سامنے معیاری دانشوروں کی تخلیقات آئیں جن سے ان کے لکھنے پڑھنے کا شعور پروان چڑھے یہ بہت بڑا کارنامہ تھا۔ اور اگر کبھی اہلِ اردو کا ضمیر بیدار ہو گیا تو یقیناً بشیر وارثی اور اُن کے خواب "ذوقِ نظر" کو مدتوں بھلایا نہ جا سکے گا۔

بشیر وارثی نمبر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اہلِ قلم اصحاب، اُنکے دوستوں اور معاصرین نے اپنے تاثرات اور بشیر شناسی کے جذبات سے نوازا ہے۔ ہم اس پرچہ کو حضرت بشیر وارثی کی یاد میں انشاءاللہ جاری رکھنے کے عزم کو دہراتے ہیں۔ آپ سب کے تعاون کے ساتھ۔

ظہیر وارثی

حضرت بشیر وارثیؒ

حمد باری تعالیٰ

جتنے بھی حق نے عالم اب تک بنا دیئے ہیں
نورِ محمدیؐ سے سب کو سجا دیئے ہیں

تارے دمک رہے ہیں ذرّے چمک رہے ہیں
پردے میں خود ہے لیکن جلوے دکھا دیئے ہیں

کانٹے بھرے پڑے تھے دنیائے کن فکاں میں
تیرے کرم نے یارب گلشن کھلا دیئے ہیں

اُس کا نہیں ہے ثانی کوئی اُلوہیت میں
باطل کے سارے دعوے اس نے مٹا دیئے ہیں

اس نے کرم سے اپنے رکھا ہے یاد ہم کو
یہ اور بات ہے ہم اُس کو بھلا دیئے ہیں

دیدار اُس کا دل سے ہوتا ہے لمحہ لمحہ
مومن کے قلب میں وہ نقشے جما دیئے ہیں

رحم و کرم سے اپنے توبہ قبول کر کے
ہم عاصیوں کے عصیاں سارے مٹا دیئے ہیں

اعجاز ہے یہ تیرا بے شک ہے تو مسیحا
رحمت نے تیری آقا مُردے جِلا دیئے ہیں

محروم جلوہ کیوں ہے چشمِ بشیر آخر!
تو نے تو ہر نظر سے پردے اُٹھا دیئے ہیں

قطعہ

ہر شئے کا معبود اللہ ہے اللہ
ہر شئے کا مسجود اللہ ہے اللہ
ہستی ہے قائم دم سے اسی کے
ہر شئے میں موجود اللہ ہے اللہ

نعتِ شریف

یہ شانِ عبدیت، دلِ شوریدہ دیکھنا
خالق ہے خود رسولؐ کا گرویدہ دیکھنا

سمجھے کوئی بلالؓ سے شانِ سپردگی
سیکھے کوئی اویسؓ سے نادیدہ دیکھنا

کیا دشمنوں کا خوف، خدا کے حبیبؐ کو
زانو پہ یارِ غارؓ کے خوابیدہ دیکھنا

تخلیق کی ہو شان کہ خالق کی آن بان!
دونوں ہیں انؐ کی ذات سے چسپیدہ دیکھنا

پروردگارِ پاک کسی حال میں، کبھی
کب چاہتا ہے آپؐ کو رنجیدہ دیکھنا

کھلتے نہیں ہیں کھل کے بھی اسرارِ ذاتِ پاکؐ
ظاہر بھی ہو کے کتنے ہیں پوشیدہ دیکھنا

انؐ کی نظر کے سامنے کیا بات ہے بشیرؔ!
ہر اک کے دل کی حالتِ پوشیدہ دیکھنا

حضرت بشیر وارثی مرحوم

بشیر وارثی

جناب بشیر وارثی صاحب کے اِنتقال سے حیدرآباد ایک علم دوست اور ادب نواز شخصیت سے محروم ہوگیا۔ وارثی صاحب سے میرا ربط گذشتہ دس بارہ سالوں سے تھا۔ وہ شاعر تھے علمی و ادبی محفلوں کو سجاتے، شاعروں اور ادیبوں سے دوستی کا پورا حق ادا کرتے۔ انہیں بلند پایہ شاعر تو نہیں کہا جاسکتا مگر وہ اصنافِ سخن پر پوری طرح قادر تھے۔ اُن کی نظمیں، غزلیں اور مذہبی کلام اپنا مقام رکھتا ہے وہ بحیثیتِ انسان بیحد بہ دِل عزیز تھے۔ وارثی صاحب نے جب رسالہ "ذوقِ نظر" نکالا اُن سے کچھ ربط وضبط اور بڑھا۔ وہ بڑی پابندی سے بہت اچھا بلند معیاری رسالہ نکالتے تھے۔ میں اُن سے کہا کرتا کہ آپ اپنے رسالے کو خود مکتفی بنایئے۔ آپ کب تک رسالے کے اخراجات خود برداشت کریں گے۔ وہ میری بات سے اتفاق کرتے مگر ذوقِ نظر کے لیئے مالی پہلو کو مضبوط بنانے میں توجہ نہیں کی۔ انتقال سے چند دن پہلے پھر ملاقات ہوئی۔ پھر ذوقِ نظر کی بات چلی۔ میں نے اُن سے کہا کہ آپ کا رسالہ تقریباً ایک سال سے نکل رہا ہے۔ نیوز پرنٹ آپ کو مل سکتا ہے۔ رسالہ کی پابندی سے اشاعت کے باعث اِشتہارات بھی مل سکتے ہیں اُنہوں نے کہا کہ وہ اِس مسئلہ پر مجھ سے تفصیلی بات کریں گے تاکہ پرچہ خود مکتفی ہو جائے۔ مگر وہ اچانک ہم سے بچھڑ گئے اُن کے صاحبزادے ذوقِ نظر کا خصوصی شمارہ نکال رہے ہیں مجھے اُمید ہے کہ یہ نمبر وارثی صاحب کی خِدمات کی تخلیقات کا ایک نمائندہ مجموعہ ہوگا۔

وارثی صاحب ہم میں نہیں رہے مگر اُن کی مرنجان شخصیت اور دل سے ہمدردی اور اُردو کی خدمت کا جذبہ اُن کی خصوصیت تھی جو ہمیشہ باقی رہے گی۔

پدم شری: عابد علی خاں صاحب
ایڈیٹر روزنامہ "سیاست"

حضرت بشیر وارثی مرحوم

یقین نہیں آتا کہ حضرت بشیر وارثی اب ہم میں موجود نہیں ہیں۔ ان کے اچانک انتقال سے اُردو شاعری کی دنیا میں جو خلا پیدا ہوا، وہ ممکن ہے کہ پُر ہو سکے لیکن اُردو دنیا میں اب ایسی شخصیت پیدا نہیں ہو سکتی جو گروہ بندیوں سے بالاتر رہے اور جس کی ہر لمحہ یہ کوشش رہے کہ کسی بھی نیک کام سے اپنے آپ کو وابستہ کریں۔ دنیا میں اچھے شاعروں کی کوئی کمی نہیں، لیکن اچھے انسان اب نظر نہیں آتے ــــ

ــــ حضرت بشیر وارثی مرحوم اپنی ذات سے ایک انجمن کی حیثیت اختیار کر گئے تھے، ان کے دفتر پر آپ کسی بھی وقت جائیے تو آپ کو کئی سرکردہ شعرا ملتے تھے جن میں آپسی بھلے ہی اختلافات کیوں نہ ہوں، حضرت بشیر وارثی مرحوم کو ان میں سے ہر شاعر دل سے چاہتا تھا۔ حضرت بشیر وارثی کی ہر دلعزیزی قابلِ رشک تھی ــــ

ــــ اب ان کے پرستاروں کا کام ہے کہ وارثی صاحب کی اہم ترین ادبی یادگار "ذوقِ نظر" کی اشاعت کا سلسلہ بہرصورت جاری رکھیں۔

جناب محمود انصاری صاحب
ایڈیٹر روزنامہ "منصف"
حیدرآباد۔



محمد عارف الدین



محمد ضیاء الدین





محمد ظہیر الدین وارثی



محمد کلیم الدین

حیات وارثی

شاعرِ بے نظیر حضرت بشیرؒ

(ایک تاثراتی خاکہ)

عزیز گرامی ظہیر وارثی کے خط سے اطلاع ملی ہے کہ عاشق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دیوانۂ غوث الاعظمؒ اور شیدائے حاجی وارث علی شاہؒ حضرت بشیر وارثی کا وصال ہوگیا۔ نہایت روحانی اذیت ہوئی کیوں کہ فطرت کا تقاضا یہی ہے لیکن میرا عقیدہ ہے کہ ؎

موت پیش کرتی ہے زندگی کا پیمانہ ٥ میکشانِ طیبہ کی بات ہی نرالی ہے

(حیات وارثی)

۲ر ستمبر ۱۹۱۹ء سے حضرت بشیر وارثی نے جو سفر شروع کیا تھا وہ شمشیر و قلم کی رہگزاروں سے ہوتا ہوا ۱۸ر جولائی ۱۹۸۷ء کو اپنی منزل پر پہنچ کر ختم ہوگیا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اُن کا سفر کامرانی اور شادمانی کے ساتھ انشاء اللہ قیامت تک جاری رہے گا۔ ان کے افکار و خیالات، صالح نظریات اور "فنی" اور روحانی باقیات کے ذریعہ۔

گذشتہ سال آستانۂ سیدنا حاجی وارث علی شاہؒ دیوہ شریف (ضلع بارہ بنکی) کے مشاعرۂ نعت میں اُن سے پہلی بار نیاز حاصل ہوا۔ اُن کا نعتیہ کلام مشاعرہ میں نہایت پسند کیا گیا۔ اور وہ بہت کامیاب ہوئے۔ میں نے بحیثیت کنوینر ان کا شکریہ ادا کیا اور آئندہ سال بھی شرکت کی درخواست کی۔ کاش وہ کچھ اور ہم لوگوں کے ساتھ رہتے! خدا کی رحمتیں نازل ہوں اُن پر۔ ★ حیدرآباد کے علمی اور ادبی حلقوں میں بشیر وارثی صاحب قدآور شخصیت کے مالک تھے۔ اُن کے وصال پر جو تاثرات میری نگاہ سے گذرے ہیں وہ یقیناً ان کی عظمت اور مقبولیت کی علامت اور شہادت ہیں۔

وقار خلیل نے انہیں بزرگ شاعر، خودشناس اور خداشناس دردمند انسان سے تعبیر کیا ہے!

"ذوقِ نظر" کے توسط سے بشیر وارثی صاحب نے دین و ادب کی جو خدمت کی ہے وہ قابلِ تقلید ہے۔ اُن کے کئی نمبر اُردو زبان و ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ میکدۂ وارثی کے رندِ پاکباز کی رحلت سے ساغرِ فن اور پیمانہ تصوف اُداس ہے۔ میں اُن کی خدمت میں ہدیۂ عقیدت پیش کرتا ہوں۔ وارثانِ بشیر وارثی کی خدمت میں بھی تعزیت پیش کرتا ہوں۔ امید ہے کہ انشاء اللہ ان کے وارث "بصارت و بصیرت" سے ادبی دنیا کو شادکام کریں گے اور حضرت بشیر وارثی کی روحِ پاکیزہ کو فردوسِ بریں میں فرحت سے ہمکنار کریں گے۔ • •

بشیر بھائی صاحب مرحوم

جناب محمد بشیر الدین صاحب وارثی مرحوم کے ذہن و قلم میں سنجیدگی و پختگی نمایاں تھی. وہ اُردو زبان کی خاموش و دِل سے خدمت میں لگے رہتے تھے۔ پیرٗ اسنے شہر مغلپورہ میں اُردو گھر کے قیام سے وہ بے حد خوش تھے. چنانچہ شروع شروع میں جناب بشیر وارثی صاحب و جناب خورشید جنیدی صاحب سنے کی ادبی محفلوں اور مشاعروں کا انعقاد اُردو گھر میں کرتے رہے در حقیقت اُردو گھر میں اُردو زبان سے متعلق سرگرمیوں کا آغاز کیا۔

جناب بشیر وارثی صاحب ماہنامہ "ذوقِ نظر" کے مدیرِ اعلیٰ تھے۔ اس زمانہ میں ماہنامہ میں معیاری مضامین اور اشعار کا انتخاب ان کی فکر و نظر کی داد دیتا ہے۔

آپ کی سادگی و فکر کی بلندی کے باعث آپ کا شمار حقیقت پسند عوامی شعراء میں کیا جاتا ہے۔

منوہر راج سکسینہ

بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی
(ایڈوکیٹ)

مکرمی ظہیر وارثی!

سلام و رحمت،

میں دہلی سے باہر تھا۔ واپسی پر یہ روح فرسا خبر ملی کہ حضرت بشیر وارثی کا وصال ہو گیا ہے۔ مجھے مرحوم سے شخصی طور پر نیاز حاصل تھا، ان میں بہت سی خوبیاں تھیں۔ کہنے دیجئے کہ ان کی شخصیت مجموعۂ اوصاف تھی۔ انھوں نے "ذوقِ نظر" کے ذریعہ ادب اور تصوف کی جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ اس کے لیے ہم لوگ متشکر اور وہ ماجور رہیں گے۔ انشاء اللہ۔

حضرت بشیر وارثی مرحوم کے دل میں روحانیت کی جو شمع روشن تھی، اس کا اظہار ان کی تخلیقات میں بھرپور انداز میں ہوا ہے۔ جس کی قدر افزائی اربابِ اردو پر فرض ہے۔

مجھے بشیر وارثی صاحب کے انتقال پر ملال سے جو دلی رنج ہوا ہے۔ اس کا اظہار الفاظ میں ممکن نہیں۔ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جوارِ رحمت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل کی دولت عطا کرے۔ آمین۔

سوگوار

عنوان چشتی

سجادہ نشین درگاہ حضرت شاہ ولایت منگلوری رح

نعت شریف

جھکائی ہے در پہ جبیں یا محمدؐ
نکل جائے جانِ حزیں یا محمدؐ

نہ ارض و سما تھا نہ عرشِ بریں تھا
ہیں بعد از خدا اولیں یا محمدؐ

وہاں سب سے اوّل یہاں سب سے آخر
تمہیں اولیں، آخریں یا محمدؐ

شبِ اسریٰ آواز سدرہ سے آئی
نہیں کوئی تم سا حسیں یا محمدؐ

مدینے کی گلیاں نہ کیوں ہوں منوّر
یہاں تم ہو پردہ نشیں یا محمدؐ

محبت میں ایسے مقامات بھی ہیں
کہیں اللہ اللہ کہیں یا محمدؐ

بشیر آپ کا ہے بشیر آپ کا ہے
مدینہ میں دے دو زمیں یا محمدؐ

بشیر وارثی صاحب بشیر

سلامِ شوق

بحضور حضرت حاجی سید وارث علی شاہ قدس سرہٗ

السّلام اے مرشدِ عالی مقام
السّلام اے عاشقِ خیر الانام

السّلام اے وارثِ ارثِ علی
السّلام اے ہادی ذی احترام

السّلام اے پیشوائے دو جہاں
آپ کا گرویدہ ہے عالم تمام

آپ کا جلوہ ہے آنکھوں میں مری
آپ کا مسکن ہے میرا دل مدام

ہر نفس آتی ہے "وارثؒ" کی صدا
آپ میرے ساتھ ہیں بالالتزام

آپ کی نسبت سے ہے میرا بھرم
آپ کی چشمِ کرم سے ہے مقام

جی رہا ہوں میں توکل پر حضور
آپ کرتے ہیں مرا سب انتظام

ہر خوشی ہر غم میں میرے ساتھ ہیں
میرے وارث، وارثِ خیر الانامؐ

ہے حیاتِ سرمدی کا خواستگار
یہ بشیرِ وارثی ادنیٰ غلام

حضرت خواجہ شوقؔ

خَیرُ النَّاسِ مَن یَّنفَعُ النَّاسَ

بشیر وارثی ہے نام اس تہذیبِ رفتہ کا
وہ زندہ تھے تو کتنے ہی ادارے ان سے زندہ تھے

یکایک ان کی رحلت نے کیا غمگین کتنوں کو
مگر کیا کیجئے مجبور ہے انساں مشیت سے

ادارہ ہو کہ مکتب کوئی جلسہ ہو کہ محفل ہو
سلوک ان کا برابر یکدگر پھر رہتا تھا ہر اک سے

جو استمداد کو آتا تھا وہ خالی نہ جاتا تھا
فقط اک شہر کیا اضلاع میں بھی ان کے تھے چرچے

نہ تھا اپنے پرائے کا کوئی بھی امتیاز ان کو
جہاں تک ان سے ہو سکتا تھا سب کے کام آتے تھے

تھا آفس ان کا ایسا مرکزِ شعر و سخن گوئی
جہاں دن رات یارانِ طریقت جمع رہتے تھے

دیا تھا فیضِ فطرت نے انہیں ذوقِ نظر ایسا
قلم کاروں کی خدمت کو وہ فرض اپنا سمجھتے تھے

طبیعت سیدھی سادی تھی ریاکاری نہ تھی کوئی
بڑے خوش باش مخلص نیک سیرت نیک طینت تھے

تھے شامل حضرتِ وارث علی شاہؒ کے مریدوں میں
عقائد کے بھی تھے مضبوط شیدائی بھی نسبت کے

سپاہی تھے سپاہی کی خصوصیات تھیں ان میں
نظر آتے ہیں کم ایسے نمونے اب شرافت کے

رہے جو "یَنفَعُ النَّاسَ" اسکو خَیرُ النَّاس کہتے ہیں
وہ شاعر بھی تھے اچھے اور تھے انسان بھی اچھے

"خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں"

دعا ہے روز و شب مرقد پہ برسیں پھول رحمت کے

بشیر وارثی

عابد قادری

(در صنعتِ توشیح)

ب بشیر وارثی، انسان وہ انسان تھا اے دل

ب بجائے خود جو اپنی آپ اک پہچان تھا اے دل!

ش شریف النفس یہ انساں، پجاری تھا شرافت کا

ش شرافت ہی نے بخشا تھا جسے پیکر مروت کا

ی یہ وہ انسان تھا، جو ہر کسی کے کام آیا ہے

ی یہی وہ شخص تھا جس کا ابھی تک بول بالا ہے

ر رہا جو زندگی بھر نیک نامی، پاک بازی سے

ر رہا مقبول جو سب میں ہمیشہ کسرِ نفسی سے

و وجیہہ ایسا کہ جس پر خود وجاہت ناز کرتی تھی

و وہی جس پر تصدق ہو گئی قد آوری جس کی

ا اسی کی یاد میں ہم کر رہے ہیں اشک افشانی

ا ابھی تک جس سے مل کر ہوتی تھی تسکینِ روحانی

ر رہے گی یاد مدت تک دلوں میں موجزن اس کی

ر رہے گا نام تابندہ، خدا سے ہے امید ایسی

ث ثواب اب پا رہا ہوگا، عجب کیا نعت گوئی کا

ث ثواب اس کو ملے گا بالیقیں ہر ایک نیکی کا

ی یہی تو پوچھتی ہے مجھ سے عابد! میری حیرانی

ی یہ شاعر مر گیا کیسے، ہے زندہ شاعری جس کی

محبت کا سپاہی

ڈاکٹر یعقوب عمر

میری اور بشیر الدین بشیر وارثی کی ملاقات صرف چھ سال کے عرصے پر محیط ہے۔ اِس سے پیشتر میں اُن سے واقف نہیں تھا، سب سے پہلے ان سے ملاقات تو یاد نہیں ہے۔ البتہ نواب مظفر الدین خان صاحب حیدر آبادی کی کسی تالیف پر میں نے مقدمہ تحریر کیا تھا۔ اور اِس ضمن میں نواب صاحب نے مجھے بتایا کہ میرے مقدمے میں سے ایک لفظ وہ نکالنا چاہتے ہیں مجھے بے حد غصہ آیا کہ اتنی محنت سے میں نے جو مقدمہ لکھا تھا اس میں سے کون لفظ ایسا ہے جو وہ نکالنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ وہ مقدمہ ہی لوٹا دیجئے اسے شائع کرنے کی ضرورت نہیں تب نواب صاحب نے بشیر وارثی صاحب کا نام بتایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لئے "خلاقِ قرآن" کی ترکیب سے متفق نہیں کیوں کہ اس سے کسی ناخوش گوار بحث کے چھڑ جانے کا احتمال ہے۔ نواب صاحب تو یہ کہہ کر خاموش ہو گئے اور میں گھر چلا آیا۔ غور کرتا رہا کہ آخر اس اختلاف کی وجہ کیا ہے۔ اچانک میرا ذہن مامون الرشید کے عہد میں رونما اس سانحے کی طرف چلا گیا جس کی بنا پر خلق قرآن کی نازیبا بحث پیدا ہو گئی تھی۔ اور میرا غصّہ کافور ہو گیا کیوں کہ اِس دور میں بھی فتنہ پیدا ہو سکتا تھا۔

اِس واقعہ سے بشیر وارثی صاحب کے وسیع مطالعے کی حقیقت سامنے آئی۔

بشیر وارثی صاحب کے متعلق معلوم ہوا کہ انھوں نے ایک فوجی کی حیثیت سے اپنی زندگی کا آغاز کیا تھا کہاں ایک فوجی اور کہاں شعر و ادب جیسے فنونِ لطیفہ بہرحال بہت سی مختلف چیزیں اِن میں جمع ہو گئی تھیں

کسی شخص کے اِنتقال کے بعد دو قسم کے خیال اکثر لوگ ظاہر کیا کرتے ہیں، ایک تو اِس کے مداح جو اسے بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں اور یہ اکثریت میں ہوتے ہیں۔ دوسرے ناقد، یہ کم ہوتے ہیں اور اپنی رائے کا اظہار ڈھکے چھپے طور پر کرتے ہیں۔ اکثر ادیبوں شاعروں اور دانشوروں کی یاد میں نمبر نکالے جاتے ہیں۔ جس میں اُن کے اصلی اور فرضی کمالات نہ صرف بڑھا چڑھا کر پیش کیے جاتے ہیں بلکہ ایسے ایسے گوشے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے جاتے ہیں جس سے ممدوح اِنسان کم اور فرشتہ زیادہ معلوم ہونے لگتے ہیں۔ بعض تو اس سے بھی آگے نکل جاتے ہیں۔ اور اِسے فرشتہ ہی بنا کر چھوڑتے ہیں۔ اِیسی تعریف و تمجید کے مرقعے جب آئندہ دو تین نسلوں کے ہاتھ سے گذریں گے تو کتنے توقیع اور معتبر سمجھے جائیں گے اسکا اندازہ کرنا بڑا

پچھلی پانچ صدیوں میں اردو اور فارسی شعرا کے تذکروں پر آج کے بے لاگ نقادوں کی رائے دیکھ لینا چاہیے کہ مداحی اور مدح گوئی نے کس طرح ان لوگوں کے اصل کارناموں کو پردۂ خفا میں ڈال دیا۔

میرے نزدیک تو سب سے اچھی تعریف یہی ہے کہ وہ ایک کامیاب "انسان" تھے۔ (فرشتہ نہیں) باوجود انسانی کمزوریوں اور کوتاہیوں کے جس کے افعال و اعمال میں انسانیت نوازی، اور انسان دوستی کا پہلو غالب ہو، وہ یقیناً ایک کامیاب انسان ہے۔ اور مگر کامیاب انسان ہونا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے اور بشیر وارثی کے متعلق میرا خیال ہے کہ وہ ایک کامیاب انسان تھے۔ ناکامیوں، ناامیدیوں اور یاس کے ہجوم میں اپنے ذہنی توازن کو نہ کھونا اور جس راہ کو اپنے لئے، قوم کے لئے اور اردو زبان کے لئے مناسب سمجھا اس سے کبھی نہ ہٹنا ان کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔

وہ کوئی فقید المثال ادیب، شاعر یا نثر نگار نہ تھے لیکن اس کے باوجود اردو، اور اردو کے نادار اور گمنام ادیبوں اور شاعروں کی جو خاموش خدمت انھوں نے انجام دی، اسے اردو والے بھول جائیں تو بھول جائیں مگر صحیفۂ وقت پر ان کا نام، ان کے کارناموں کی آب و تاب سے جگمگاتا رہے گا۔

ان کی منکسر المزاجی کا یہ عالم تھا کہ دمِ آخر تک شعر و ادب کے معاملے میں اپنے ہم سنوں ہی سے نہیں بلکہ کم سنوں سے بھی مشورہ کرتے تھے، ہمیشہ اپنے آپ کو مبتدی اور طالبِ علم بتانے والی اس ہستی کو اس سے بڑھ کر اور کیا خراجِ عقیدت پیش کیا جا سکتا ہے کہ وہ ایک اچھے، نیک اور کامیاب انسان تھے۔

اپنی خوبیوں سے زیادہ انھوں نے اپنے خامیوں کو پیشِ نظر رکھا، اور اس بات نے ان کے مزاج میں ایک ایسا خوش گوار توازن پیدا کر دیا تھا کہ وہ کبھی بھی اپنے بارے میں دوسروں کی طرح اونچے دعوے کرنے سے باز رہے۔ حالاں کہ وہ اس نفس پرستی کے دور میں خسارہ برداشت کرتے ہوئے اردو کی خدمت کے لئے پونے تین سال تک برد قت " ذوقِ نظر" شائع کرتے رہے اور یہ تنہا کارنامہ اس بات کا مظہر ہے کہ وہ اک نہایت مستقل مزاج اور ثابت قدم انسان تھے۔

بشیر وارثی نے گو زندگی کا آغاز ایک فوجی کی حیثیت سے کیا مگر ان کی طبیعت بنیادی طور پر تصوف کی طرف مائل تھی اور آخر ایک دن سلسلۂ وارث علی شاہؒ کے ایک سالک کے ہاتھوں پر انھوں نے بیعت کرلی، تصوف میں انھیں سب سے زیادہ جو بات پسند تھی وہ عالمگیر جذبۂ محبت تھا، اسی جذبۂ محبت میں وہ آخر تک سرشار رہے۔ صوفیائے کرام یا تصوف پر جو کتاب بھی نظر آجاتی خرید لیتے اور پڑھتے رہتے۔ فلسفۂ وحدت الوجود کے عاشق تھے مگر اس کے باوجود تصوف کے خلاف لوگوں سے بھی گھُل کر ملتے تھے۔ ان کے مسلک اور عقائد سے اتفاق نہ رکھنے والا بھی انھیں پیارا تھا۔

شاعری میں انھیں بنیادی طور پر نعت و منقبت سے مناسبت تھی، غزل بھی کہتے تھے مگر نعت اور منقبت پر ہی زیادہ خامہ فرسائی کرتے تھے۔ مشاعروں میں بہت کم جاتے تھے، زیادہ تر نوجوان نسل اور ابھرتے ہوئے شعرا کی طرف ملتفت ہوتے۔ ان کی حوصلہ افزائی کرتے اور اگر کوئی مشورہ کا طالب ہوتا تو نہایت مناسب مشورہ دیتے۔

حاجی وارث علی شاہؒ کے سلسلہ میں مرید ہونے کے بعد ان کے فلسفۂ محبت سے متاثر ہوئے اور اپنی گفتگو میں اکثر اس کا تذکرہ کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ ان کی طبیعت میں ایک ایسا صلح کل کا جذبہ پیدا ہوگیا تھا کہ ہر قسم کے آدمی سے چاہے وہ کیسے ہی خیالات کیوں نہ رکھتا ہو اچھی طرح عہدہ برآہ ہوتے۔

کام سے بے حد لگاؤ تھا، بیکار بیٹھنا ان کے لئے دوبھر ہو جاتا۔ تنہائی پسند نہیں کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اکثر دکان پر لوگ انھیں گھیرے رہتے تھے۔ ان کی دکان ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور سے کم نہ تھی۔ دیکھنے میں انتہائی بوسیدہ اور سالخوردہ فائیلوں سے بھری ہوئی، ہر قسم کے آرائش و آسائش سے خالی لیکن زندگی سے بھرپور ــــــ ہر مسئلہ پر چاہے وہ سیاست ہو، صحافت ہو، شاعری ہو یا ان کا محبوب موضوع تصوف ــــــ گھنٹوں تذکرے چلتے رہتے تھے۔ کسی چھٹی میں بھی دکان بند نہ کرتے یہاں تک کہ ہر اتوار کو بھی دکان کھلی رہتی، اور کاروبار شوق کے ساتھ ساتھ سیل ٹیکس کی کاروائیاں بھی چلتی رہتیں۔ شاعروں اور ادیبوں کی گروپ بندی سے سخت متنفر تھے۔ چنانچہ ہر گروپ کے شاعروں اور ادیبوں سے ملتے تھے اگر کوئی انھیں بلاتا تو چلے جاتے تھے وہ اپنے آپ پر کسی قسم کا لیبل لگانا پسند نہیں کرتے تھے۔ ہر گروپ کی محفل میں جانے سے انھیں کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ نجی ملاقاتوں میں ہمیشہ گروپ بندی ختم کرانے کی کوشش کرتے اور ہر ایک کو برداشت کرنے کی صلاح دیتے۔ چنانچہ ان کی دکانِ ادب نوازہر قسم، ہر گروپ اور ہر مسلک کے ادیبوں، اور شاعروں کی آمد و رفت رہتی تھی۔

ایک دن باتوں باتوں میں میں نے انھیں ایک رسالے کی اشاعت کا مشورہ دیا اور مکمل قلمی تعاون کا یقین دیا۔ نام طے ہوا "آدابِ نظر" میں کچھ دنوں کے بعد بھول بھال گیا، دو چار مہینے کے بعد وہ ایک دن گھر پر تشریف لائے اور کہنے لگے کہ رسالہ کی منظوری مل گئی ہے۔ مگر "آدابِ نظر" کے بجائے "ذوقِ نظر" نام منظور ہوا ہے۔ آپ فوراً رسالہ کی ترتیب و تدوین کا کام شروع کردیں۔ میں نے سوچا کہ رسالہ نکالنا آسان کام تو نہیں ہے، دو چار دن میں انھیں اندازہ ہو جائے گا اور وہ دست بردار ہو جائیں گے۔ مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب انھوں نے ہزاروں روپئے کی رقم رسالہ کے لئے مختص کردی۔ رسالہ کے نام پر ایک الگ اکاؤنٹ کھولا گیا اور وہ انتہائی سنجیدگی سے کتابت،

طباعت اور دیگر مراحل سے عہدہ برآہ ہونے لگے۔ ان کے اس عزم نے مجھے بھی مجبور کردیا کہ مجھ سے جو ممکن ہو اس سے میں دریغ نہ کروں اور میں بھی ان کے اِس جہاد میں شامل ہوگیا۔ رسالہ کی تدوین میں انھوں نے مجھے کافی آزادی دی اور بہت کم میری رائے سے انحراف کیا۔ البتہ شاعری اور چند ایک مضامین کے سلسلہ میں وہ رائے نہیں مانتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر وہ میرے اِنتہائی اونچے معیار کو پیشِ نظر رکھیں تو رسالہ ایک خاص گروپ کی حد تک محدود ہوجائے گا۔ نئے اور تجربہ کار لکھنے والے کہاں جائیں گے اور ظاہر ہے کہ ہر قاری کا معیار جدا جدا ہوتا ہے۔ لہذا زیادہ کام لے لیا کرتے تھے۔ خصوصاً نئے اور ناتجربہ کار لکھنے والوں کی تحریرات کی مناسب حد تک تصحیح کا کام بھی انھوں نے میرے ذمے کردیا تھا۔

"کسوٹی" کے عنوان سے میں نے اِس رسالے میں ایک ایسا سلسلہ شروع کیا تھا جو نئے شاعروں اور ادیبوں کے لئے رہنمائی کا کام دے سکتا تھا اس کا مقصد ہی مشہور شاعروں کے کلام کی خامیوں کو پیش کرنا اور نئی نسل کو اِس سے روکنا تھا۔ بشیر وارثی صاحب کو غالباً یہ خیال گزرا یا انھیں باور کرایا گیا کہ یہ کالم میں نے صرف اپنی دکان چمکانے کی غرض سے شروع کیا ہے مگر جب انھوں نے دیکھا کہ میں اپنے ارادے میں اٹل ہوں تو انھیں یقین ہوگیا کہ اس کالم کے پسِ پردہ جذبۂ خیر ہے۔

چنانچہ انھوں نے دِل پر نہایت جبر کر کے مجھے "شاذ تمکنت" کے کلام پر "کسوٹی" تحریر کرنے کی اجازت دے دی۔ دل پر جبر اس لئے کہ وہ شاذ تمکنت صاحب کو بہت پسند کرتے تھے۔ مگر انھوں نے اپنی پسند پر میرے جذبہ کو دیکھتے ہوئے قابو کرلیا۔ یہ ان کی غیر جانبداری اور اُردو شاعری سے بے لوث لگاؤ کی زبردست دلیل تھی۔ چنانچہ اِسی متناسب اور متوازن اندازِ فکر کی بنا پر انھوں نے میری نگارشات پر بھی لوگوں کو دعوتِ نقد دی اور جو کچھ لوگوں نے تحریر کیا، اُسے شائع بھی کیا۔ شاذ تمکنت کا انتقال ہوا تو انھوں نے ـــ

عیب با جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو

کی ذمہ داری بھی میرے سپرد کی اور یہ بھی ظاہر کردیا کہ یہ "کسوٹی" کا کالم نہیں ہوگا جہاں صرف ایک ہی پہلو کو لیا گیا تھا۔ یہ خراجِ عقیدت کا معاملہ ہے اور اس میں آپ صرف دوسرے رخ کو پیش کریں گے۔ چونکہ پہلا رخ بھی آپ نے پیش کیا تھا لہذا یہ پہلو بھی آپ ہی پیش کریں گے۔

ان کی دکان چھتہ بازار حیدرآباد میں مرجع شعرا و ادبا تھی۔ کاروبار ان کا انتہائی غیر شاعرانہ یعنی سیل ٹیکس کے معاملات پر مشورت اور پیچیدہ معاملات کی پیروی تھا لیکن مشغلہ ضرورت مند شعرا اور ادبا کی چوری چھپے امداد ان کے مجموعوں کی اشاعت میں دامے درمے قدمے سخنے ہر طرح کی مدد، مختلف شعری محفلوں کا انعقاد اس کی بنا پر ان کی دکان پر عجیب و غریب منظر دیکھنے

میں آتے تھے۔ ایک طرف اکاؤنٹ چل رہا ہے دوسری جانب کسی شعری محفل کے انعقاد کی تیاری تیسری جانب "ذوقِ نظر" کی کتابت و طباعت کے مراحل اور موصوف ہیں کہ ہر محاذ پر ڈٹے ہوئے ہیں۔

کوئی خوش خط اردو لکھنے والا آیا۔ آپ نے ملازم رکھ لیا۔ اب بھلا پوچھئے کہ یہ بیچارہ کیا کام کرے گا۔ آپ کے کس مصرف کا، کہنے لگے اس زمانے میں خوش خط اردو لکھنے والا ملتا کہاں ہے۔ پوچھا آپ اس کا کیا کریں گے۔ کہنے لگے مفلس ہے "اسکا کوئی نہ کوئی مصرف سوچوں گا۔ فی الحال اس کے ہاتھ میں کچھ پرانے رسالے پکڑا دیئے کہ اس میں سے کچھ اچھی چیزیں نقل کر دیا کرے۔

کاتبوں کا کوئی کام نہیں ہے مگر آپ ہیں کہ ان سے کچھ نہ کچھ لکھوا رہے ہیں۔ میں نے پوچھا بشیر بھائی یہ کیا ہو رہا ہے، کہنے لگے اچھا کاتب ہے۔ اہلِ ہنر ہے، غیور ہے یوں ہی دوں گا تو اس کی طبیعت گوارا نہیں کرے گی لہٰذا اسے یہ گمان نہ گزرے کہ میں اس پر احسان کر رہا ہوں ایسے بیسوں واقعات ہیں کہاں تک گنوا دوں۔

فوجی آدمی تھے غصہ جتنا تیزی سے آتا اتنی تیزی سے چلا جاتا تھا۔ جس کاتب پر بگڑتے یقین ہو جاتا کہ آج کچھ زیادہ ہی مل جائے گا۔

ہجوم خیالات ہے کس، واقعے کو چھوڑوں اور کیسے لکھوں۔ یہ نمبر ان کی یاد میں شائع ہو رہا ہے۔ اردو کے اس مجاہد کو کیا خراجِ عقیدت پیش کروں جس نے کبھی اپنے نام و نمود کے لئے کچھ نہیں کیا جو کچھ کیا اردو زبان کے لئے کیا۔ اس کے ادیبوں اور شاعروں کے لئے کیا۔ اس بدنصیب زبان کے ابھرتے ہوئے نئے اور ناتجربہ کار افسانہ نگاروں، سخنوروں اور کاتبوں کے لئے کیا اور دوسروں کے لئے اپنے نقشِ کفِ پا چھوڑ گیا۔ مجھے یقین ہے کہ دمِ آخر اس کی زبانِ حال پر وجد کا یہ شعر ضرور رہا ہو گا۔

ہم نے نقشِ ہوسِ خام نہیں چھوڑا ہے
کام چھوڑا ہے کہیں نام نہیں چھوڑا ہے

رباعی

قوسین کی منزل میں نہیں ہے پردا
محبوب و محب آج ہیں دونوں یکجا
اللہ کے سامنے نبی بیٹھے ہیں
بے پردہ ہے گنجینۂ مخفی تھا

حضرت بشیر وارثی مرحوم

باغِ اردو کا گلاب
جناب بشیر وارثی کی یاد میں

راغب فاروقی

داغِ فرقت دے گئے ہم کو بشیر وارثی
پا گئے ہیں آج وہ - اپنی حقیقی زندگی
یوں تو شاعر تھے - مگر تھے اصل میں - شعرا پرست
سب سے ملتے - پھر بھی رہتے - اپنی خود - داری میں مست
شاعروں کے بن کے محسن ساتھ رہتے تھے سدا
پیار و اُلفت دیا کرتے - جفاؤں کا صلہ
سرپرستی کرتے تھے ہر ایک اُردو بزم کی !
جسکی ہے "ذوقِ نظر" تصویر جیتی جاگتی !
ہیں سخنور آج بھی ملکِ دکن میں لاجواب
تھے بشیر وارثی بھی باغِ اُردو کا گلاب
نیک نیت - نیک خُو - اور - نیک فطرت شخص تھے
مستحق ہیں یا خُدا! وہ - جنت الفردوس کے
یا خُدا - اولاد کو دے ان کی تو صبرِ جمیل
تجھ سے بڑھ کر اس جہاں میں کون ہے ان کا کفیل

سید دلاور علی حزیں

قطعات

پاک سیرت پاک طینت تھے بشیر وارثی
پیکرِ اخلاق و عظمت تھے بشیر وارثی
جذبۂ خدمت ہمیشہ اُسے حزیں غالب رہا
بس محبت ہی محبت تھے بشیر وارثی

اب کہاں ڈھونڈیں تجھے ہم اے بشیر وارثی
اب یہ سہنے کا نہیں غم اے بشیر وارثی
کہہ رہا ہے یہ تڑپ کر آج ہر اک دل حزیں
اب نہ ہوگی یہ تڑپ کم اے بشیر وارثی

کر گیا کیا کام تیرا وارثی ذوقِ نظر
کم نظر بھی ہو گئے صحبت میں تیری دیدہ ور
کتنی تھی مقبول تیری ذات تیری شخصیت
معترف سب ہیں تیرے اہلِ سخن اہلِ ہنر

حضرت راز عابدی

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

حضرت بشیر مرحوم کا اور میرا تعلق فوجی گھرانے سے ہے۔ مرحوم کے پدر بزرگوار سکنڈ لانسر میں جمعدار اور میرے والد مرحوم رسالدار میجر تھے۔ بچپن ہی ایک دوسرے کے مکانوں میں رشتہ داروں کی طرح آتے جاتے تھے وارثی مرحوم میرے بڑے بھائی حضرت جوہر عابدی مرحوم کے ہم عمروں میں تھے۔ سکنڈ لانسرز کے مدرسہ ہاشمیہ میں ہماری ابتدائی تعلیم کا آغاز ہوا۔ میرے والد مرحوم کے وظیفہ پر سبکدوش ہو جانے کی وجہ سے ملکر جوڑ سکونت پذیر ہوئے اور میں نے مستعید پورہ اسکول میں داخلہ لے لیا اس تبدیلی کے باوجود بھی مرحوم ہمارے پاس آتے جاتے رہے۔ مستعید پورہ اسکول سے مڈل کا سرکاری امتحان دے کر کامیاب ہو جانے کے بعد دار الشفاء ہائی اسکول میں شرکت حاصل کرلی۔ خاندانی حالات اس موڑ پر آ گئے تھے کہ مجبوراً ترک تعلیم کر کے ملازمت کیلئے کوشاں رہا۔ چنانچہ محکمہ بلدیہ حیدرآباد میں تقرر ہو گیا۔ مگر ترقی کے لئے معیار قابلیت لازمی تھا۔ نتیجتاً دفتری فرائض انجام دیتے ہوئے رات میں مولانا قمر مرحوم کے ادارہ موقوعہ پنجہ شاہ میں منشی فاضل کی تعلیم حاصل کرنے میں مصروف رہ کر کامیابی سے ہمکنار ہوا۔ بشیر بھائی مرحوم نے بھی سکنڈ لانسر میں ملازمت اختیار کرلی۔ جس کے بعد سے قطعی ملاقات کے مواقع نہیں ہوئے۔ فوج میں میرے دادا حضرت باسق مرحوم جو حضرت داغ کے ارشد تلامذہ میں شمار کئے جاتے تھے ایک اور کہنہ مشق شاعر قربان علی صاحب بھی تھے اور فرصت کے اوقات میں اکثر مشاعرے ہوا کرتے تھے جس میں بشیر وارثی صاحب مرحوم وغیرہ بلا اعتبار عمر بحد سماعت رہتے تھے۔

مرحوم کو اردو اور ادب سے خاص لگاؤ تھا۔ چنانچہ انہوں نے بھی شاعری کی ابتداء کی اور غالباً قربان علی صاحب مرحوم کے پاس زانوئے ادب تہہ کئے تھے۔ عجیب اتفاق ہے کہ آج سے آٹھ نو سال قبل حکیم تیموری مرحوم کے پاس خاکسار کی صدارت میں مشاعرہ منعقد ہوا تھا۔ معتمدی کے فرائض عارف بیابانی مرحوم انجام دے رہے تھے۔ اس مشاعرہ میں پہلی مرتبہ بشیر وارثی مرحوم شریک ہو کر غزل سرا ہوئے۔ مگر میرے ذہن کے کسی گوشہ میں بھی مرحوم محفوظ نہیں تھے۔ اختتامِ مشاعرہ بعد مرحوم نے خود کو متعارف فرما کر سابقہ ساری زندگی کی یاد تازہ کر دی۔ کیوں کہ میں ان کے ذہن میں محفوظ تھا۔ فوری ہم دونوں بغل گیر ہو گئے۔ مرحوم نے ارشاد فرمایا کہ چھتہ بازار میں میرا آفس ہے میں سیل ٹیکس کی پیروکاری کا کام انجام دے رہا ہوں۔ آپ مجھ سے ملتے رہیئے۔ یہ وہ دور ہے کہ عارف بیابانی مرحوم کا مقدس مشغلہ نعت شریف اور بزرگان دین کے وصال اور ولادت پر منقبتی محفلیں منعقد کرنا تھا۔ مگر مالی مشکلات کے پیش نظر حیران و سرگرداں رہ کر کسی نہ کسی طرح مشاعرے کیا کرتے تھے۔ اتفاقیہ طور پر میں ایک مرتبہ بشیر وارثی مرحوم کے آفس پر پہنچا موصوف نے فرمایا کہ تم اچھی طرح واقف ہو کہ اردو ادب سے بچپن ہی سے مجھے خاص دلچسپی رہی ہے۔ حیدرآباد کے شعراء و ادیب مجھ سے قطعی ناواقف ہیں۔ لہذا جہاں بھی محفلیں منعقد ہوں میری شرکت بھی پیش نظر رہے تو بہتر ہوگا۔ ان کی اس والہانہ جذبہ سے میں متاثر ہو کر عارف بیابانی مرحوم کو اپنے ہمراہ لے جا کر مرحوم سے ملاقات کرا دی۔ اور پابند کر دیا کہ اب آپ ان کو اپنا شریک کار بنا لیجئے۔ نتیجتاً بڑی دھوم دھام سے وارثی صاحب کی صدارت و

گرانی میں مشاعرے ہونے لگے۔ دکن کے نامور و ممتاز شعرائے کرام اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے مشاعروں میں شرکت سے گریزاں رہے۔ مگر ہم نے اس مشن کو جاری رکھنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ نتیجتاً تمام معترضین نہ صرف مشاعروں میں شریک ہونے لگے بلکہ بشیر وارثی صاحب کا سیل ٹیکس آفس شعرا کا آفس بن کر رہ گیا۔ مرحوم نے اس مختصر مدت میں اُردو ادب کی خدمات انجام دینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ کئی شعرا کے مجموعۂ کلام کی کتابت و طباعت کے تمام امور طے کر کے رسم اجرائی کے انتظامات میں تک دلچسپی لینے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا اسی پر اکتفا نہیں بلکہ بعض ادبا و شعرا جن کے مالی حالات دگرگوں تھے اُن کی اس ہاتھ سے اس ہاتھ کو خبر نہ ہونے کے مصداق امداد کرتے رہے۔ ایک طرف سیل ٹیکس کے فرائض دوسری طرف شعرا کے خدمات اور مختلف انجمنوں کے دامے درمے سخنے مدد کے ساتھ ساتھ مشاعروں کی شرکت بھی ان کی صحت کو متاثر کرتی رہی۔ خود ایک انجمن خاصانِ ادب کے نام سے قائم کر کے ناقابلِ فراموش مشاعرے کراتے رہے۔ اس کے علاوہ ایک ماہنامہ "ذوقِ نظر" کے نام سے شائع کرنے لگے۔ اور خسارہ کے باوجود بھی تادمِ زیست جاری رکھا۔ مرحوم غزل سے زیادہ مذہبی مشاعرے یعنی نعت شریف منقبت اور سلام کی محفلوں کو اولیت دینے میں کوشاں رہتے۔ بحالتِ مجبوری کبھی کبھی غزلوں کی محفلوں میں شریک ہونے لگے تھے بہر حال ان کے انتقال سے ایک ایسا ادبی خلا پیدا ہو گیا ہے جس کا پُر ہونا ممکنات سے نہیں ہے کیونکہ وارثی مرحوم اچھے شاعر سے زیادہ اچھے انسان تھے۔ ان کے فرزند عزیز ظہیر وارثی "ذوقِ نظر" کا بشیر وارثی نمبر نکالنے کا اعلان فرمائے ہیں۔ جو لائقِ صد آفریں ہے۔ مگر میں عرض کروں گا کہ مرحوم کے مذہبی کلام کے مجموعہ جات یعنی نعت شریف منقبت اور سلاموں کی اشاعت کی طرف توجہ دیں تو وہ ایک ایسا ایصالِ ثواب ہے جس سے ان کی رُوح کو نہ صرف مسرت ہوگی بلکہ بارگاہِ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم میں ہدیہ پیش کیے یقینی موقف میں آجائیں گے۔ "خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں" آمین

بشیر وارثی مرحوم

غزل

چہرہ اُداس، زُلف ہے ژولیدہ دیکھنا
ممکن نہیں ہے یار کو رنجیدہ دیکھنا

اے دِل دھڑک کے شورِ قیامت بپا نہ کر
جاگے کہیں نہ فتنۂ خوابیدہ دیکھنا

دَیر و حرم کے جھگڑوں سے کیا واسطہ مجھے
تصویر اُس کی دِل پہ ہے چسپیدہ دیکھنا

جلوے ہزار دیکھ چکی چشمِ آرزو
جی چاہتا ہے جلوۂ نادیدہ دیکھنا

قائم مرا وجود ہے جس کے ظہور سے
میں دِل سے بس اُسی کا ہوں گرویدہ دیکھنا

حدِ نظر بھی دیتی ہے دھوکا نگاہ کو!
نادیدہ دیکھنا ہے کہ فہمیدہ دیکھنا

دیکھو حضورِ عشق میں ہے سرنگوں بشیر
ہے یہ طریقِ عشق پسندیدہ دیکھنا

★

زاہد قادری

نذرِ بشیر وارثی مرحوم

زندگی ہے بے بھروسہ، بے ثبات۔ زندگی ہے صرف پابندِ حیات
ہے یہی قانونِ ربِّ کائنات موت کا پابند ہے ہر ذی حیات
زندگی کا مختصر سا ہے یہ سفر! آدمی طے کر رہا ہے بے خبر
زندگی اپنی برائے نام ہے صبح اپنی ہے، نہ اپنی شام ہے
زندگی ہے موت کے زیرِ اثر اِس حقیقت پر نہیں پڑتی نظر
موت سے ہرگز مفر ممکن نہیں اِس سے بچنے کا ہنر ممکن نہیں
موت تو ہے زندگی کا لازمہ کس طرح کہیئے اسے پھر واہمہ
موت کو تم خواہ کوئی نام دو! خواہ اچھے سے بُرے سے نام لو
وہ تو آجاتی ہے اپنے وقت پر چاہے دشمن پر ہو، چاہے دوست پر
کیا کہوں کیسی اچانک آگئی! چل بسا آخر بشیر وارثی
وہ بشیر وارثی، جو نیک تھا منفرد اپنی طرح کا ایک تھا
جو نمونہ تھا مجسّم خُلق کا! جو سراپا پیکرِ اخلاص تھا
بامروّت، اس طرح دل کا غنی شاذ ہی ایسا ملے کوئی سخی
انکساری، عاجزی جس کا شعار زندگی جس نے گزاری باوقار
قدر داں تھا علم کا اور پاسباں جس کو پیاری تھی بہت اُردو زباں
مربّی تھا ادب کا، دوست تھا اک زمانہ معترف جس کا رہا

ہر کس و ناکس پہ احساں کر گیا — اس کے مرنے پھر یہ اندازہ ہوا
اس کا پرچہ بے لگ ہیں "ذوقِ نظر" — تھا نگاہِ معتبر میں خوب تر
اس کے فرزندوں میں ہے چھوٹا ظہیر — باپ کا اک لاڈلا بیٹا ظہیر
وہ بھی اس قابل کبھی ہو جائے گا — نام جو روشن کرے گا باپ کا
اس سے امیدیں ہیں تو البتہ ہزار — کیوں نہ ہو یہ بھی تو ہے اک ہونہار
دل شکستہ دیوانہ تھا وہ سرکار کا — تھا وہ مالک دولتِ بیدار کا
حاجی وارثؒ سے عقیدت تھی اسے — قطب جو تھے خود بھی اپنے وقت کے
پیر کی نسبت سہارا بن گئی ! — مطمئن تھا یوں بشیرِ وارثی
ہائے اس کی موت کا غم کیا ملا — ہر کسی کو بیکراں صدمہ ہوا
ہر طرف ہے اس کی یادوں کا دھواں — مبتلائے درد ہے پیر و جواں !
یاد آئے گا ہمیشہ، ہر گھڑی — زود گو شاعر بشیر وارثی !
اس کی یادوں کی جہاں تک بات ہے — اب یہی آنسو مری سوغات ہے

اب یہی منظوم نذرانہ مرا !

ترجمانِ زاہد! ہے احساسات کا

قطعہ

صبر کرنے پہ عشق ہے مجبور — حسن عادی ہے دلستانی کا
منزلِ زیست میں بشیر! سدا — حوصلہ رکھیے کامرانی کا

بشیر وارثی مرحوم

بشیر وارثی

شیخ احمد قریشی
ایم۔ اے۔ ایم فل (عثمانیہ)

نیاز مندی سے، اخلاص سے، قرینہ سے
نکل کے خانۂ ہستی سے بابِ جنت تک

سلیقہ جینے کا دُنیا کو ہم بتا کے چلے!
شمیمِ گُل کی طرح دوشِ پر ہوا کے چلے

نام محمد بشیر الدین تخلص بشیر تھا۔ بشیر وارثی ایک فوجی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کے دادا محمد کمال الدین صاحب کینٹونمنٹ فوج سکندر آباد میں ملازم تھے اور والد جناب محمد قطب الدین صاحب نے بھی کینٹونمنٹ فوج میں ملازمت کی۔ بشیر وارثی ۱۹۱۹ء میں موضع کاغذ ملدور تعلقہ نرسا پور ضلع میدک میں پیدا ہوئے۔ جہاں ان کی آبائی زمینات ہیں۔ جو جنگ سے واپس ہونے والوں کو حکومت کی جانب سے عطا کی گئی تھیں۔ حضرت حیرت شاہ وارثی رح لاہوری سے بیعت و ارادت ہونے کی وجہ وارثی کہلاتے تھے۔

ابتدائی تعلیم اپنے چچا محمد غیاث الدین صاحب سے حاصل کی۔ جو حیدرآباد میں پیشۂ تدریس سے وابستہ تھے۔ اس کے بعد کچھ عرصہ مدرسہ وسطانیہ گولکنڈہ میں زیرِ تعلیم رہے۔ ستمبر ۱۹۳۷ء میں فوج میں ملازم ہوئے۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران انڈین آرمی کے ہمراہ مشرقِ وسطیٰ بھیجے گئے۔ اور اس جنگ میں ۱۹۴۶ء میں شریک رہے۔ اس ملازمت سے انہوں نے ۱۹۵۰ء میں جزوی وظیفہ پر علاحدگی اختیار کی۔ ملازمت سے علاحدگی کے بعد ۱۹۵۰ء سے ہی کمرشیل اکاؤنٹنٹ کی حیثیت سے اپنا ایک آفس قائم کیا۔ یہ آفس چھتہ بازار حیدرآباد میں واقع ہے۔ بشیر وارثی نے ایک کامیاب کمرشیل اکاؤنٹنٹ کی حیثیت سے اپنا ایک نمایاں مقام بنایا تھا۔ ۱۹۷۵ء میں کوئٹہ بلوچستان سے امبالہ جانے کے لئے ٹرین سے سفر کر رہے تھے۔ اس چلتی ہوئی ٹرین میں بھاولپور کے مقام پر حضرت حیرت شاہ وارثی لاہوری کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس واقعہ کو بشیر صاحب نے نظم کیا ہے۔ چند اشعار یہاں درج کئے جاتے ہیں ؎

صورتِ حیرت نمایاں دِل میں ہے
سیرتِ حیرت رح درخشاں دِل میں ہے
جس نظر سے آپ نے گھائل کیا
وہ نگاہِ حشر ساماں دِل میں ہے
اک مسافر کو سفر میں دے کے دِل
خود مجسم جلوہ ساماں دِل میں ہے

بشیر وارثی کی شادی اکتوبر ۱۹۴۷ء میں جناب میر حسن علی صاحب کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ جناب میر حسن علی صاحب کینٹونمنٹ فوج کے وظیفہ یاب تھے۔

بشیر وارثی صاحب کے چار لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں۔ جناب بشیر وارثی صاحب ہر ایک کے چہیتے تھے ان کی خدمات کے اعتراف میں ۲۴، اپریل ۱۹۸۰ء کو ڈاکٹر یعقوب عمر صاحب کی صدارت میں قلعہ گولکنڈہ میں ایک

جلسہ و مشاعرہ ہوا۔ جس میں ادیبوں اور شاعروں نے بشیر وارثی صاحب کی حیات و خدمات کا تفصیلی جائزہ اور منظوم ہدیہ تہنیت پیش کیا تھا۔

بشیر وارثی صاحب نے ۱۷ر جولائی ۱۹۸۷ء کو بھی حسب معمول اپنے دفتر میں کام انجام دیا۔ اچانک ۱۸ر جولائی ۱۹۸۷ء کو بوقت فجر داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْن۔ اسی روز نمازِ جنازہ جامع مسجد مُرادنگر میں پڑھی گئی۔ اور احاطہ قبرستان حضرت مُرادشاہ دھوتی ؒ میں تدفین عمل میں آئی۔ اللہ تعالےٰ سے دُعا ہے کہ مرحوم کو جنت نعیم میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

وہ اپنی وفات سے تقریبًا دو ہفتے پہلے سے اپنے ملاقاتیوں سے جن میں راقم الحروف بھی شامل ہے اپنی صحت کی خرابی کا تذکرہ کر رہے تھے۔

بشیر وارثی ابتداء میں قلعہ گولکنڈہ میں رہتے تھے اس کے بعد حیدرآباد کے کئی محلوں شاہ گنج، دودھ باولی اور مرادنگر میں بھی رہے۔ آخر میں اپنے ذاتی مکان موسیٰ رام باغ میں رہنے لگے۔ اسی مکان میں ان کا انتقال ہوا۔

شاعری کی ابتداء

۱۹۲۹ء میں بشیر وارثی کے بہنوائی جناب سید احمد صاحب رجسٹرار آرمی ہیڈ کوارٹر کے مکان واقع مرادنگر میں ہر ماہ ادبی محفلیں بشمول درس اقبالؔ ہوا کرتے تھے۔ درس اقبالؔ پروفیسر عبدالقیوم خاں باقیؔ دیا کرتے تھے۔ ان ادبی محفلوں میں کئی شاعر، ادیب، افسانہ نگار اور مضمون نگار وغیرہ شرکت کرتے تھے۔ ان محفلوں میں بشیر وارثی صاحب بھی برابر شریک ہوتے رہے۔ اس طرح ان کے ادبی ذوق کو جلا ملی۔

انہوں نے ۱۲، ۱۳ سال کی عمر میں اپنے پڑوسی شاعر جناب قربان علی صاحب سالکؔ سے قافیہ ردیف کی شناخت حاصل کی۔ اور ۱۹۳۶ء میں جناب محمد علی خاں صاحب سے فن تاریخ گوئی میں سبق لیا۔

بشیر وارثی صاحب نے ۱۹۳۸ء سے شعر کہنا شروع کیا انہوں نے مختلف اصناف سخن نعت، منقبت، سلام اور غزل پر طبع آزمائی کی ہے۔ بشیر صاحب کی پسندیدہ صنف سخن غزل ہے۔ ۱۹۴۷ء سے مشاعروں میں شریک ہوتے رہے ۱۹۵۶ء میں ان کے بہنوائی جناب سید احمد صاحب کے منع کرنے پر تقریبًا ۱۴ سال مشاعروں سے دور رہے۔ لیکن احباب کے اصرار پر جناب سید احمد صاحب کی اجازت سے ۱۹۷۰ء سے دوبارہ مشاعروں میں اپنا کلام سنانا شروع کیا۔ وہ نہ صرف حیدرآباد بلکہ اضلاع کے مشاعروں میں بھی شرکت کرتے اور صدارت بھی کرتے تھے ادبی حلقوں میں ان کی شخصیت ایک انجمن کی حیثیت رکھتی تھی۔ شاعر، ادیب اور افسانہ نگار، مصنف اور محقق سبھی ان سے کسی نہ کسی طرح مدد لیتے رہے۔ اور وہ بڑی فراخدلی سے سب کے کام نکالتے رہے۔ کوئی کام اپنے ذمہ لیا تو بڑی خوش اسلوبی سے پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ وہ کہتے ہیں ؎

سینچ کر خونِ دِل سے گلشن کو
میں نے خدمت جو ہو سکی کی ہے

سب کے رفیق سب کے شفیق بشیر وارثی صاحب نے ڈیڑھ سو سے زائد نعت اور اتنی ہی تعداد میں منقبت اور سلام کہے ہیں۔ اور ان کی کہی ہوئی غزلوں کی تعداد ڈھائی سو سے زائد ہے۔ ان کا مذکورہ بالا کلام مختلف مقامی اور بیرونی اخبار و رسائل میں شائع ہو چکا ہے ان میں سے چند اخبار و رسائل کے نام یہ ہیں۔ پندرہ روزہ "نیک سماچار" دہلی، ماہنامہ "بیسویں صدی" لاہور، ماہنامہ "ایوان" حیدرآباد، ماہنامہ "سب رس" حیدرآباد، ماہنامہ "ذوقِ نظر" حیدرآباد، اور روزنامہ "رہنمائے دکن" "منصف" اور "سیاست" قابل ذکر ہیں۔

بشیر وارثی صاحب کی غزلوں پر تصوّف کا رنگ غالب ہے۔ وہ اپنی غزلوں میں موجودہ دَور کی تصویر کشی کے ساتھ ساتھ پند و نصیحت بھی کرتے جاتے ہیں۔ اور کہیں کہیں طنز کے تیر بھی برساتے ہیں۔ اس کے علاوہ آیات اور روایات سے بھی اپنے کلام کو مزیّن کیا ہے۔ ان کے کلام کا پہلا مجموعہ زیرِ طبع ہے۔ اس مجموعہ کلام کے مسودہ کا نام "بصارت و بصیرت" ہے۔

بشیر وارثی بڑے ہی ادب دوست واقع ہوئے تھے۔ چنانچہ ۱۹۷۵ء سے ان کی وفات تک ان کی نگرانی میں ۳۰ شعرائے کے مجموعہ کلام چھپ کر شائع ہو چکے ہیں۔ اس سلسلہ میں بشیر وارثی نے قدمے سخنے ہر طرح کی مدد کی ہے۔ طلبائ ہوں کہ محقق، ادیب ہوں کہ شاعر حسب ضرورت ہر ایک کی مشکل کو دُور کرنا ان کا خاص وصف تھا۔

بشیر وارثی صاحب نے جناب ڈاکٹر یعقوب عمر صاحب ریڈر شعبہ فارسی جامعہ عثمانیہ، جناب علی احمد جلیلی صاحب اور جناب خورشید جنیدی صاحب کے مشورہ سے ایک اردو ادبی ماہنامہ "ذوقِ نظر" ۱۹۸۵ء سے اپنی ادارت میں جاری کیا۔ "ذوقِ نظر" کے پرنٹر اینڈ پبلشر بھی تارِ لیست وہی ہے۔ ماہنامہ "ذوقِ نظر" کا شمارہ حیدرآباد کے معیاری ادبی رسالوں میں ہوتا ہے۔ خریداروں کی کمی کے باوجود یہ رسالہ ہر ماہ پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ اور انشاءاللہ آئندہ بھی شائع ہوتا رہے گا۔

بشیر وارثی صاحب ایک شگفتہ مزاج ہمدرد انسان تھے۔ اپنے ہر ملاقاتی سے نہایت خندہ پیشانی سے ملاقات کرتے اور ہمیشہ سلجھے ہوئے انداز میں اور شیریں زبان میں گفتگو کرتے تھے۔

بشیر وارثی صاحب کے انتقال پر مقامی و بیرونی اخبارات میں تعزیتی مضامین شائع ہوئے۔ حیدرآباد اور بیرون حیدرآباد کی ادبی انجمنوں کی جانب سے تعزیتی جلسوں کا انعقاد عمل آیا۔ ان تعزیتی جلسوں میں تعزیتی قرار دادیں اور قطعاتِ تاریخی پیش کئے گئے۔ چند ادبی انجمنوں کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ جن کی جانب سے تعزیتی جلسے منعقد کئے گئے۔

بزمِ حسانِ دکن، بزمِ امیر مینائی، مکہ مسجد سوسائٹی، بزمِ فردوسِ ادب، بزمِ جوہر ادارہ تنظیمِ اردو، ادارۂ تہذیبِ ادب اور نیرنگِ ادب کے علاوہ شعبۂ اردو گلبرگہ یونیورسٹی میں بھی جلسہ تعزیت منعقد کیا گیا اور تعزیتی قرار دادیں منظور کی گئیں۔

نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔ غزل کے اشعار ہیں۔

ان کو زیبا ہے بانکپن اپنا
راس آیا ہمیں چلن اپنا
جانتے ہی نہ تھے گناہ کیا ہے
باغِ جنّت تھا جب وطن اپنا
رِس رہا ہے لہو بھی رہ رہ کر
چُور زخموں سے ہے بدن اپنا
پھر کسی سے میں بات بھی نہ کروں
تو بنائے جو ہم سخن اپنا
زندگی دولتِ نایاب ہے دنیا میں بشیر
بزمِ احباب کو یہ راز بتا دو آکر

حق ہی کہلائے گا جو حق ہوگا
تم سے جتنا بھی ہو نفی کر لو

تیرا خیال ہی کافی ہے زندگی کے لئے
قسم ہے تجھ کو محبّت کی گھر کا گھر لے جا
انانیت نہیں تیرے ضمیر کا جوہر
مٹا کے اپنی خودی آ و پر اثر لے جا
جنوں کی حد سے پرے ہے یہ آخری سجدہ
سر نیاز نہ اُٹھے گا کاٹ کر لے جا

بشیر اشکِ ندامت کو رائیگاں نہ سمجھ
ہے نذرِ عشق کے قابل یہی گہر لے جا

گزرے ہیں اس طرف سے بہاروں کے قافلے
وہ دیکھنا کہیں مرے گھر تو نہیں گئے
احساس کمتری میں جو ہیں مبتلا بشیر
ان کے ضمیر دیکھئے مر تو نہیں گئے

جنہوں نے کی ہے حکومت بغیر جاہ و حشم
قسم خدا کی فقط چار یار گزرے ہیں

جمالِ یار جو قلب و نظر میں رہتا ہے
سکوتِ شب میں وہی چشمِ تر میں رہتا ہے
تخیلات کے ہر دم اثر میں رہتا ہے
سنا ہے یار لباسِ بشر میں رہتا ہے
بنا کے اپنی ہی صورت پہ خاک کا پتلا
حیات بن کے وہ مٹی کے گھر میں رہتا ہے

خلد سے میری ہستی نکالی گئی
یوں قیامت کی بنیاد ڈالی گئی
کیا جلائے گا خالق اسے آگ میں
اپنی صورت پہ صورت جو ڈھالی گئی

ذو قافیتین

فکر و فن، علم و ہنر کی خوبیاں سمجھا گئے
آپ بہتر زندگی کی جھلکیاں دکھلا گئے
دوسروں کے حال پہ ہم ہو رہے تھے خندہ زن
خرمنِ دل پر گریں جب بجلیاں گھبرا گئے

اپنی سوچوں سے نکلنا بھی بہت دشوار تھا
آپ کا احساں ہے جو خامیاں تبلا گئے
کوئی مانے یا نہ مانے یہ حقیقت ہے بشیر
زندگی کی ہم ہزاروں گتھیاں سلجھا گئے

نعت شریف ملاحظہ فرمائیے :

محبت دل میں، شوق آنکھوں میں، سودائے نبیؐ سر میں
نمایاں تھے یہی جلوے تو سلمانؓ و ابو ذرؓ میں
جو ہونا ہے وہ ہو جائے جھکا دی ہے جبیں در پر
مرے سرکارؐ لکھ دیں خلد کو میرے مقدر میں
محمدؐ کے پرستارو اٹھو تیار ہو جاؤ
نبیؐ ہیں جلوہ فرما عام ہے دیدار محشر میں
گناہوں کی سیاہی کو بشیر یہ دھو ہی ڈالیں گے
ندامت کے جو آنسو آ گئے ہیں دیدۂ تر میں

سلام کے اشعار پیش کئے جاتے ہیں

کعبہ کے ساتھ ساتھ مدینہ ہے کربلا
اہلِ نظر کے واسطے کیا کیا ہے کربلا
راکبِ نبیؐ کے دوش کا پیا سا ہے کربلا
فیضانِ لا الہ کا دریا ہے کربلا
حجت تمام ہو گئی ذبحِ عظیم کی !
مکہ کے امتحاں کا نتیجہ ہے کربلا
خیمے جلے ہیں جس جگہ آلِ رسولؐ کے
نیرنگئ جہاں کا وہ نقشا ہے کربلا
دنیا یزید، دین ہیں شبیرؑ ذی وقار
روزِ ازل سے حق کا یہ منشا ہے کربلا
ہیں مستحق درود کے سبطِ رسولؐ پاک
ان پر درودِ حق کا تقاضا ہے کربلا
وہ سر بلند، روزِ ازل سے ہیں سر بلند
اسلام جن کے خون سے زندہ ہے کربلا
ان کی ولا، ولائے رسولؐ انام ہے
وابستہ ان سے سارا زمانہ ہے کربلا
کرب و بلا سے بن گیا فردوس جو بشیر * دنیا میں وہ مقام الٰہی کا ہے

نعتیں

حضرت بشیر وارثیؒ

وصفِ ذاتی ایسا ہو — اللہ جس پر شیدا ہو
حبِّ احمدؐ پختہ ہو — دائم حق سے رشتہ ہو
ظاہر باطن ایسا ہو — ذاتِ حق میں ڈوبا ہو
بندہ کامل بندہ ہو — جس پہ رب کا دھوکا ہو
سر میں ایسا سودا ہو — "قطرہ پھیلے دریا ہو"
فانی جس کی دنیا ہو — باقی اُس کا عقبیٰ ہو!
لب پہ بشیر اب احمدؐ احمدؐ — نعتِ محمدؐ گویا ہو!

دمِ آخر ہمیں جلوہ دکھانا یا رسول اللہؐ — کہ آنکھوں میں رہے چہرہ تمہارا یا رسول اللہؐ
کرم اتنا تو ہو جائے خدارا یا رسول اللہؐ — درِ اقدس کا کر لوں میں نظارا یا رسول اللہؐ
کہاں جاؤں درِ اقدس سے اُٹھ کر میں کہاں جاؤں — تمہارا ہوں، رہوں گا میں تمہارا یا رسول اللہؐ
ہمیں کیا خوف دنیا سے اگر دشمن ہماری ہے — ہمارے سر پہ ہے سایہ تمہارا یا رسول اللہؐ
چلی آئی ہے رحمت کھنچ کے فوری بابِ رحمت سے — شکستہ دل سے جب ہم نے پکارا یا رسول اللہؐ
مزاجِ زندگی بدلا ہے لیکن دل نہیں بدلا — کہ ہے عشق آپؐ کا میرا سہارا یا رسول اللہؐ
بشیرِ وارثی جیتا ہے اس اُمید میں اب تک — کہ اس بیکس کا جنّت ہو ٹھکانا یا رسول اللہؐ

(بشیر وارثی)

تعزیت

عزیزم ظہیر وارثی سلمہ'

آج کی ڈاک میں پڑا

دل دوز خط آپ کا ملا۔ پڑھ کر بے حد ملال اور دکھ ہوا۔ گذشتہ ہفتہ آپ کے ذوقِ نظر کی پانچ کاپیاں ملی تھیں۔ اس شمارہ کے صفحہ ۳۲ پر مرحوم بشیر وارثی کی غزل اور اسی صفحہ پر نیچے میری غزل شائع ہوئی ہے میں یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ بشیر بھائی اتنی جلد داغِ مفارقت دے جائیں گے۔ گذشتہ اکتوبر ۸۶ء میں ان سے دیوہ شریف میں میری پہلی ملاقات ہوئی جو آخری ہی ہو گئی بڑی تفصیلی ملاقات تھی۔ پھر اس دوران کافی خط و کتابت رہی۔ اور ذوقِ نظر برابر مجھے ملتا رہا۔ بشیر بھائی سے مختصر ملاقات ہی میں اُن سے کافی متاثر ہوا تھا۔ اُن کی شخصیت ان کی محبت اُن کی بعد از اس بہ بھول پائے گی۔ جہاں تک انکی شاعری کا تعلق ہے اُن سے زبانی سنی اور پھر ذوق نظر میں پڑھتا رہا۔ مرحوم کی حمد، نعت، منقبتیں اور غزلیں بے نظیر اور لاجواب رہیں۔ انہوں نے جس صنف پر قلم اٹھایا اس کی اصلیت اور ماہیئت کی گہرائی تک پہنچے۔ بیان اور اسلوب میں بشیر وارثی کسی استادِ فن سے کم نہیں تھے۔ الفاظ کی تلاش اور محاوروں استعاروں کی بندش سے اپنے ہر شعر کو خوبصورت اور بامعنی بنایا

صحافی دنیا میں ذوقِ نظر کی باقاعدہ اشاعت ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ آج کے نامساعد حالات میں باقاعدہ کوئی ماہنامہ اُردو نہیں نکالتا۔ بڑی جرأت کی بات ہے۔ مگر بشیر صاحب نے ہمت نہیں ہاری اور وہ "ذوقِ نظر" کو ہر طرح دیدہ زیب بامقصد اور بامعانی بناتے رہے۔ یہ ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے جس کا زندہ رہنا اور قائم رہنا بہت ضروری ہے میری ہر طرح کی اعانت تمہارے ساتھ ہے۔

میاں ظہیر سلمہ مجھے بھائی بشیر وارثی کی وفات پر بے حد تکلیف پہنچی ہے۔ سجدہ اللہ تعالےٰ سے یہی التجا ہے کہ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت دے اور تم سب پسماندگان کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین

سوگوار
عزیز وارثی
ہمدرد دواخانہ
ہمدرد مارگ، نئی دہلی

———— × ————

قطعہ

تھے خوبیوں کے حامی جنابِ بشیر بھائی
تھے محفلوں کے داعی جنابِ بشیر بھائی
ہمدرد اور مخلص و خوش مزاج باشعور و خوش خیال
وارثؔ کے تھے فدائی جنابِ بشیر بھائی

ساگر مظہری

علی احمد جلیلی

بے غرض محسن

کسی شخصیت کے سلسلہ میں اگر کوئی مضمون لکھنا ہو تو اس کے لئے وقت چاہیئے۔ اور اگر زیر بحث شخصیت بشیر وارثی جیسی دہری شخصیت ہو تو یہ کام اور بھی مشکل ہو جاتا ہے کیوں کہ بحر حیات کے وہ ایک ایسے ناخدا تھے جن کے ایک ہاتھ میں کاروبار کی فائیلوں کے چپو اور تھے تو دوسرے ہاتھ میں شعر و ادب کی آبیاری کے لوح و قلم۔

انسان کی سب سے بڑی ذمہ داری خود اپنی ذات کی تہذیب ہے۔ انسان اس فرض کو پورا کرنے میں بہت زیادہ دقتیں محسوس کرتا ہے۔ زندگی کی ایک اعلیٰ ترین کیفیت انسان میں اسی لئے جلوہ گر ہوتی ہے کہ وہ اپنے ارادوں کو کام میں لاکر اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کی تنظیم کرے۔ وقت کے ساتھ ساتھ پیہم عمل سے یہ صلاحیتیں زیادہ تیز اور قوت کے ساتھ ابھرتی ہیں اور بالآخر اس ذات کا کوئی مخصوص طرز فکر و اسلوب نظر پیدا کردیتی ہیں۔ اور اس کی تمام جسمانی و دماغی صلاحیتیں اسی ایک نقطہ پر مرکوز ہو جاتی ہیں۔ بشیر وارثی ان مرحلوں سے گزر کر اس مقام پر پہنچ چکے ہیں جہاں حیات کا لائحہ عمل مرتب و معین ہو جاتا ہے۔ گزرنے کو تو ہر ایک زندگی گزر ہی جاتی ہے کیوں کہ ماہ و سال کسی کے روکے نہیں رکتے۔ لیکن کیسی اچھی ہے وہ زندگی جو خیر کے کاموں میں گزرے اور جس سے دوسروں کے دل میں بھی بھلائی کی ترغیب پیدا ہو۔

بشیر وارثی سے میری پہلی ملاقات ۸/۱۰ سال پہلے ہوئی اس ملاقات میں خاطر زیادہ اور باتیں کم ہوئیں۔ ان کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ کھیلتی رہی۔ اس مسکراہٹ کے بانکپن میں ایک مقناطیسی کشش تھی۔ جو آخری ملاقات تک جو بارہ گھنٹے قبل ہوئی تھی باقی رہی۔ دوستی کی یہ عمر زیادہ طویل نہیں لیکن محسوس ایسا ہوتا ہے جیسے وقت آنکھ جھپکنے میں گزر گیا ہو۔ انسان کی عمر پل کے پل میں بیت جاتی ہے لیکن اسے سلیقے سے بسر کیا جائے تو انسان مر کر بھی زندہ رہ سکتا ہے۔

یادوں کے اوراق الٹتا ہوں تو بشیر وارثی کے دل و دماغ کردار و اخلاق سلوک و عمل کی تہیں خود بخود کھلتی جاتی ہیں۔ وارثی ان شخصیتوں میں نہیں تھے جو صورتاً ہو پیدا ہوتی ہیں۔ ان شخصیتوں میں سے بھی نہیں جو پرشائیں، پتا آپ آجاکر کرتی ہیں۔ ان شخصیتوں میں سے بھی نہیں جو باطن پر ظاہر کا پردہ ڈالے رکھتی ہیں۔ وہ کھلی کتاب تھے جہاں سے انہیں پڑھ لیجئے۔ ان کی یہ شخصیت آئینہ نہیں شیشہ تھی۔ جس میں سے نگاہیں آسانی سے آرپار ہو جاتی ہیں۔ گرد کدورت سے پاک، شاعروں جیسی قوم کے درمیان رہ کر اور ان سے معاملہ کرتے ہوئے اپنے دامن کو کدورتوں سے بچائے رکھنا حیرت انگیز ہے۔ میں سمجھتا ہوں اس شخصیت کی تعمیر میں انہوں نے کسی بڑی ریاضت سے کام نہیں لیا تھا۔ شخصیت کو شفاف بنانے کی انہوں نے کوئی ارادی کوشش بھی نہیں کی تھی بلکہ فطری طور پر ان کی شخصیت کا خمیر ہی ایسا تھا۔

بشیر وارثی کی ذات و شخصیت کے اوصاف متعدد

اور مشفق رہتے تھے۔ متواضع، مرنجِ و مرنجان، غمگسار، دردمند، خوش اطوار، خوش گفتار، وضعدار، شریف النفس، سراپا بے نیاز اور حد درجہ غنی نفس۔ لیکن ان سب میں ان کی اہم صفت جس پر ان کی شخصیت کی اساس استوار تھی۔ وہ ان کی یار دوستی، حلقہ احباب اتنا وسیع کہ اندازہ لگانا مشکل۔ کیوں کہ دل میں گھر کرنے کا وصف انہیں خوب آتا تھا۔ جس کو ٹٹولیے وہی ان کا مداح۔ ان میں شاعر بھی تھے، اہلِ ذوق بھی معتبر بھی نامعتبر بھی۔ ہر ایک کی بات، ہر ایک کی ضرورت، بڑی خندہ پیشانی سے سنتے۔ کوئی کام ہو کام ہو جانے کی حامی بھر لیتے۔ دوستوں یاروں کی مدد کرنا اور ان کا کام بنا دینا ان کے نزدیک ایک کارِ ثواب تھا۔ ان کی نیکیاں ان کے اعمال میں تھیں۔ معاملات کی یکسوئی میں وہ اچھے خاصے صابر تھے۔ صابر ان معنوں میں کہ دوستوں کی زیادتیوں کا حساب دل کے نہاں خانے میں چھپا کر رکھتے جاتے۔ اس معاملہ میں وہ بڑے ذخیرہ اندوز تھے۔

آج کے دور میں دوستوں یا کسی اور کی ضرورتوں کا خیال کرنے والے کتنے ہیں؟ چھوٹی سے چھوٹی باتوں سے ان کی کشادہ قلبی کا اندازہ ہوتا ہے۔ میں ایسے واقعات سے واقف ہوں جو ان کے صاحبِ دل اور صاحبِ ظرف ہونے کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ میں نے دیکھا کچھ لوگ ان کی مروت کا ناجائز فائدہ بھی اٹھایا کرتے۔ افتادِ طبیعت کا یہ حال تھا کہ دانستہ فریب کھاتے۔ سب کچھ جانتے اور سمجھتے ہوئے پر بھی کیا مجال جو گفتگو میں ذرا تلخی یا شور یدگی آئے۔ اس شخص کے جانے کے بعد کہتے میں جانتا تھا کہ یہ شخص مطلبی ہے لیکن میں خوش ہوں کیونکہ وہ مطمئن ہو کر گیا ہے۔ خیر سے میری ناراضگی کا احساس اس کو نہیں ہوا ورنہ اس کی دلشکنی ہوتی۔ انہیں کبھی کبھی غصّہ بھی آجاتا تھا۔ فوجی جو ٹھہرے۔ میں نے ایک بار انہیں غصّہ کے عالم میں دیکھا جس پر غصّہ تھا وہ ابھی ابھی اٹھ کر جا چکے تھے۔ مگر ادھر یہ عالم تھا کہ گال سرخ ہو رہے تھے۔ زبان گم اور چہرہ غم زدہ۔ بول رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا ان کے اندر ایک طوفان بپا ہو۔ نفسیات کے ماہرین کہتے ہیں کہ ایسے وقت میں جو بات دل میں ہو کہہ ڈالو۔ چنانچہ میں نے غصّہ اتارنے کا نسخہ استعمال کیا مگر ان سب کے جواب میں انہوں نے مسکرا کر کہا چلئے چائے پیجئے۔ سارا قصّہ چائے کی پیالی میں تحلیل ہو کر رہ گیا۔ اس طرح جن دوستوں کے بارے میں یہ فیصلہ کرتے کہ اب کبھی نہ ملیں گے۔ لیکن کچھ دن بعد وہ اگر خود ان کی خدمت میں حاضر ہو جائیں تو سارے گلے شکوے ختم۔ درحقیقت بات یہ تھی کہ بشیر وارثی کا ایک وصف یہ بھی تھا کہ وہ سچی اور کھری بات کہنے میں رُکتے نہ تھے، تکلف نہ کرتے تھے۔ خواہ اس میں خود ان کی یا سننے والے کی سبکی کا امکان ہی کیوں نہ ہو۔ ایسے ہی مواقع بعض اوقات ناگوار صورتِ حال سے دوچار کرتے۔

عام طور پر جن لوگوں کو سوسائٹی میں کوئی مقام حاصل ہو جاتا ہے یا جنہیں مقبولیت کے پر لگ جاتے ہیں۔ وہ ہوا میں اڑنے لگتے ہیں۔ خواہ مخواہ یہ باور کرنے لگتے ہیں کہ ہم بھی کوئی چیز ہیں۔ بشیر وارثی میں اس قسم کے تفاخر کی کوئی بات نہ تھی۔ مگر جوں جوں انہیں دوستوں کی محبت حاصل ہوتی گئی، پھل دار درخت کی طرح ان کی شاخِ مروت جھکتی ہی چلی گئی۔ کہتے ہیں کہ عجوب ہی سے انسان کی شخصیت دلچسپ بنتی ہے نیکی ہمیشہ بور کرتی ہے۔ عیب سے خالی کوئی ذات نہیں اس لئے بشیر وارثی صاحب میں برائیاں بھی ہونگی مگر مرحوم کا کمال یہ تھا کہ جو برائیاں اور کمزوریاں تھیں بھی ان کو اس طرح دل کے نہاں خانے میں چھپا کے رکھتے جہاں کسی قریبی دوست کا گزر بھی ممکن نہ تھا!

زبان اگر دو سطر ان کی محبت تخلیق شعر و ادب میں ان کا انہماک جنون کی حد تک تھا۔ جو "ذوقِ نظر" کی صورت میں ظہور میں آیا۔ ماہنامہ کے اجرا کے تعلق سے جب بھی ذکر نکلا

میں نے ان کی ہمت کو پست ہی کیا۔ کیونکہ میں اس راہ کی ناہمواریوں اور دشواریوں سے واقف تھا لیکن انہیں تو اپنی لگن سے عشق تھا۔ ارادے کے پکے اور کام کے دھنی پھر یہ کہہ کر بھِڑ کے چھتوں میں ہاتھ ڈالنے کی عادت تھی۔ حریفِ موجِ انگبینِ عشق ہونا ہر ایک کے نصیب میں نہیں۔ وہ "ذوقِ نظر" نکال کر ہی رہے۔ اور مالی مشکلات سے بھی ہار نہیں مانی۔

"ذوقِ نظر" پر برا وقت بھی آیا لیکن بڑی استقامت کے ساتھ انہوں نے اپنا خونِ جگر پلا کر اُسے زندہ رکھا ہی نہیں بلکہ اس بحرانی دور میں یکے بعد دیگرے کئی خاص نمبر نکالے اور خوب سے خوب تر نکالے۔ جو معیار انہوں نے متعین کیا تھا اس بلندی سے اُسے نیچے نہیں اُترنے دیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے جس ان تھک لگن کا مظاہرہ کیا اور جرأت آزما تجربات کئے وہ انہیں کا کام اور انہیں کا حوصلہ تھا ورنہ اس میدان میں منہ کے بل گرنے والوں کی کمی نہیں۔ بشیر وارثی نے پیشہ ورانہ کاروبار کے ساتھ بڑی سرگرم ادبی زندگی بھی گزاری۔ وہ شاعر تھے۔ اور ان کے ذوقِ شاعری نے شعری و ادبی حلقوں میں خاصا نام پیدا کر لیا تھا۔ زود گو اور موزوں طبع تھے۔ جو کچھ کہتے سوچ سمجھ کر کہتے۔ اور بلا کسی اُلجھاؤ کے کہتے۔ زبان و بیان کی کمزوری کا انہیں احساس تھا اس لئے مشورۂ سخن بھی کیا کرتے۔ مشاعروں میں پڑھنے کا اندازِ شاعرانہ کم سپاہیانہ زیادہ تھا۔ اپنی شاعری کے مقام کو وہ سمجھتے تھے کبھی اپنے شاعر ہونے پر تعلّی نہیں کی۔

وہ بظاہر صحت مند تھے کسے اندازہ تھا کہ یہ چراغ اس طرح اچانک بجھ جائے گا۔ دراصل بات یہ ہے کہ انسان کا جسم ایک مشین کے مانند ہے اسے بے دردی سے استعمال کیا جائے تو ٹوٹ پھوٹ بھی سکتا ہے۔ وقتِ واحد میں اتنی ساری مصروفیتیں اکٹھی کر لینا کھیل نہ تھا۔ جان کھپانی پڑتی ہے۔ پیشہ ورانہ کاروبار۔ شاعری، مشاعروں میں شرکت، مشاعروں کی سرپرستی، دوستوں کی مدد۔ شعری مجموعوں کی کتابت و طباعت کا انتظام اور پھر "ذوقِ نظر" کی ادارت ان عائد کردہ مصروفیات کے تعاقب میں وہ دراصل اپنے جسم کی توانائی بکھیرنے لگے تھے۔ بیمار پڑے پھر سنبھل گئے اور اس طرح بظاہر انہوں نے اپنی صحت پر قابو پا لیا تھا۔ لیکن اندر سے ٹوٹ رہے تھے۔ دوست احباب تو کیا خود ان کو اس کا قطعی احساس نہ تھا۔

وہ آج ہم سے دور چلے گئے ہیں۔ ان کے بغیر ہم خود کو تنہا محسوس کر رہے ہیں۔ لیکن وہ دور ہو کر بھی ہم سے بہت قریب ہیں۔ کیونکہ وہ دوسروں کے لئے جینا سکھا گئے۔

ہائے قطعہ تاریخ

— ۱۴۰۷ —

الوداع رہبرِ علم و فن
الوداع اے غیورِ دکن
جس سے روشن تھی ہر انجمن
"گل ہوا وہ چراغِ سخن"

۱۹۸۷ء

مظہر رضی

حضرت بشیر وارثی مرحوم

منقبت حضرت صدیقِ اکبرؓ

اثاثہ دے کے سب کچھ شادماں صدیقِ اکبرؓ ہیں
حبیبِ کبریاؐ کے پاسباں صدیقِ اکبرؓ ہیں !

قسم اللہ کی اعجازِ صدیقی ذرا دیکھو !
نبیؐ کو دوش پہ لے کر رواں صدیقِ اکبرؓ ہیں

خدا کی راہ میں اسباب سارا اپنا دے ڈالا
سخاوت کی فقط روحِ رواں صدیقِ اکبرؓ ہیں

لباسِ فاخرہ دے کر غلاموں کو نوازا ہے
پھٹی کملی میں کتنے شادماں صدیقِ اکبرؓ ہیں

جمالِ مصطفےٰؐ گویا عبادت ہے عبادت ہے
فدائے حسنِ شاہِ دوجہاںؐ صدیقِ اکبرؓ ہیں

محمد مصطفےٰؐ جس گھر میں اب آرام فرما ہیں
اسی مٹی کے پردے میں نہاں صدیقِ اکبرؓ ہیں

خدا رحمٰن ہے اور رحمتِ عالم محمدؐ ہیں
بہ فیضِ مصطفےٰؐ رحمت نشاں صدیقِ اکبرؓ ہیں

خدا نازاں نبیؐ نازاں صداقت ان پہ نازاں ہے
جو سچ پوچھو امامِ عاشقاں صدیقِ اکبرؓ ہیں

نصیبہ ناز کرتا ہے مقدر فخر کرتا ہے
بشیرِ خستہ دل پہ مہرباں صدیقِ اکبرؓ ہیں

محترم الحاج مرزا شکور بیگ

آہ۔ بشیر بھائی

خود غرضی اور مطلب پرست ماحول سے کسی مخلص انسان کا اُٹھ جانا ایسا حادثہ ہے جسے آسانی سے بھلایا نہیں جا سکتا۔ بشیر الدین وارثی صاحب بڑی پہلودار شخصیت کے حامل تھے۔ ان میں کئی خوبیاں تھیں۔ ان خوبیوں کا تقاضا یہ ہے کہ اُس کا تفصیل سے بیان کیا جائے مگر دل جب غم کے بوجھ سے دبا رہتا ہے تو الفاظ ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ اور آنسوؤں کی جگہ لے لیتے ہیں قریب سے جانی پہچانی شخصیت پر قلم اٹھاتے وقت بھی پیش آتی ہے کہ ابتداء کہاں سے ہو۔ ادھر میری بینائی کی خرابی نے لکھنے پڑھنے کے کام سے مجھے معذور کر دیا ہے۔ پھر بھی مرحوم سے آخری ملاقات کا حال لکھ دیتا ہوں۔

پیوستہ سال رجب کے مہینے میں جب میں نے انگلستان اور وہاں سے امریکہ جانے کا پروگرام بنایا تو میں نے اپنا نعتیہ کلام ضروری اخراجات کے ساتھ طباعت کے لئے بشیر بھائی کے حوالے کر دیا۔ بشیر بھائی کسی کے کام سے انکار کرنا تو جانتے ہی نہ تھے۔ اس ذمہ داری کو بھی قبول کر لیا۔

امریکہ سے فراغت حج و زیارت ماہ ستمبر میں حیدرآباد پہنچنے کا ارادہ تھا مگر ہوا یہ کہ حج کے بعد مجھے پھر امریکہ جانا پڑا اور وہاں تقریباً ۲ ماہ ٹھہر کر ماہِ نومبر کے آغاز ہی میں یہاں پہنچا۔ ہلالی لحاظ سے ربیع الاول شریف کا مہینہ تھا۔ میں سمجھتا رہا تھا کہ نعتیہ کلام چھپ کر تیار ہوگا۔ مگر یہاں پتہ چلا کہ کام ابھی ابتدائی منزل میں ہے۔

میرے دل میں خیال آیا کہ شاید بشیر بھائی پر کام کا بوجھ بہت بڑھ گیا ہے۔ یا پھر ان کی صحت خراب رہنے لگی۔ مگر میں نے شکایت کی نہ انہوں نے معذرت چاہی یہاں پہنچ کر بھی جب مجھے دو تین ماہ ہو گئے تو اخبار "سیاست" میں یہ خبر چھپوا دی کہ میرا نعتیہ کلام بشیر الدین وارثی صاحب اپنی نگرانی میں طبع کروا رہے ہیں۔ جو عنقریب منظرِ عام پر آ جائے گا۔ بشیر بھائی نے وہ اخبار مطبع والوں کے پاس پہنچ کر دکھایا اور کہا اب تو میری لاج رکھ لو، ادھر توجہ کرو۔

ماہِ رمضان المبارک [illegible] میں میں نے پھر سعودی عرب جانے کا پروگرام بنایا اور شوال کے مہینے میں حاضری طے پائی۔ بشیر بھائی سے میں نے فون پر عرض کیا کہ میری خواہش تھی کہ اس سفر میں نعتیہ کلام کے کچھ نسخے بھی میرے ساتھ ہوتے مگر شاید یہ ممکن نہ ہو سکے گا۔ بشیر بھائی نے فرمایا ان شاء اللہ آپ کی تمنا پوری ہوگی۔

۱۲، جون [illegible] کے دن رات کے ہوائی جہاز سے بمبئی جانا طے ہوا تھا۔ ایک آدھ دفعہ یہ خیال بھی آیا کہ نعتیہ کلام ساتھ ہی ہوتا تو اچھا تھا۔ شاید تین بج چکے تھے کہ اطلاع ملی کہ بشیر الدین صاحب تشریف لائے ہیں۔ باہر نکل کر دیکھا تو بشیر بھائی "مدینے کے انوار" کے دو نسخے آٹو رکشا میں رکھے لے آئے ہیں۔ چہرے پر کچھ ندامت اور زیادہ خوشی ہے فرمانے لگے اس کام میں بہت دیر ہو گئی۔ معاف فرمائیے۔ یہ تھے بشیر بھائی۔ ایسا کام جس میں خود کو دمڑی کا فائدہ نہ تھا محض دوستی میں اللہ واسطے

کر رہے تھے اس میں دیری کی معافی چاہ رہے ہیں۔ بلکہ ہر کسی کے کام کو اپنا کام سمجھ کر اسی لگن سے انجام دیا کرتے تھے۔ پھر وہ فرمانے لگے میں چلتا ہوں آپ سفر کی تیاری میں شاید مشغول تھے میں مخل ہوا معاف کیجئے اور میری طرف سے حضور پُر نور کی بارگاہ میں صلوٰۃ و سلام کا نذرانہ پیش کیجئے۔ یہ کہکر وہ مجھ سے گرمجوشی سے گلے ملے اور دیر تک مجھے چپٹائے رکھا۔ میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے ہیں۔ انہوں نے مجھے دیکھا اور پھر مجھ سے لپٹ گئے۔ کاش!! مجھے معلوم ہوتا کہ یہ ان کی آخری ملاقات ہے۔ ایک دن مدینہ منورہ میں مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں پہلے صحن کے کنارے پر جہاں سے گنبد شریف صاف نظر آتا ہے میں بشیر الدین عیدروسی صاحب کے قریب بیٹھا ہی تھا کہ انہوں نے کہا کہ بشیر الدین وارثی صاحب کا انتقال ہوگیا۔ مجھے عجیب دھچکا لگا۔ میں نے پوچھا کس نے کہا؟ جواب ملا رہنمائے دکن میں یہ خبر چھپی ہے۔ نہ پوچھئے کہ دل پہ کیا گذری۔ میں نے ڈبڈبائی آنکھوں سے دعائے مغفرت کے لئے ہاتھ اٹھائے یہ غم اب بھی تازہ ہے۔

"خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں"

مری دعا ہے کہ ان کی آل اولاد چھوٹے اور سب اتفاق و اتحاد سے ان کے کام کو سنبھالیں اور ان کے نقش قدم پر چلیں۔

حضرت محمد علی زورؔ آغائی الہلالی

قطعات

بہ وفات حسرت آیات محبی و مشفقی جناب بشیر وارثی مرحوم

— —

منزلِ امن و اماں راحت میں ہیں
فضلِ حق سے سایۂ رحمت میں ہیں
چھوڑ کر اے زورؔ! وہ دنیائے دوں
اب بشیرِ وارثی جنت میں ہیں

o

وہ بشیرِ وارثی سب سے بھلائی کرتے تھے
ہر ضرورت مند کی عقدہ کشائی کرتے تھے
زورِ آغائی ہو فردوسِ بریں ان کو نصیب
جو ہر حاجت مند کی حاجت روائی کرتے تھے

حضرت بشیر وارثی

منقبتِ حضرت فاروقِ اعظمؓ

مسلمانوں میں تازہ قوتِ فاروقِ اعظمؓ ہے
کھلے بندوں عبادت، جراءتِ فاروقِ اعظمؓ ہے

یہی وہ ہیں جنہیں اللہ سے مانگا محمدؐ نے
صحابہ میں مسلّم عظمتِ فاروقِ اعظمؓ ہے

صدائے نعرۂ تکبیر گونجی ہے دو عالم میں
دلِ باطل پہ طاری ہیبتِ فاروقِ اعظمؓ ہے

نبی ہوتا جو میرے بعد کوئی تو عمرؓ ہوتے
عیاں اس قول سے خود عظمتِ فاروقِ اعظمؓ ہے

جہاں تک مملکت اسلام کی پھیلی زمانے میں
برائے دینِ حق وہ خدمتِ فاروقِ اعظمؓ ہے

کیا دریا کو تابع یہ عجیب اعجاز دکھلایا
ہے نیل اب تک رواں یہ حکمتِ فاروقِ اعظمؓ ہے

بصارت تھی ٹیلیویژن، صدا تھی ان کی لاسلکی
کہاں تھے ساریہؓ یہ قدرتِ فاروقِ اعظمؓ ہے

سندِ حسنینؓ سے لکھوا کے اپنی قبر میں رکھ لی
لحد میں شجرہ رکھنا سنتِ فاروقِ اعظمؓ ہے

باذنِ عائشہؓ پائی جگہ حضرتؐ کے حجرہ میں
نبیؐ کے ساتھ رہنا فطرتِ فاروقِ اعظمؓ ہے

مقامِ عشق میں عاشق ہمیشہ ساتھ رہتا ہے
جمالِ مصطفیٰؐ بھی نعمتِ فاروقِ اعظمؓ ہے

بشیر وارثی اشعار یہ لکھ کر بتایا ہے
کہ اچھے شعر سننا عادتِ فاروقِ اعظمؓ ہے

منوہر لعل بہار

آہ! بشیر وارثی

اے بشیر وارثی، اے شاعرِ مردم شناس
آج تیری یاد میں محفل کی محفل ہے اُداس

اہلِ دل، اہلِ نظر، اہلِ قلم، اہلِ سخن
حق تو یہ ہے بالیقیں تو تھا شہیدِ علم و فن

اب بشیر وارثی جیسا بشر ہوگا کہاں
شاعرِ ذوقِ نظر وہ دیدہ ور ہوگا کہاں

شاعروں پر اُس کا احسان ان گنت تھا بے شمار
یاد آتی ہے خیال آتا ہے اُس کا بار بار

نعت گوئی میں شرف اُس کو ملا سرکارؐ سے
بالیقیں بخشش ملے گی احمدِ مختارؐ سے

قطعۂ تاریخ ہو یا نعت ہو یا ہو غزل
شاعرِ بے مثل ہر صنفِ سخن میں بے بدل

اب کہاں ایسا ملے گا دوستدارِ بیکساں
کس طرح آگے بڑھے گا اب ادب کا کارواں

رُوٹھ کر ہم سے کہاں وہ چھُپ گیا اپنا بشیر
کیا ستمگر موت کے ہاتھوں ہوا ہے وہ اسیر

تیرگی محفل میں چھائی، بجھ گئی شمعِ سخن
سر جھکا کر رو رہی ہے انجمن کی انجمن

بارگاہِ رب میں ہو جائے دعا اس کی قبول
بخش دے اس کی خطائیں وہ تھا شیدائے رسولؐ

صاحبِ کردار تھا لائقِ صد افتخار
مخلص و محسن کرم فرما تھا وہ جانِ بہار

اویب حیدرآبادی

آہ! بشیر وارثی

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا :: دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام لیا۔

۱۸ر جولائی ۱۹۸۷ء کی شام کا ذکر ہے کہ جب میں گھر سے چلا تو اتفاقاً ایک معمّر بزرگ کا سامنا ہوا انہوں نے سلام علیکم کہکر مجھے یہ شنائی سنائی!

"بشیر الدین صاحب وارثی کا انتقال ہوگیا۔ جو ماہنامہ "ذوق نظر" نکالتے تھے۔ مجھے بھی اس کا ایک نسخہ دیا کرتے تھے۔ چھتہ بازار کے سب دُکاندار میت میں جارہے ہیں۔ دُعا فرمائیے"!

یہ خبر سنتے ہی میں کچھ ایسا گم سُم سا ہوگیا کہ منہ سے یہ بلو چھ تک نہ سکا۔

"آخر لوگ جا کہاں رہے ہیں؟ بشیر صاحب کا انتقال کب ہوا؟" اُن کی مغفرت کی دل ہی دل میں دُعا تو کی مگر زبان دُعائیہ کلمات ادا کرنے کے قابل نہ رہی۔ چھتہ بازار کی کمان جس سے بشیر بھائی کی دُکان ملحق ہے، برسوں میری گزرگاہ رہی۔ میں دُور ہی سے انہیں دیکھ لیا کرتا تھا۔ بعض مشاعروں میں ان کا کلام سُننے کا اتفاق بھی ہوا۔ مگر ملنے کی خواہش اُس وقت پیدا ہوئی جب اخبار "منصف" کی ہفتہ وار اشاعت میں حیدرآباد کی ادبی شخصیتیں کے عنوان سے جناب بشیر وارثی کی ہنس مکھ تصویر شائع ہوئی۔ اور جنوری ۱۹۸۵ء سے اُن کی ادارت میں ماہنامہ ذوق نظر" صوری و معنوی آب و تاب کے ساتھ نکلنا شروع ہوا۔

بشیر بھائی صاحب ۱۹۱۹ء میں صوبہ گلشن آباد میدک کے ایک قصبہ میں پیدا ہوئے۔ چونکہ اُن کے اجداد حکومت آصفیہ کے محکمۂ فوج سے منسلک تھے اس لئے ان کی ابتدائی تعلیم گولکنڈہ کے مدارس میں ہوئی۔ پھر ادارہ ادبیات اُردو امتحانات پاس کئے۔ ۱۹۴۳ء تا ۱۹۵۰ء فوجی ملازمت کے فرائض منصبی انجام دیتے رہے۔ دوسری جنگ عظیم میں مڈل ایسٹ سیکٹر پر مصر، فلسطین، قبرص اور بلادِ اسلامیہ میں اپنے ممتاز فوجی خدمات کے صلے میں برطانوی حکومت سے کئی اعزازات پائے۔ وظیفہ حسنِ خدمت پر سبکدوش ہونے کے بعد انکم ٹیکس کے تنقیحی کام سے انہیں کچھ ایسا شغف پیدا ہوا کہ ایک پرائیویٹ ادارہ کھول کے انتقال سے ایک دن پہلے تک بڑے کامیاب طریقہ پر اسے چلاتے رہے۔

وارثی صاحب کا پرچہ "ذوقِ نظر" بلاشبہ اسم بامسمّیٰ تھا جو بہت جلد مقبول ہوا۔ اُس کے چند خصوصی نمبر نکلے جب میں اپنا ایک مضمون اس پرچہ میں شائع کرانے کی غرض سے لے گیا تو بشیر صاحب بڑی خندہ جبینی سے پیش آئے اور شکریہ ادا کرکے مضمون لے لیا۔ جو چند روز کے بعد شائع ہوگیا۔ شائع شدہ مضمون کے دو شمارے پیش کرتے ہوئے مجھ سے اگلی اشاعت کے لئے نیا مضمون لکھنے کی فرمائش کی چنانچہ ان فرمائشوں کی میں نے ایک سے زیادہ مرتبہ تعمیل کی۔ خدا بخشے مرحوم علاؤالدین حبیب بھی ایسے ہی تقاضے کر کرکے اخبار "ملاپ" اُردو میں چھاپنے کے لئے مجھ سے امتحانات اعلیٰ ثانوی کے پرچہ جات اُردو کا حل

لکھوایا کرتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ طلاب کے لئے نہ سہی کسی اور پرچہ کے لئے لکھیئے مگر لکھیئے ضرور !!

بشیر بھائی صاحب کے پرچہ میں میرے دو ایک مضامین کے چھپنے کے بعد بھی (حوالہ) حالیہ نیا مضمون لکھنے کی فرمائش وہ جاری رکھتے تو میں کہتا کسی بڑے آدمی سے لکھوایئے مگر وہ مُصر ہی رہتے۔ اور کہا کرتے آپ کی ہر تحریر "ذوقِ نظر" میں چھپنے کے قابل ہوتی ہے پھر مجھے نہیں ڈاکٹر یعقوب عمر کی رائے ہے۔"

۱۸ جولائی ۱۹۸۶ء سے آٹھ دس دن پیشتر کی بات ہے کہ دوپہر کے وقت جب میں وارثی صاحب مرحوم کی دکان سے گزرتے ہوئے ان کی جانب پلٹا تو انہیں فرصت میں پا کے جا ملا۔ حسبِ عادت مصافحے کے ساتھ ہی میری جانب سگریٹ اور دیاسلائی کی ڈبیا بڑھاتے ہوئے انہوں نے اپنی پاٹ دار آواز میں "چائے لاؤ" کے الفاظ منہ سے نکالے۔ اور مجھ سے پوچھا "حکم" ؟

میں نے کہا "راہ چلتے چلتے یونہی آپ کے آستانے پر ٹھٹک گیا۔ آپ کی مشقِ سخن تو جاری ہی ہو گی ۔ خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگے '

"جی جی ہاں جاری ہے مگر ہم کیا' ہماری شاعری کیا' ٹوٹی گنڈے جو ٹھیرے' ہاں احباب کی فرمائش ہوتی ہے تو بھلا برا کہہ لیتے ہیں۔ چنانچہ رئیس تقی جاہ مرحوم کے مصرعۂ طرح "کیا کیا ورق ورق سے ہے چسپیدہ دیکھنا" پر غزل تو ہوئی ہی تھی' نعت شریف بھی نظم کر لی' میرے اشتیاق پر یہ نعتیہ اشعار انہوں نے سنانا شروع کئے

یہ شانِ عبدیت دلِ شوریدہ دیکھنا
خالق ہے خود رسول کا گرویدہ دیکھنا
سیکھے کوئی بلالؓ سے شانِ سپردگی
سیکھے کوئی اویسؓ سے نادیدہ دیکھنا

کیا دشمنوں کا خوف خدا کے حبیب کو
زانو پہ یارِ غار کے خوابیدہ دیکھنا

تخلیق کی ہو شان کہ خالق کی آن بان
دونوں ہیں اُن کی ذات میں چسپیدہ دیکھنا
پروردگارِ پاک کسی حال میں کبھی
کب چاہتا ہے آپ کو رنجیدہ دیکھنا
کھلتے نہیں ہیں کھل کے بھی اسرارِ ذاتِ پاک
ظاہر بھی ہو کے کتنے ہیں پوشیدہ دیکھنا
اُن کی نظر کے سامنے کیا بات ہے بشیر
ہر اک کے دل کی حالت پوشیدہ دیکھنا

اِن اشعار کو سُن کے میں نے کہا بشیر صاحب! آپ نے عشقِ رسول میں ڈوب کے نعت کہی ہے۔ بارگاہِ رسالت سے یہ عطا آپ کے حصّے میں آئی۔ میرے اس تبصرہ پر مارے خوشی کے سر دُھننے لگے!

اتنے ہی جناب رونق قادری آ پہنچے' وارثی صاحب اُن سے بھی بڑے تپاک سے ملے اور کہا" براہ کرم اپنی اُس نظم کی نقل عنایت فرمائیے جو آپ نے حمید رونق صاحب کے جلسۂ اعترافِ خدمات کے موقع پر سنائی تھی — حکم ہوا ہے کہ ذوقِ نظر کے آئندہ شمارے میں اُسے شائع کیا جائے۔" بعد میں بتایا کہ یہ فرمائش خسرو صاحب کی تھی۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ کسی برقع پوش خاتون نے آ کے وارثی صاحب کو سلام کیا۔ انہوں نے جواب سلام کے ساتھ ہی سو سو روپے کے دو نوٹ بٹوے سے نکال کے اس خاتون کے حوالے کئے۔ نوٹ لے کے وہ چلتی بنی۔ مگر رونق صاحب اس وقت سنبھلے نہ بیٹھ سکے۔ اور وارثی صاحب کو اس طرح چھیڑا کہ ہمیں پہلے سے اس کا علم ہوتا تو ہم بھی

برقعہ اوڑھ کے آتے اور آپ سے اپنا حصہ پاتے۔

وارثی صاحب نے سنجیدہ لہجہ میں یہ واقعہ سنایا۔

"میرے ایک مرحوم دوست کی بیوہ کی چھوٹی موٹی جائداد کا کرایہ دو سو روپے ماہانہ مشخص ہوا تھا مگر کرایہ دار کے بروقت کرایہ ادا نہ کرنے کی وجہ سے بیوہ موصوف کو میں اپنی جیب سے بروقت یہ رقم پہنچاتا رہا اسی سلسلہ کے وہ دو نوٹ تھے جو آپ حضرات نے دیکھے۔

یہ سنتے ہی روحی صاحب بھی سنجیدہ لہجے میں بولے

"اللہ آپ کو اس کی جزائے خیر دے!"

میں نے روحی صاحب سے کہا "دیکھئے تو! اس زمانۂ قحط الرجال میں بھی اللہ کے کچھ نیک نفس بندے پائے جاتے ہیں۔"

ہم تو اس ایک ہی واقعہ پر ششدر و حیران تھے مگر مرحوم کے دو ایک قریبی دوستوں سے معلوم ہوا کہ وہ اس کے عادی تھے کہ دائیں ہاتھ سے دیں تو بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو اور ان کی رقم مستحقین کے کام آئیں۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ع

مری جاں! آدمی اخلاق سے تلوار ہے

بشیر صاحب مرحوم جہاں ایک تجربہ کار انکم ٹیکس آڈیٹر تھے وہاں ایک مشاق اور پُرگو شاعر بھی تھے۔ انہیں مشاعرہ بازی کا بہت شوق تھا؛ بلدۂ حیدرآباد کے اندر اور باہر طرحی یا غیر طرحی مشاعروں میں نہ صرف شریک ہوتے بلکہ اپنا کلام سنا کے سامعین سے داد تحسین بھی حاصل کر لیتے تھے؛ چونکہ وہ ایک مرنجاں مرنج اور مجلسی انسان تھے۔ اور اُن کا اپنا مشرب صلح کل تھا۔ اس لئے ہر بانیٔ مشاعرہ اپنے یہاں ان کو ضرور مدعو کرتا تھا۔ غزل والے مشاعرے کے لئے تو وہ غزل جیسی غزل کہہ بھی لیا کرتے تھے۔ مگر نعت گوئی کے ارادے سے قلم اٹھاتے تو اس کی بات ہی جدا ہوتی۔ حمد و نعت ہو کہ سلام و منقبت، ان موضوعات پر ان کا قلم رکنے کا نام نہ لیتا تھا۔ متذکرہ صدر نعت کی زمین میں انہوں نے جو غزل کہی اس میں شاعرانہ آمد کی وہ شان نہیں جو اس نعت شریف میں پائی جاتی ہے۔ چنانچہ ان کا نعتیہ شعر

کھلتے نہیں ہیں کھل کے بھی اسرارِ ذاتِ پاک
ظاہر بھی ہو کے کتنے ہیں پوشیدہ دیکھنا

معاملات میں معرفت سے اُن کے دلی لگاؤ اور فطری مناسبت کو ظاہر کرتا ہے۔ اس قدر سنگلاخ زمین میں ایسا رواں شعر کہنا یقیناً ان کی حوصلہ مندی پر دال ہے۔

بشیر صاحب کے اور میرے تعلقات خلوص محض پر مبنی رہے۔ اس لئے مجھ پر اُن کا بڑا حق تھا کہ اُن کی یاد میں چند سطریں لکھوں۔ اُن کے پیر و مرشد کی تعلیم کے سبب جب انہیں پنجتن پاک سے بہت زیادہ دلی عقیدت تھی جس کا میں اُن کے فاتحہ چہلم کے دن اور زیادہ قائل ہو گیا۔ جب کہ میں نے مسجد میں رکھے ہوئے پاروں میں سے بغرض تلاوت ایک پارہ اٹھایا اور اُسے کھولا تو وہ قرآن کا بائیسواں پارہ نکلا جس کی تلاوت کے دوران میں آیت تطہیر کی تلاوت کی اور اہلبیت اطہار رع سے مرحوم کی روحانی نسبت کا تصور کر کے جھوم اُٹھا۔

ع۔ ہم اُن کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا!

اُسی دن جب ہم مرحوم کی قبر پر پھول چڑھانے جا رہے تھے تو ایک نوجوان نے نیاز مندانہ طریقہ سے مجھے سلام کہتے ہوئے کہا میں آپ کا شاگرد رہا ہوں میں نے کہا ہاں پہچانا' کہا مرحوم کا بڑا لڑکا ہوں سنتے ہی میں نے انہیں چمٹا کے کہا چہرہ مرحوم سے کافی مشابہ ہے۔ اب بحق طٰہٰ و یٰسین دعا کرتا ہوں کہ خدا بشیر وارثی مرحوم کی مغفرت فرمائے۔ اور ساتھ ہی ان کے چاروں فرزندوں' دختروں اور بیوہ کو صبر جمیل کی توفیق جزیل عطا فرمائے۔ آمین!

اسدؔ انصاری سرپٹ حیدرآبادی

بشیر وارثی مرحوم

کی عمر بھر ہماری قیادت بشیر نے | دی ہم کو زندگی کی بشارت بشیر نے
ہیں رہنمائے راہِ عمل اُن کے نقشِ پا | ہم کو دکھا رہے ہیں جو منزل کا راستہ
رہتے ہیں رات دن وہ نگاہوں کے سامنے | کرتے ہیں رہنمائی وہ راہوں کے سامنے
حسنِ عمل سے اُن کے رہے فیضیاب ہم | راہِ عمل میں آج بھی ہیں کامیاب ہم
ہے نقش اُن کا دل پہ مٹایا نہ جائے گا | حسنِ سلوک اُن کا بھلایا نہ جائے گا
اُن سے مصیبتوں میں سہارا ملا ہمیں | امواجِ بحرِ غم میں کنارا ملا ہمیں
ہم کو وہ زندگی کے طریقے سکھا گئے | دنیا کے اُونچ نیچ وہ ہم کو دکھا گئے
ہر حال میں ہمارے وہ ہمدم رہے اسدؔ | ہر قسم کے وہ زخموں کا مرہم رہے اسدؔ
وہ زندگی میں دیتے رہے ہم کو زندگی | مر کر ہمیں بتا گئے کیا شئے ہے موت بھی
تدفین اور زیارت و چہلم بھی ہو چکا | سونا تھا جن کو قبر میں وہ جا کے سو چکا

ہر سُو فضا میں اُن کی مہک آج تک بھی ہے
سرپٹ کو اُن کے مرنے میں شک آج تک بھی ہے

ڈاکٹر رزاق فاروقی
صدر شعبۂ اردو، گلبرگہ یونیورسٹی

بشیر بھائی

یادیں اور یادگار کی ضرورت

میں پچھلے چار برسوں سے جامعہ گلبرگہ سے اردو مجلہ شائع کرنے کے منصوبے بناتا تھا۔ مادر علمیہ جامعہ عثمانیہ کا ترجمان مجلّہ عثمانیہ اور علی گڑھ یونیورسٹی کا علی گڑھ میگزین اور ایسے ہی کئی علمی جرائد کی علمی و ادبی خدمات سامنے تھیں۔ جی چاہتا تھا کہ شعبۂ اردو گلبرگہ یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلباء بھی اچھی خطوط پر اپنے اپنے رشحاتِ قلم کو شائع کریں۔ لیکن میرے ہی شعبہ کے ایک گوشہ سے اس کام کی سخت مخالفت ہوئی۔ میں نے ایسا محسوس کیا کہ اس کام کی ابتداء کو میرے ہاتھوں انجام پاتا دیکھنا ان لوگوں کو گوارا نہ تھا چنانچہ میں جب کبھی حیدرآباد آتا میرے ساتھ یہ دکھ بھری داستان بھی ہوتی۔ بشیر بھائی سے گفتگوں کی موضوعات پر باتیں کرتا۔ ہماری باتوں کا آغاز رات ۹ بجے کے بعد شروع ہوتا اور گیارہ بجے تک ہم مختلف مسائل پر کھل کر بات چیت کرتے تھے۔ گرم گرم چائے کے دور چلتے۔ بشیر بھائی چائے کے ساتھ سگریٹ کے دھویں کو اپنے سینہ میں بند کرتے اور پھر اپنے نتھنوں سے چھوڑتے جاتے تھے۔ میں ان سے بہت چھوٹا۔ الله وہ میرے لئے واجب التعظیم تھے۔ وہ میرے ماموں جناب حسن فاروقی صاحب مرحوم کے قریب ترین احباب میں سے تھے۔ میں اس کا لحاظ ہمیشہ رکھا کرتا تھا۔ لیکن جب زہریلے تمباکو کا دھواں ان کی ہند مٹھی میں جمع ہو کر ان کے خوب صورت لبوں سے نکلتا ہوا ان کے حلق اور سینہ کو عبور کر کے پھر اسی زاویئے سے واپس آجاتا تو مجھے نہ جانے کیوں خوف محسوس ہوتا تھا۔ میں بعض وقت ان کے مسلسل دھویں کے مشق یا کھیل کو دیکھ کر ایک انجانے سے خوف کو محسوس کرتا۔ لیکن ظاہر نہیں کر سکتا تھا۔ آخر میرا یہ خوف ایک حقیقت کے روپ میں سامنے آ ہی گیا۔ سگریٹ کا یہ دھواں زہریلے تمباکو کا یہ اثر ایک طویل مدت تک بشیر بھائی کے گلے، حلق، سینہ دل، خون اور سارے جسم پر محیط ہو گیا تھا۔ ایک رات وہ اپنے کئی چاہنے والوں سے رخصت ہو کر اپنے بستر پر پہنچے تو ان کے ساتھ تمباکو کے دھویں کے بے شمار بادل بھی تھے اور وہ ان بادلوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھو گئے۔ ایک انجانا سا خوف میرے پیچھے دوڑا چلا آتا تھا ایک سانحہ بن کر میرے سامنے آ گیا۔ اب میں اپنے شہر میں جب کبھی آؤں گا تو رات دیر گئے تک کس کے ساتھ باتیں کروں گا۔ کون مجھے مخالفین سے مقابلہ کے داؤ پیچ بتائے گا؟ مجھے عزم و ایقان کی دولت سے مالا مال کرے گا؟

میں بشیر بھائی سے گلبرگہ یونیورسٹی کے اردو میگزین کی اشاعت کے منصوبے کو بیان کرتا تھا۔ وہ سگریٹ کی تلخیوں کو اپنے نہاں خانۂ دل میں اتارتے پھر مجھے غور سے دیکھتے اور کہتے کہ کیا آپ نے اپنے وائس چانسلر سے اس بارے میں بات چیت کی تھی؟ میں اثبات میں جواب

تو وہ مجھ سے پوچھتے کہ کیا جواب ملا؟ پھر میں انہیں بتاتا کہ وائس چانسلر مجھے زبانی اجازت دے رہے ہیں کہ شعبۂ اردو کی طرف سے مجلہ شائع کر سکتا ہوں لیکن تحریراً اجازت دینا نہیں چاہتے کیوں کہ اجازت کے ساتھ ہی یونیورسٹی کو مجلہ کی اشاعت کے لئے مالی امداد بھی دینی ہوگی۔ اور میں اجازت کا حصول ضروری سمجھتا ہوں۔ میری ان تفصیلات کو سن کر انہوں نے دوسرا اسگریٹ سلگایا اور ایک لمبا کش لے کر کچھ دیر تک سوچتے رہے۔ پھر ان کا قانونی دماغ مجھے گر اور داؤ پیچ سکھانے لگا۔ کہنے لگے فاروقی صاحب ایک کام کرو آپ وائس چانسلر کو ایک خط لکھ دو جس میں شعبۂ اردو سے مجلّہ شائع کرنے کی زبانی اجازت کا ذکر ہو۔ ساتھ ہی ساتھ مجلّہ کے اغراض و مقاصد بھی بیان کرو۔ اور پھر وائس چانسلر کا اور یونیورسٹی کا شکریہ ادا کرو۔ اور یہ بھی لکھ دو کہ ہم اردو والوں کو یونیورسٹی کی مالی امداد کی ضرورت نہیں کیوں کہ ہم ہمارے کاموں کو کسی بھی طرح سے انجام دینے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ اس خط کی رسید محفوظ رکھو یہی آپ کا اجازت نامہ ہوگا اور جب یہ مجلّہ چھپ جائے تو وائس چانسلر سے اس پہلے مجلّہ کے لئے پیام کی درخواست کرو۔ یہ گویا ان کی اجازت کی مزید تصدیق ہوگی۔

میں نے گلبرگہ واپس ہوتے ہی بشیر بھائی کے داؤ پیچ آزمائے صد فی صد کامیابی سے جب میں ہمکنار ہوا تو اساتذہ اور طلبائے سے مضامین لکھوائے۔ مجلّہ کی اشاعت کے لئے صرف اساتذہ، ریسرچ اسکالرس اور طلبائے سے ان کے حسب مقدور مالی اعانت کو حاصل کیا۔ اور بعد ازاں مضامین اور رقم بشیر بھائی کے حوالے کر دی کہ وہ گلبرگہ یونیورسٹی کے پہلے اردو میگزین "فکر نو" کی طباعت کی نگرانی فرمائیں انہوں نے اس صبر آزما منزل کو بڑی محبت اور خلوص سے طے کر نے میں بڑی ہمدردی دکھائی جب "فکر نو" چھپ کر تیار ہو گیا۔ اور ایک ریسرچ اسکالر کے ذریعہ بشیر بھائی نے اس مجلّہ کے گٹھوں کو میرے پاس بھیجا تو ہم سب "فکر نو" کی اشاعت پر خوش تھے۔ اور اس شکریہ کا خط بشیر بھائی کی خدمت میں پوسٹ کرنے ہی والا تھا کہ روزنامہ "سیاست" میں ان کے انتقال کی خبر شائع ہوئی اور ایسا محسوس ہوا کہ وہ "فکر نو" کی اشاعت میں تعاون کا شکریہ قبول کرنا نہیں چاہتے تھے وہ شکریہ ادا کرنے سے پہلے ہی چلے گئے۔ ویسے ہم بشیر بھائی کا کن کن باتوں کے لئے شکریہ ادا کریں۔ میں نے ابھی ان کی "بند مٹھی" ذکر کیا ہے۔ جس میں اکثر سگریٹ کا دھواں بھرا رہتا تھا۔ پھر یہ دھواں ان کے لبوں میں گھومتا تھا۔ ان کی یہ "بند مٹھی" اور ان کے گول گول سے لب ہماری نگاہوں کے سامنے ہوا کرتے تھے۔ لیکن ان کی وہ "بند مٹھی" جس میں مستحقین کے لئے زر اعانت بند ہوا کرتا تھا ان کے گول گول سے ہونٹ جن کے ذریعہ وہ پُر سکون اور تجربہ سے بھرپور مشورے ہم تک پہنچ پاتے تھے۔ اکثر دنیا کی نگاہوں سے اوجھل رہے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ ان کی "بند مٹھی" جو کہ مستحق غریب شاعر کے لئے یا ادیب کے لئے یا کسی مشاعرہ یا جلسہ کرنے والی جماعت کے لئے محفوظ تھی۔ عام نگاہوں میں بھی پڑ جائے کئی شاعر اور ادیب اور مجبور افراد اس "بند مٹھی" سے استفادہ کے لئے آجاتے تھے۔ یا یہ "بند مٹھی" منی آرڈر کی شکل میں ان تک پہنچ جاتی تھی۔ ان کے تجربے سے بھرپور مشورے نہ جانے کتنے پریشان افراد کے کام آئے۔ زندگی کا یہ رکھ رکھاؤ اور زندگی کا یہ سلیقہ انہوں نے اپنے روحانی سلسلہ سے سیکھا تھا۔ حضرت پیر وارث علی شاہ صاحب قبلہؒ کے سلسلۂ عالیہ سے ان کو نسبت تھی۔ وہ اپنی نسبت کا عملی مظہر بننا چاہتے تھے۔ وہ اپنے اس انسان دوستی کے عمل کو عین عبادت سمجھتے تھے۔ انہیں حضرت پیر وارث کے آستانہ سے از حد عقیدت تھی۔ وہ بڑے والہانہ انداز سے اپنے روحانی سلسلہ کے بزرگوں کا ذکر کرتے تھے

دم سے بڑھ [illegible]
کر کوئی چیز نہیں۔ یہی ان کی عبادت کی اساس تھی۔ وہ دستِ تعاون کو عبادت، دل جوئی کو مسلکِ حیات اور کرم فرمائی کی عادت کو لذتِ حیات سمجھتے تھے۔!!

ان کی زندگی کا ایک رُخ روشن ان کی شعری خدمات ہیں۔ خاص کر ان کا نعتیہ کلام ان کے مسلکِ حیات کا ترجمان ہے اس تعزیتی مضمون میں اس رُخ روشن کے آگے شمع جلانے کو جی نہیں چاہتا۔ لیکن اتنا کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتا کہ بشیر بھائی کی حیات کے ان خوش گوار علمی ادبی اور اخلاقی اقدار کو قائم رکھنے کی آج سخت ترین ضرورت ہے۔ بشیر بھائی کی یاد میں" ذوقِ نظر" کا ایک خصوصی شمارہ ان کے بار کا قرض اتارنے کے لئے کافی نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کے دوستوں ان کے عزیزوں اور ان کے خاندان کے افراد ان کی ایک مستقل یاد قائم رکھنے کے لئے اپنے اخلاص و عمل کا مظاہرہ کریں۔

"بشیر وارثی یادگار خطبات ایک تجویز"

میں ایک تجویز پیش کرنے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ بشیر بھائی سلسلۂ چشتیہ عالیہ سے وابستہ تھے۔ ارضِ دکن پر حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودراز کا آستانہ پیار و محبت کا ایک نشانِ امتیاز ہے اس سرزمین پر بشیر بھائی کی کم از کم سالانہ یاد کے اہتمام کے لئے ایک مستقل ٹرسٹ کا قائم کیا جا تا علم و ادب کے لئے ایک ٹھوس خدمت ہوگی۔ شعبۂ اردو گلبرگہ یونیورسٹی میں ہر سال بشیر وارثی یادگار لکچر اور اس کے ساتھ ساتھ بشیر وارثی یادگار مشاعرہ کے لئے میری اس تجویز پر غور کرنے استدعا کرتا ہوں ارضِ دکن میں آستانۂ بندہ نوازؒ کے قریب ایک نئی یونیورسٹی کروڑوں روپیوں کے خرچ سے ایک شاندار مستقبل کی طرف رواں دواں ہے شعبۂ اردو بھی اپنی رفتار کے ساتھ واقف ہے اور اس کا شریک ہے۔ اگر بشیر وارثی یادگار لکچر کے زیر اہتمام ہر سال ہوتے رہیں اور اس کے مشاعرہ کی محفلیں بھی سجائی جاتی رہیں تو یقین ہے کی انسان دوستی کی حسین روایت گلبرگہ یونیورسٹی میں محفوظ رہے گی۔ اور جگمگاتی رہے گی۔

بشیر بھائی کے دوستوں اور عزیزوں چاہنے والوں نے اگر ایک موزوں فنڈ جمع کر کے گلبرگہ یونیورسٹی میں محفوظ کر دیا تو ایک ٹھوس علمی کام کی بنیاد پڑ جائے گی۔ اور بشیر وارثی یاد کا اہتمام ہوگا۔ اور مرحوم کی روح یقیناً مسرور ہوگی۔ بندہ نوازؒ کی خوشبو میں گلبرگہ یونیورسٹی کے اہتمام بشیر وارثی میموریل لکچرس" باعث اعزاز بن جائیں۔ میں نے اس مجوزہ ٹرسٹ کے لئے دس ہزار روپیہ جمع کرنے کا منصوبہ سوچا ہے۔ یہ رقم لاکھوں میں ہے۔ اگر عزم اور استقلال کے ساتھ یہ کام شروع کیا تو دس ہزار کی رقم سے یہ ٹرسٹ گلبرگہ یونیورسٹی نذر کیا جاسکے گا۔ اس سے ہونے والی سالانہ آمدنی ۱۳ سو روپے میں سالانہ ایک وقیع خلوص و محبت بھرا ہوا بشیر وارثی خطبہ مدتوں بشیر بھائی کا اہتمام کرتا رہے گا۔

دعا گو

(رزاق فاروقی)

قطعہ

جہاں تک ہے نمودِ حُسن و الفت
کوئی طالب کوئی مطلوب
نظر والو بشیر وارثی بھی
[illegible] حق میں کہیں مطلوب

افسوس ہم نہ ہوں گے

[illegible]

[illegible] ہر ساز رو رہا ہے — [illegible] رو رہا ہے

[illegible] طرزِ بیاں کے دل پر — اک تیر سا چلا ہے اُردو [illegible]

[illegible] شعر و ادب کے آنسو — کچھ حالِ [illegible]

[illegible] ہمدم آہ و بکا کریں گے — [illegible]

[illegible] پڑھیں گے [illegible] ہو گی — شاداب پھر چمن میں اُردو زباں ہو گی

[illegible] احترامِ حکم — لہرائے گا جہاں میں [illegible]

علم و ادب کے میلے دنیا میں کم نہ ہوں گے
افسوس ہم نہ ہوں گے افسوس ہم نہ ہوں گے

حضرت بشیر وارثی مرحوم

منقبت سیدنا عثمانِ غنیؓ

تھے صحابہ میں بڑے دھن وان عثمانِ غنیؓ — دین پر کرتے رہے احسان عثمانِ غنیؓ
ان کے اندازِ حیا کا پاس کرتے تھے رسولؐ — اس قدر تھے کامل الایمان عثمانِ غنیؓ
آپ نے قرآن کی تدوین کی بعدِ رسولؐ — اس لئے ہیں جامع القرآن عثمانِ غنیؓ
عقد میں دی ہیں نبیؐ نے اپنی دو شہزادیاں — آپ ذوالنورین ہیں ذیشان عثمانِ غنیؓ!
ہر گھڑی اسلام کی امداد فرماتے رہے — جان حق پر کر گئے قربان عثمانِ غنیؓ
ہے خلافت آپ کی مقبولِ ربِّ دوجہاں — وقتِ رحلت پڑھتے تھے قرآن عثمانِ غنیؓ
ہے زبانِ مرتضیٰؓ رطب اللساں تعریف میں — آپ کی کتنی بڑی ہے شان عثمانِ غنیؓ!
جان سے پیارا خدا کا دین ہے ثابت کیا — زندۂ جاوید ہیں ہر آن عثمانِ غنیؓ

مالِ دنیا کی نہیں تھی کوئی اہمیت بشیر!
دولتِ دیں سے بنے عثمانؓ، عثمانِ غنیؓ

حضرت بشیر دہلوی

منقبت مولائے کائنات سیدنا علیؑ

نفسِ رسولؐ مالک و مختارِ شش جہات
مولائے کائنات سے حق کو ملا ثبات

دی ہے خدا نے اِن کو دو عالم میں برتری
مولائے کائنات ہیں مولائے کائنات

مولائے کائنات امام اولیائے کے ہیں
جن کی نگاہِ فیض ہے اسلام کی حیات

قدرت خدا کی ضم جو ولایت میں ہو گئی
بازو علیؑ کے ہو گئے ٹھوکر خدا کے ہات

دی ہے خدائے پاک نے مولاؑ کو ذوالفقار
ہیبت سے جس کی لرزہ بر اندام کائنات

اِسلام کو فروغ اسی دور میں ہوا
جس دور میں علیؑ تھے مشیرِ سیاسیات

بتلاؤ کیا علیؑ نے کیا تھا کبھی حسد
احبابؓ کے رفیق تھے مولائے کائناتؑ

مشکلکشائیؑ قوم کی تقدیر بن گئی !
ہاتھ آ گیا نصیب سے حلّالِ مشکلاتؑ

مومن پہ کیوں نہ آتشِ دوزخ حرام ہو
یادِ علیؑ بشیرؔ ہے پروانۂ نجات

ڈاکٹر صادق نقوی

بشیر وارثی — ایک شخصی تاثر

موت وہ حقیقت ہے جس سے کائنات کے کسی بشر کو انکار نہیں لیکن کچھ لوگ دھرتی کا ئنات پر ایسے بھی پیدا ہوتے ہیں جن کے صرف طبعی وجود ہی موت کے حادثہ سے دوچار ہوتے ہیں۔ اُن کے جسم سماج کی نظروں سے چھپ جاتے ہیں۔ لیکن وہ افراد کے ذہنوں میں زندہ رہتے ہیں۔ اُن کی زندگی۔ یوں بقا کے دامن میں سمٹ جاتی ہے کہ گذرتا ہوا وقت اور ہوتے ہوئے حادثات اُسے فنا نہیں کر پاتے۔

انسان کی یہ لازوال زندگی اُس کے سماج کے لئے خدمات سے عبارت ہوتی ہے۔ فطرتِ انسانی کا یہ خاصہ ہے کہ وہ اپنے لئے کشمکش میں مبتلا رہتا ہے۔ اُسے ہمیشہ یہ فکر لاحق رہتی ہے کہ وہ اپنے لئے کیا، کیسے اور کس قدر حاصل کر سکتا ہے۔ یہ حصول کی طلب انسان کے ظرف کی مناسبت سے ہوتی ہے۔ کوئی دولت کے حصول میں سرگرداں رہتا ہے تو کوئی شہرت کے۔ کسی کو جائداد کی فکر ہوتی ہے تو کوئی رتبہ کے حصول کا طالب ہوتا ہے۔ صاحبانِ فکر و نظر کے پاس ایسے تمام افراد عام انسانوں کی تعریف میں آتے ہیں۔ انہیں یہ دنیائے دانش کوئی مرتبہ دیتی ہے نہ ان کی یاد ذہنوں میں مستقل حیات پاتی ہے۔ امر تو وہ افراد ہوتے ہیں جن کی کشمکش کا مرکز خود اپنی ذات نہیں ہوتی وہ دوسروں کو نوازتے، سنوارتے اور نکھارتے ہیں۔ دوسروں کی کامیابیوں پر خوش ہوتے اور ان کی کامیابیوں کا تذکرہ کرتے ہیں [illegible] ہیں جن کی ذات ایک اکائی نہیں بلکہ ایک انجمن ہوتی ہے۔

محترم بشیر وارثی ہمارے درمیان ایک ایسے ہی فرد کا نام تھا۔ بشیر وارثی کی زندگی کا احاطہ [illegible] تو مشکل ضرور ہے۔ وہ شاعر بھی تھے اور صحافی بھی۔ آرٹسٹ بھی تھے اور ایڈیٹر بھی۔ کئی انجمنوں کے سرپرست بھی تھے اور اردو ادب کے ایک خدمت گذار بھی۔ انہوں نے [illegible] کو نوازا اور دل کھول کر نوازا۔ شعر کے مشاعروں [illegible] اپنی راتوں کو صبح سے ملایا۔ صدارت کی۔ داد [illegible] داد لی۔ لیکن شعر کی دنیا اور اُس کی تہذیب [illegible] کے حسن مزاج پر کم ہی اثر کیا۔ جو انہیں [illegible] کی دین تھی۔ آرٹسٹ وہ پیشہ کے اعتبار سے تھے۔ ایڈیٹر اردو کی خدمت کے شوق نے بنا دیا تھا۔ "ذوقِ نظر" کو دنیائے ادب کی خدمت میں پیش کیا۔ ایک بار جب چھپ گیا تو پھر اسے بند کرنا انہیں منظور نہ ہوا۔ [illegible] اور نقصان کی انہیں کوئی فکر نہ تھی۔ [illegible] انہوں نے پرچہ نفع کمانے کی لالچ میں کب نکالا تھا۔ وہ اردو کو ایک صحت مند پرچہ دینا چاہتے تھے اور "ذوقِ نظر" اس مقصد کو پورا کر رہا تھا۔ دنیائے ادب کو سنوارنے اور نکھارنے کے اس ولولے نے بشیر وارثی کو کئی انجمنوں کی سرپرستی کرنے کا موقع فراہم کیا۔ وہ حیدرآباد کی جانے کتنی انجمنوں کے سب کچھ تھے۔ مشاعرے کے دعوت ناموں

لے کر شعرا کی شرکت تک اور مشاعرے کی ابتدا سے اس کے اختتام تک سب کچھ بشیر وارثی بڑی خندہ پیشانی سے اپنے ذمہ لے لیتے پھر یہ دن ہوتا کہ مشاعرہ کسی اور کا ہوتا لیکن مصروف بشیر وارثی ہوتے۔ بات یہیں تک ہوتی تو خیر تھا لیکن ان کا شعرا سے رشتہ صرف اور صرف مشاعروں کا رہین منت نہ تھا۔ وہ شعر کے علاوہ بھی منتقلی سے کام لیتے تھے کسی کی تقاضے کو جانتے ہیں کسی کو کچھ دیا تو احسان جتانے کے نام نہیں لاتی کہ تقاضے اسی لئے سننے والے کے ماتھے پر شکن نہیں آئی ورنہ شاعری انا کا ئنات کا سب سے مہلک ہتھیار ہے۔ اسے ٹھیس لگے تو کائنات میں انقلاب آ جاتا ہے۔

بشیر وارثی دنیا سے چلے گئے۔ میں مر گئے نہیں لکھوں گا۔ لکھ بھی نہیں سکتا۔ اس لئے کہ ایسے فرد کو موت نہیں آتی وہ یادوں میں زندہ رہتا اور دوستوں کی زبانوں سے بولتا ہے۔ لیکن یہ جانتے اور مانتے ہوئے بھی ایک کسک بہر حال دل میں ہوتی ہے۔ ایک دھچکا سا لگتا ہے کہ کل تک جو شخص تو ایسا تھا جسے اپنا کہا جا سکتا تھا آج وہ نہیں رہا۔ بشیر وارثی نے زندگی کا راستہ معلوم بدلا کر لمحوں میں سال مہینوں میں بدل گیا خبر ملی تو یقین نہ آیا۔ لیکن یہ سوچ کر دل کو تسلی دی کہ درویش صفت ملنگ ہی ہوتے ہیں۔

اللہ انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

غزل

بشیر وارثی

ہر قدم پر گناہ کی ترغیب
ہے نئے دور کی نئی تہذیب
آج کل زعمِ خودنمائی میں!
کر رہے ہیں اپنا خود تکذیب
اب وہ رسمِ ادب کہاں باقی
ایک امرِ محال ہے تادیب
رہنما بھی رہبری کا دے کے فریب
سوچتے ہیں نئی نئی ترکیب
ذوقِ تعمیر کے پس پردہ!
کار فرما ہے خواہشِ تخریب
فضل کیجئے کہ وصل کے لئے ایسے
دور رہ کر بھی ہیں وہ دل کے قریب
خون آلود ہر جگہ ہے زمیں
پرچمِ امن ہو کہاں تنصیب
اپنے دل میں انہیں چھپا لیں گے
ان کے پانے کی ہے یہی ترکیب

یادِ عہدِ شباب آج بشیر!
کیا قصیدہ کی ہے کوئی تشبیب

حضرت بشیرؔ وارثی

نعتِ شریف

دستِ خدائے پاک کے شہکار آپؐ ہیں — واللہ کل خدائی کے مختار آپؐ ہیں

سردار انبیاء بھی ہیں، خیر الانام بھی — محشر میں عاصیوں کے طرفدار آپؐ ہیں

جی بھر کے حق کو عرش پہ دیکھا ہے آپؐ نے — کون و مکاں میں صاحبِ دیدار آپؐ ہیں

محبوبِ رب، محبِّ خدا، علّتِ کائنات — ظاہر ہے سب پہ کاشفِ اسرار آپؐ ہیں

ختم الرسل ہیں، رحمتِ پروردگار ہیں — ظلِّ خدا ہیں، حق کے پرستار آپؐ ہیں

بخشا ہے خاطیوں کو، دعا ظالموں کو دی — ایسے کریمؐ، صاحبِ کردار آپؐ ہیں

کس کے نصیب میں ہے خدا کا درودِ پاک — حق ہے درودِ پاک کے حقدار آپؐ ہیں

بے اذن کر سکا نہ فرشتہ بھی روح قبض — حکمِ خدا سے زیست کے مختار آپؐ ہیں

ایسے بشیرؔ انفس و آفاق میں کہاں
سچ پوچھئے تو سیدِ ابرار آپؐ ہیں!

خواجہ قطب الدین صابر گلشنی
تحصیل ... ضلع ... آباد

بساطِ غم

ہر جان فسردہ خاطر و ہر دل ملول ہے !
پژمردہ باغِ زیست کا کیوں پھول پھول ہے
کیوں اس قدر اُداس ہے ماحول آج کا
احساسِ دردِ عام ہے، مغموم ہے فضا
کیا بات ہے، کہیں کوئی صدمہ نیا ہوا؟
معمورۂ جہاں میں کوئی حادثہ ہوا
شعر و سخن کی انجمنیں بھی خموش ہیں !
گویا شکستہ حال ہیں اور غم بدوش ہیں
احباب ڈھونڈتے ہیں کسے، کون گم ہوا
کس کے فراق میں ہے زمانہ بجھا بجھا
مایوسیوں کے کیسے یہ بادل ہیں چار سو
بے چین زندگی ہے، پریشاں ہے آرزو
اہلِ نظر کے سامنے منظر ہے دلستاں
نامہربان کس لئے آخر ہے آسماں
معلوم یہ ہوا کہ کوئی دوست چل بسا
دنیا سے انتقالِ بشیر و فا ہوا

صابر ! انھیں ہماری عقیدت کا ہے سلام

جو محترم مقام تھے اور سب میں نیک نام

مرزا حبیب علی حبیب

قطعہ تعزیت

انتقال پُر ملال حضرت بشیر الدین المتخلص
بشیر وارثی، مرحوم و مغفور

دوامًا زندگی کس کو یہاں ہے
یہ دنیا دارِ فانی بے گماں ہے
بشیر وارثی کا اب عدم کو
روانہ زندگی کا کارواں ہے
قضا آئی ہے کیا بے وقت ان کی !
بہت ہی دُکھ بھری داستاں ہے
بڑا جانکاہ ہے یہ غم عزیزو !
ہر اک باچشمِ نم، گریہ کناں ہے
جو مرجائے محمدؐ کی وِلا میں
اُسے حاصل حیاتِ جاوداں ہے
حضورِ خالقِ کون و مکاں اب
بشیر وارثی جنت مکاں ہے
حبیب ! اب اشک برسانے سے حاصل
دُعائے مغفرت کا یہ سماں ہے

= ٭ =

"پیکرِ خلوص و محبت"

از: مسز اطہر فاروقی
گلبرگہ شریف (کرناٹک)

مکرمی و محترمی!

سلام مسنون!

آپ کا عنایت نامہ موصول ہوا۔ میں خود بھی سوچ رہی تھی کہ جناب بشیر وارثی صاحب مرحوم کی انسانیت نوازی اور ادب شناسی پر چند سطور لکھنے کی سعادت حاصل کروں لیکن خود میں اتنی ہمت نہیں پا رہی تھی تاکہ اردو داں طبقہ بھی اس "پیکرِ خلوص و محبت" سے کچھ اور واقف ہو جائے کہ دنیا میں چند ایسی شخصیتیں بھی جنم لیتی ہیں جو اپنے نیک اعمال کا اجر دنیا والوں سے نہیں بلکہ اپنے "خالقِ حقیقی" سے لینے کی خواہاں ہوتی ہیں۔ بلکہ ملاحظہ فرمایئے بشیر صاحب کی زبانی۔

ع "مجھ کو لینا ہے حیاتِ جاوداں سبحان سے"

اور

بمصداق "نیکی کر دریا میں ڈال" کے اصول پر کاربند رہتے ہیں۔ سب سے پہلے تو میں یہ بات واضح کر دوں کہ اپنے ان منتشر خیالات میں مرحوم سے صرف چند ملاقاتوں کے دوران جو تاثرات میرے ذہن میں مرتب ہوئے۔ انہیں قلمبند کرنے کی ایک ادنیٰ سی سعی کی ہے۔ جناب بشیر وارثی صاحب کیا تھے "خلوص و محبت" کا ایک پیکر تھے ایثار و قربانی کی ایک زندہ مثال اور ان سب سے بڑھ کر وہ ایک سچے عاشقِ نبی تھے۔ ان سے ملنے کے بعد بس یہی ایک بات سمجھ میں آئی تھی کہ جنون کی حد تک وہ "سرکارِ دو عالم" کے والہ و شیدا تھے۔ اور بس یہی ایک تمنا ان کے سر میں سمائی ہوئی تھی کہ ؎

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اُجالا کر دے
اقبال

سرزمینِ حیدرآباد کو اس بات کا بجا طور پر فخر حاصل ہے کہ وہ نہ صرف اپنی سیاسی، معاشی، تاریخی اور ثقافتی حیثیت سے مشہورِ زمانہ رہا ہے بلکہ علمی و ادبی حیثیت سے بھی افضل و برتر رہا ہے۔ جہاں ایسی بے شمار ہستیاں وجود میں آئیں جو کیتائے روزگار رہتیں۔ بفضلِ تعالیٰ آج بھی وہاں چند علمی و ادبی شخصیتیں موجود ہیں۔ جنہوں نے نئے اور پرانے تقاضوں، پرانی قدروں اور پرانی روایات کو قائم رکھنے کا گویا بیڑا اٹھایا ہے۔ ورنہ آج کے مادہ پرستی اور خود غرضی کے دور میں تو یہ تمام باتیں عنقا ہو گئیں۔

اپنے تحقیقی کام کے سلسلہ میں مجھے حیدرآباد جانا پڑا۔ اپنے قابل و فاضل گائیڈ جناب ڈاکٹر محمد عبد الرزاق فاروقی صاحب کی ایما پر میں نے نہ صرف وہاں کے سرکاری اور غیر سرکاری کتب خانوں سے استفادہ کیا۔ بلکہ ساتھ ہی ساتھ وہاں کی مشہور و معروف ہستیوں سے بھی ملاقات کی سعادت حاصل کی۔ جو نہ صرف زبانِ اردو کے عالم و فاضل ہیں بلکہ سرتاپا خلوص و محبت اور اعلیٰ ظرفی کے پیکر بھی ہیں اور یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ یہ علمی و ادبی شخصیتیں نہ صرف آصفی دور کا "ورثہ" ہیں بلکہ از خود ایک "جامعہ" ہیں میں ہماری [illegible]

شاعر جن کا "فی الحال" میں صرف حضرت بشیر وارثی کے بارے میں اپنے کچھ تاثرات پیش کرنا چاہتی ہوں جنہوں نے پچھلے مہینے میں اسی دنیائے فانی کو خیر باد کہا اور ایک بار پھر دنیا کو اپنا خاموش زبان سے درسِ عبرت دے گئے۔"

ط "ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو"

استادِ محترم جناب ڈاکٹر فاروقی صاحب کی یہ اعلیٰ ظرفی اور دیانت داری کا ثبوت ہے کہ انہوں نے اپنے سے ہٹ کر دوسری بھی علمی و ادبی شخصیتوں سے ملاقات کرنے اور ان سے اپنے "عنوان" کے بارے میں تبادلۂ خیال کرنے اور مفید مطلب باتوں کو اخذ کرنے کی اجازت فرمائی۔

حضرت معز الدین ملتانی صاحب مرحوم کی شفیق رہنمائی سے محرومی کا رنج ابھی دھندلانے نہ پایا کہ کہ جناب بشیر وارثی صاحب نے بھی داعیِ اجل کو لبیک کہا اور نہ صرف سرزمینِ حیدرآباد حیدرآباد بلکہ زبان اُردو اور اُردو کے چاہنے والے ایک اور گوہر نایاب سے محروم ہو گئے۔ جناب بشیر وارثی صاحب کو "مرحوم" لکھتے ہوئے آنکھیں خود بخود "پُر آب" ہوئی جا رہی ہیں۔

مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے یہ کل ہی کی بات ہو۔ لیکن آج سے تقریباً دو سال قبل جامعہ عثمانیہ کے کتب خانے سے استفادہ کے دوران اچانک میری نظر وہاں رکھے ہوئے ایک رسالہ "ذوقِ نظر" پر پڑی۔ وہ رسالہ کیا تھا نعتوں کا ایک حسین گلدستہ تھا اور میرا کام بھی چونکہ نعتوں ہی سے متعلق ہے۔ لہٰذا اس کا پورا رسالہ پڑھا اور جستجو ہوئی کہ "ذوقِ نظر" کے مدیرِ اعلیٰ سے ملوں، بہت ممکن ہے کہ وہ نعتوں کے "COLLECTION" کے سلسلہ میں میری کچھ اور رہنمائی فرمائیں۔ لہٰذا دوسرے ہی دن میں دفتر پر پہنچ گئی۔ میں نے دیکھا کہ بالکل سفید کپڑوں میں ملبوس ایک نہایت شفیق و باوقار شخصیت اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ محوِ گفتگو ہے۔ سلسلۂ کلام منقطع کر کے انہوں نے میری جانب توجہ فرمائی۔ میں نے ان سے بعد سلام و تسلیم اپنے آنے کا مدعا بیان کیا اور کچھ علمی اعانت کی مؤدبانہ گزارش بھی کر دی۔ تب مرحوم و مغفور نے نہایت خندہ پیشانی سے اور نہایت ہی شفقت کے ساتھ میری مدد فرمائی۔ وہ نایاب کتب عنایت فرمائیں جو ہمیں بڑے بڑے کتب خانوں میں بھی ڈھونڈنے سے نہ ملی تھیں۔ خداوند کریم کا لاکھ لاکھ شکر و احسان ہے کہ میرا تحقیقی کام مرحوم ہی کی زندگی میں پایۂ تکمیل کو پہنچا اور انہیں کی زیرِ نگرانی ٹائپ بھی ہوا۔

میں اپنے اس محسن و کرم فرما کے بارے میں کیا لکھوں؟ مرحوم سے میری بس صرف چند ہی ملاقاتیں ہوئیں۔ انہیں ملاقاتوں کے دوران جو باتیں میرے علم میں آئی ہیں وہی سپردِ قلم کرنے پر مجبور ہوں۔

جناب بشیر وارثی صاحب ایک سچے عاشقِ رسول تھے۔ بس سرکار کے نام پاک پر فدا و قربان تھے۔ اسی جذبۂ قربانی سے مجبور ہو کر شاید انہوں نے ایک اور احسان ہم پر یہ فرمایا کہ ان کتب کو بلا کسی معاوضہ کے ہمارے حوالے کر دیا میں نے لاکھ کوشش کی کہ ان کو خرید لوں لیکن انہوں نے ہرگز ہرگز قبول نہ کیا۔ مجبوراً مجھے بعد تکمیل کام کتابوں کی واپسی کا وعدہ کرنا پڑا۔ مندرجہ شعر سے میرے مندرجہ بالا خیال کی حرف بہ حرف تصدیق ہوتی ہے۔

ساتھ لے کے جائیں گے ہم بشیر دنیا سے
عمر بھر کا سرمایہ حُبِّ مصطفیٰ دل میں

ایسا لگتا ہے جیسے جناب بشیر وارثی صاحب ایک قلندر صفت آدمی تھے۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر وہ "یادِ رسول" کو ہمیشہ سینے سے لگائے رہے۔ تبھی تو ہم ان کو شاعری میں جگہ جگہ یہی باتیں دیکھتے ہیں۔

نبیؐ کے نام پہ جینا آپؐ کے نام پہ مرنا
کرلیا ہے ہم نے توبس یہ فیصلہ دل میں

ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔

نبیؐ کی یاد ہے اے دوست پروانہ شفاعت کا
ادب کے ساتھ اسے رکھنا یہ کام آئے گا محشر میں

چنانچہ ہر ایسی محفل میں آپ بلا تکلف تشریف لے جانا باعث خیر و برکت سمجھتے جہاں " آقائے دو عالمؐ " کا ذکر خیر ہوتا۔ چنانچہ ایسے ہی ایک " نعتیہ مشاعرے " کے موقع پر وہ گلبرگہ تشریف لائے۔ تب مرحوم نے ہمارے غریب خانہ کو بھی رونق بخشی تھی اور فرمایا تھا۔

" اب گلبرگہ شریف میں میرے آنے کے لئے دو گھر ہو گئے۔ پہلے صرف بھائی عبدالرحیم آرزو صاحب (ایڈوکیٹ) کا تھا اور اب دوسرا گھر بہن کا (یعنی راقم الحروف کا)" اسی دوران آپ نے اپنی تعلیم و ملازمت کا بھی ذکر فرمایا تھا کہ وہ فوج میں ملازم تھے۔ " اپنی تعلیم و تربیت کے بارے میں حضرت سعدیؒ کی یہ حکایت سنائی تھی۔

گلی خوشبوئی در حمام روزی
رسید از دستِ محبوبی بدستم
بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری
کہ از بوئے دلاویز تو مستم
بگفتا من گِلی ناچیز بودم
ولیکن مدتی با گل نشستم!
جمالِ ہمنشیں در من اثر کرد
وگرنہ من ہمان خاکم کہ ہستم

بالفاظ دیگر انہوں نے کسی کالج یا یونیورسٹی سے کوئی بڑی ڈگری نہیں لی تھی۔ یہ صرف عالم فاضل شعراء و ادبا کی صحبتوں کا فیض تھا۔ شاید ایسے ہی کسی موقع پر ڈاکٹر فاروقی صاحب نے فرمایا تھا۔

" یہ ایسی عالم و فاضل " ہستیاں ہیں جن کی علمی لیاقت اور قابلیت پر بڑی بڑی ڈگریاں قربان ہیں۔"

صحیح معنوں میں وہ ایک " نعت گو" شاعر تھے۔ ذوقِ نظر کے صفحات اس بات کے شاہد ہیں۔

قطعۂ تاریخ لکھنے میں کمال حاصل تھا۔"

قطعۂ تاریخ رحلت جناب نذیر احمد خاں ایڈوکیٹ

قطعہ

پاکیزگی نفس کی جو تھی سرشت میں
نیکی کا بیج بو گیا ہے دنیا کی کشت میں
سنتا ہوں گوشِ دل سے یہی ہاتف کی صدا
اے اہلِ دین ہیں نذیر احمد بہشت میں

حال میں جامعہ گلبرگہ کے مجلہ " فکرِ نو " کے موقع پر یوں رقم فرمایا ہے۔

خوب ہے تاریخ اجراء کی بشیر
ماشاءاللہ خوب تر ہے فکرِ نو
۱۹۸۷

غزل میں بھی آپ کافی مہارت رکھتے تھے۔ لیکن ذوقِ نظر تو صرف "نعت گوئی" اور "منقبت" کا پتہ دیتے ہیں۔ ذیل میں " غزل کے چند اشعار بطور نمونہ پیش ہیں۔

مثلِ شفق حیا سے ہوا روئے یار سرخ
رخسار آج اس کے ہیں جیسے انار سرخ
اس سال آئی ہے عجب انداز سے بہار
گلشن کا پتہ پتہ ہے مثلِ چنار سرخ
الزام قتل کا نہ کسی پر لگا سکے!
آئی کہاں سے آپ کے دامن پہ دھار سرخ
شبیرؑ کے لہو نے کیا سرخرو بشیر
اسلام کی قبا کا ہوا تار تار سرخ

ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے جناب بشیر وارثی صاحب مرحوم سرسید، حالی اور اقبال کے "مشن" کو آگے بڑھاتا

تھے۔ ان کا یہی نظریہ ان کو چین سے بیٹھنے نہ دیتا
یہی ان کا عین مقصد زندگی بن کر رہ گیا تھا۔ جیسا کہ
ذوقِ نظر" کے صفحات کہتے ہیں۔

"مغربی دنیا نے اخلاقی اور روحانی اقدار کو مالی
یابی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا ہے۔

ہمیں اپنے اسلاف کی علمی و اخلاقی دولت
ان کو سامنے رکھ کر قدم آگے بڑھانا ہے۔ لہٰذا ہمارے
ب و دانش کی ذمہ داریاں اور بڑھ گئی۔ انہیں صرف
اتی تعلیم پر اکتفا نہیں کرتا ہے۔ بلکہ اپنی ذات و
ت میں عملی نمونہ پیش کرتا ہے۔ اگر آج ارباب
چوک گئے اور انہوں نے اپنا فرضِ منصبی پورا نہیں
آئندہ نسل بلکہ آئندہ کے مورخین بھی
معاف نہیں کریں گے۔ اور جو چیز تاریخ کے صفحات
ج ہو جاتی ہے۔ اسے قیامت تک کوئی نہیں مٹا سکتا"

جذبۂ قومی کے تحت انہوں نے رسالہ "ذوقِ نظر"
جس میں حیدرآباد کے انتہائی مشہور و معروف اور
علم و کمال ہستیاں اپنے اپنے علمی، ادبی اور شعری
مے بھیج کر مسلمانوں میں مذہبی، اخلاقی، سیاسی
ماجی بیداری پیدا کرنے کی ممکنہ سعی کر رہی ہیں
انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ جس ایمانداری اور
سے "ذوقِ نظر" کی ترقی اور بقاء کے لئے جدوجہد
رہے، اتنی ہی شدت سے اردو داں حضرات
لاپرواہی اور بے اعتنائی کا ثبوت دیتے رہے
تو ہے۔

وفا شعار صلیبوں کے مستحق ٹھہرے
یہی یہاں کا چلن ہے کئی زمانوں سے

رسالہ "ذوقِ نظر" میں ادارہ یہ شکوہ بے جا نہیں
ذوقِ نظر اہلِ اردو کی بے ... مسلسل شکار رہا
اس رسالے کے ارباب اقتدار کی ہی ہمت

مردانہ ہے۔ جو مسلسل خسارے کے باوجود اس چراغ
کو روشن رکھے ہوئے ہیں۔ ورنہ دو تین شماروں
کے بعد "ذوقِ نظر" کا بند ہو جانا عین ممکن تھا۔ پابندی
سے مسلسل تیرہ شماروں کا اشاعت پذیر ہونا کوئی
مذاق نہ تھا۔ مگر ارباب اردو سے اتنی بھی سرپرستی بھی
حاصل نہ ہوئی کہ "ذوقِ نظر" کی لاگت ہی نکل آتی۔ حالانکہ
یہ رسالہ تقریباً ڈیڑھ تا دو ہزار کی تعداد میں چھپتا ہے"۔

ایسا لگتا ہے مرحوم نے بھی اس بے حسی اور
بے اعتنائی کے خلاف فولادی عزم و استقلال کے
ساتھ اپنے دل میں یہ بات ٹھان رکھی تھی کہ سے

نشیمن بنانے کی ٹھانی ہے ہم نے
فلک حوصلہ ہو تو بجلی گرانا ! (نیاز)

سچ یہ ہے کہ جناب مرحوم گویا علامہ اقبال کی اس
دعا کا اثر دیکھنے کے دل سے خواہاں تھے۔

جوانوں کو مری آہِ سحر دے
پھر ان شاہین بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کر دے

ماہنامہ "ذوقِ نظر" ان کے لئے ایک قاصد تھا، ایک وسیلہ تھا ایک ذریعہ تھا۔ اپنی قوم تک اپنا پیغام پہنچانے کا "ذوقِ نظر" ان کی زندگی کا ایک "جزو لازم" بن کر رہ گیا تھا۔ ملاحظہ فرمائیے "ذوقِ نظر" جنوری ۱۹۸۶ء

" الٰہی ! تیری غیبی تائید سے "ذوقِ نظر" اپنی اشاعت کے تیسرے سال میں داخل ہو چکا ہے اب تیرے لطفِ بیکراں کے بھروسہ پر تیسرے سال کا آغاز ہو رہا ہے بس آئیے میرے کارساز! میرے مولائے بندہ نواز ! "ذوقِ نظر" کو اس سال کی بھی تکمیل کرنے کی سہولت عطا فرما اور اس رسالے کو جاری رکھنے کے لئے عمر، صحت و فراغ حالی کے ساتھ وہ عزم دے جو کبھی متزلزل نہ ہو"

وہ ہمت دے جو پست ہونے پائے، وہ دستِ قوت دے جو کوتاہ ہونے کا نام نہ لے غرض ہر وہ چیز دے جو اس مہم کے سرانجام دینے میں میرے لئے ممد و معاون ہو۔ اے دعاؤں کے سننے والے مولا! بوسیلہ محمد مصطفےٰؐ میری دعا کو قبول فرما۔ "آمین"۔

آخر میں میں رسالہ "ذوقِ نظر" سے وابستہ تمام اربابِ اقتدار اور قارئینِ "ذوقِ نظر" سے گذارش کرتی ہوں کہ "مرحوم" کے اس "عزم و استقلال" کو پیشِ نظر ہوئے "ذوقِ نظر" کو قائم و دائم" رکھنے میں حتی المقدور سعی فرمایئے۔ بشیر وارثی مرحوم و مغفور کی خدمت میں یہی ہمارا سچا اور پُر خلوص نذرانۂ عقیدت ہوگا اس میں شک نہیں کہ اس کام کو جاری رکھنا "جوئے شیر" لانے سے کم نہیں ہے۔ ؎

ہر اک مقام سے آگے گزر گیا مہِ نو
مقام کس کو میسّر ہوا ہے بے تگ و دَو

بارگاہِ خداوندی میں دست بدعا ہوں کہ وہ جناب بشیر وارثی کو اپنے فضل و کرم سے جنّت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور بے شمار رحمتوں سے نوازے اور آپ کے افرادِ خاندان کو اس صدمۂ جانکاہ کے برداشت کرنے کی طاقت اور ہمت عطا فرمائے۔ "آمین"

موت اُس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس
یوں تو آئے ہیں یہاں پر سبھی مرنے کے لئے

★

آہ بندۂ خاص بشیر وارثی

۱۹۸۷ء

تاریخِ وفات مرحوم

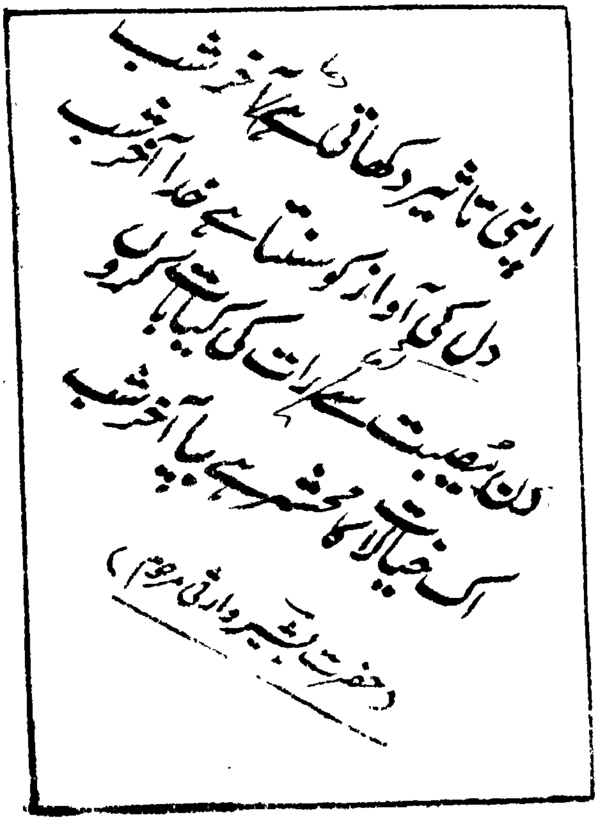
۱۹۸۷ء

صاف گو، نیک، حلیم، باکردار
شخصیت ایسی کہ اعتبارِ علم
کہدے تاریخ مرگِ وارثی!!
شاعرِ خوش بیاں وقارِ علم

۱۹۸۷ء

● از نکتہ سنج ڈاکٹر عقیل ہاشمی

۱۹۸۷ء



ساغر مظہری
بی۔کام، ایل ایل بی

یادِ بشیر

کیا خوب آدمی تھے جنابِ بشیر بھائی
ہم دیکھتے ہی رہ گئے، رخصت وہ ہو گئے
شعر و سخن کی محفلیں آباد ان سے تھیں
شاعر ہوں یا عوام روابط سبھی سے تھے
ہر کام سے لگاؤ بھی سب پہ کرم بھی تھا
سادہ مزاج رکھتے تھے اور پُر خلوص تھے
وابستگی تھی وارث علی شاہ سے بڑی
"ذوقِ نظر" کے بانی تھے انسان دوست تھے
فطرت کرم نوازی کی پائی تھی آپ نے
شیدائی اولیاء کے تھے حاصل تھا فیض بھی
بااعتماد سب کے تھے اور سب سے پریم تھا

اِک مرکزِ خودی تھے جنابِ بشیر بھائی
مقبول آدمی تھے جنابِ بشیر بھائی
ذہنوں کی روشنی تھے جنابِ بشیر بھائی
شایانِ دلکشی تھے جنابِ بشیر بھائی
غمخوار آدمی تھے جنابِ بشیر بھائی
تسکینِ زندگی تھے جنابِ بشیر بھائی
نسبت سے وارثی تھے جنابِ بشیر بھائی
تفسیرِ بندگی تھے جنابِ بشیر بھائی
تصویرِ سادگی تھے جنابِ بشیر بھائی
پیغامِ آگہی تھے جنابِ بشیر بھائی
ہر دل کی اک خوشی تھے جنابِ بشیر بھائی

تھا دوستوں کا آپ کے حلقہ وسیع تر
ساغر وہ روشنی تھے جنابِ بشیر بھائی

آہ! بشیر بھائی

آر۔ بانو
محمدی لائن، سکوڈر لانسرز
حیدرآباد

عزیزی محمد ظہیر وارثی۔
السّلام علیکم!
آپ کا خط ملا۔ شکریہ
بشیر وارثی نمبر ذوقِ نظر کے لئے پرخلوص نذرانۂ عقیدت ارسال کر رہی ہوں۔
کیا خبر تھی کہ آج ہم کو یہ دن دیکھنے پڑیں گے۔ خیر مرضی مولیٰ۔ از ہمہ اولیٰ۔ اِنَّ اللہَ مَعَ الصّابِرِین ـــ خدا حافظ۔
مخلص۔
آر۔ بانو

جان کر منجملۂ خاصانِ میخانہ مجھے ؛؛ مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے (جگرؔ)

قانونِ قدرت کے تحت یوں تو دن رات دنیا میں ہزاروں آدمی پیدا ہوتے اور اپنی میعاد مقررہ پوری کر کے دارِ فانی سے چل بستے ہیں۔ کوئی پوچھتا نہیں کہ کون آیا کون گیا۔ "چل چلاؤ" اور رواروی کی یہ گرم بازاری قیامت تک جاری رہتی ہے۔ مگر گرمیٔ بزم میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ بقول مجازؔ ؎

یہ رنگ بہارِ عالم ہے کیا فکر ہے تجھ کو اے ساقی ؛؛ محفل تو تری سونی نہ ہوئی کچھ اٹھ بھی گئے کچھ آ بھی گئے

مگر اٹھنے والوں میں کچھ ایسی مقتدر ہستیاں بھی ہوتی ہیں جو محفل سے اپنے نہ مٹنے والے نقوش جما کر اٹھتی ہیں۔ اور اہلِ محفل کے دلوں میں گھر بنا کر ـــ ان ہی میں سے ایک برگزیدہ اور فارغ زمانہ ہستی بشیر وارثی صاحب کی تھی۔ آدمی کی قدر و منزلت مال و زر سے نہیں بلکہ اعمالِ حسنہ سے ہوتی ہے۔ ؎

قاروں ہلاک شد کہ چہل خانہ گنج داشت
نوشیرواں نہ مُرد کہ نامِ نکو گذاشت

بشیر صاحب کی خوش خلقی دوستی اور فطری جذبۂ ہمدردی نے انہیں مقبولِ خلائق بنا دیا تھا۔ وہ نہایت خاموشی اور انہماک کے ساتھ اردو ادب کی خدمت انجام دیتے رہے۔ وہ شہرت اور نام و نمود کے خواہاں نہ تھے کام کی لگن اور ذوقِ فطری نے آخر دم تک انہیں آرام نہ لینے دیا۔ اپنے نصب العین سے ایک لمحہ بھی غافل نہ رہے۔ مصروفیت بھی بہت بڑی نیکی ہے۔ لارڈ میکالے نے کہا تھا:

"مروں تو کتب خانہ میں مروں، مروں تو یار کے کوچہ میں مروں"۔

زندگی کی آخری رات بھی بشیر بھائی اپنے آفس میں

۸–۹ بجے تک کام کرتے رہے۔ آج کل احساس ذمہ داری سے ہر شخص عاری ہے۔ مگر اردو زبان و ادب کا یہ سچا پرستار، بے لوث خدمت گذار، ستائش کی تمنا اور صلہ کی پروا کئے بغیر دن رات گیسوئے اردو کے سلجھانے میں لگا رہا۔ نہ اپنی صحت کا خیال کیا، نہ مالی خسارہ دامن گیر ہونے دیا۔ اردو ادب کے فروغ میں اپنا رول ادا کرتا رہا۔ ۱۹ر جولائی کی اندوہناک صبح "منصف" کے تیسرے صفحہ پر دائیں جانب ایک غزل پر جب میں نے بشیر وارثی مرحوم لکھا دیکھا تو حیرانی ہوئی کہ ارے یہ کون! مگر ساتھ ہی تو ٹو پر نظر پڑی تو کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ آنسوؤں کی روانی اور دل کی دھڑکنوں پر قابو نہ رہا۔ آہ! کیسی سچی، مخلص، باوقار، وضعدار، مخلص ہستی ہم سے جدا ہو گئی!

غزل کا مطلع تھا:

اپنے اعمال سے ہم نور میں ڈھل سکتے ہیں
صحنِ فردوس میں آرام سے چل سکتے ہیں

واقعی اپنے اعمال صالحہ کی بدولت نور کے سانچے میں ڈھل کر وہ فردوس بریں سدھار گئے۔ اور "سانس لینے کے لئے مکان بدل دیا ہے۔" بقول اقبال "موت کو اختتام زندگی نہ سمجھنا چاہئیے۔ بلکہ ؎

ہے یہ شامِ زندگی صبحِ دوامِ زندگی

اور پھر ایسے صالحین کے لئے تو آخرت ایک دائمی آماجگاہ بن جاتی ہے۔ اَلْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْن۔

جناب وقار خلیل صاحب نے لکھا ہے کہ "بشیر صاحب انسان دوست، خدا رسیدہ اور اوصاف حمیدہ کے مظہر تھے۔ جس کسی سے صاحب سلامت رہی، تادم واپسیں عہد کو نبھایا۔"

مجاز، تعلی اس کا ذاتی طور پر تجربہ رہا ہے کیوں کہ برسوں سے موصوف کا تمام کلام اور ادبی خدمات سنتی اور دیکھتی چلی آ رہی ہیں۔ مگر ۸۵ء سے جب کہ ماہنامہ "ذوقِ نظر" کی اجرائی ہوئی موصوف سے میرا غائبانہ تعارف رہا۔ اپنی علالت کے سبب چند ماہ سے میں نے "ذوقِ نظر" کے لئے کچھ نہیں بھیجا۔ مگر یہ پرچہ ہر ماہ پابندی سے میرے نام آتا رہا۔ یہ ان کی خوش خلقی اور انسان دوستی کا بیّن ثبوت ہے۔

بشیر وارثی صاحب کی شاعری میں غزل، نظم، رباعی، حمد، نعت اور منقبت سبھی اصناف سخن شامل ہیں۔ مگر نعت اور منقبت سے جو ان کا قلبی لگاؤ تھا اور جو جذباتی کیفیت ان کی اس صنفِ سخن میں پائی جاتی ہے، معتقد نعت گو شعرا میں انہیں خاص مقام عطا کرتی ہے۔ نمونتہً موصوف کے چند نعتیہ اشعار پیش ہیں:–

مدینہ دور ہے ہم سے بشیر وارثی تو کیا
کہ دل میں تو محمد مصطفےٰ کی یاد پیہم ہے

انھوں نے نہ صرف اعمال صالحہ سے مزین ہو کر فردوس میں جگہ پائی ہے۔ بلکہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی عقیدت و محبت کا سرمایہ بھی ساتھ لے گئے ہیں ؎

ساتھ لے کے جائیں گے ہم بشیر دنیا سے
عمر بھر کا سرمایہ حبِّ مصطفےٰ دل میں

اقبال نے کہا تھا ؎

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

بشیر کہتے ہیں — یہ "نورِ مجرّد" کا اثر ہے جس نے "نگاہِ مومن" کو معتبری بخشی ہے ؎

دیکھئے نورِ مجرّد کا اثر چاروں طرف
معتبر نگاہِ مردِ مومن چاروں طرف

[illegible] ایسا نگہ فرماتے ہیں ؎

[illegible] شعر [illegible] کہا ہے محمد دل میں [illegible]
[illegible] قریں [illegible] کا تجربہ

حبیب نبوی کے ساتھ ساتھ وہ اولیائے کرام سے
بھی سچی عقیدت رکھتے تھے۔ اور أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ
لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ کی تفسیر
سے بخوبی واقف تھے ؎

وہ دینِ حق خدا سے جو لائے تھے شاہ دیںؐ
پہنچا ہے ساری خلق میں وہ اولیاؒ کے ہاتھ

حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کی تعریف میں فرماتے ہیں ؎

حق نما، حق پرست و حق نگر ہو کر بشیر
سرگروہِ مستعین ہیں خواجہ بندہ نوازؒ

ذکر و فکر بشیر صاحب کا وظیفہ شبانہ روز تھا۔
أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ ۔
ارشاد ہے ؎

شغل ہو ذکر کا ہر سانس پہ حاوی تیرا
ذکرِ حق لحظہ بلحظہ رہے جاری تیرا
دم نکل جائے اگر ذکرِ خدا میں تو سمجھ
شاملِ حال ہو افضلِ الٰہی تیرا !

بشیر صاحب کے تغزل میں بھی تصوف کا رنگ جھلکتا ہے ؎

گر نہ جاؤں نگاہِ دنیا سے
مجھ کو اپنی نظر میں رہنے دو

غالبؔ کے اس خیال سے ملتا جلتا ہے ؎

سب کے دل میں ہے جگہ تیری، جو تو راضی ہوا
مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائے گا

بشیر صاحب کی ادارت میں ماہنامہ "ذوقِ نظر" نے
کافی مقبولیت حاصل کر لی۔ یہ ادبی، شعری، دینی و مذہبی
معلومات والا ایک بلند معیار پرچہ ہے۔ جس کے کئی
خصوصی شمارے اتنی کم مدت میں شائع ہو چکے ہیں۔ جیسے
شافع محشرؐ نمبر، غوث الاعظمؒ نمبر، عید نمبر، اقبال نمبر
گوشہ محمد قلی قطب شاہ نمبر وغیرہ۔ اس کے علاوہ حضرت
وارث علی شاہؒ نمبر بھی شائع کر کے انہوں نے اپنے
مرشد کامل کا حق ارادت ادا کر دیا۔ بقول جناب عابد
قادری "ذوقِ نظر" کی یہ بصیرت افروز اور حیات آفریں
پیش کش حضرت وارث علی شاہؒ نمبر" اس کے تابناک
مستقبل کی ضمانت ثابت ہوگا۔"

واقعی اس متذکرہ شمارہ میں دینی و مذہبی معلومات
کی ایک دستاویز محفوظ ہے۔ جس میں پروفیسر ضیاء الدین
خان کاوشؔ نے "آئینہ وارثؒ" کے ذریعہ اپنی کاوش سے
دینی معلومات کا ایک انمول خزانہ نہایت دلچسپ انداز میں
پیش کیا ہے۔ کیا خبر تھی کہ آج ہمارے ہاتھوں بصد حزن و
ملال بشیر وارثی نمبر شائع کرنے کی نوبت آئے گی۔ آہ

تدبیر کند بندہ، تقدیر زند خندہ

خدائے برتر انہیں فردوس میں اعلیٰ درجات عطا فرمائے
اور ان کا یہ کام اور نام ہمیشہ زندہ رہے ؎

نامِ نیک رفتگاں ضائع مکن   تا بماند نامِ نیکت برقرار

جناب وقار خلیل صاحب کے مطابق نماز جنازہ کے بعد
جب آخری دیدار کرایا گیا تو محسوس ہوا کہ مسلسل اور انتھک کام
کے بعد تھک کر لیٹے ہیں، چہرہ پر سکون اور اعتماد کی لطیف
فضا، اپنا تاثر چھوڑتی ہوئی "

بے شک وہ "نفسِ مطمئنہ" اور قلبِ سلیم لے کر دنیا سے
رخصت ہوئے ہیں۔ ؎

موت آ گئی کہ دوست کا پیغام آ گیا :: دل کو سکون روح کو آرام آ گیا

نذرانہ عقیدت

جس دم عدم کی راہ لی حضرت بشیر نے
در ہائے خلد وا کئے ربِّ قدیر نے
رضوان نے سلام کیا اور یہ کہا
"رتبہ دیا ہے آپ کو خیرِ کثیر نے" !

آر۔ بانو

حضرت بشیر وارثی

غزل ذوقافیتین

فکر و فن، علم و ہنر کی خوبیاں سمجھا گئے
آپ بہتر زندگی کی جھلکیاں دکھلا گئے

دوست میرے، داستانِ عہدِ ماضی چھیڑ کر
کیا قیامت ہے، دبی چنگاریاں بھڑکا گئے

آج ہم فرطِ جنوں میں چاک کر کے پیرہن
کوچۂ جاناں میں اُس کی دھجیاں بکھرا گئے

کیا خبر تھی آستینوں میں بھی خنجر تھے چھپے
دوست دکھلا کر کرشمہ سازیاں تڑپا گئے

دوسروں کے حال پر ہم ہو رہے تھے خندہ زن
خرمنِ دل پر گریں جب بجلیاں گھبرا گئے

اپنی سوچوں سے نکلنا بھی بہت دشوار تھا
آپ کا احسان ہے جو خامیاں بتلا گئے

شوخیاں، اٹھکھیلیاں، رنگینیاں، نیرنگیاں
کر کے وہ ہر گام پر سرمستیاں بہلا گئے

کوئی مانے یا نہ مانے یہ حقیقت ہے بشیر!
زندگی کی ہم ہزاروں گتھیاں سلجھا گئے

حضرت بشیر وارثی مرحوم

غزل

دیارِ ظلم میں سوغاتِ چشمِ تر لے جا
یہی بچا ہے میرے پاس اک ہنر لے جا

انانیت نہیں تیرے خمیر کا جوہر
مٹا کے اپنی خودی آہِ پُر اثر لے جا

وفا شعار لگا ہوں کو روشنی دینے
مرا گداز، مرادِ دل، مری نظر لے جا

ہے تیرا ساتھ ہی ہے عشق معتبر اب تو
جدھر بھی چاہے مجھے میرے ہمسفر لے جا

ترا خیال ہی کافی ہے زندگی کے لئے
قسم ہے تجھ کو محبت کی، گھر کا گھر لے جا

جنوں کی حد سے پرے ہے یہ آخری سجدہ
سرِ نیاز جھکے گا کاٹ کر لے جا

بشیر اشکِ ندامت کو رائیگاں نہ سمجھ
ہے نذرِ عشق کے قابل یہی گہر لے جا

رئیس الاولیاء حضرت حسنؓ ہیں

شبیہِ مصطفیٰؐ حضرت حسنؓ ہیں　　　سراپا مرتضیٰؓ حضرت حسنؓ ہیں
سخاوت ان کی ہستی پر ہے نازاں　　　مثالِ فاطمہؓ حضرت حسنؓ ہیں
رہی ہے صلح جوئی اُن کی فطرت　　　پرستارِ وفا حضرت حسنؓ ہیں
خلافت چھوڑ کر دکھلا دیا ہے　　　رئیس الاولیاء حضرت حسنؓ ہیں
علیؓ کے جانشیں زہراؓ کے دلبر　　　ہر اک کا مُدّعا حضرت حسنؓ ہیں
حسن بصریؒ کو سکھلایا تصوف　　　امیرِ صوفیا حضرت حسنؓ ہیں
منور ہے جہاں آلِ عبا سے　　　زمانے کی ضیاء حضرت حسنؓ ہیں
غمِ دُنیا نہ ہم کو خوفِ عقبیٰ　　　ہمارا آسرا حضرت حسنؓ ہیں

بشیر وارثی قربان اُن پر
امام الاتقیاء حضرت حسنؓ ہیں

(حضرت بشیر وارثی مرحوم)

سلام

شبیرؑ کیا ہیں صرف پیمبرؐ سے پوچھیے
ہے حوصلہ تو خالقِ اکبر سے پوچھیے

ہاتِ خدا نبیرۂ سرورؐ سے پوچھیے
یا پھر جنابِ فاتحِ خیبرؓ سے پوچھیے

صبر و رضا کے آخری پیکر سے پوچھیے
حالِ سکینہؓ عابدِؑ مضطر سے پوچھیے

بنیاد لا الٰہ کی کیوں کر حسینؑ ہیں
ہندوستان کے خواجہ سنجرؒ سے پوچھیے

سجدے میں سر کٹا کے ہوئے کتنے سربلند
حق بات ہے یہ حق کے پیمبرؐ سے پوچھیے

آلِ نبیؐ تو مقصدِ ذبحِ عظیم ہے
یہ کیوں ہے کیا ہے داورِ محشر سے پوچھیے

مومن کا عشق، عشقِ الٰہی بشیر ہے
یہ راز آپ آلِ پیمبرؐ سے پوچھیے

(حضرت بشیر وارثی مرحوم)

وقار خلیل

بشیر وارثی کی یاد میں

۱۸ جولائی ۱۹۸۶ء کی اوّلین ساعتوں میں بزرگ شاعر، خود شناس اور خدا شناس دردمند انسان نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ کل شام ۸ بجے تک بشیر وارثی اپنے دفتر واقع چھتہ بازار میں مصروف کار رہے۔ سیل ٹیکس حسابات کے باب میں وہ بے حد مقبول اور مشہور آڈیٹر تھے۔ چار دہائی کے عرصہ ان کی مقبولیت روز روشن ایسی تھی۔ علمی، دینی اور قومی امور میں وارثی مرحوم اگلے وقتوں کے بزرگوں کی آخری نشانی ایسے تھے۔ تقریباً ۵۰ برسوں کی رفاقت رہی۔ اپنی وضع حیدرآبادی روایات اور شیروانی و رومی ٹوپی کی تہذیب حسن اخلاق اور شعری و ادبی نیز مذہبی معلومات کے لحاظ سے بشیر وارثی، انسان دوست، خدا رسیدہ اور اوصاف حمیدہ کا مظہر تھے۔ جس کسی سے صاحب سلامت رہی تادم واپسیں عمدگی سے نبھایا۔ برے وقتوں میں انہوں نے بہت سوں کی دستگیری کی۔ مگر اس طریق سے کہ اس ہاتھ دیا تو دوسرے ہاتھ کو خبر تک نہ ہوئی۔

آج مغرب سے پہلے سیکڑوں، بشیر شناسوں، شاعروں، مدیروں، تاجروں، مذہبی اور سماجی و تعلیمی اداروں کے سربراہوں نے انہیں مٹی دی۔ ہر آنکھ اشکبار اور ہر دل [illegible] خوان نظر آیا ۔۔۔

حضرت مراد شاہ دھوتیؒ کے قبرستان واقع مراد نگر میں بشیر صاحب کی تدفین عمل میں آئی۔ نماز جنازہ کے بعد جب آخری دیدار کرادیا گیا تو محسوس ہوا کہ مسلسل اور انتھک وہ ہمیشہ تھک کر لیٹے ہیں۔ چہرے پر سکون اور اعتماد کی لطیف فضا اپنا تاثر چھوڑتی ہوئی۔ سب سے چھوٹے بیٹے ضمیر وارثی کی اشکبار آنکھیں اپنے بابا کے ملنے والوں کو دیکھتے ہوئے [illegible] کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ بڑے صاحبزادے [illegible] اس صدمے کو کس طرح جھیلا ہوگا۔ وہ بھی مجسم شعر [illegible] شہر خموشاں میں اپنے بزرگ اور شفیق باپ کو مٹی دے رہے تھے۔ ہونٹ کانپ رہے تھے۔ عزیزوں نے سہارا دیا۔ شہر خموشاں میں ایک طرف شاعروں کا گروہ ان کی شعری صفتوں کا ذکر کر رہا ہے۔ تو دوسری طرف تاجروں کا ہجوم سیل ٹیکس کے مسائل پر ان کے تجربے اور انہماک کے گن گا رہا ہے۔ غرض بشیر وارثی مرحوم کی نیکیاں اور ان کا حسن سلوک ہر غمزدہ کو مدتوں یاد رہے گا۔

اب سے پہلے میں نے ہفتہ وار "پرواز شاہین" حیدرآباد کی اشاعت ۲۷ اگست ۱۹۸۳ء میں حیدرآباد کے شعرا کے سلسلہ مضامین کے تحت بشیر وارثی صاحب پر ایک نوٹ لکھا تھا۔ بشیر بھائی نے اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں بتایا تھا کہ ۵ ستمبر ۱۹۱۹ء کو میدک کے ایک قصبہ

میں پیدا ہوئے۔ والد اور دادا فوج میں جمعدار تھے اور انعامدار بھی۔ ابتدائی تعلیم و تربیت گولکنڈہ کے مدرسوں میں پائی۔ ادارہ ادبیات اردو کے امتحانات کی انہی دنوں تکمیل کی اور زندگی کے آخری سالوں میں ادارہ کی تقریب یوم محمد قلی قطب شاہ کے سالانہ مشاعرہ اور پبلک پروگرام کے وہ فعال کنوینر بھی رہے۔ درجنوں شاعروں کو سواری میں گنبد پہ لاتے۔ ان کی ضیافت کرتے اور مشاعرہ کو کامیاب بناتے ۱۹۳۷ء سے ۱۹۵۰ء تک محمد بشیر الدین وارثی افواجِ حکومت آصفیہ حیدرآباد سے منسلک رہے دوسری جنگ عظیم میں مڈل ایسٹ سیکٹر پر مصر، فلسطین اور قبرص اور بلادِ اسلامیہ میں نمایاں خدمات انجام دیکر برطانوی حکومت سے بہتر خدمات پر اعزاز حاصل کئے اردو شعر و ادب کے دیرینہ لگاؤ نے انہیں شاعر بنا دیا۔ حضرت حاجی سید وارث علی شاہؒ کے سلسلۂ وارثیہ سے بیعت کی تھی۔ اسی نسبت سے وارثی کہلانے لگے۔ جنوری ۱۹۸۵ء میں انہوں نے ستھرا علمی، ادبی اور مذہبی رسالہ ماہنامہ "ذوقِ نظر" شائع کرنا شروع کیا جو اب تک پابندی سے نکل رہا ہے۔ اپنے دیرینہ علمی ادبی ذوق کی تسکین کے لئے بشیر وارثی نے اس پرچہ کی باوجود کثیر خسارہ کے اشاعت جاری رکھی۔ "ذوقِ نظر" کے خصوصی شمارہ اپنے موضوعات کے اعتبار سے معلوماتی رہے ہیں۔ جن میں خاتم محشر نمبر، حاجی وارث علی شاہؒ نمبر، غوث اعظمؒ نمبر، عید نمبر ... اقبال نمبر کے علاوہ گوشۂ محمد قلی قطب شاہ دستاویزی اہمیت رکھتے ہیں۔ "ذوقِ نظر" کے معیار کو برقرار رکھنے میں ان کے دوستوں ڈاکٹر یعقوب عمر، جناب علی احمد جلیلی اور جناب خورشید بلندی کے ساتھ مشیر قانونی محمد شمیم ایڈوکیٹ اور ان کے صاحبزادے ظہیر وارثی اور مشہور شاعر جناب عابد قادری کے اشتراک و تعاون کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ وارثی صاحب کے فرزندوں اور احباب کو چاہیئے کہ وہ "ذوقِ نظر" کا مجوزہ بشیر وارثی نمبر ضرور شائع کریں۔

وہ شاعروں، ادیبوں، مصنفوں کے لئے ایک ادارہ اور اکیڈمی سے زیادہ فیض رساں اور مخلص رہے ہیں۔ مشاعرے کے اہتمام، دعوت ناموں کی طباعت سے لے کر مشاعروں کے مسودات کی ترتیب، اشاعت، اکیڈمیوں تک مطبوعات کو اپنے خرچ پر بھجوا کر انعامات دلوانے میں بشیر وارثی صاحب کی خدمات سے درجنوں اہل قلم اصحاب نے فائدہ اٹھایا ہے۔

وہ کسی گروہ بندی کے قائل نہ تھے۔ ان کے ملنے والے قلمکاروں میں قدیم طرز کے نامی گرامی شعراء اور نوجوان سخنور بھی نظر آتے ہیں۔ کسی کے کام آکر انہیں جو مسرت اور سکون حاصل ہوتا تھا اس کی گواہی بہت سے اصحاب دیں گے۔ بشیر بھائی سے تقریباً دس پندرہ برس کی ملاقاتیں یاد آتی ہیں۔ شعراء کے جھگھٹے میں ان کی مثالی خاطر تواضع کا ایک ایک باب ذہن کے کینوس پر نظر آتا ہے۔ اُن کی مشاعروں میں مقبولیت اور ان کے ستھرے سلیس اور کلاسیکی اشعار کی گونج کانوں میں گونج رہی ہے چھتہ بازار کی کمان سے ملحق ان کے دفتر کا ایک ایک منظر یادوں کو معطر کر رہا ہے۔ نعتیہ شاعری سے اُن کے غیر معمولی شغف مادۂ ہائے تاریخ نکالنے میں ان کی ریاضت غزلیہ شاعری سے ان کی دلبستگی بہت سوں کو مدتوں

تڑپائے گی۔

ع ایسی ہی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی

۱۹۸۶ء میں ریاستی اُردو اکیڈیمی نے اُن کے مجموعہ کلام "بصارت و بصیرت" کی اشاعت کے لئے گرانٹ منظور کر کے ان کی شعری خدمات کو تسلیم کیا۔ یہ مجموعہ آفسٹ کتابت سے آراستہ ہے اب ان کے فرزندوں کو اس کی اشاعت کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ بشیر وارثی کی شاعری کلاسیکی اقدار کی پاسدار ہی۔ حیدرآباد کی تہذیب اور شرافت کا جس طور وہ نمونہ رہے، اُن کے سخن میں بھی اس کی مہک اور روشنی اپنا تاثر چھوڑتی ہے۔ چند شعر جو یاد آرہے ہیں۔

صبر کر لیتے مصیبت میں مزہ آجاتا !
لوگ گھبرا کے عبث ہائے خدا کہتے ہیں
شکر کرنے کی ہر اک حال میں عادت ہے بشیر!
کب بُرے وقت کو ہم لوگ بُرا کہتے ہیں

گر نہ جاؤں نگاہِ دنیا سے
مجھ کو اپنی نظر میں رہنے دو
غم کا اظہار غم کی سبکی ہے
بات گھر کی ہے گھر میں رہنے دو

دیکھ کر دل درود پڑھتا ہے
مصحف بلا جواب ہے چہرہ
جن چراغوں میں خون جلتا ہے
کامیابی اُنہی کے سر ہے بشیر

نعتیہ شاعری کا اسلوب کس قدر خوب ہے ہے
یہ فیضِ آلِ رسولؐ و طفیل غوث پاک رضؓ
ملا ہے جینے کا اک ڈھب نبیؐ کے صدقے میں
بشیر وارثی محشر میں آپ دیکھیں گے
نجات پائیں گے ہم سب نبیؐ کے صدقے میں

بشیر وارثی مرحوم کی اچانک وفات شعری اور علمی نیز حیدرآبادی روایات کے تناظر میں المناک سانحہ ہے۔ ع خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں...

غلام دستگیر شیدا

سانحہ ارتحال

عجیب سماع تھا یہاں قلب پہ تیر چلا کر چلے
بشیر وارثی صاحب کو ساتھ لے کے چلے
محل میں بیٹیاں بیٹے عزیز روتے ہیں!
تم سب کو چھوڑ کے خاموش مسکرا کے چلے
جب آپ آئے تو دُنیا میں خود ہی رونے لگے
اب آپ چھوڑ کے دنیا کو مسکرا کے چلے
اذان بوقت ولادت نماز بعد وفات
بس اتنی زندگی دنیا کو دکھا کے چلے
عزیز دوست اقارب کئی شعرا بھی تھے ساتھ
لحد میں بس تمہیں تنہا یہ سب لِٹا کے چلے
چلے جب فاتحہ پڑھ کے کانوں میں آئی صدا
کیا آپ لوگ مجھے خاک میں ملا کے چلے
زمانہ ساتھ کسی کا دیا نہ دے گا کبھی !
سب اس طرح ہی زمانہ سے ہاتھ اُٹھا کے چلے
ہاں نعت گوئی میں اونچا مقام تھا اُن کا
ہم ان سے نعتیں سُنیں آج یہ خاموش ہو کے چلے
تھی ان میں قابلیت پرچہ نکالے ذوقِ نظر
یہ پرچہ ذوقِ نظر سب کی قدر کر کے چلے
ہاں ان کا نام زمانہ میں کام بھی باقی ہے
جدا یہ ہم سے اور ہم کو چھوڑ کے چلے
بشیر بھائی اب دور ہم سے ہو گئے شیدا
کہ اک زمانہ تک یہ ہم کو ساتھ لے کے چلے

منقبت "حضرت غوث اعظم رض"

مشہور ہے زمانے میں غوث الوریٰ کی بات
ہر بات ہے حضور رض کی گویا خدا کی بات

اندازِ گفتگو میں ہے قرآن کا مزاج
خوفِ خدا کا ذکر ہے لطفِ خدا کی بات

سن کر خدا کی بات رسولِ خدا کی بات
"پھیلی ہوئی ہے دہر میں غوث الوریٰ کی بات"

وہ عاشقِ رسولؐ ہیں، وہ عاشقِ خدا
مخلوق کو سناتے ہیں صبر و رضا کی بات

اُن کے عمل کا نام ہے سنتِ رسولؐ کی
شرعِ مبیں سے ہٹ کے نہ کی مدعا کی بات

اُن کے مرید خوف کی منزل سے کیوں ہیں دور
اہلِ وفا سے پوچھیے اہلِ وفا کی بات

وہ غوثِ وقت قطبِ زمانہ بھی ہیں بشیر
پنہاں ہے ان کے قُرب میں قربِ خدا کی بات

میرے آقا نہیں ہیں کسی کی طرح
اُن کو سمجھو نہ عام آدمی کی طرح
نُور سے اُن کے روشن ہے عالم مگر
وہ نہیں ہیں کسی روشنی کی طرح

حضرت بشیر وارثی مرحوم و مغفور

جناب محمد بن حسین نقیب

"بشر نواز"

وہ بشیر وارثی' اردو کا جو پروانہ تھا   دشمنوں کا دوست تھا اور دوست کا دیوانہ تھا
خدمتِ شعر و سخن میں کاٹ دی سب زندگی   اک چھلکتا جام تھا' اردو کا اک پیمانہ تھا

○

ہر اک کی خبر اُس کو ہر بات سے آگاہی   ہر ایک مسافر کا بن جائے جو ہمراہی
اک مردِ جواں ہمت' بے باک سپاہی وہ   آئی نہ کبھی جس کو پُرکاری و رُوباہی

○

غریب طبع بھی تھا اور غریب پرور بھی   وہ شاخِ گُل تھا کسی کے لئے تھا خنجر بھی
ادب نواز جہاں تھا وہ بے نیاز بھی تھا   بشیر ایک سخنور بھی تھا' قلندر بھی

○

بشر نواز' بشیرِ سخن شناس گیا   تمام بزم کو کر کے بہت اُداس گیا
نکل پڑا وہ سفر پہ اسی سبب شاید   کہ جن سے عشق اُسے تھا انہیں کے پاس گیا

محمد شمیم بی۔ اے۔ ایل ایل بی
ایڈوکیٹ

"بشیر وارثی" شخصیت اور کارنامے

۱۸ر جولائی ۱۹۸۷ء کی وہ منحوس صبح کبھی نہ بھلائی جاسکے گی جس نے بشیر وارثی کو ہم سے چھین کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا۔ ہماری آنکھیں آج بھی اُن کی تلاش میں سرگرداں ہیں جن کے شعروں کی بازگشت آج بھی سماعت میں گونج رہی ہے۔

حیات و موت کا سلسلہ ازل سے ایک فلسفیانہ پہیلی بنا ہوا ہے۔ جسے سمجھنا ذہنِ انسانی کے بس سے باہر ہے۔ یوں تو اس جگمگاتی ہوئی کائنات میں روز ہی ہزاروں تارے ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں۔ مگر ان میں کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اوصاف و کردار کی بنا پر مرنے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔ اور زندگی کی شاہراہ پر اپنے قدم کے نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔ جو ہمیشہ یاد روشن اور تابندہ رہتے ہیں۔

اس وقت بھی ایک ایسی ہی شخصیت کا ذکر کیا جارہا ہے جو مرتے دم تک ہمارے ذہنوں کو منور کئے ہوئے ہے۔ بشیر وارثی کی زندگی ایک کھلی کتاب کی مانند تھی میری آنکھیں پاس تقریباً گیارہ بارہ سال سے روزانہ آمد و رفت تھی۔ میں زیادہ تر بعد نمازِ عصر اُن کے آفس واقع چھتہ بازار جاتا تھا۔ اور چار چار، پانچ پانچ گھنٹے ان کی صحبت میں گزار کر بس گیارہ بجے رات گھر واپس ہوتا تھا۔ یہ سلسلہ اُن کی زندگی کی آخری رات تک جاری رہا۔ اگر میں کسی وجہ سے کسی دن حاضر نہ ہوتا تو بشیر صاحب دوسرے روز مجھ سے ہنستے ہوئے فرماتے "کل کہاں تھے وکیل صاحب بہادر"

ان کے یہ الفاظ آج بھی میرے کانوں میں گونجتے رہتے ہیں۔ بشیر صاحب میرے بے لوث محسن اور قابلِ احترام دوست تھے۔ بارہ سال کے طویل عرصہ میں مجھے ان کو بہت قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ وہ مجھ سے اس قدر بے تکلف تھے کہ عام گفتگو کے علاوہ اپنے ذاتی خانگی حالات بھی اس طرح بیان کر دیتے جیسے اپنے فردِ خاندان کے سامنے بیان کرتے ہیں۔

بشیر صاحب فرماتے تھے کہ وہ ابھی کم عمر ہی تھے کہ والد بزرگوار کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ اور ان کی پرورش و تربیت کی ذمہ داری ان کے شفیق بہنوی جناب سید احمد صاحب نے اپنے ذمہ لے لی۔ بشیر صاحب اپنے بہنوی صاحب کا ذکر بڑے ادب و احترام سے کرتے اور ان کے بے حد ممنون و احسان مند تھے۔ کیوں کہ انہوں نے ان کی پرورش و تربیت میں باپ کی کمی کو کبھی محسوس نہ ہونے دیا۔

بشیر صاحب فرماتے تھے کہ اُن کے جدِ اعلیٰ افغانستان سے دہلی اور دہلی سے حیدرآباد آکر سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ اُن کے چہرہ مہرہ، ڈیل ڈول اور رنگت سے بھی ان کے افغانی النسل ہونے کی تصدیق ہوتی تھی۔ آبائی پیشہ سپاہ گری تھا۔ جس کا وہ اکثر ذکر کرتے تھے۔ وہ ایک خوش وضع خوش طبع اور بذلہ باش آدمی تھے۔ اُن کی مکتبی تعلیم کوئی خاص نہ تھی مڈل اسکول کی تعلیم بھی مکمل نہ تھی اپنے دوستوں کے سامنے ازراہِ مذاق اور بلا جھجک اپنے آپ کو "جاہلِ محض بحرِ بیٹ" کہتے تھے جس پر

سب کو بے ساختہ ہنسی آجاتی تھی۔ اور خود بھی ہنستے تھے حافظہ قوی اور طبیعت موزوں پائی تھی۔ علاوہ اس کے شاعری سے فطری لگاؤ بھی تھا۔ ان کے بہنوئی سید احمد صاحب کے گھر میں ادبی محفلیں جمتی تھیں جس میں کئی شعراء ادیب اور علمی ذوق رکھنے والے اصحاب جمع ہوتے تھے۔ جس سے ان کی شاعرانہ صلاحیتوں میں نکھار پیدا ہوا۔

تعلیمی سلسلہ ختم کر کے فوج کی ملازمت اختیار کر لی اور وہیں خاموش شاعری کرتے رہے۔ اس وقت ان کی عمر بیس سال کے قریب تھی۔ جو بھی کہتے تھے اس کو ایک بیاض میں لکھ لیتے کبھی ساتھی فوجیوں کو اپنا کلام سناتے تھے۔ کبھی کبھی مشاعروں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ مگر بہنوئی صاحب کے منع کرنے سے مشاعروں میں جانا ترک کر دیا اور تقریباً تیرہ چودہ سال تک مشاعروں میں شرکت نہیں کی۔ یہ ان کی شاعری کا ابتدائی دور تھا۔

بشیر صاحب کی شادی ۱۹۴۶ء میں جناب حسن علی صاحب کی دختر سے ہوئی تھی۔ آپ کے خسر بھی ایک فوجی تھے۔

بارہ تیرہ سال تک فوج میں ملازمت کی دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر انڈین آرمی کے ساتھ اقوام متحدہ کے امن مشن کے تحت مشرق وسطیٰ بھیجے گئے۔ اور مصر، قبرص و فلسطین وغیرہ میں اپنی خدمات انجام دیں۔ بیت المقدس کی زیارت بھی کی۔ وہ اپنے بیرون ملک قیام کے دوران کے دلچسپ واقعات تفصیل سے سناتے تھے جو ان کے حافظے میں پینتیس ۳۵ چھتیس ۳۶ سال گزر جانے کے بعد بھی اس طرح محفوظ تھے۔ جیسے کل کی بات ہو۔ ان واقعات کا اس مختصر مضمون میں احاطہ ممکن نہیں۔ فوجی ملازمت کے دوران ہی سلسلہ وارثیہ میں بیعت کر لی تھی اور اسی مناسبت سے وہ وارثی کہلاتے تھے۔

فوجی ملازمت سے جس وقت وظیفہ پر علٰحدہ ہوئے اس وقت وہ کثیر العیال تھے۔ تین فرزند اور دو دختران کے علاوہ خود میاں بیوی جملہ سات افراد کی کفالت و پرورش کی ذمہ داری تنہا آپ پر تھی۔ علاوہ ازیں سکونتی مکان بھی کرایہ کا تھا۔ وظیفہ حسن خدمت بہت قلیل تھا جو ان تمام اخراجات کا متحمل نہ تھا۔ لہٰذا کوئی متبادل ذریعہ آمدنی تلاش کرنا ناگزیر تھا۔ وہ فرماتے تھے کہ تلاش معاش میں روزانہ صبح سویرے کبھی ناشتہ کر کے اور کبھی بغیر ناشتہ گھر سے نکل جاتا اور دن بھر کئی کئی میل تاجروں کے مکانوں پر جا کر حساب کتاب لکھ دیا کرتا تھا۔ اور اس طرح بیڑی سگریٹ کا خرچہ نکال کر دو تین روپیہ بچا کر گھر لاتا جس سے بمشکل گزر بسر ہو جاتی تھی۔ بشیر صاحب کی زندگی کا یہ دور عسرت اور تنگ دستی کا دور تھا۔ جس کا انہوں نے بڑی جوانمردی اور حوصلے سے مقابلہ کیا۔ اس زمانہ میں انہوں نے بازار میں لوگوں کو تار کے بنے ہوئے ہینگر س (کپڑے لٹکانے کا فریم) فروخت کرتے دیکھا۔ ان کو بھی یہ کاروبار کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ ایک دن گھر لوٹتے وقت دن بھر کی آمدنی سے تار خرید کر لائے۔ اور رات میں دونوں میاں بیوی نے مل کر ہینگرس بنائے اور دن میں اپنے بڑے اور منجھلے صاحبزادوں کے ذریعہ (جن کی عمریں اس وقت دس اور بارہ سال کی ہوں گی) بازار میں فروخت کروا دیتے اس طرح آمدنی کا ایک ذریعہ اور ہاتھ آ گیا۔ کچھ عرصہ یہ کام اچھا چلا۔ جب مانگ کم ہو گئی تو یہ کام بند کر دیا۔

بشیر صاحب کی دوستی کئی کمرشیل [illegible] سے تھی۔ انہیں دوستوں کے مشورہ سے آپ نے اپنا ایک ذاتی آفس کمرشیل اکاؤنٹنٹ کی حیثیت سے قائم کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اور اس وقت موجودہ آفس کے روبرو عمارت کی ملگیوں میں سے ایک ملگی کرایہ پر حاصل کر لی (اب یہ ملگیاں عدالت کی ملکیت ہیں) اور اپنا خود اکاؤنٹ آفس کھول دیا۔ اور مشیر سیلس ٹیکس و انکم ٹیکس کی حیثیت سے کام کا آغاز کر دیا۔ جن تاجروں کے مکانوں پر جا کر بشیر صاحب لکھا کرتے تھے اب وہ خود ان کے دفتر پر آ کر [illegible]

لکھواتے اور ضروری مشورے لیتے۔ بشیر وارثی صاحب کرمنل ٹیکس کے دفاتر کی پیروی بڑی پابندیٔ محنت، لگن اور دیانت داری سے کرتے تھے۔ جو بھی موکل ایک بار آپ کے پاس آتا وہ آپ کے حسنِ سلوک اور کام کی مہارت سے ایسا مرعوب ہوتا کہ پھر وہ آپ کو کبھی نہ چھوڑتا۔ اس طرح موکلین کی تعداد کافی بڑھ گئی۔ جس سے ان کی آمدنی میں معتدبہ اضافہ ہوگیا۔ اور اب عسرت اور تنگدستی کا دور بھی رخصت ہوا۔ یہی دور بشیر صاحب کی شاعری کا نشاطِ ثانیہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

مثل مشہور ہے کہ جہاں شمع ہوتی ہے وہاں پروانے اُڑ کر پہنچ جاتے تھے۔ بشیر صاحب کی شخصیت بھی ایک شمع سے کم نہ تھی۔ خود شاعر تھے ہی مگر اس سے زیادہ وہ شاعروں کے قدردان اور ہمدرد تھے۔ اس لئے ان کے اطراف شعراء کا جمگھٹ بڑا ضروری تھا۔ بشیر صاحب شام میں حساب کتاب کی دنیا سے نکل کر باہر آتے۔ تو شعرا حضرات کی محفل جم جاتی۔ اس محفل میں نہ صرف شعرا حضرات ہی شریک ہوتے بلکہ اپنے وقت کے عالم، اہلِ قلم، لکچرارس اور پروفیسر صاحبان بھی نظر آتے اور شاعری کے علاوہ مختلف موضوعات پر سیر حاصل بحث مباحثے ہوتے۔ یہ محفلیں ان کی شاعری کے نکھار میں بے حد ممد و معاون ثابت ہوئیں۔ اور ان کی شاعری میں جِلا پیدا ہوتی گئی۔ دوست احباب کے اصرار پر دوبارہ مشاعروں میں شرکت کرنے لگے۔ فوجی ہونے کی حیثیت سے شعر پڑھنے کا انداز گھن گرج کا تھا۔ سامعین گوش بر آواز رہتے تھے۔ اور داد و تحسین دیتے تھے۔

بشیر صاحب کا آفس جس عمارت کی گلی میں تھا اس میں کئی گلیاں اور بھی تھیں۔ وہ تمام گلیاں اور عمارتیں حکومت نے عدالت کے لئے خرید لیں۔ جس کی وجہ سے سب کرایہ داروں کو تخلیہ ہوگیا۔ اور بشیر صاحب کو بھی اپنا آفس وہاں سے نکل کوٹ منتقل کرنا پڑا۔ مگر بہت جلد لکڑ کوٹ سے اپنا آفس موجودہ گلی واقع چھتہ بازار منتقل کر دیا اور موجودہ آفس تقریباً پندرہ سال سے اسی جگہ ہے۔

اب بشیر صاحب اپنے پیشے کی مصروفیت کے دوران جہاں اپنے ناخن تدبیر سے حساب کتاب کی قانونی گتھیوں کو سلجھانے میں مشغول رہتے تھے وہیں گیسوئے اُردو کی آرائش کا عمل بھی جاری رہتا تھا۔ شعر و سخن کی مخصوص محفلوں اور مشاعروں میں نہ صرف شرکت کرتے تھے بلکہ کئی انجمنوں اور تنظیموں کی صدارت اور سرپرستی بھی کرتے تھے شعر و شاعری سے حد درجہ شغف اور اُردو ادب کی بے لوث خدمت بشیر صاحب کا نصب العین تھا۔ ان کا کلام مختلف مقامی اور بیرونی اخبارات و رسائل میں بھی شائع ہوتا تھا۔ علاوہ اس کے وہ ریڈیو اور ٹی وی پر بھی کلام سناتے تھے۔ مقامی مشاعروں کے علاوہ اضلاعی مشاعروں میں بھی پابندی سے شریک ہوتے۔ ساتھ میں کوئی نہ کوئی دوست شاعر ضرور رہتے جن کے تمام اخراجات بعض وقت خود برداشت کرتے اور بعض وقت داعیِ مشاعرہ سے دلوا دیتے۔

بشیر صاحب نے یوں تو ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے مگر ان کا خاص موضوع اور میلانِ طبع نعت گوئی کی طرف زیادہ تھا۔ اکثر ان کی غزل کے کسی نہ کسی شعر میں نعت کا اثر جھلکتا تھا۔ جس پر وہ کہتے تھے کہ کیا کروں فطرت سے مجبور ہوں۔ بشیر صاحب کی غزلوں میں صوفیانہ خیالات کی عطر بیزی اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے ان کے اشعار میں طرزِ ادا کی لطافت بھی ہے۔ اور دل آویزی بھی جس سے قاری بادۂ تصوف سے سرشار ہو کر عرفان حاصل کرتا ہے ملاحظہ فرمائیے

ملے نہ ہم سے وہ نہ ہم ملے ان سے
رہے تلاش میں دونوں مگر پتہ نہ ملا

تجلّیِ ذات کی مخلوق کے پردے میں مخفی ہے
بجز محشر کے اس کو نمایاں کون دیکھے گا

بخش دی چشمِ بصیرت نے بصارت ایسی
قطرے قطرے میں سمویا ہوا دریا دیکھا

بن کر حیات پیکرِ خاکی میں رہے بشیر
وہ ذاتِ پاک اصل میں ہے حاملِ حیات
اُس نے جلا کے دھو دیا ہر داغ کو بشیر
دامن تھا داغدار دلِ پاک باز کا

ہم کو وہاں مناظرِ کون و مکاں ملے
راہِ طلب میں صاحبِ عرفاں جہاں ملے
مظہر ہر ایک ذرّہ ہے جس کے نشان کا
اے کاش ایک بار وہی بے نشاں ملے

بشیر صاحب کو فنِ تاریخ گوئی میں بھی خاص ملکہ حاصل تھا۔ انہوں نے خوشی غم اور یادگاری مواقع پر تاریخی قطعات و اشعار لکھے ہیں۔ جس کے لئے انہوں نے کافی محنت اور عرق ریزی کی تھی۔ بشیر صاحب کو اساتذہ کے سیکڑوں اشعار زبانی یاد تھے۔ وہ مجھے اکثر سناتے تھے۔ ان کی زود گوئی کا یہ عالم تھا کہ اگر کسی طرحی مشاعرہ کی غزل کا مصرع صبح ان کو مل جاتا تو شام تک نصرف غزل تیار ہو جاتی تھی بلکہ اسی طرح میں نعت بھی لکھ لیتے تھے۔ اور اسی طرح اگر نعت کی طرح مل جاتی تو نعت اور غزل دونوں لکھ دیتے تھے

شاعری میں بشیر صاحب کا کوئی استاد نہ تھا۔ مگر وہ اپنا کلام کسی نہ کسی شاعر کو بلا جھجک دکھا لیتے تھے اور فرماتے تھے کہ بھائی اگر کوئی غلطی ہو تو بتا دینا۔ اگر کوئی اصلاح دیتا تو اس کو بہ طیبِ خاطر احسان مندی اور شکریہ کے ساتھ قبول کر لیتے۔ [illegible] شعرا حضرات کے مجموعہ کلام کی کتابت طباعت بائنڈنگ وغیرہ میں دامے درمے سخنے ہر طرح معاونت کرتے اور اگر کوئی مالی تعاون کا طلبگار ہوتا تو اس سے بھی گریز نہ کرتے اور سب کی حتی المقدور مدد کر تے۔ میں نے دیکھا ہے کہ بعض وقت ان کی جیب خالی ہوتی تو وہ خود دوسروں سے قرض لے کر اہلِ غرض کا طلب کی تکمیل کرتے جو کوئی شاعر ادیب یا مصنف اپنی کتاب چھپوانا چاہتا وہ سیدھے بشیر صاحب کے پاس چلے آتا۔۔۔۔۔ اور ان سے مشورہ کرتے میں نے دیکھا ہے کہ وہ اس کام کی تکمیل کی ذمہ داری خود بخوشی قبول کر لیتے۔ اور اگر اس کی تکمیل میں مالیہ کی کمی پڑ جاتی تو وہ خود اپنی جیب سے لگا دیتے جو بعد میں وصول ہوتا۔ بعض وقت وصول بھی نہ ہوتا ان کے دفتر میں میں نے دیکھا ہے بعض شعراء کے مجموعوں کی کتابیں پوری محفوظ رکھی ہیں۔ جس کے متعلق بشیر صاحب فرماتے تھے کہ یہ کتابیں میں نے اپنے صرفہ سے اس وعدہ پر تیار کروائیں کہ تیار ہونے پر پورا خرچہ ادا کر کے کتابیں لے جائیں گے مگر افسوس کئی سال گزر نے پر بھی نہ رقم ادا ہوئی اور نہ کتابیں لینے آئے۔

ماہنامہ "ذوقِ نظر" کی اجرا کا سبب :

ماہنامہ "ذوقِ نظر" کے اجرا کا سبب ایک واقعہ تھا۔ جس کی تفصیل بشیر صاحب بیان فرماتے تھے کہ وہ کسی جلسہ میں شرکت کے لئے گئے تھے۔ اس جلسہ میں ایک اُردو روزنامہ کے ایڈیٹر صاحب بھی تشریف لائے تھے [illegible] بشیر صاحب پہلے ان کی رسمی ملاقات ہوئی۔ چند احباب اور بھی موجود تھے سب کی موجودگی میں ایڈیٹر نے بشیر صاحب سے مخاطب ہو کر فرمایا "شہر حیدر آباد جو اُردو کا گہوارہ کہلاتا ہے یہاں سے آج تک کوئی معیاری اُردو ماہنامہ نہ نکل سکا۔" یہ بات بشیر صاحب کے دل کو لگ گئی۔ اور اسی وقت ایک معیاری اُردو ماہنامہ نکالنے کی دل میں ٹھان لی۔ اور ماہنامہ "ذوقِ نظر" نکال کر ہی دم لیا "ذوقِ نظر" نکالنے کے لئے انہیں بہت تگ و دو اور محنت کرنی پڑی۔ اور جس وقت پہلا شمارہ منظرِ عام پر آیا تو بشیر صاحب کے اس جرأت مندانہ اقدام کی ہر طرف سے بڑی تعریف ہوئی اس طرح یہ سلسلہ ہر ماہ پابندی کے ساتھ نکلنے لگا۔ پرچہ کی عمر جیسے جیسے بڑھتی گئی بشیر صاحب کی محنت گرتی گئی گئی شاہ

نکلنے کے بعد بھی پرچہ خود کفیل نہ ہو سکا۔ دوستوں، ہمدردوں، بہی خواہوں، ان کے متعلقین اور خود میں نے بھی پرچہ مسدود کرنے کا مشورہ دیا مگر بشیر صاحب کا سب کو ایک ہی جواب تھا کہ "یہ میری وضعداری اور خودداری کے خلاف ہے۔ پرچہ کو اپنی زندگی کی آخری سانس تک جاری رکھوں گا۔ چاہے اس میں مجھے کتنا ہی مالی نقصان کیوں نہ اٹھانا پڑے۔" آخر انہوں نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا۔ اور جس دن ان کا انتقال ہوا اس ماہ کا پرچہ دیدہ زیب سرورق کے ساتھ نکل چکا تھا۔ جو کہا تھا وفا کیا اس نے۔ انتقال کے تقریباً ایک ماہ قبل میرے استفسار پر مسکرا کر فرمایا تھا کہ آج تک ماہنامہ "ذوقِ نظر" کی اشاعت پر تقریباً چالیس پینالیس ہزار کا خسارہ اٹھا چکا ہوں۔

ماہنامہ ذوق نظر کو نکلے ہوئے تقریباً پونے تین سال ہو چکے ہیں۔ مگر افسوس کہ اس کا سالانہ خریداری کی تعداد پچاس ساٹھ سے آگے نہ بڑھ سکی۔ بشیر صاحب نے ماہنامہ ذوقِ نظر کو نہ صرف ہندوستان کے کونے کونے میں بلا معاوضہ پہنچایا بلکہ بیرونِ ہند بھی روشناس کرایا۔

بشیر وارثی کے بعد ان کی جانشینی کے فرائض ان کے چھوٹے فرزند ظہیر وارثی انجام دے رہے ہیں خداوند کریم ان کے حوصلے بلند کرے اور عزمِ صمیم عطا کرے۔ بشیر صاحب کے ورثا میں چار فرزند تین دختران اور ایک بیوہ ہیں۔

بشیر صاحب کی نمازِ جنازہ مسجد واقع اندرون درگاہ حضرت مراد شاہ دھوتیؒ مراد نگر میں بعد نمازِ عصر ادا کی گئی۔ متعلقین کے علاوہ دوست احباب کی کثیر تعداد موجود تھی۔ نمازِ جنازہ کے فوری بعد مرحوم کے فرزند کی جانب سے اعلان کروایا گیا کہ والد صاحب مرحوم پر اگر کسی کا کچھ قرض باقی ہو وہ بلا تکلف ان کے فرزند سے آ کر حاصل کر لے۔ ان کا یہ مثالی اور مستحسن اقدام نہ صرف سبق آموز ہے بلکہ قابلِ تقلید بھی۔ بعد نمازِ جنازہ بشیر صاحب کی تدفین اسی قبرستان میں عمل میں آئی۔ آخر میں اتنا ضرور عرض کروں گا کہ جو کچھ میں نے لکھا ہے یہ سب ان کی مجھ سے بے پناہ محبت اور شفقت کا بے اختیارانہ اظہار ہے۔ میں اپنی اس تحریر میں کہاں تک ان کے ساتھ انصاف کر سکا ہوں۔ اس کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔ کیوں کہ یہ خود احتسابی کا عمل ہے۔ اور ان چند باقی لمحات میں مجھ سے خود احتسابی کی توقع نہ کیجیے۔

جاتے جاتے وقار ناصری کے اشعار مجھے بار بار یاد آ رہے ہیں۔

عجیب شخص تھا وہ
چلو کہ دفن کہیں اس کو کر دیں مٹی میں
یہ اس کا زخم زمانہ تو بھول جائے گا
مگر وہ ہم کو ہمیشہ یاد آئے گا۔
کہ اپنی زیست کے ہر موڑ پر اکیلا وہ
تھا اپنی ذات سے روشنی کر چراغ جلیا وہ
سراپا سایہ فگن نور کا فرشتہ وہ
عجیب شخص تھا وہ
جو اس کی قبر پہ کتبہ لکھیں تو یہ لکھیں
جو سو رہا ہے یہاں نرم نرم نیندوں میں
بہت شریف بہت خوش مزاج انسان تھا۔
ہماری ذات پہ اس کا ہزار احسان تھا
خلیق، نیک سیَر، فردِ باکمال تھا وہ
مثال جس کی نہیں اتنا بے مثال تھا وہ
عجیب شخص تھا وہ

جناب عابد قادری

بشیر وارثیؒ - اردو ادب کا بہی خواہ

موت کیا ہے زندگی کا لازمہ ہے۔ مشیت پروردگار کا
موت کب کسی کے اختیار میں رہی؟ خواہی نا خواہی یہ تو اپنے وقت پر بے اختیار
بے دریغ آ جاتی ہے۔ گویا اس کا آنا برحق۔ ہر ذی حیات کو
اس کا مزہ چکھنا لازمی (کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْت)۔
یہاں بجز مشیت یہ کہتے ہیں ہستی ہر آدمی کی بلبلہ ہے پانی کا۔
چنانچہ بشیر بھائی بھی اسی موت کا شکار ہو گئے۔ موت
کے ظالم و بے رحم ہاتھوں نے انہیں آن واحد میں ہم سے
چھین لیا۔ اور ہم دل مسوس کر یہ سوچتے ہی رہ گئے کہ آخر ایسا
کیوں کر ہو گیا۔ ایسا با مروت، خوش مزاج، یار باش انسان
کس طرح اس بے مروتی کے ساتھ ہم سے منہ موڑ کر چلا گیا۔

اب جبکہ عزیزم ظہیر الدین سلمہٗ اپنے والد محترم حضرت
بشیر وارثی مرحوم مؤسس و مدیر اعلیٰ ماہنامہ "ذوقِ نظر" کی یاد
میں "ذوقِ نظر" کا یادگاری نمبر نکال رہے ہیں اور مجھے اس
کے لئے کچھ لکھنا ہے۔ اس انسان کے تعلق سے جو مجھے اپنے
ایک چھوٹے بھائی کی طرح چاہتا رہا، مری ہر ادا [illegible]
[illegible] کو خندہ پیشانی سے برداشت کر لیتا رہا۔ جو خود آن بان
والا تھا، عزت دار، با اخلاق انسان تھا اور ہر چھوٹے بڑے
کی عزت کرتا۔ جس نے شاید ہی کسی کی دلشکنی کی ہو۔ [illegible]
مخلص، محنتی، دیانت دار، اولوالعزم، جہاندیدہ [illegible] تھا
وہ کوئی [illegible] مثال [illegible]
[illegible]
[illegible]

شخصیت وہ تو ایک نام تھا۔ دورِ رفتہ کا۔ ایسی شخصیت
کے تعلق سے اس مختصر سی فرصت میں صفحات کی اس
محدود وسعت میں کیا لکھا جائے۔

بشیر بھائی ایسے با وصف انسان کے لئے جس کی
زندگی کے کئی پہلو ہوں اور جس کی زندگی کا ہر گوشہ اجاگر
ہو کیا لکھا جائے اور کیا نہ لکھا جائے۔ وہ صلح کل، منکسر المزاج،
پاک طینت، صاف گو، خوش اوقات، یار باش کیا نہیں تھے۔
رواداری، وفا شعاری، خلق و مروت، اخلاص و خلوص،
ان کی زندگی کا جزو لاینفک تھے۔ وہ مجسم اخلاق تھے، پیکر انسانیت
تھے۔ پاسداری، عجز و انکساری کے ساتھ بردباری، وضعداری،
خوش باشی ان کا وصف خاص تھا۔ اس قحط الرجال کے دور
میں ایسے اوصاف والے کم ہی ملتے ہیں۔ بشیر بھائی (خدا انہیں
غریقِ رحمت کرے) کی کن باتوں کو یاد کیا جائے۔ کونسی خوبیوں کو
گنا جائے۔ فیاضِ ازل نے انہیں کیا کچھ نہ بخشا تھا۔ وہ تو ہر
حیثیت سے یاد کرنے کے قابل ہیں اور رہیں گے۔ میں تو کہوں کہ وہ ایک
ایسے مکمل انسان تھے جس پر آدمیت کو بجا طور پر ناز ہو سکتا ہے۔
میں کسی کی تعریف و توصیف میں روایاتی غلو اور جذباتی
اظہار کا روادار نہیں ہوں۔ میں اس بارے میں بہت محتاط
[illegible] میں [illegible] پرست [illegible]
[illegible] اس کی مدت [illegible] زمین و آسمان کے
[illegible]
[illegible]

معاملہ میں بلا کا تخصیص واقع ہوا ہوں' بدنام ہوں' سخت گیر ہوں' میں تو ان آنکھوں کا جو میرا اپنا مشاہدہ' ہو ۔ میں تو کسی تحسینِ ناشناس کو بھی حقدار کی حق تلفی کا مترادف سمجھتا ہوں ہاں ع "آئینِ جواں مرداں' حق گوئی و بے باکی" کا میں قائل ہوں' حق بیانی اور صاف گوئی میں عار کیا' شرم کیسی ۔۔ بے محابانہ میں تو کہوں گا کہ بشیر وارثی ایک مکمل انسان تھے یہ اور بات کہ آدمی ہونے کے ناطے ان میں محاسن کے ساتھ عیوب کا ہونا بھی لازمی تھا۔ اور یقیناً ان میں بھی بہت ساری برائیاں رہی ہوں گی۔ مگر ان کی خوبیوں نے اس حد تک ان کی پردہ داری کی تھی کہ دُور دُور تک ان کا شائبہ تک نظر نہ آتا تھا۔

کہنے کو تو یہ اپنے پیشہ آبا پر فخر کرنے والے ایک ریٹائرڈ فوجی تھے۔ ایک کندۂ ناتراش لیکن اس کا سہ واثر گوں کی کرامات سے کیا کہنے کہ یہی کندۂ ناتراشیدہ ایک تراشیدہ ہیرے کی آب و تاب لئے یوں چمک اٹھا کہ اچھے اچھے آب دار موتیوں کی چمک دمک بھی اس کے آگے ماند پڑ گئی۔ سچ ہے فیاضِ ازل کی سرفرازی ہو جائے تو پھر کیا چاہیے۔

بشیر بھائی ایک انسان دوست کی حیثیت سے تو مشہور تھے ہی ان کی خدا ترسی' ہمدردی اور فراخدلی ہر کسی کے ساتھ سلوک' مسلوک نے ان کے نام کو اور چمکا دیا' وہ ہر کسی کے غمخوار' ہر کسی کے درد مند ہو جاتے۔ وہ ایک دردمند دریا دِل انسان تھے۔ ادیبوں شاعروں اور اہلِ علم حضرات کی معاونت ان کی دامے' درمے' سخنے مدد کرنا گویا وہ خود پر لازم گردانتے تھے۔ چنانچہ اس فقیر منش انسان کی فیاضی کے افسانے سن سن کر جانے کہاں کہاں کے مستحق' غیر مستحق سبھی ادیب و شاعر بہر استمداد ان کے دفتر چلے آتے ایک آس ایک اُمید لئے ۔۔۔ مجھے یہ لکھتے ہوئے کوئی جھجک نہیں ہوتی کہ میری آنکھوں نے بظاہر کتنے ہی وضعدار و خوش نام شخصیتوں کو ان سے رقمی امداد طلب کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

بشیر بھائی صاحب کی علمی استعداد ویسے کچھ نہیں تھی۔ یہ کہیں کے باضابطہ ڈگری یافتہ' سند یافتہ نہیں تھے لیکن ان کی فطری صلاحیت' میلانِ طبعی' ادبی رجحان اور وسیع مطالعہ نے انہیں بہت کچھ بنا دیا تھا۔ ان کی معلومات اتنی وسیع تھیں کہ طبیعت عش عش کرنے لگتی۔ انہوں نے اپنے لئے ایک بہتر صاف ستھرا ادبی ماحول ڈھونڈھ لیا تھا گویا وہ زندگی کا راز پا چکے تھے۔ انہوں نے اپنی منزل متعین کر لی تھی۔ دفتری مصروفیات کے ساتھ ساتھ ان کا ادبی شغف بھی برابر رہتا' ہر وقت اہلِ علم حضرات شعرائے کرام کی بیٹھک جمی رہتی۔ علمی مباحث سیرتِ اولیاء کے تذکرے چلتے' صوفیائے کرام کی باتیں ہوتیں ان کے مسلک کی خوبیاں بیان ہوتیں' بہر حال ہر قسم کی بامقصد گفتگو آپ یہاں سنتے۔ ان کا دفتر گویا ان کا ایسا دیوان خانہ تھا جس پر کسی ادبی انجمن کا گمان گزرتا۔

صوفی ازم کے وہ بڑے قائل تھے؛ دیوہ شریف کی مایہ ناز مذہبی شخصیت حضرت حاجی وارث علی شاہؒ کے سلسلہ سے وابستہ تھے۔ اور اسی ارادت و وابستگی نے گویا انہیں زندگی کی وہ تمام اعلیٰ اقدار دلادی تھیں جو ایک سیدھے سادے نیک و پاک باز انسان کے لئے ازبس ضروری ہیں۔ انہیں اپنے پیرؒ سے والہانہ عقیدت تھی۔ وہ اکثر "یا وارث" کا وِرد کرتے رہتے۔ انہیں اس نام کی برکت پر پورا ایقان تھا۔ اور ہوتا بھی یہ تھا کہ اکثر وہ اسی ورد کے فیضان سے اپنی افتاد کو دور کر لیا کرتے۔

بشیر بھائی کو ادب سے گہرا لگاؤ تھا۔ کتب بینی ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ وہ رات دیر گئے تک مطالعہ میں مشغول رہتے۔ ایسا کیوں نہ ہوتا۔ مطالعہ ہی تو ان کا سب کچھ تھا۔ یہ علم کے رسیا ہی نہ تھے بلکہ بو یا بھی تھے۔ ادب نوازی ان کا شیوہ تھا' انہیں اپنی مادری زبان سے بڑا پیار تھا۔

اسی پیار و لگن سے وہ اس زبان کی ترویج اس کے فروغ و اشاعت کی فکر میں دن رات لگے رہتے۔ اس کی بقاء اس کی زندگی بنانے کے منصوبے بناتے رہتے۔ اردو زبان سے ان کی اسی دلچسپی اور گہرے تعلقِ خاطر ہی کا نتیجہ تھا جو ان کی زیرِ ادارت ایک اردو ماہنامہ "ذوقِ نظر" کا اجراء عمل میں آسکا۔ ان ناسازگار حالات میں اور خاص کر اس کساد بازاری اپنی ہی زبان سے اپنی غفلت و بیزاری کے اس دور میں ایک اردو رسالے کی اشاعت اور محض ادبی مذہبی نکات نظر پر مبنی پرچہ کا اجراء کتنا کچھ حوصلہ آزما سکتا آزما نہ تھا مگر اس دھن کے پکے حوصلہ مند نے اس ضعیف العمری میں بھی اپنی جواں ہمتی، عالی حوصلگی کا وہ ثبوت فراہم کیا کہ جس کا جواب نہیں۔ ماہنامہ "ذوقِ نظر" نے منصۂ صحافت پر ابھر کر کتنے ہی جیالوں کے حوصلے آزما لئے، جانے کتنوں سے خراج لے لیا۔ بشیر بھائی واقعی اس معاملہ میں بڑے خوش مقدر رہے کہ ان کے اس ادبی رسالے نے بہت کم عرصہ میں شہرت اور قبولِ عام کی سند لے لی۔

بشیر صاحب کی اس اچانک رحلت سے بے شبہ اردو ادب کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔ شہر کی کئی ایک ادبی انجمنوں کو جن کی انہوں نے زندگی بھر سرپرستی کی بڑا زبردست دھکا پہنچا۔ اور آج یہ محفلیں اس قد آور ادب نواز شاعر کو بڑی حسرت بھری نظروں سے ڈھونڈ رہی ہیں اور یہ سب ان کی جدائی پر نوحہ کناں ہیں۔ ؎

"بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا"

آج اس ادب دوست انسان کو ہمارا خراجِ عقیدت یہی ہوسکتا ہے کہ ہم دیانتِ فکر اور پختہ احساس کے ساتھ اسے اردو کا ایک سچا بہی خواہ، بے حد خوش اخلاق اور نیک نفس انسان قرار دیں۔

سچ تو یہ ہے کہ بشیر وارثی صاحب کے ادبی کارنامے ان کی ادبی خدمات کچھ ایسی رہی ہیں کہ یہ ان کے نام کو دنیائے ادب میں زندہ رکھنے کو بہت کافی ہیں۔ چنانچہ "بشیر وارثی پبلیکیشن" کی قابلِ قدر اشاعتیں خود ہمارے اس خیال کی صداقت پر شاہد ہیں۔

آج اگر ہم یہ سوچتے ہیں تو غلط نہیں سوچتے کہ کل کا مورخ اگر دیانتِ فکر کے ساتھ اس دور کی اردو نواز ہستیوں پر قلم اٹھائے تو وہ بشیر وارثی کے تذکرہ کے بغیر نہ رہ سکے گا۔ بلکہ وہ اس بات پر خود کو مجبور پائے گا کہ وہ ان کے تذکرے کو جلی حرفوں سے لکھے اور اسے نمایاں مقام دے۔

آخر میں، میں ان چند دعائیہ کلمات پر مضمون کو تمام کروں کہ خدائے رحیم و کریم حضرت بشیر وارثی کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ ان کے متعلقین کو صبرِ جمیل عطا ہو۔ اور ان کے جواں سال چھوٹے فرزند ظہیر کو اس کی توفیق ملے کہ وہ اپنے والد کے نقوشِ قدم پر گامزن رہتے ہوئے ان کے مشن کی تکمیل اور اس کاز کو آگے بڑھانے کی ممکنہ سعی کر سکے جس کی بشیر صاحب نے بڑے ارمانوں سے ابتدا کی تھی، آغاز کیا تھا۔

"آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے"

امامِ اعظم حضرت ابو حنیفہؒ

قطعہ

ایسی فقہ ملی ہے امامِ ہمامؒ سے ملتا ہے جس کا سلسلہ خیر الانامؐ سے
ہے وہ ابو حنیفہؒ پہ سرکارؐ کا کرم لیتی ہے نام خلقِ خدا احترام سے

منقبت

بو حنیفہؒ ہیں اماموں میں بڑے عالیمقام — ان کے رتبہ کو پہنچ سکتا نہیں کوئی امام
پیشوائے اہلِ سنّت نیک دل عالیمقام — سنّتِ پیغمبری کے مہرِ تابندہ نظام
آپ نے آراستہ علمِ فقہ کو کر دیا — آپ ہیں پہلے فقیہہ و ماہرِ علم الکلام
ہو گئی ہے آپ کی کاوش سے تدوینِ فقہ — فیض جاری یہ رہیگا اہلِ ایماں میں مدام
سرورِ کونینؐ سے پائی بشارت علم کی — سرورِ کونینؐ نے بخشا انھیں اعلیٰ مقام
مذہبِ اہلِ سنّن کو جہانگیری ملی — آپ نے علمِ شریعت کا کیا وہ اہتمام
جانچ لو فہم و فراست سے ذرا ہر مسئلہ — آپ کا ارشاد تھا ہر ایک سے صبح و شام
عفو و بخشش سے عیاں ہے جوہرِ انسانیت — کب لیا ہے آپ نے دشمن سے اپنے انتقام
ہر سزا برداشت کرنا خیرِ امّت کے لئے — حوصلہ تھا آپ کا اسے عزمِ راسخ کے امامؒ
بو حنیفہؒ آفتابِ علمِ دینِ پاک ہیں — آپ کی مدحت ہے لازم اہلِ سنت پر مدام
یہ امام بو حنیفہؒ آپ کا کردار تھا — آپ نے ٹھوکر پہ رکھا مالِ دنیا کو مدام

پیش کرتا ہوں انہیں نذرِ عقیدت اے بشیرؔ!
ایک عالم جن کا کرتا ہے اُنل سے احترام

حضرت بشیرؔ وارثی مرحوم

منقبت

خواجہ غریب نوازؒ

جلالِ حضرتِ مشکل کشاؑ غریب نوازؒ ۔ جمالِ حضرتِ خیر الوریٰؐ غریب نوازؒ
ہمارے حق میں ہیں دستِ خدا غریب نوازؒ ۔ ہمیں تو کہتے ہیں سب کچھ عطا غریب نوازؒ
مزاجِ دارِ نبوت ہیں حق شناس ہیں آپ ۔ ملا ہے آپ سے حق کا پتا غریب نوازؒ!
تمہارے نام سے بیدار ہو گیا ہے دل ۔ تمہارا نام ہے معجز نما غریب نوازؒ!
تمہارے روضہ کا کرتے ہیں ہم جہاں دیدار ۔ تو یاد آتا ہے ہم کو خدا غریب نوازؒ!
ہیں بارگاہیں بہت یہاں اور بھی مگر خواجہؒ! ۔ تمہارا روضہ ہے کعبہ نما غریب نوازؒ!
خدا سمجھ کے جو پتھر کو پوجتے تھے لوگ ۔ ملا ہے آپ سے ان کو خدا، غریب نوازؒ!

بشیر وارثی ہے ملتجی عنایت کا
عطا ہو اس کو نیا حوصلہ غریب نوازؒ!

حضرت بشیر وارثی مرحوم

مُنقبت

حضرت بندہ نوازؒ

بندگانِ حق کے رہبر خواجۂ بندہ نوازؒ — ہیں دکن کے آپ سرور، خواجۂ بندہ نوازؒ!
اہلِ نسبت کو محبت آپ سے ہے دائمی — ہے کرم سب پر برابر، خواجۂ بندہ نوازؒ!
لُٹ رہی ہے دولتِ کونین در پر آپ کے — بانٹتے ہیں آپ گھر گھر، خواجۂ بندہ نوازؒ!
اِک طرف ہند الولیؒ ہیں خواجۂ ہندوستان — اک طرف ہیں بندہ پرور، خواجۂ بندہ نوازؒ!
جاں نکل جائے مری، روضہ پہ جب تک حاضری — جاگے خوابیدہ مقدر، خواجۂ بندہ نوازؒ!

حق نے بخشی ہے یہ نعمت ہم غریبوں کو بشیرؔ!
حکمراں ہیں آج ہم پر، خواجۂ بندہ نوازؒ

حضرت بشیر وارثی مرحوم

حضرت برہنہ شاہؒ

سجدہ گاہِ خلق ہے روضہ برہنہ شاہؒ کا
جلوہ گاہِ عشق ہے جلوا برہنہ شاہؒ کا

اِک جہاں پہلے بھی تھا شیدا برہنہ شاہؒ کا
اِک جہاں ہے آج بھی شیدا برہنہ شاہؒ کا

جذب کی حالت میں ساری عمر کاٹی آپ نے
خود فراموشی رہا منشا برہنہ شاہؒ کا

پا برہنہ، سر برہنہ، تن برہنہ آپ تھے
خلق سے باقی نہ تھا پردا برہنہ شاہؒ کا

یادِ حق میں زندگی گذری برہنہ شاہؒ کی
یادِ حق تھی عمر بھر شیوا برہنہ شاہؒ کا

دین ہے اللہ کی اُس دور سے اِس دور تک
مل رہا ہے خلقِ عالم کو تبرکا برہنہ شاہؒ کا

دیکھ کر خاموش رہتی کیا شریعت وقت کی
جذب میں پوشیدہ تھا جلوا برہنہ شاہؒ کا

حسنِ پنہاں کو نہ رہنا چاہیئے پنہاں بشیرؔ!
تھا یہی انداز سرتاپا برہنہ شاہؒ کا

حضرت بشیر وارثی مرحوم

حضرت بشیر وارثی مرحوم

غزل

"لطف دیکھا، ترا غضب دیکھا"
جلوہ ہر روز اک عجب دیکھا

حق پہ لڑتے ہیں، تشنہ لب دیکھا
جان دیتے ہیں سب کے سب دیکھا

جس نے شہِ عربؐ دیکھا
اُس نے دُنیا میں روئے رب دیکھا

مصلحت کے اسیر ہیں ہم لوگ
کہیں ایسا بھی روز و شب دیکھا

سچ یہی ہے کہ عاجزی کے سوا!
دست قدرت میں میں نے سب دیکھا

ذرّہ ذرّہ میں نظر آیا!
دیکھ کر میں نے تم کو جب دیکھا

وہ ہیں مائل بھی یا نہیں معلوم
چھیڑ کر میں نے اُن کو جب دیکھا

خوب کھل کر پیا لہو دل کا!
کتنا خنجر تھا تشنہ لب دیکھا

بے ارادہ ہی اُٹھ گئیں آنکھیں
جو بھی دیکھا، وہ بے طلب دیکھا

آئینہ بن گیا تھا میرا وجود
میں نے اپنے میں اُس کو جب دیکھا

جھیل کر دن کی سختیاں میں نے
راحت آثار حُسن سب دیکھا

ایسے باہم ہوئے ہیں حُسن و عشق
چشم با چشم، لب بہ لب دیکھا

اُس کی تعریف کی ہے دُنیا نے
جس کو دنیا نے با ادب دیکھا

دل ہے وہ جس میں عشقِ رب ہے بشیر
آنکھ وہ جس نے حُسنِ رب دیکھا

بشیر وارثی ایک عظیم انسان

جناب منوہر لعل بہار

بشیر وارثی مرحوم سے تقریباً (۴۵) سے واقف ہوں. وہ ہمارے محلے زیرین دھول پیٹ (ٹیکروا ڑی) میں چھپروں کے ساتھ آٹے کی گرنیوں کا کاروبار کرتے تھے۔

فوج سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد یہ اولوالعزم انسان اپنی محنت اور مشقت سے غربت کی سنگلاخ دیواروں کو گراتے ہوئے اس ترقی کی منزل پر پہنچا۔ اس زمانے میں وہ بھی جوان تھے اور میں بھی جوان تھا۔ سیتل سنگھ لشکری جو آج کانگریس (آئی) کے قائد ہیں اس زمانے میں وہ کم عمر طالب علم تھے اور ان کا مکان جو بھبکی والی کے نام سے مشہور تھا۔ اسی زمانے میں آنجہانی بھوانی پرشاد سحر جیسا آفاقی شاعر (کوی) بھبکی والی کے مکان میں کرایہ پر فروکش تھا. شعر و شاعری کی محفلیں جمتیں. بشیر وارثی مرحوم بھی بغرضِ سماعت شرکت فرماتے اور لطف اندوز ہوتے۔ وہ زمانہ رضاکارانہ پیریڈ کا تھا اور اس کے بعد پولیس ایکشن کا۔ ہندو مسلم فسادات ہوئے مگر ہم (ہندو مسلمان) اس محلے کے اپنے مسلم بھائیوں کی حفاظت کرتے اور مسلم بھائی ہندو بھائیوں کا ساتھ دیتے اس بھائی چارگی کے رشتوں کو استوار رکھتے۔ وہ بھی کیا پیارا زمانہ تھا کہ ہندو بھائی مسلمان (ہم محلہ) کے پسینے پر خون بہا دیتے اور مسلم بھائی اپنے ہندو بھائی کی آن پر مر مٹتے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ دھول پیٹھ کے گنیشوں کی تقریب جو ہر سال بڑے پیمانے پر ہوا کرتی تھی اس وقت کرفیو کے دوران میں بھی مسلم شعرا اور سامعین مشاعروں میں شرکت کرتے اور ہندو بھائیوں کی یہ ذمہ داری ہوتی کہ وہ بعد ختم مشاعرہ ان شعرائے کرام کو بحفاظت پرانے پل کے پار پہنچا دیتے.

فتح دروازہ کے قریب ایک چھوٹا سا چائے خانہ تھا. وہاں شعرا کی نشست رہتی جس میں آنجہانی منوہر لعل شاداب، ابنِ احمد تاب مرحوم، ندیم مغربی، تاثیر صدیقی وغیرہ شطرنج کھیلتے اور اپنی اپنی تازہ غزلیں سناتے۔ ہم دیکھتے تھے کہ بشیر وارثی مرحوم بھی شریک رہتے اور ان شعرا کے کلام کو سن کر محظوظ ہوتے۔

پھر کچھ دنوں کے بعد بشیر وارثی صاحب محلہ دھول پیٹھ سے دوسرے محلے میں منتقل ہو گئے۔ حالاتِ زمانہ نے ایسا رخ بدلا کہ برسوں ایک شہر میں رہ کر بھی ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ ایک عرصہ کے بعد یاقوت پورہ، چنچلگوڑہ اور حکیم تیموری صاحب مرحوم کے مشاعروں میں عارف بیابانی مرحوم کے ساتھ تشریف لاتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ عارف بیابانی مرحوم نے ہی ادبی حلقوں میں بشیر مرحوم کا تعارف کرایا۔

مجھے خاص طور پر تعجب اور مسرت ہوئی کہ بشیر صاحب بھی شعر کہتے ہیں۔ اس کے بعد میں پرانی حویلی ان کے آفس پر پہلی

مرتب کیا۔ جہاں ہمارے پرانے دوست بشیر وارثی مرحوم Sales Tax , Income Tax کے کام انجام دیتے تھے، ملاقات ہوئی۔ رفتہ رفتہ شعراء اور احباب کا دائرہ بڑھتا گیا۔

بشیر وارثی جیسا مخلص، بے لاگ انسان میری نظر سے بہت ہی کم گزرا۔ اپنے شہر ہی میں نہیں اضلاع کے ادبی حلقوں میں موصوف نے وہ نام پیدا کیا کہ ادبی دنیا آج تک ان کی ممنون و مشکور ہے۔ کئی ادبی انجمنوں کی دامے، درمے، سخنے، انھوں نے سرپرستی کی، چاہے وہ شہر کے مشاعرے ہوں یا اضلاع کی۔ کئی ایسے شاعر جو منظرِ عام پر نہیں تھے ان کو روشناس ہی نہیں کرایا بلکہ اپنی کوششوں اور مالی تعاون سے انھیں صاحبِ دیوان بنا دیا۔ اس صف کے سرفہرست شاعروں میں یہ خاکسار بھی ہے۔ صاحبِ موصوف نے میری کتابوں کی اشاعت کے لئے بھرپور تعاون کیا۔ میں ان کے احسانات تادمِ زیست فراموش نہیں کر سکتا۔

اکثر ہم احباب بشیر مرحوم کو کہتے کہ آپ کی غزلوں کی کتابت ہو چکی ہے آپ اپنے دیوان کی طرف بھی توجہ فرمایئے تو ہنس کر کہتے "بھائی میرے خاندان، احباب اور فلمی ساتھیوں کا دائرہ اتنا وسیع تر ہے کہ مجھے کم از کم ۵ ہزار جلدیں چھپوا کر تقسیم کرنی پڑیں گی۔ یہ کیا کم ہے کہ آپ حضرات کی کتابیں چھپوا کر ہی مجھے بے حد مسرت ہوتی ہے"

بشیر مرحوم نے بحیثیت شاعر بہت کم عرصے میں اپنی فکر و محنت سے ایسی شاعری کی کہ اچھے اچھے شاعر بھی انگشت بدنداں رہ جاتے۔ زود گوئی کا یہ عالم تھا کہ صبح اگر کسی طرحی مشاعرے کی طرح دی جاتی تو شام تک غزل، نعت، سلام جو بھی ہو تیار کر کے شام میں احباب کو سناتے۔ میرے خیال میں [illegible] کی فہرست میں موصوف سرِ فہرست نظر آئیں گے۔

یہ عاشقِ رسولؐ شاعر جن کا نعت گوئی میں کوئی جواب نہ تھا وہ قطعۂ تاریخ نکالنے میں بھی مہارت رکھتا تھا۔ اکثر لوگ موصوف سے تاریخ نکالنے کے لئے آتے تھے۔ بہرحال وہ ہر فن مولا تھے۔ ہر صنفِ سخن میں قلیل عرصہ میں انھوں نے اتنی ترقی کی۔ یہ خدا کی دین ہے اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے۔

بشیر صاحب کو ادب سے گہرا لگاؤ تھا، اور اردو ادب کی ترویج، اس کی تشہیر و اشاعت کو وقت کا اہم تقاضہ خیال کرتے۔ اردو کی یہ زبوں حالی اور پامالی ان کی حساس طبیعت پر بڑی گراں گزرتی تھی۔ چنانچہ ماہنامہ "ذوقِ نظر" کے اجراء کا محرک بھی یہی جذبہ و احساس تھا۔ ان ناساعد حالات میں، اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود بشیر صاحب نے جس محنت و جانفشانی کے ساتھ اس پرچہ کو جاری رکھا اور اسے اتنی کم مدت میں شہرت و قبولِ عام کی جو سند دلوا دی یہ ان کا ایک ایسا ناقابلِ فراموش کارنامہ ہے جو ان کے نام کو ادبی دنیا میں زندہ رکھنے کو بہت کافی ہے۔

آخر میں بارگاہِ رب العزت میں دست بدعا ہوں کہ خدا مرحوم کو غریقِ رحمت کرے اور لواحقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

اب ان کے چھوٹے صاحبزادے ظہیر وارثی اپنے والد کا نام سنبھال رہے ہیں۔ یہ نونہال بھی اپنے باپ کے نقشِ قدم پر رواں دواں ہے۔ خدا اسکی عمر و اقبال میں ترقی دے۔ آمین۔

غزل

حضرت بشیر وارثی صاحب مرحوم

یہ دل ہمارا دلِ فتنہ گر میں رہتا ہے
ہے شاہِ عشق حسینوں کے گھر میں رہتا ہے

جمالِ یار جو قلب و نظر میں رہتا ہے
سکوتِ شب میں وہی چشمِ تر میں رہتا ہے

تخیلات کے ہر دم اثر میں رہتا ہے
سنا ہے یار، لباسِ بشر میں رہتا ہے

علاجِ عشق مسیحا! ترا خیال غلط
یہ درد وہ ہے جو قلب و نظر میں رہتا ہے

ہے عرش و فرش ازل سے تری گذرگاہیں
کبھی حضر میں، کبھی تو سفر میں رہتا ہے

بنا کے اپنی ہی صورت پہ خاک کا پتلا
حیات بن کے وہ مٹی کے گھر میں رہتا ہے

بشیر وارثی! اِس کی تلاش گر ہے تمہیں
تم آنکھ موند کے دیکھو، نظر میں رہتا ہے

حضرت بشیر وارثی مرحوم

غزل

میں نے دنیا ترے بازار میں کیا کیا دیکھا ۔ خود تماشہ بنا اوروں کا تماشہ دیکھا
اک نئے دور کا ہر سمت اُجالا دیکھا ۔ ”درد کی رات گزاری تو سویرا دیکھا“
عمر بھر جلوۂ ترا دیکھنے گزاری لیکن ۔ پھر بھی ہم کہہ نہیں سکتے ترا جلوا دیکھا
جذبِ الفت کو یقیں تھا کہ تو آئے گا ضرور ۔ اسی اُمید پہ شب بھر ترا رستا دیکھا
جس جگہ ہو گئے مجروحِ نظر اہلِ نظر ۔ بس وہیں میں نے نمایاں ترا جلوا دیکھا
بخش دی چشم بصیرت نے بصارت ایسی ۔ قطرہ قطرہ میں سمویا ہوا دریا دیکھا

دِل نے احساس کی عظمت سے جلا پا کے بشیرؔ
ذرّے ذرّے میں محبّت کا اُجالا دیکھا

غزل

حضرت بشیرؔ وارثی مرحوم

مثلِ شفق حیا سے ہوا روئے یار سرخ　　رخسار آج اس کے ہیں جیسے انار سرخ
سرخی شباب کی ہے کہ لائی شراب کی　　آنکھیں ہیں اسکی جیسے کوئی لالہ زار سرخ
شاید تصورِ لبِ لعلیں کا فیض ہے　　آیا نہیں ہے یوں ہی شفق پر نکھار سرخ
اس سال آئی ہے عجب انداز سے بہار　　گلشن کا پتہ پتہ ہے مثلِ چنار سرخ
الزام قتل کا نہ کسی پر لگائیے　　آئی کہاں سے آپ کے دامن پہ دھار سرخ

شبیرؑ کے لہو نے کیا سرخرو بشیرؔ!
اِسلام کی قبا کا ہوا تار تار سرخ

سید محمد عباس ساجد

ذوقِ نظر اور بشیر وارثی

جناب بشیر وارثی صاحب نے حیدرآباد میں ایک نئے رسالے کو جنم دیا۔ جس کا نام "ذوقِ نظر" رکھا۔ اور اپنی خدمات اردو ادب کیلئے وقف کردیں۔ ماہنامہ "ذوقِ نظر" کی اجراء جنوری ۱۹۸۵ء شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔ اس کی رسم اجراء عاشق رسول الحاج جناب مرزا انکور بیگ مرزا نے انجام دی۔ اور صدارت پروفیسر ڈاکٹر عبدالستار خاں نے بتاریخ ۹؍ دسمبر ۱۹۸۴ء بروز یکشنبہ ۳۰۔۱۰ بجے ساعت صبح بمقام اردو گھر مغلپورہ میں عمل میں آئی۔ بحیثیت مہمان خصوصی جناب عابد علی خان صاحب مدیر سیاست پروفیسر ڈاکٹر غلام عمر خان اور ڈاکٹر سید مجاور حسین رضوی تھے۔ جلسہ کا آغاز قرأت اور نعت شریف سے ہوا۔ سامعین کی کثیر تعداد موجود۔ شکریہ جناب بشیر وارثی نے ادا کیا۔ پہلے شمارے "شافع محشر نمبر" میں ممتاز ملک کے مشہور علماء کے ۱۸ مضامین موجود ہیں۔ اور شعرائے کرام کا اسمار نعتیں بھی موجود ہیں۔ "ذوقِ نظر" کے چیف ایڈیٹر جناب بشیر الدین وارثی صاحب تھے۔ مدیر انتظامی خورشید جنیدی صاحب مدیر اعزازی ڈاکٹر یعقوب عمر صاحب ناظم نشر و اشاعت عابد قادری صاحب اور مشیر قانونی محمد شمیم ایڈوکیٹ تھے۔ مجلس مشاورت عبدالستار خاں ڈاکٹر وحید اشرف میسٹر احمد علی احمد جلیل عقیل ہاشمی رہے۔ بمقام چھتہ بازار سے ذوقِ نظر شائع ہوتا رہا۔ اس ماہنامہ کی قیمت [illegible] روپے رکھی گئی تھی۔ پہلا شمارہ ہی چھوٹی سائز میں شائع ہوا۔ اس کے بعد تین شمارے ڈیمی سائز میں شائع ہوئے۔ اس کے بعد حسب معمول شائع ہوتا رہا۔ اکتوبر ۱۹۸۷ء سے ذوقِ نظر بڑی جسامت کے ساتھ شائع ہونا شروع ہوا۔ اکتوبر ہی میں حضرت وارث علی شاہ نمبر شائع ہوا۔ جس کی مسلسل خوب صورتی بشیر وارثی صاحب کی زندگی تک رہی۔ انتقال سے قبل ماہ اگسٹ کے شمارے کی بھی کتابت ہو چکی تھی۔ مگر افسوس کہ یہ شمارہ شائع نہ ہو سکا۔ اب ظہیر الدین ظہیر وارثی نے اپنے والد بزرگوار کے نام سے "ذوقِ نظر" کا بشیر وارثی نمبر شائع کر رہے ہیں۔ جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں رونق افروز ہے۔ جس میں مدیر اعلیٰ جناب بشیر وارثی صاحب کی حیات کارنامے ان کی شاعری اور سلسلۂ وارثی سے نسبت کے مطابق مضامین موجود ہیں۔

اس خصوصی نمبر کی اشاعت کی ذمہ داری جناب بشیر وارثی صاحب کے فرزند ظہیر الدین ظہیر وارثی کے سر جاتی ہے۔ ذوقِ نظر ۱۹۸۵ء سے ۱۹۸۶ء اپریل تک اعجاز پرنٹنگ پریس میں چھپوا کر شائع کیا گیا۔ اس کے بعد اقبال نمبر سے اس کی اشاعت دائرہ الیکٹرک پریس میں ہوتی رہی ہے۔ "ذوقِ نظر" نے اب تک ۱۵ خصوصی نمبر شائع کئے ہیں۔ جنوری ۱۹۸۶ء کے غوث اعظم نمبر میں جو روضۂ مبارک کی تصویر شائع کی گئی وہ مورخ دکن جناب ہدایت علی خاں مندوزئی نے اپنے ذخیرہ سے دی تھی۔

جناب بشیر وارثی صاحب نے ایک گراں بہا خدمت یہ بھی انجام دی کہ بغیر کسی معاوضہ کے اعزازی طور پر اس ماہنامہ کو ملک اور بیرون ملک کے کونے کونے کے کتب خانوں لائبریریوں اور کالجس کو بھیجتے رہے۔ جناب بشیر وارثی صاحب نے دوسروں کے شعری مجموعہ کو بھی اپنے تعاون سے چھپوایا۔ اور بہت سے صاحب دیوان شاعروں کو بھی مالی تعاون

دیتے رہے۔ ہر ایک کے دُکھ درد میں وہ ہمیشہ شریک اور آگے رہے۔ جناب بشیر وارثی صاحب نے اپنی زندگی تک شاعروں کی خدمت کے لئے ایک ٹرسٹ کھول رکھا تھا۔ جس کا نام بشیر وارثی ٹرسٹ تھا۔ بہت سے نامور لوگوں نے انہیں یہ بھی مشورہ دیا کہ اس ماہنامہ کو بند کر دیں کیا فائدہ ہے۔ تو جناب بشیر وارثی صاحب نے کہا کہ جب تک دم میں دم ہے میں نقصان برداشت کرتے ہوئے بھی اُردو ادب کی ترقی کے لئے اس رسالے کو شائع کرتا ہوں گا۔ جناب بشیر وارثی صاحب کو "ذوقِ نظر" سے بہت اُمیدیں وابستہ تھیں۔ جناب بشیر وارثی صاحب شاعروں کی گروہ بندی کے سخت مخالف تھے۔ بہت سی بزموں کے صدر اور بانی بھی تھے۔ بہت سی بزموں کی طباعت و اشاعت کے اخراجات برداشت کرکے مالی اعانت کرتے رہے۔ جناب بشیر وارثی اُصول پسند فرض شناس اور ملنسار شاعر تھے۔ ملک اور بیرونی ملک میں آپ کا کلام رسالوں میں شائع ہوتا رہا۔ آل انڈیا ریڈیو اور ٹی وی سے بھی آپ کا کلام نشر ہوتا رہا۔ جناب بشیر وارثی صاحب زبان کے بے باک تھے۔ نہ تو وہ کسی کی چاپلوسی کرتے تھے اور نہ کسی کے سہارے کے محتاج رہے۔ انہوں نے خود اپنا مقام بنایا تھا۔ بے شمار کتابوں میں آپ کا مختصر تذکرہ موجود ہے۔ اردو کی ہفتہ وار اور ماہنامہ میں آپ کا تذکرہ موجود ہے۔ انتقال کے دوسرے دن ہی جناب وقار خلیل نے روزنامہ منصف میں "بشیر وارثی کی یاد میں" کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا۔ اور ان کے کارنامۂ حیات پر روشنی ڈالی۔ بشیر وارثی صاحب کے گھر پر بھی ایک چھوٹا سا کتب خانہ ہے۔ جس میں ہزار ہا دینی، اخلاقی کتابیں اور شعرا کے دواوین موجود ہیں۔ — راقم الحروف کو جناب بشیر وارثی صاحب کے قریبی دوست جناب ماجد دفائی کے فرزند ہونے کی بنا پر ان سے بخوبی واقفیت ہے۔ راقم کو ان کی سرپرستی میں کام کرنے کا موقع ملا۔ جناب بشیر وارثی صاحب اپنے اخراجات پر دوسرے شعراء کو اضلاع کے مشاعروں میں لے جایا کرتے تھے۔ راقم کو بھی بے شمار مشاعروں میں بشیر وارثی کا کلام سننے کا موقع ملا۔

جناب بشیر وارثی سلسلہ وارثیہ کے بے شمار سبق آموز واقعات اپنے دوستوں اور عزیزوں کو سنایا کرتے تھے۔ جناب بشیر وارثی صاحب بزرگانِ دین سے بیحد محبت اور عقیدت رکھتے تھے۔ ہمیشہ خوفِ خدا دل میں رہا اور ہمیشہ مغفرت کے لئے اشعار کہتے رہے۔ نہ جانے کس شعر کی بنا پر مغفرت ہو جائے۔

قطعۂ تاریخ

اہلِ محفل آج کیوں خاموش ہیں
چھیڑ دی ہے کس نے کس کی سرگزشت
ہاتفِ غیبی نے یہ آواز دی
ہے بشیر وارثی اہلِ بہشت

۱۹۸۷ء

نتیجۂ فکر
الحاج محمد شمیم
-: ایڈوکیٹ :-

منظوم تاریخِ وفات حضرت بشیر وارثی مرحوم و مغفور

تھے بشیر وارثی اک شاعرِ شیریں بیاں
چاہتے تھے آپ کو اِس شہر کے پیر و جواں
آپ کی ہستی تھی بے شک جانِ بزمِ شاعراں
شاعری کی محفلوں کے آپ تھے رُوحِ رواں
شاعروں کا آپ کے مسکن پہ رہتا تھا ہجوم
شغل شعر و شاعری رہتا تھا جاری جاوداں
آپ کے اشعار سُن کر لوگ سب دُھنتے تھے سَر
شوخیِ الفاظ کہتی تھی کہ شاعر ہے جواں
شعر تحت اللفظ پڑھنے کا عجب انداز تھا
ایسی خوبی اور ندرت ہے ترنّم میں کہاں
تھے یہ مالک و مُدیر پرچہ "ذوقِ نظر"
جو ادب کی شان ہے اَوجِ ادب ہے بے گُماں
چھپتے ہیں مضمون اِس میں ہر طرح کے لاجواب
اِس سے کیا محروم ہو جائیں گے سارے قدرداں
موت ایسی کیسی حیرت ناک و عبرت ناک ہے
وارثی صاحب ہوئے اللہ کو پیارے ناگہاں
گر کوئی پُوچھے سُہاؔ سالِ وفاتِ پُرملال
کہہ دو "ہاں مرحوم تھے اِک شاعرِ شیریں زباں"
(۱۹۸۷ء)

محمد ابراہیم سُہاؔ قادری۔ موظف اِنسپکٹر سروے اینڈ لینڈ ریکارڈ

غزل

حضرت بشیر وارثی مرحوم

غم نہیں تارِ نفس آج جو اپنا ٹوٹا ✧ جانِ جاناں سے دہر سے رشتا ٹوٹا
جب حضوری میں خدا کی اکیلا پہنچا ✧ آل اولاد سے احباب سے ناطا ٹوٹا
چشمِ ساقی کا کرشمہ تھا کہ تقدیر پھیر ✧ ہاتھ لگتے ہی مرا ساغرِ صہبا ٹوٹا
ٹھہر و اے ہمسفر و درد کا درماں کر لوں ✧ پاؤں زخمی ہے مرا پاؤں میں کانٹا ٹوٹا
سب تو اپنے ہی تھے محفل میں کوئی غیر نہ تھا ✧ پھر تعجّب ہے بھرم آپ کا کیسا ٹوٹا
منزلِ عشق میں ایسا بھی مقام آیا ہے ✧ دار پر ہم جو چڑھے دار کا پھندا ٹوٹا

ان کو آنا تھا نہ آئے دمِ آخر بھی بشیرؔ
ہائے کس موڑ پہ یہ خواب سہانا ٹوٹا

حضرت بشیر وارثی مرحوم

غزل

دل ہے مقام تیرے قیام و قرار کا
توسین جلوہ گاہ ہے دیدارِ یار کا

یہ دبدبہ، یہ شان، یہ رتبہ وقار کا
احسان مجھ پہ ہے مرے پروردگار کا

اس کا کرم ہے اس کی عطا اس کا انتظام
اک نور ہے گرہ میں کلی کی بہار کا

جشنِ بہار آؤ منائیں تمام رات
پھیلا ہے نور خوب دلِ داغدار کا

چھائی ہے خاک کوچۂ جاناں کی بار بار
غازہ چڑھا ہے چہرے پہ گرد و غبار کا

نظروں سے دور، دل سے نہایت قریب ہے
آنکھوں پہ پھر نظر میں ہے دیدار یار کا

ہر روز خیر و شر کے مطالب نئے نئے
مصرف غلط ہوا ہے میاں اختیار کا

نرگس سے آپ پوچھئے وہ جانتی ہے خوب
"رویا ہے کون تھام کے دامن بہار کا"

شمس و قمر بساط میں آتے نہیں بشیرؔ
رخسار ہی جواب ہے رخسارِ یار کا

بشیر

"ایک سپاہی بھی ایک شاعر بھی"

از
جناب راحت عزمی

بشیر وارثی خود سپاہی تھے اور "پیشۂ آبا" بھی سپہ گری تھا۔ تاریخِ ادبِ اردو کا کہنا ہے کہ غالب کا "پیشۂ آبا" بھی سپہ گری تھا۔ غالب اردو اور فارسی کے عظیم فلسفی شاعر تھے۔ تاریخِ ادب کے اس اشارے سے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ سپہ گری سے شاعری کا ضرور کوئی رشتہ یا تعلقِ خاطر ہے۔

بشیر وارثی بھی سپاہی تھے اور اردو کے اچھے شاعر تھے۔ جب میں ان کی ذات اور ان کی شاعری میں ربط تلاش کرتا ہوں تو ایک بات جو سب سے نمایاں طور پر نظر آتی ہے وہ یہ کہ بشیر وارثی ایک سپاہی کی حیثیت سے جتنے سادگی پسند تھے اور بے ریا دل رکھتے تھے ان کی شاعری بھی اتنی ہی سادہ اور غیر ضروری ادبی تکلفات سے بری ہے۔

سپاہی کی فطرت یہ ہوتی ہے کہ اس کے دل اور زبان میں فاصلہ نہیں ہوتا، فرائض کی ادائگی میں کوتاہی نہیں کرتا، دوست کے لئے بچھ جاتا ہے اس کا دل محبت سے مملو ہوتا ہے۔ انسان دوستی اسکی رگوں میں خون بن کر سدا گرم رفتار رہی ہے، وہ لگی لپٹی کو پسند نہیں کرتا۔ جو کہتا ہے دو ٹوک کہتا ہے زمانہ سازی اس سے کوسوں دور رہتی ہے۔ جو سوچتا ہے بے کم و کاست بیان کر دیتا ہے چونکہ دل کا صاف ستھرا ہوتا ہے اس لئے وہ اس کی پرواہ بھی نہیں کرتا کہ اس کی باتیں کس کے لئے کڑوی کسیلی ہیں اور کس کے لئے میٹھی۔ جس کام کو کرنے کی ٹھان لیتا ہے اسے مکمل کئے بغیر دم نہیں لیتا اپنے مقررہ راستہ پر چلتا ہے کسی کی پسند ناپسند کو اپنے قریب آنے نہیں دیتا اپنی راہ چلتے ہوئے ہمیشہ یہ کوشش کرتا کہ وہ خود نہ کسی کی زد میں آجائے اور نہ کسی کو اپنی زد میں آنے دے، ہاں اگر دشمن اور کھلا دشمن ہو تو بات دوسری ہو جاتی ہے۔ اونچے درجہ کے سپاہی کا یہی وطیرہ رہتا ہے کہ خود حملہ آور نہ ہو لیکن مدافعت میں سپاہیانہ جوہر کھل کر دکھائے۔ مفتوح پر رحم بھی اسکی فطرت کا ایک جوہر ہوتا ہے۔ ایک سپاہی مقدور بھر کوشش

کرتا ہے کہ مغلوب پر دباؤ ظلم کی حد سے دور ہے۔

ایک اچھے سپاہی کی ان چند خصوصیات کو سامنے رکھ کر جب میں بشیر وارثی کو دیکھتا ہوں تو ان میں تمام سپاہیانہ جوہر اپنی بہار دکھاتے نظر آتے ہیں۔ جس وقت میں ان سے متعارف ہوا تھا اس وقت ان کے جسم پر وردی نہیں تھی لیکن انداز اور طور طریق سے وہ خود سپاہی کی حیثیت سے متعارف ہو جاتے تھے۔ وظیفہ کے بعد انھوں نے جو کام سنبھالا تھا اس میں بھی سادگی اور صفائی کی تمکنت موجود تھی۔ وہ سیل ٹیکس کے مشیر تھے اس پیشہ میں بھی "ریاضیاتی صداقت" کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ مشہور ہے کہ اس پیشہ میں ہیرا پھیری بہت ہوتی ہے۔ دروغ بر گردنِ راوی کہا جاتا ہے کہ لوگ "حسابی چکّے" دے کر لکھ پتی ہو جایا کرتے ہیں جناب بشیر وارثی کا دامن سپاہی کی وردی کی طرح پاک رہا۔ جب خاص انداز میں وہ کرن انگلی کے درمیان سگریٹ کو دبا کر اور کش لگا کر گفتگو کرتے تو ان کے اس انداز میں بڑے استغنا اور بڑی بے نیازی کی کیفیت ہوتی ان کی کشادہ دستی اور داد و دہش کے تو سارے دوست احباب معترف ہیں۔ وہ کسی کا درد و غم نہیں سن سکتے تھے۔ ضرورت مند کی ضرورت کو اپنے امکان کی حد تک پورا کرنے میں مستعد رہتے تھے۔ شعرا برادری میں بھی ان کی کشادہ دستی ہمیشہ سرگرم رہتی۔

شعر و ادب کی خدمت میں بھی وہ کبھی کوتاہ دست نہیں رہے بلکہ اکثر اپنے امکان سے آگے نکل جاتے تھے ادبی تنقیدی اصولوں میں سے ایک اصول یہ بھی ہے کہ کسی ادب پارہ کو جانچنے کے لیے اس کے تخلیق کار سے ملا کیا جائے۔ اسی اصول پر جب میں نے بشیر وارثی کے کلام کا مطالعہ شروع کیا تو قدم قدم پر مجھے محسوس ہوا وہ اپنے قلب و ذہن اور قلم کے درمیان کسی فاصلہ کے روادار نہیں رہے۔ ان کی سیدھی سادھی شاعری اسی لیے بہت اچھی ہے کہ اس میں سچائی ہے۔ شاعری وہی اچھی ہوتی ہے جو سچی ہوتی ہے۔

بشیر وارثی کے فکر و جذبہ کے اظہار و ابلاغ میں بھرپور صداقت ہے وہ جیسا سوچتے ہیں صاف ستھرے اور آسان لفظوں میں اسی طرح ادا کر دیتے ہیں۔ حالی کی شاعری میں بھی یہی پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ شاعر کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ اس میں صداقت ہو اور بے ساختہ ادا ہو۔ ظاہر ہے بے ساختگی دوراز کار ترکیبوں وغیرہ کی متحمل نہیں ہوتی۔ میرا اس سے یہ مطلب نہیں ہے کہ ترکیبوں، محاوروں اور روزمرّہ کو غیر اہم سمجھا جائے۔ لب و لہجہ اور رنگ و آہنگ میں اسی کے تقاضے نمایاں ہوں گے۔ ماہر القادری کی زبان میں یہ کہنا چاہتا ہوں۔ ؎

شعر ہے دراصل ماہر! ترجمانِ واردات
دل پہ جو گزرے وہی منظوم ہونا چاہیئے

دل پہ جو گزرتی ہے اس کو منظوم کرنے کیلئے ضروری ہوتا ہے کہ لفظوں کے انتخاب کا اچھا سلیقہ بھی ہو کہ وہ کیفیتوں کے ترجمان بن سکیں دوسرے یہ کہ شاعری صرف جذبہ ہی کی ترجمان نہیں ہوتی۔ وہ فکر و خیال کی بھی ترجمان ہوتی ہے اس واسطے

ضروری ہے کہ دماغ بھی دل کا ساتھ دے انہی دونوں کے مضبوط اتحاد سے اچھی شاعری وجود میں آتی ہے۔

بشیر وارثی کی شاعری سادہ لفظوں کی شاعری ہے۔ چاہے وہ حمد و نعت ہو یا غزل ان کے اشعار پڑھتے وقت محسوس ہوتا ہے کہ ہم آپس میں باتیں کر رہے ہیں نعت کا یہ شعر دیکھئے ؎

جہاں والو! جہاں کے مالک و مختار آتے ہیں
محمد مصطفیٰ صلی علیٰ تشریف لاتے ہیں

غزل کا انداز ملاحظہ ہو ؎

قتل کر کے مجھے مرا قاتل — مرے بارے میں سوچتا ہوگا

نظروں نظروں میں انتخاب ہوا — وہ بھی ایسا کہ لاجواب ہوا

اجل کا خوف نہ جینے کی آرزو دل میں
بڑے مزے سے گزرتی ہے زندگی تنہا

بشیر وارثی نے کتنے سادہ اور پُر اثر انداز میں اپنے دل کی بات بیان کر دی ہے یہی ان کا منفرد اسلوب ہے۔ اگر کوئی گہری اور فکر انگیز بات بھی کہنا چاہتے ہیں تو اس کے اظہار کے لئے کوئی نیا راستہ نہیں ڈھونڈتے بلکہ اپنا اسلوب برقرار رکھتے ہیں ؎

کعبہ خدا کا گھر ہے مگر خلق کے لیے
دل سے بڑا خدا کا کوئی اور گھر نہیں

اپنی حقیقت جان کے میں نے اپنے رب کو سمجھا ہے
جس نے محبت اس سے کی ہے عشق اسی کا سچا ہے

میرے دل نے یہ صدا دی کہ ہے سب تجھی میں پنہاں
مجھے راستہ دکھایا مرے دل کی روشنی نے

اس بلیغ اشاریت کو کس قدر سہل ممتنع انداز ہے۔

؎ جنوں کی حد سے پرے ہے یہ آخری سجدہ
سر نیاز نہ اٹھے گا کاٹ کر لے جا

بشیر وارثی نے بھی اور شاعروں کی طرح دنیا کو دیکھا اور سمجھا اور اللہ کی عطا کردہ نعمتِ حیات کو صحیح طریقہ سے گذارنے کے لیے ان کی فکر نے بہ پابندی شریعت ایک راستہ متعین کیا۔ ان کا اپنا نظریہ تھا ان کے سماجی زندگی کے دائرے میں ساری انسانیت شامل تھی ؎

یہ اخوت کا تقاضہ ہے رہو مل کے بشیر!
غم انساں ہو تو پھر غم کو بدل سکتے ہیں۔

انھوں نے نااہل قیادت پر اس قدر بھرپور تنقید کی ہے کہ اس کا جواب نہیں لیکن اس کے لئے جو مثبت طریقہ اختیار کیا ہے وہ ایک کلیہ بن گیا ہے۔

فکر اس کی ہے، شعور اس کا، قیادت اسکی
خونِ دل سے جو چراغوں کو جلا سکتا ہے

جس شخصیت میں یہ خصوصیتیں نہ ہوں چاہے وہ کتنا ہی بڑا آدمی ہو وہ قوم کا قائد نہیں ہو سکتا۔

یہ دنیا بھی عجیب دنیا ہے۔ خود غرضوں کی اس بستی میں بے غرض انسان کا سانس لینا بھی دو بھر ہو جاتا ہے بشیر وارثی کے ساتھ شائد کوئی ایسا ہی حادثہ ہوا تھا، آدمی سیدھے تھے دل کی حالت صاف صاف بیان

کردی ہے

یوں ہی اکیلا میں صحرا میں جیسے کوئی بے پات کا پیڑ
کوئی نہ مونس، کوئی نہ ہمدم سب سے رشتہ ٹوٹ گیا

بشیر وارثی کا کلام جب طبع ہو کر منظرِ عام پر آئے گا تب ان کی شخصیت اور ان کا شعری قد دونوں کھل کر ادبی دنیا کے سامنے آئیں گے۔ ان چند شعروں سے اتنا اندازہ تو قائم کیا جا سکتا ہے کہ وہ "حالی مزاج" شاعر یوں تھے کہ انھوں نے بہت سادہ زبان استعمال کی ہے۔ مثلاً یہی کہ حالی نے ایک مقام پہ کہا تھا ؎

بات جب ہے کہ دشمنوں سے بھی
جب کرو دوستی کی بات کرو

ایسے ہی آسان زبان کے شعر بشیر وارثی کے یہاں کثرت سے ملتے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ اس مرنے والے میں بہت سی خوبیاں تھیں۔ یہ خوبیاں ان کی عملی زندگی میں بھی تھیں اور ان کے شعری سرمایہ میں بھی ہیں۔ وہ وسیع المشربی کے مناظر سب دوستوں نے دیکھے ہیں۔
"حق مغفرت کرے، عجب آزاد مرد تھا"

۷۸۶
۹۲

محترم صاحب حیدرآبادی
(از نیویارک)

قطعاتِ تاریخ

بہ انتقال جناب بشیر وارثی صاحب مرحوم

قطعہ

قضا لینے کو آئی ان کی صاحب!
بھلا کب کوئی جائے بن بلائے
ملی ہے ازسرِ دیدار تاریخ
بشیر وارثی کوثر پہ آئے

۱۹۸۷ء

دیگر

پسِ مردن ہیں گلزارِ جناں میں شادماں ہر دم
کہیں کلیوں، کہیں پھولوں سے گلشن کے مخاطب ہیں
دیا ہے سالِ رحلت ہاتفِ غیبی نے یہ مجھکو
کہو صاحب! بشیر وارثی طوبیٰ کی جانب ہیں

۱۴۰۷ھ

عابد قادری

نامۂ سپاس

(بشیر وارثی مرحوم کے حینِ حیات لکھی گئی ایک نظم)

با مروّت، نیک خو، سرمایہ دارِ فکر و فن
ایسے ملتے ہیں زمانے میں بہت کم آدمی

قدر دانِ علم و فن، دلدادۂ شعر و سخن
جن کو فطرت سے ملا ہے خود بھی ذوقِ شاعری

جو سمجھتے ہیں کہ کیا ہے اقتضائے فکر و فن
جن کی خواہش ہے پھلے پھولے دکن میں شاعری

اِن کی ہے تحویل میں گنجینۂ شعر و سخن
یہ امانت فکر و فن کی باعثِ نازش ہوئی

شاعری جن کا بجائے خود غزل بانکپن
جو شعورِ فکر کی آماجگاہوں میں پلی

ان کا دفتر خود بھی ہے اک شاعروں کی انجمن
جب کبھی دیکھو یہاں ہوتی رہے گی شاعری

جو سبک گامی سے ہیں راہِ وفا میں گامزن
حضرتِ وارث علیؒ کرتے ہیں جن کی رہبری

پیرِ وارثؒ کی عقیدت نے کھلائے وہ چمن
جن کی خوشبو سے معطر ہے مشامِ زندگی

مرکزِ قلب و نظر جن کے رسولِ ذوالمننؐ
سایۂ رحمت میں جن کے کٹ رہی ہے زندگی

اب یہی اپنی دعا ہے از طفیلِ پنجتنؑ
کاتبِ تقدیر لکھ دے ان کے حق میں ہر خوشی

زندگی بھر یہ نہ دیکھیں صورتِ رنج و محن
آل کو اولاد کو یارب! عطا ہو خرمی

جس کسی کو دیکھئے رکھتا ہے ان سے حسنِ ظن
جو میرے ممدوح ہیں عابدؔ! بشیر وارثی

بشیر وارثی مرحوم

غزل

مجھے نورِ عشق بخشا مرے دل کی روشنی نے   مری آبرو بچالی مرے ذوقِ بندگی نے

یہ خرد کا ہے تقاضہ کروں فکرِ آخرت بھی   ملے گوشۂ سکوں اک مجھے چند روزہ جینے

تری رحمتیں سلامت یہ کرم ہے تیرا ساقی   مجھے آدمی بنایا مرے ذوقِ مے کشی نے

مرے دل نے یہ صدا دی کہ ہے سب تجھی میں پنہاں   مجھے راستہ دکھایا مرے دل کی روشنی نے

مری فکر سے منوّر یہ جہانِ رنگ و بو ہے   "یہ نیا نظام بخشا مرے ذوقِ آگہی نے"

ہے تمھی سے بزمِ امکاں تمھی وارثِ جہاں ہو
کہ تمھی سے زیست پائی ہے بشیر وارثی نے



حضرت بشیر وارثی کی صدارت میں پہلا ٹی. وی مشاعرہ حیدرآباد کے ممتاز شعرا کی شرکت

از
انور ہاشمی
"مدیر شاہکار ہفت روزہ"

موت سے کیسکو رستگاری ہے ؎ آج وہ کل ہماری باری ہے

مالکِ حقیقی پروردگارِ عالم نے آج کے ترقی یافتہ انسانوں سے دو چیزیں اپنے پاس محفوظ رکھی ہیں اور ان دونوں حقیقتوں پر اللہ پاک کو پورا پورا اختیارِ کل حاصل ہے۔ جہاں انسانوں نے آسمانوں پر کمندیں پھینکیں چاند پر چہل قدمی کی، ہواؤں کے دوش پر مہینوں اور سالوں کا فاصلہ چند گھنٹوں میں عبور کرنے کا مظاہرہ کیا دنیا کے ہر ملک سے گھر بیٹھے گفتگو کرنے کا طریقہ ایجاد کیا اور اپنے افرادِ خاندان کے ساتھ بیٹھکر ٹی وی کے ذریعہ دنیا کے تمام حالات اور کھیل کود کا نظارہ اپنے ہی گھر کے دیوان خانہ میں کرلیا۔ مگر!

حضرتِ انسان آج تک موت اور رزق دینے والی طاقت پر اپنی حکومت نہ چلا سکا۔ حضرتِ انسان ترقی کرتے کرتے چاند کی منزلیں طے کرگیا اور موت کی منزل پر اسکی ترقی سائنس اور نئے نئے ایجادات سب بیکار اور ناقص نظر آتے ہیں۔ آج کل آپ حضرات مسلسل اخبارات میں قلب کی حرکت بند ہوجانے کی باعث انسانوں کی اچانک موت کی اطلاع برابر پڑھتے رہتے ہیں۔ انسان کے پورے جسم میں صرف حضرتِ "دل" ہی ایک ایسی چیز ہے جسے سارے بدن کا اور انسان کی حیاتِ ابدی کا سرچشمہ کہا جاتا ہے۔ دل کی حرکت گھڑیال کے اس پنڈولم کی طرح ہے جو مسلسل چلتا رہتا ہے اور اپنا وقت بتاتا رہتا ہے۔ ادھر پنڈولم کی حرکت بند ہوئی گھڑی نے اپنا وقت بتانا بند کردیا۔ بالکل اسی طرح دل کی حرکت بھی گھڑی کے پنڈولم کی طرح ہے۔ ادھر دل نے چلتے چلتے اچانک اپنی حرکت بند کردی اور حضرت انسان دنیائے فانی سے عالم بالا کی طرف کوچ کرگیا۔ اتفاق سے راقم الحروف بھی تقریباً (۷) سات ماہ سے دل کی شکایت کا مریض ہے۔ ہمارے شہر کے ایک قدیم اور بزرگ وضعدار شخصیت کے مالک حضرت

بشیر وارثی مرحوم بھی دل ہی کے ہاتھوں دیکھتے ہی دیکھتے اللہ کو پیارے ہوگئے۔ دیوان دیوڑھی چھتہ کمان کے آخری حصہ میں مرحوم کا انکم ٹیکس کے حسابات کا آفس تھا۔ مختلف بڑی بڑی کمپنیاں مرحوم بشیر وارثی کے خدمات حاصل کرتی تھیں۔ مرحوم اپنی اس بے پناہ مصروفیتوں کے باوجود شعر و شاعری سے بے انتہا شغف رکھتے تھے۔ شاعروں، ادیبوں، دانشوروں کے قدردان تھے۔ خود بھی ایک بہترین شاعر تھے۔ راقم الحروف نے اکثر دیکھا ہے کہ مغرب کے بعد حیدرآباد کے اکثر شعرائے کرام کا ایک جمگھٹا مرحوم کے اطراف جمع رہتا۔ چائے کے دور چلتے۔ مشاعروں کے پروگرام ترتیب دیئے جاتے۔ حیدرآباد کے اکثر شعرائے کرام کے مجموعۂ کلام کی طباعت و اشاعت میں بھی مرحوم دل کھول کر حصہ لیتے تھے۔ اس وقت ہم اپنے ناظرین کو حضرت بشیر وارثی کے ایک یادگار ریلے ٹی۔ وی مشاعرہ کی یاد دلاتے ہیں۔ یہ مشاعرہ ۱۹۷۶ء میں مرحوم کی صدارت میں ادارۂ شاہکار رہفت روزہ کی جانب سے منعقد کیا گیا تھا۔ جسے پہلی مرتبہ حیدرآباد کی سرزمین پر ٹی وی والوں نے فلمایا تھا۔ اس مشاعرہ کے مہمانِ خصوصی جناب تجمل حسین صاحب تہذیبی سفیر تھے۔ حیدرآباد کے ممتاز شعرائے کرام جناب صلاح الدین نیر، رئیس اختر، فیض الحسن خیال، جناب خیرات ندیم، مرحوم علی سرفد، منوہر لعل بہار، بزرگ شاعر حضرت راز عابدی، مرحوم [illegible] عزیز بھارتی، ڈاکٹر اسد انصاری، محترمہ سعادت جہاں رضوی سحر، محترمہ عزیز النساء حیا [illegible]

دوسرے کئی شعرائے کرام نے اس یادگار مشاعرہ میں حصہ لیا تھا۔ حیدرآباد کے نامور شاعر جناب کنول پرشاد کنول نے بھی مشاعرہ میں اپنا کلام پیش کر کے مشاعرہ کو لوٹ لیا تھا۔ سب سے آخر میں معتمد مشاعرہ راقم الحروف اور صدر مشاعرہ حضرت بشیر وارثی مرحوم و مغفور نے اپنی بہترین غزل سنا کر حاضرین محفل سے خوب داد حاصل کی۔ ہنری مارٹن انسٹیٹیوٹ کا ہال اپنی تنگ دامنی کی شکایت کر رہا تھا۔ حیدرآباد کے اہلِ ذوق حضرات و خواتین کی کثیر تعداد نے اس مشاعرہ میں شرکت کی تھی۔ یہ مشاعرہ ۱۹۷۶ء یومِ آزادی ۱۵ اگست کی مسرت میں منعقد کیا گیا تھا۔ گو متذکرہ اس تاریخی مشاعرہ میں تقریباً پندرہ (۱۵) یا سولہ (۱۶) شعرائے کرام کو ٹی وی والوں نے فلمبند کیا۔ مگر جس وقت راقم الحروف اور صدر مشاعرہ کے کلام سنانے کی باری آئی ٹی۔ وی کا فلم ختم ہوگیا۔ اس وقت صدر مشاعرہ بشیر وارثی مرحوم نے زیرِ لب مسکرا کر یہ جملہ کہا تھا کہ انور ہاشمی صاحب آپ کا یہ مشاعرہ ٹی وی کا پہلی بار بہت کامیاب رہا۔ اگر اتفاق سے ٹی وی کا فلم ختم ہوگیا ہے تو آپ افسوس نہ کیجیے کم از کم ہمارے حیدرآباد کے دوسرے شعرائے کرام کو تو پہلی مرتبہ ٹی وی پر پیش کرنے کا سہرا آپ کے سر ہے۔ خدا مغفرت کرے حضرت بشیر وارثی مرحوم پر موت کے بے رحم ہاتھوں نے محفلِ شعر و سخن کے ایک ایسے جگمگاتے چراغ کو بجھا دیا جو ہر محفل کی رونق تھا۔ ہر شاعر و ادیب کے دکھ درد کا شریک، ایک اچھا انسان، ایک اچھا شاعر، خداوند کریم آپ کے تمام فرزندوں اور متعلقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

حضرت بشیر وارثی مرحوم کی نعتیہ شاعری

از: قاری جمالِ محمد طاہر حیدرآبادی

بلغ العلی بکمالہ کشف الدجی بجمالہ
حسنت جمیع خصالہ صلوا علیہ وآلہ

عاشقانِ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ سرکارؐ کی شان میں نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کو اپنی سعادت اور نجاتِ آخرت سمجھا۔ حضرت حسانؓ شاعر بارگاہِ نبویؐ سے لے کر آج تک خدا معلوم کتنے خدا کے بندوں نے اِس سعادت کو حاصل کیا ہے۔ اس کا شمار مشکل ہے۔

تمام اصنافِ سخن میں نعت گوئی ہی ایک ایسی صنف ہے جس میں حد درجہ احتیاط کرنی پڑتی ہے اور یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں حضرت بشیر وارثیؒ کو سرکارؐ سے کمال درجہ کا عشق تھا اور انہیں یہ مقام اپنے پیر کے واسطہ سے ملا تھا۔ اِس لئے نعت کہتے تو ڈوب کر کہتے۔ مشاعروں میں شعر سناتے تو داد حاصل کرنا اور بات ہے اشکبار خود ہوتے اور دوسروں کو رُلا دیتے۔ نعت گو شاعر کی قدر کرتے اور ان کی ہمت افزائی کرتے۔ مولانا سید معز الدینؒ کی سامنے اور غائبانہ بڑی عزت کرتے کہ آپ بھی بلند پایہ نعت گو شاعر اور باکمال صوفی سے تھے۔ "معز صاحب حضرت" سے نام لیتے۔ اولیاء اللہ کی محبت مرحوم کے دِل میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اور اسی ذریعے اُنہوں نے حُبِّ نبوی سے اپنے قلب و ذہن کو منور کیا تھا۔

سرکارؐ کے شہرِ پاک مدینہ طیبہ کے بارے میں فرماتے ہیں۔

فضا رحمت کی رہتی ہے ہر اک جانب مدینہ میں ؛ مسلمان کھینچ کے آتے ہیں وہاں انوار کی خاطر

گنبدِ پاک کے بارے میں شعر ملاحظہ کیجئے۔

تمنا ہے بشیر وارثی کی آخری یارب ؛ عطا ہو گنبدِ خضرا پہ موقع جبہ سائی کا

پھر مدینہ طیبہ کے بارے میں لکھتے ہیں۔

ہے بے شک عرشِ معلّٰی زمین بطحا کی ؛ بشیر شام و سحر بھیجئے سلام نیا

ماہنامہ ذوقِ نظر کی اِدارت کوئی آسان کام نہ تھا۔ رات دن پرچہ کی اشاعت کی فکر میں رہتے۔ کئی نمبر دینی و اسلامی مضامین پر مشتمل شائع کئے۔ دیگر شعراء کرام کی نعتوں کو ماہنامہ میں جگہ دی ہر وقت اداروں کو اوپر اٹھانے کی فکر میں لگے رہتے۔ آخری زمانہ میں تو بس نعت گوئی اور نعتیہ مشاعروں میں ہی شرکت کیا کرتے۔ مولانا سید معز الدین ملتانیؒ کے وصال کے بعد بڑے دل برداشتہ ہو گئے تھے۔ راقم انتقال سے صرف دو دن قبل ملاقات کا شرف حاصل کیا کتنی نعتیں سنائیں ہشاش بشاش تھے۔ ہمیشہ کی طرح چہرہ متبسم وہی مدارات اور حیاء سے تواضع کا مزاج تادمِ زیست باقی رہا۔ نعتِ پاک کا اتنا ذخیرہ ہے کہ اس کے منتخب اشعار بھی اس مختصر مضمون میں سمانا مشکل ہے۔ اہلِ ذوق کی تسکین کیلئے مرحوم کے وارث اگر اسکی طباعت کا اہتمام کریں تو لوگ عقیدت سے اپنی آنکھوں پر رکھیں گے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں سرکارؐ کی ہمسائیگی نصیب فرمائے اور وہاں بھی نعت گوئی اور مداح سرائی مرحوم کا مشغلہ رہے۔ آمین۔

جناب عظمت پاشا، حیدرآباد

موت اُس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس
یوں تو دنیا میں سب آئے ہیں مرنے کے لئے

میاں ظہیر الدین صاحب!

السلام علیکم و رحمۃ برکاتہ،

بشیر وارثی صاحب کے انتقال سے مجھ کو بہت رنج ہوا۔ اس لئے کہ وہ میرے مخلص دوست تھے۔ آپ بھی اس سے واقف ہیں) عیاں راچہ بیاں۔ مرحوم وارثی صاحب بہت سی خوبیاں کے مالک تھے۔ وہ شاعر اور نثر نگار تھے۔ ان کے کلام میں حقیقت، معرفت، طریقت اور شریعت کی نمایاں جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ مرحوم کو حمد، نعت، منقبت، غزل اور نظم میں کمال حاصل تھا۔ وہ عاشقِ وارثؒ تھے۔ قدرت نے ان کو بیک وقت دو چیزیں عطا کی تھیں۔ وہ اہلِ قلم اہلِ سیف تھے۔ وہ فوجِ آصفی کے رسالہ میں ایک عہدہ دار تھے۔ اور دوسری جنگ عالمگیر (Second great war) میں جس کو عرفِ عام میں جنگ عظیم اور جنگ جرمنی کہتے ہیں۔ جنگ میں گئے اور فتح یابی حاصل کر کے لوٹے۔ اس کے بعد وظیفہ حسنِ خدمت حاصل کر کے قلم ہاتھ میں لے لیا۔ اور مرتے دم تک قلم کو ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ اس کا ثبوت ان کا معرکتہ الآرا ماہنامہ "ذوقِ نظر" ہے۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ظہیر میاں! میں آپ سے بطورِ خاص یہ کہتا ہوں کہ الولد سر لابیہ ہو

زندہ است کسے کہ دردِ یار رش
مانند خلفے یہ یادگار رش!

اور حضرت والدِ محترم مرحوم کے نقشِ قدم پر چل کر صحیح جانشیں کہلاؤ۔ "ذوقِ نظر" کے اعلیٰ ادبی معیار کو برقرار رکھو، میں آپ کے غم میں برابر کا شریک ہوں۔ میری دعا ہے کہ مرحوم بشیر وارثی صاحب کو اللہ تعالیٰ اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کے پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرما۔ آمین۔





والدِ محترم کی رحلت سے معیاری اردو رسالوں کی دنیا میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے اس کے بارے میں تو تاریخِ زبانِ اردو کے مورخین ہی کچھ روشنی ڈال سکیں گے۔ البتہ میری زندگی میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے اسکی تلافی شاید ہی ہو سکے۔ مرحوم والد صاحب کی زندگی اس قدر متحرک اور تیز رفتار تھی کہ مجھے ان کے بارے میں کچھ زیادہ سوچنے اور انھیں سمجھنے کا موقع نہ مل سکا۔ کام کام اور مسلسل مصروفیت و مشغولیت کا یہ عالم تھا کہ جس دن علی الصبح انھوں نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا اس کی گذشتہ شب میں رات ۹ بجے تک وہ اپنے آفس موقوعہ چھتہ بازار میں کام کرتے رہے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا آغاز فوج سے کیا تھا اور ہر فوجی کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ اُس کی اجل میدانِ کارزار میں آئے، موصوف نے بھی اردو ادب کے میدانِ کارزار میں ہر قسم کی مخالفتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے آخری سانس لی، نہ کبھی بیمار ہو کر وہ صاحبِ فراش ہوئے نہ انھوں نے ہم سے اس قسم کی کوئی خدمت لی جو معمر والدین اپنی اولاد سے لیا کرتے ہیں، زندگی کی آخری شب بھی وہ تنہا آفس سے گھر لوٹے، رات کاٹی اور علی الصبح چند لمحوں کے اندر مالکِ حقیقی سے جا ملے۔

ذوقِ نظر کی اشاعت میں قدم قدم پر حوصلہ شکنی، اردو والوں کی بے حسی دیکھ دیکھ کر میں والدِ محترم مرحوم سے کہا کرتا تھا کہ وہ اس رسالے سے دست کش ہو جائیں مگر اس مردِ میدانِ وفا نے انتہائی ناسازگار حالات میں بھی اس رسالہ کو جاری رکھا اور ہر شمارہ بر وقت نکالتے رہے۔ یہ قسمت کی ستم ظریفی ہے کہ مجھ جیسے ہیچمدان اور ناتجربہ کار نوجوان کے شانوں پر اس رسالہ کی تدوین کا بارِ گراں آپڑا ہے۔ مجھے اقرار ہے کہ میں اتنی بڑی ذمہ داری کا اہل نہیں ہوں۔ لہٰذا اہلِ علم حضرات سے گزارش ہے کہ وہ اس رسالہ کی ذمہ داری قبول فرمائیں۔ اس نمبر کی تدوین و ترتیب میں مجھ سے جو کچھ بن پڑا اس سے میں نے دریغ نہیں کیا۔ والد صاحب کی زندگی کے ہر پہلو، شرافت اور چوری چھپے سخاوت سے لیکر دمِ آخر تک ان کی انتھک جدوجہد اور کارزارِ حیات میں انکے ایک منضبط کردار کی ادائیگی سبھی کچھ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ پھر بھی ان کی زندگی اور کارناموں کی کما حقہٗ عکاسی نہ ہو سکی ہو۔ لہٰذا دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس رسالہ کے جاری رکھنے کی مجھے اور دردمندانِ اردو کو توفیق عطا فرمائے تاکہ رفتہ رفتہ اس کی تلافی ہو سکے۔

آخر میں میں ان تمام حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں، جنھوں نے اس شمارے کی تکمیل میں قلمے سخنے بھرپور تعاون کیا۔ والد صاحب پر مضامین لکھے، نظموں میں انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا اور اس کی نوک پلک سنوارنے میں مفید مشورے ہی نہیں دیئے بلکہ میری ہمت افزائی بھی کی۔

ظہیر وارثی

غزل

بشیر وارثی مرحوم

ہلکی ہلکی گھٹا چھائی ہر گام پر
آئے گیسو وہ کھولے ہوئے بام پر

بادہ خواروں کی محفل سجی رات بھر
ہر نظر تھی چھلکتے ہوئے جام پر

پی کے جب جھک گئے ہوش جاتے رہے
پہنچی اپنی نظر اپنے انجام پر

اپنے وعدہ پر کھائی ہے تم نے قسم
ٹالتے کیوں ہو پھر صبح پر شام پر

فکرِ ماضی نے دی روشنی حال کو
عہدِ رفتہ کی یاد آئی ہر گام پر

میری تخلیق سے پہلے میرے خدا
کون تھا جینے والا تیرے نام پر

غم اُٹھانے کو جب تو نے پیدا کیا
مفتخر ہے بشیرؔ اپنے انجام پر

بشیر وارثی ایک مطالعہ

مشتاق حیدرآبادی
مدیر روزنامہ ماسٹر کارٹون

حمد، نعت، منقبت، مناجات جہاں تک صوفیانہ کلام ہے وہ قطب شاہی حکمرانوں اور ان کے زمانے کے شعرائے کرام میں بکثرت ملتا ہے دورِ قطب شاہی کے شعرا نے دکنی ادب کو صوفیانہ شاعری سے اتنا کچھ مالامال کیا ہے کہ بس فارسی ادب بھی اسی طرح صوفیانہ شاعری کا گنجینہ قرار پاتا ہے۔ یوں اگر اس کی تفصیل چاہیں اور اس صوفیانہ شاعری کا احاطہ کرنا چاہیں تو اس کے لیے بلا شبہ کئی سو صفحات درکار ہوں گے۔ اس کے سرسری جائزہ ہی سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ ہر مذہب و ملت کے ماننے والے نے کم و بیش اس رنگ میں اپنے خدا کو یاد کیا ہے پکارا ہے، اپنے کیفیاتِ قلبی کو الفاظ و معنی کا پیکر دیا ہے۔

آج بھی بے شمار شعرا آپ کو ایسے ملیں گے جو بلا لحاظ مذہب اردو کی گود کو صوفیانہ انداز کے گراں مایہ اشعار سے بھر رہے ہیں اور اس دعوے کی دلیل میں کتنے ہی شعرا کے نام بلا جھجک لئے جا سکتے ہیں جن کے عمیق مطالعہ اور گہرے مشاہدے نے نبی آخر الزماں، علی کرم اللہ وجہہ اور دیگر بزرگانِ دین سے کیسی کچھ توقعات وابستہ کی ہیں۔

چنانچہ اسی ذیل میں ہم آج بشیر وارثی کی شاعری کو دیکھتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ واقعی صوفی ازم کو بشیر وارثی نے بھی کافی حد تک گلے لگایا تھا اور صوفیانہ رنگ میں انھوں نے بھی بہت سارے شعر کہہ ڈالے ہیں۔

مشتے نمونہ از خروارے کے مصداق ان کے کچھ اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

یہ زندگی فریبِ مسلسل سہی بشیر　　لے اس فریب سے بھی حقیقت کا کام آج

ـــہ جو حق کو دیکھ کر باطل کو چھوڑ دیتے ہیں　　قسم خدا کی وہ ہر دل کو جوڑ دیتے ہیں

ـــہ وہ اپنی جنبشِ ابرو سے کر کے دل ٹکڑے　　تڑپتا دیکھ کے بس کو چھوڑ دیتے ہیں

ـــہ عاجزی ملبوس ہے میرا بشیر　　زیب دیتی ہے بشیر کو عاجزی

ـــہ نارسائی کا روز رونا ہے　　عشق نافہم، حسن فہمیدہ

ـــہ حیاتِ پاک انؐ کی جاوداں ہے　　عمل ہے حق نما نورٌ علیٰ نور

ـــہ خلد سے میری ہستی نکالی گئی　　یوں قیامت کی بنیاد ڈالی گئی

ـــہ کیا جلائے گا خالق اسے آگ میں　　اپنی صورت پہ صورت جو ڈھالی گئی

ـــہ بندۂ حق ہو بندگی کر لو　　کام اچھا ہے اک یہی کر لو

ـــہ شیخ رندوں سے دوستی کر لو　　قلبِ مردہ میں روشنی کر لو

ـــہ خدا نے ان کو عطا کی ہے برتری بھی بشیر　　جو اپنا فیض کسی وقت عام کر نہ سکے

آج یہ لکھتے ہوئے ذہن و قلب ہی نہیں قلم بھی سوگوار ہے کہ ایک صوفی منش شاعر فقیرانہ شانِ بے نیازی کے ساتھ اس دارِ فنا سے اٹھ کر عالمِ بقا کی طرف چل دیا اور ہم سب پرستاروں کو آنِ واحد میں ایک نہ مٹنے والا داغ

مفارقت دے گیا۔ اللہ اسے غریقِ رحمت کرے اپنی جوارِ رحمت میں اُسے اعلیٰ مقام دے (آمین) آج اُسے مرحوم کہتے ہوئے جس اذیت اور کربناکی کا احساس ہو رہا ہے اِس کا بیان مشکل ہے۔ بشیر وارثی جیسا علم دوست خداترس مردم شناس خوش باش اِنسان شاید ہمیں مشکل ہی سے ملے۔ جو بیک وقت دوست بھی تھا ہمدرد و مخلص بھی، شاعر بھی تھا، ادیب نواز بھی، جو اک بانفس، بامروت، خوش اوقات اِنسان تھا۔ عاشقِ رسولؐ ایسا کہ ہر بن شعر سے عشقِ رسول آری جیسے ٹپک پڑتا۔ اولیائے اللہ بندگانِ دین کا ایسا عقیدت کیش کہ ان کی مدح و توصیف میں کہی گئی منقبتیں اس کے لئے سرمایۂ نجات ہوگئیں۔ آج یہ جو ہیں شعر و سخن کی انجمنیں بھی اداس ہیں۔ آج ہر محفل اس کی کمی کو بڑی شدت سے محسوس کر رہی ہے۔ ہر کوئی ان کی جدائی کو محسوس کر رہا ہے اور یہ احساس بھی شدت سے ہو رہا ہے کہ۔

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا۔

قطعات

تھے مہکا ہوا پھول بشیر اپنے چمن میں
شہرت تھی بڑی انجمنِ شعر و سخن میں

تھے مرحلے راہوں میں بہت ذوقِ نظر کے
لیکن نہ کمی پائی گئی دِل کی لگن میں

انجمن تھا جو بشیر وارثی
بھیڑ میں تنہائیوں کی کھو گیا

زندگی کی دھوپ کا مارا تھا وہ
موت کے سائے میں جا کر سو گیا

داؤد نصیب

انتخابِ کلام

حضرت بشیر وارثی

مرتب: ظہیر وارثی

ہے التفاتِ خاص مرے کارساز کا
بخشا ہے اُس نے حوصلہ مجھ کو نیاز کا
دیکھا تو ہر طرف تھے حضورؐ آپ جلوہ گر
اُٹھتے ہی میری آنکھ سے پردہ مجاز کا

رشتوں کی حقیقت جہاں کھل گئی
کتنے رسوا ہوئے دربدر دیکھنا
جن میں بوئے خرد ہے نہ خوئے جنوں
لوگ ایسے بھی ہیں دیدہ ور دیکھنا

یہ سرزمینِ عشق ہے کانٹوں پہ چل کے آ
لغزش نہ آئے چال میں ایسا سنبھل کے آ
ہے بارگاہِ دل کسی مخدوم کا مقام
کہتا ہے تجھ کو کون نہ آ، پر سنبھل کے آ

اجل کا خوف نہ جینے کی آرزو دل میں
بڑے مزے سے گذرتی ہے زندگی تنہا
اُمیدِ وصل ہے اندیشۂ فراق کے ساتھ
ملی ہے راہِ وفا میں کہاں خوشی تنہا

زورِ طوفاں کی قسم، موجِ تلاطم کی قسم
ساتھ جب تک نہ دے ہمت تو بھلا کیا ہوگا
تو سمجھتا ہے ترا حق ہے بہاروں پہ بشیرؔ
لوٹ لیں غیر یہ دولت تو بھلا کیا ہوگا

بے نام اک سفر ہے جسے زندگی کہیں
جانا وہیں ہے لوٹ کے آئے جہاں سے آپ
مت بھولئے بشیرؔ کہ دارِ فنا ہے یہ
جائیں گے لامکاں کی طرف اس مکاں سے آپ

دیکھنے آج وہ مجھے آگئے خود ہی بام پر
دل ہے خوشی سے باغ باغ چہرۂ یار دیکھ کر
عکسِ ضیائے یار سے میں بھی چمک گیا بشیرؔ
جلتے ہوں گر جلیں عدو میرا وقار دیکھ کر

شوقِ دیدار نے جب قرب کی لذت بخشی
گرمیِ حسن سے دل جل گیا پروانے کا
آتشِ عشق میں جلتا رہا پروانہ بشیرؔ
حسن خاموش تماشائی تھا پروانے کا

اُٹھائے ہاتھ خدا کے حضور میں اپنے
بلا سے حسنِ طلب کا صلہ ملا نہ ملا

○

چھپا کے دل میں اُسے ڈھونڈتا رہا برسوں
فریب دے کے مجھے آگہی نے لوٹ لیا
لگا کے آگ چمن میں بشیر کہتے ہیں
گُلوں کی زیست کو وارفتگی نے لوٹ لیا

○

جہاں کی جب فضا بدلی ہر آئینِ کہن بدلا
مزاجِ یار کیا بدلا زمانے کا چلن بدلا
سفر طے ہو چکا آخر بشیر وارثی اپنا
نفس کے ٹھہرتے ہی طائرِ جاں نے چمن بدلا

○

کعبہ خدا کا گھر ہے مگر خلق کیلئے
دل سے بڑا خدا کا کوئی اور گھر نہیں
ہم نے غموں میں نصفِ صدی کاٹ دی بشیر
مجھ پر غمِ حیات کا کوئی اثر نہیں

○

گو تھی مانگنے میں شرم سے ہوئی
اس نے دینے میں کب کمی کی ہے
میں نے ہر گام پر رہِ غم میں
دل جلایا ہے روشنی کی ہے

○

چھین کر گلشنِ ہستی سے بہاروں کی چمک
دل میں اُمید کی اک شمع جلا دیتا ہے
بندگی کا مری اعزاز مرا عجز و نیاز
میرے قدموں پہ فرشتوں کو جھکا دیتا ہے

○

اپنی حقیقت جان کے میں نے رب کو سمجھا ہے
جس نے محبت اُس سے کی ہے عشق اسی کا سچا ہے
تنہائی کے کرب میں تو نے یہ بھی کبھی سوچا ہے بشیر
جس نے بنائی ساری خلقت وہ بھی آخر تنہا ہے

○

مُسکرا اُٹھے وہ میرے اشکِ پیہم دیکھ کر
غنچۂ ارماں کھلا ہے کتنی برساتوں کے بعد

○

دُعا مانگی تھی شاید بے وسیلہ
پلٹ کر آ گئی بابِ اثر سے

بشیر وارثی آسمانِ ادب کا چمکتا ہوا ستارہ

نعیم راہی
شاعرِ "شہرِ وفا"

ساتھ لے کے جائیں گے ہم بشیرؔ! دُنیا سے
عمر بھر کا سرمایہ، حُبِّ مصطفےٰ دِل میں

سُبحان اللہ! بشیر وارثی صاحب کی قلندرانہ صفت اور عشقِ رسولؐ کا جذبہ یقینی طور پر وارثی صاحب ایک صوفی شاعر اور عاشقِ رسولؐ ہیں۔

حیدرآباد دکن کی یہ وہ ممتاز ہستی ہے جس کا نام ادب کے آسمان پر ایک ستارے کی طرح چمکتا رہا اور جس کے کارنامے اگلی نسلوں کے ذہنوں میں روشنی بخشتے رہیں گے۔

جنوبی ہندوستان کی اس مایہ ناز شخصیت نے "ذوقِ نظر" کے ذریعہ اُردو ادب کی بیش بہا خدمت انجام دی ہے۔ کئی شاعر، ادیب اور نقد لکھنے والوں کو اُردو ادب کی دُنیا سے روشناس کرایا اور ساتھ ہی اُن کی ہمیشہ پذیرائی کی، ہمتیں بڑھائیں اور انھیں ہندوستان گیر شہرت کا حامل بنایا۔

اس بات سے چاہے کوئی انکار کرے "بشیر وارثی" ایک کھرے قسم کے آدمی اور جلد برہم ہونے والے انسان تھے۔ لیکن میں اور میرا تجربہ ہے کہ وہ ایک اصول پسند انسان، صداقتوں کے علمبردار تھے۔ یہ بات میں یونہی لکھنے کی جرأت نہیں کر رہا ہوں، یہ ایک حقیقت ہے کہ بشیر وارثی صاحب بڑے ہی پیار اور شفقت سے پیش آتے تھے، چھوٹے بڑوں کی عزت کرنا ان کا شیوہ کردار تھا۔

میں انھیں گذشتہ لگ بھگ بیس برسوں سے جانتا ہوں۔ پہلی مرتبہ ان سے میری ملاقات جناب خیرات ندیم کے ہمراہ ہوئی۔ گفت و شنید کا انداز اور چہرے پر مسکراہٹ، باتوں کی چاشنی اور دل لبھا دینے والی ہنسی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا اور پھر یوں ہوا کہ اکثر و بیشتر میری ان سے ان ہی کے دفتر (چھتہ بازار) پر ملاقات ہو جاتی۔ بڑی محبت سے کہتے کہ "نعیم راہی آؤ چائے پئیں اور ہاں کہاں ہیں ملک کے ممتاز شاعر جناب خیرات ندیم؟" اور میں ویسے بھی انھیں چچا کہہ کر بلاتا تھا۔ ان کی سامنے والی سیٹ پر بیٹھ جاتا۔ وہ کہتے "کوئی تازہ غزل ہو تو سناؤ"۔ بہر حال بڑے پیارے آدمی تھے بشیر صاحب جو حیدرآباد کی سرزمین پر اُردو کی خاموش خدمت انجام دے رہے تھے۔

۱۸ جولائی ۱۹۸۷ء کو بشیر وارثی نے اس دنیا کو آخری سلام کیا۔ لیکن ان کے کارہائے نمایاں

رہتی دنیا تک قائم رہیں گے۔

شعر و ادب کی آبیاری کرنے والے، اپنی تہذیب و ذات کا خیال رکھنے والے اور انسانیت کے جام زمانے کو پلانے والے بشیر وارثی مر نہیں سکتے۔ یہ تو ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

بقول خود شاعرِ عشقِ رسولؐ (بشیر وارثی مرحوم)

؎ وصفِ ذاتی ایسا ہو
اللہ جس پر شیدا ہو
حُبِّ احمدؐ پختہ ہو
دائم حق سے رشتہ ہو

○

؎ چلی آئی ہے رحمت کھنچ کے فوری بابِ رحمت سے
شکستہ دل سے جب ہم نے پکارا "یا رسول اللہؐ"!
بشیر وارثی جیتا ہے اس امید میں اب تک
کہ اس بیکس کا جنت میں ہو ٹھکانا یا رسول اللہؐ!

مجھے یقین ہے کہ بشیر وارثی مرحوم، ایسے نعت گو شاعر جنت میں ٹھکانا بنا چکے ہیں۔

بقول بشیر وارثی صاحب کے وہ ۱۹۳۸ء سے شعر کہنے لگے تھے اور صنفِ شاعری میں، نعت، منقبت، سلام اور غزل کہتے تھے۔ وہ مشاعرہ بھی پڑھتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ اضلاع پر بھی مشاعرے پڑھنے جایا کرتے تھے۔ حیدرآباد کے کئی ایک ادیب، شاعر، افسانہ نگار، نقد لکھنے والے ان کے علم و فن سے مستفید ہوتے رہے اور انھوں نے علم و ادب کی اس طرح خدمت کی ہے کہ اردو ادب انھیں فراموش نہیں کر سکتا۔

انھوں نے تقریباً تین سو کے قریب غزلیں، ڈیڑھ سو کے لگ بھگ نعت، منقبت اور سلام کہے ہیں۔ ان کا کلام ملک کے مختلف رسائل و اخبارات میں شائع ہوا کرتا تھا۔ جن میں قابلِ ذکر ماہنامہ "سب رس" ماہنامہ "بیسویں صدی" لاہور "سینک سماچار" دہلی روزنامہ "سیاست" حیدرآباد ماہنامہ "ذوقِ نظر" "رہنمائے دکن" روزنامہ "منصف" میں بشیر صاحب کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ وہ ایک صوفی شاعر ہیں اور ان کے کلام میں دورِ حاضر پر طنز بھی ملتا ہے اور چبھتے ہوئے نشتر بھی! ان کی شخصیت کی عکاسی شاید ذیل کے شعر سے ہو؎

کچھ رنج ملے درد ملے طنز ملے ۔ راہی! مجھے جینے کا یہ انعام ملا ہے

—

جینے کا لطف نشۂ ہستی اتر گیا
خود میرا دور مجھ پہ کئی وار کر گیا

ان کے کلام میں غالبیت کا تصوف غالب ہے تو ندا فاضلی کا طنز اور میر کا انداز ۔۔۔ ان کی نگرانی میں اور ڈاکٹر یعقوب عمر صاحب اور حضرت علی احمد جلیلی صاحب اور خورشید جنیدی کے مشوروں سے بہتر مواد، تحقیقی مقالے، شاعری، تراشے، سلام، منقبت اور نعتیہ کلام اردو ادب کو بصورت "ذوقِ نظر" ہر ماہ دیتے رہے یہ کام ان کا انھیں اردو ادب کی خدمت کے ارتقاء پر پہنچاتا ہے۔ شمالی ہندوستان کے گنے چنے رسالوں کے ساتھ "ذوقِ نظر" کو رکھا جائے تو کوئی قباحت نہیں۔ اس کا ایک معیار ہے، مقام ہے جسے وارثی

صاحب مرحوم نے برسوں کی کاوشوں سے اپنا خونِ جگر دیکر بنایا ہے۔ حسبِ ذیل اشعار سے ان کے بہترین شاعر ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ (اللہ تبارک و تعالیٰ ان کی مغفرت کرے اور جنت الفردوس میں مقام عطا فرمائے۔ آمین)

میرے آقاؑ نہیں ہیں کسی کی طرح
ان کو سمجھو نہ عام آدمی کی طرح

خیمہ رسولِ پاک کی جب آلؑ کا جلا
کعبہ جلا، مدینہ جلا، کربلا جلا

مجھ پر حرام ہوگئی دوزخ کی آگ بھی
سوزِ غمِ حسینؑ میں جب دل میرا جلا

شبیرؑ سا اللہ کا دلبر نہیں دیکھا
کرتے ہوئے سجدہ تہِ خنجر نہیں دیکھا

لباسِ فقر سلامتؑ خدا نما ہوں میں
بجا ہے ناز مجھے مظہرِ خدا ہوں میں

اک تہی دست، تہی دست کو کیا دیتا ہے
اس سے مانگو جو طلب سے بھی سوا دیتا ہے

غزل

مئے محبت کی تم آنکھوں سے پلا دو آکر
تشنہ کافی ہے بہت پیاس بجھا دو آکر

عشق کی کونسی منزل ہے بتا دو آکر
میرے دل کا مجھے آئینہ دکھا دو آکر

شمع بے نور ہے ویران ہے بزمِ ہستی
آس کی ایک نئی جوت جگا دو آکر

تازہ شبنم کو ترستی ہیں بہاریں دل کی
چند قطرے مرے دامن پہ گرا دو آکر

کب سے بے تاب ہوں عالمِ تنہائی میں
دل کی اجڑی ہوئی بستی کو بسا دو آکر

چپ ہے گونگی ہے یہ باتیں نہیں کرتی مجھ سے
اپنی تصویر کو گویائی سکھا دو آکر

میرے ہونٹوں پہ تبسم کا نہیں کوئی وجود
تم ہی کچھ پھول تبسم کے کھلا دو آکر

کس محبت سے سجائی ہے خدا نے دنیا
میرا گھر تم بھی محبت سے بسا دو آکر

زندگی دولتِ نایاب ہے دنیا میں بشیر
بزمِ احباب کو یہ راز بتا دو آکر

حضرت بشیر وارثی

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ

سفر طے ہو چکا آخر بشیر وارثی اپنا
نفس کے ٹھہرتے ہی طائرِ جاں نے چمن بدلا

حضرت بشیر الدین بشیر وارثیؒ

تاریخِ وصالؒ : ۲۱ ذیقعدہ سنہ ۱۴۰۷ھ م ۱۸ جولائی سنہ ۱۹۸۷ء

روز دوشنبہ — بوقت فجر

قطعاتِ تاریخِ وفاتؒ

اٹھ گئے دہر سے وہ دوست مزاج
بزمِ "ذوقِ نظر" میں گُل ہے سراج
قبر پر فاتحہ پڑھو خورشید
ہیں محمد بشیر خلد میں آج
۱۴۰۷ھ

نازِ الفت ہیں بشیر وارثی
اہلِ جنت ہیں بشیر وارثی
خود فرشتے بھی گواہی دیں گے آج
پاک سیرت ہیں بشیر وارثی
۱۹۸۷ء

خورشید جنیدی

بیادگار جناب محمد بشیر الدین بشیر وارثی (مرحوم)
موسس

فون : 525117

جلد (۴) شمارہ (۱، ۲، ۳)

ذوق نظر

جنوری، فروری، مارچ سنہ ۱۹۸۹ء

مدیر اعزازی : ڈاکٹر یعقوب عمر
معاون : افتخار احمد بشر
مدیر انتظامی : محمد ظہیر الدین ظہیر وارثی

ناظم نشر و اشاعت : عابد قادری
مشیر قانونی : محمد شمیم ایڈوکیٹ

مجلس مشاورت

سالانہ : ۸ ڈالر قیمت فی شمارہ : ۵ روپے : بیرونی ممالک سے ۱۲ ڈالر مع ڈاک خرچ

پتہ : انتظامی امور اور ارسال زر کیلئے : دفتر رسالہ "ذوق نظر" ۶۱۳-۸-۲۲ چھتہ بازار حیدرآباد

نگارشات کیلئے : ۲۶۳/۴-۶-۲۲ کوچہ نسیم . حیدرآباد 500002

محمد ظہیر الدین ظہیر وارثی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے "دائرہ الکٹرک پریس" میں چھپوا کر شائع کیا۔

دھنک

صلیبوحی

بازارِ شعر و ادب میں کھوٹے سکوں کا چلن اور نقلی مال کی سربراہی زمانۂ حال کا قصہ نہیں ہے یہ چیز صدیوں سے رائج رہی ہے۔ مگر قدیم زمانے میں اسکا تناسب اتنا زیادہ اور اس قدر تشویشناک کبھی نہیں رہا جتنا کہ آج ہے۔ اس زمانے کے لوگوں میں جانچ اور پرکھ کا معیار اتنا اونچا تھا کہ اس قسم کی کوششیں بہت کم سرسبز یا بارآور ہو سکتی تھیں مگر آج جس طرح برصغیر ہند و پاک کے وہ بازار جہاں اسمگلنگ کا مال فروخت ہوتا ہے کوریا اور تائیوان کے کم معیاری یا نقلی مال سے بھرے پڑے ہیں۔ اسی طرح شعر و ادب کے بازار میں بھی اشیائے کم عیار یا نقلی مال کا انبار لگا ہوا ہے۔ جانچ اور پرکھ کی صلاحیت سے محروم اردو کے قارئین کی اکثریت جن کے پاس نہ وقت ہے نہ موقعہ کہ وہ اس طلسم کو سمجھ سکیں۔ اسیں اسیر نہ ہو جائیں تو کیا کریں۔ افسانہ نگاروں یا شاعروں کو تو چھوڑیئے خود محققین و ناقدین نے ایسی ایسی دستور شکنیوں کو روا رکھا ہے جس سے بالآخر ادبی نراج پیدا ہو کر زبان اللہ کو پیاری ہو جائے۔

تجرید، ابہام، بے ابلاغی اور ادبی بدعنوانیوں نے اردو شعر و ادب میں جو کھلبلی مچادی ہے اسکے سدباب کیلئے جنگی پیمانے پر اقدامات کی ضرورت ہے مگر اپنی ڈفلی اور اپنا راگ الاپنے والوں کی اس قدر بہتات ہے کہ کسی بھی تعمیری تحریک کی کامیابی کے امکانات بیحد موہوم ہیں۔ فطری صلاحیتوں اور استعداد سے محروم ہونے کے باوجود مہارت و کمال کے اکتساب سے جی چرانے والے ادیبوں اور نقادوں نے بنیادی اقدار میں اتنی شکست و ریخت کی ہے کہ زبان و بیان کے سارے پیمانے چکنا چور ہو گئے ہیں مختلف اصناف کو اتنا سبوتاژ کیا گیا ہیکہ نہ صرف انکی حدود و فاصل گم ہو گئی ہیں بلکہ انکی امتیازی خصوصیات اور آپسی شناخت بھی ناپید ہو چکی ہے۔ اردو ادب کے بازار میں کثرت سے ایسے قلم بردار ہیں جو صرف شہرت کے طلبگار ہیں۔ چاہے وہ کسی طرح بھی حاصل ہو مگر جلد حاصل ہو۔ ریاض، عرق ریزی، کثرت مطالعہ جیسی اصطلاحیں ان کیلئے ازکار رفتہ ہو چکی ہیں۔ انھوں نے دنیائے ادب میں ایسے لفظوں اور ترکیبوں کے انبار لگا دیئے ہیں جو کہ دامن معانی و مفاہیم اور مطالب سے خالی ہیں اور ان میں سے اکثر ترکیبیں تو ایسی وضع کی گئی ہیں کہ زبان و بیان کے کسی بھی پیمانے پر انھیں آنکا نہیں جا سکتا۔ پٹریاں اکھڑ جانے کے بعد اگر ریل چل سکتی ہے یا بنیاد کے انہدام کے بعد عمارت برقرار رہ سکتی ہے تو یقیناً اردو کو بھی کوئی نقصان نہیں پہونچ سکتا اور اگر ایسا نہیں ہے تو کیا وہ وقت نہیں آگیا ہے جبکہ برصغیر کے دردمندانِ اردو منظم طریقے پر کوئی اشتراک عمل کی صورت نکالیں اور اس سفینے کو دلدل سے نجات دلائیں۔

قارئینِ ذوقِ نظر سے

مدیر اعلیٰ کے اچانک انتقال اور کچھ ناگزیر وجوہات کی بنا پر پرچہ کافی تاخیر سے نکل رہا ہے ہم اسے اور دلکش بنانے کیلئے کوشاں اور آپکے عملی تعاون کے منتظر ہیں۔ انشاءاللہ ہر شمارے میں زیادہ سے زیادہ کتابوں پر تبصرے پیش کئے جائیں گے چاہے وہ صفِ اوّل کے مصنفین ہوں یا نئے ابھرتے ہوئے۔ گزارش ہیکہ اپنی اپنی کتابوں کے دو دو نسخے تبصرے کیلئے روانہ فرمائیں اسکے علاوہ قارئین اپنی بےلاگ رائے بھی ادارہ کو بھیج سکتے ہیں جسے ہم شکریئے کے ساتھ جستہ جستہ شائع کرتے رہیں گے۔

کلامِ بشیر

غزلیں ——— بشیر وارثی (مرحوم)

ہم کو وہاں سے ناظرِ کون و مکاں ملے
راہِ طلب میں صاحبِ عرفاں جہاں ملے

ظاہر ہر ایک ذرّہ ہے جس کے نشان کا
اے کاش ایک بار وہی بے نشاں ملے

جانا جب ایک روز ہے دنیا کو چھوڑ کر
نیکی سمیٹ لیجئے جتنی جہاں ملے

روشن ضمیر آہ زمانے سے اٹھ گئے
بالیدگی کا روح کی ساماں کہاں ملے

کیا جانے کس کے سوگ میں سینہ فگار ہے
اب تک شفق پہ خون کے دریا رواں ملے

یہ میری خوش نصیبی نہیں ہے تو اور کیا
اس دور میں بھی مجھ کو کئی قدر داں ملے

جانِ عزیز جس کی امانت ہے اے بشیر
ہنگامِ نزع مجھ کو وہی جانِ جاں ملے

○

کیا میں کسی کو دیکھتا روئے نگار دیکھ کر
ہوشِ نظر ہی کھو دیا حسنِ بہار دیکھ کر

دیکھنے آج وہ مجھے آ گئے خود ہی بام پر
دل ہے خوشی سے باغ باغ چہرۂ یار دیکھ کر

بندۂ عشق گر نہیں بندۂ حسن ہے ضرور
ڈر ہے ٹھہر نہ جائے دل آمدِ یار دیکھ کر

آج کچھ اور ہی پلا مستِ نگاہِ ساقیا
میری طرف بھی اک نظر میرا خمار دیکھ کر

زندگی اسکی زندگی بندگی اس کی بندگی
خود سے گزر گیا ہے جو جلوۂ یار دیکھ کر

دونوں جہاں کی راحتیں دل میں سمٹ کے آ گئیں
مانگتا کیا کسی سے میں آپ کا پیار دیکھ کر

عکسِ ضیائے یار سے میں بھی چمک گیا بشیر
جلتے ہیں گر جلیں عدو میرا وقار دیکھ کر

○

یعقوب یاور کوٹی (ایم اے)

کچھ اقبال اور بھوپال کے تعلق سے

ہفت روزہ "ہماری زبان" کے ۱۵ر اکتوبر ۱۹۸۶ء کے شمارے میں جناب ممنون حسن خاں صاحب کا مضمون 'اقبال، کچھ یادیں' شائع ہوا ہے جس کی ابتدا کرتے ہوئے فاضل مضمون نگار نے لکھا ہے:

" اقبال نے بھوپال کو " دارالاقبال بھوپال " کہا ہے۔ بھوپال کو یہ سعادت علامہ کے قیام بھوپال کے تعلق کی وجہ سے نصیب ہوئی۔ اس تعلق کی بنا پر اور ان کے لافانی عظیم نغموں کی بدولت جو علامہ نے بھوپال میں تخلیق کی تھیں، بھوپال کا نام عالمی ادب کی تاریخ میں سنہرے الفاظ میں لکھا جائے گا"

اقبال ادبی مرکز بھوپال کے دوروزہ سیمینار (اگر اسے سیمینار کہا جا سکے؟) کے پہلے اجلاس میں استقبالیہ تقریر کرتے ہوئے مرکز کے صدر جناب ممنون حسن خاں صاحب نے یہی بات دہرائی اور اس سے قبل اقبال اکادمی حیدرآباد کے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا تھا:

" اقبال نے بھوپال کو " دارالاقبال بھوپال " کہا ہے۔ بھوپال کو یہ سعادت حضرت علامہ کے قیام بھوپال کے تعلق سے نصیب ہوئی ۔ ۔ ۔ ۔"

(مطبوعہ ہفت روزہ اردو ایکشن بھوپال "سیمینار نمبر" ۱۰ر نومبر ۸۶ء)

یہ کہنا کہ بھوپال کو دارالاقبال، اقبال کے قیام بھوپال کے تعلق سے کہا گیا ہے، غلط اور گمراہ کن ہے ۔ محترم ممنون صاحب جیسے شخص کی ذمہ داری ان معنوں میں کچھ اور بڑھ جاتی ہے کہ ان کا اقبال سے ذاتی تعلق رہا ہے۔ ان کو ایسے بے بنیاد بیانات سے پرہیز کرنا چاہیئے جس سے اقبالیات کے طالب علموں کی گمراہی کا امکان ہو۔

اس بدعت اور گمراہی کا آغاز دراصل صہبا لکھنوی نے کیا ہے وہ اپنی تصنیف "اقبال اور بھوپال" کے حرفِ آغاز میں رقمطراز ہیں:

" ایک اہم بات یہ بھی عرض کردوں کہ میری تحقیق علامہ اقبال کے بھوپال سے ربط و تعلق تک محدود ہے

جیسے اکثر خطوں میں علامہ نے دارالاقبال لکھا ہے اس طرح تحقیق کے کسی امکان کو میں نے نظر انداز نہیں کیا ہے۔" (صفحہ ۱۱)

دارالاقبال بھوپال کی اصطلاح علامہ اقبال کی نہ اختراع ہے اور نہ اقبال کے قیام بھوپال سے اس کا کچھ تعلق ہے۔ اقبال کی پیدائش سے بھی ایک صدی قبل یہ اصطلاح بھوپال میں رائج تھی۔ ثبوت کے طور پر میں نواب قدسیہ بیگم کی ایک مہر کی تصویر بھیج رہا ہوں جس میں تحریر ہے "چھاپہ چبوترہ منگل وارہ متعلقہ دارالاقبال ریاست بھوپال" (علامہ جناب نواب قدسیہ بیگم جو نواب حمید اللہ خاں جن کے دور اقتدار میں علامہ اقبال بھوپال تشریف لائے تھے، کی پرنانی تھیں۔)

ہماری زبان کے اسی شمارے میں جسٹس جاوید اقبال (خلف رشید علامہ اقبال) کا ایک خط بنام ممنون حسن خاں شائع کیا گیا۔ اس کے اداریٔ نوٹ میں لکھا ہے:

"بعض لوگوں نے یہ پروپگنڈہ شروع کر دیا ہے کہ ممنون صاحب کا اقبال سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔ ممنون صاحب نے علامہ اقبال کے فرزند جسٹس جاوید اقبال کو اس کی اطلاع دی تو جاوید صاحب نے اس کا جواب تحریر فرمایا ہے۔

ممنون صاحب کا یہ خیال کہ لوگوں کو ان کے اقبال سے تعلق پر شک ہے محض بے بنیاد ہے ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ جیسا کہ خود جاوید اقبال صاحب نے لکھا ہے کہ اقبال نے انھیں مخاطب کر کے چند خط لکھے ہیں۔ اس کے بعد ان کے اس تعلق کو جاوید اقبال کی شہادت کی بھی کوئی ضرورت نہیں تھی اور جس طرح اقبال سے محبت کرنے والے ان سے متعلق ہر چیز کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اسی طرح ممنون صاحب کا وجود بھی ان کے لئے لائق احترام و عقیدت اور مسعود ہے۔

ممنون حسن خان صاحب کے اقبال سے تعلق کا حوالہ اُردو دنیا میں غالباً پہلی بار پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی ۱۹۶۷ء میں مطبوعہ کتاب "علامہ اقبال بھوپال میں" میں ملتا ہے۔ اس کتاب کی تیاری کے دوران انھوں نے دوسرے سرکردہ حضرات مثلاً حکیم قمرالدین صاحب مرحوم مدیر روزنامہ ندیم بھوپال، عبدالحلیم آرٹسٹ اور اقبال حسین خان صاحب کے علاوہ خود ممنون صاحب سے بھی ایک انٹرویو لیا تھا۔ اس کتاب میں اقبال سے ان کی پہلی ملاقات کے تناظر میں یہ حوالہ اس طرح آتا ہے۔

"بھوپال میں آمد کے سلسلے میں جناب ممنون حسن خان بیان کرتے ہیں کہ ڈاکٹر اقبال سے میری پہلی ملاقات ۱۹۳۵ء میں ہوئی جب وہ سر راس مسعود کی دعوت پر بھوپال تشریف لائے تھے۔" (صفحہ ۱۱)

لوگ اس بات سے بھی معترف و مدّاح ہیں کہ جناب ممنون حسن خان صاحب کی کوششوں سے ہی

حکومت مدھیہ پردیش نے 'شیش محل' جہاں اقبال نے قیام فرمایا تھا' کے سامنے ایک خوبصورت میدان تعمیر کروایا جسے 'اقبال میدان' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اور اقبال کے نام پر حکومت کی جانب سے 'اقبال ادبی مرکز' کا قیام بھی ممنون حسن خانصاحب کی مسلسل محنت اور تگ ودو کا مرہون منت ہے جہاں سے ہر برس کسی ادیب یا شاعر کو 'اقبال سمان' یعنی اقبال اعزاز دیا جائے گا۔ جس میں توصیفی سند کے ساتھ مبلغ اکیاون ہزار روپے کی خطیر رقم بھی شامل ہے۔ ہندستان میں اُردو ادب کے لئے یہ اب تک کا سب سے بڑا اعزاز ہے۔ ممنون صاحب کا یہ کارنامہ نہ صرف لائق تحسین ہے بلکہ وہ پوری اُردو قوم کے خصوصی شکریہ کے مستحق ہیں اور اُردو دنیا یقیناً ان کا یہ احسان عظیم فراموش نہیں کرے گی۔

دراصل بات یہ نہیں ہے کہ لوگوں کو ان کے علامہ اقبال سے تعلق' ان کی نیت یا ان کے کارہائے نمایاں پر کسی قسم کا شک وشبہ ہے بلکہ یہ ہے کہ اس کو بنیاد بنا کر وہ جس قسم کے متضاد و متنازعہ بیانات جاری کر رہے ہیں' ان کی طرف توجہ دلانے پر وہ جھنجھلا جاتے ہیں۔ اپنے کارناموں پر کسی قسم کا تبصرہ خواہ اس کا مقصد تعمیری ہی کیوں نہ ہو' نہیں برداشت کر پاتے ہیں اور اپنے غم وغصّے کا اظہار اس انداز میں کرتے ہیں۔

اب خوبصورت اقبال میدان کے مینار شاہین کا مسئلہ ہی لیجیے۔ اس مینار پر بہ صرفِ زرِ کثیر جس کوہنہ اور بدنما پرندے کا مجسمہ نصب کیا گیا ہے وہ شاہین تو کیا کرگس کی بھی نمائندگی نہیں کرتا۔ پہلے تو کارپردازان بھوپال ڈیولپمنٹ اتھارٹی نے، جس نے اسے تعمیر کروایا اور ممنون حسن خان صاحب جس کے چیرمین ہیں' اس مجسمہ کے جواز میں یہ تاثر دیا ہے کہ شاہینِ اقبال کا تخیلاتی اور تصوراتی پیکر ہے جس کا اصل سے کوئی تعلق نہیں ہے جب کہ ماہرینِ اقبالیات اس بات پر متفق ہیں کہ شاہین اسی دنیا کا جیتا جاگتا پرندہ ہے اس کے ثبوت میں کئی کتابوں سے حوالے پیش کئے جاسکتے ہیں لیکن میں تازہ ترین حوالہ اقبال اکادمی لاہور' پاکستان کے ترجمان 'اقبالیات' کے 'اقبال نمبر' شمارہ جولائی۔ ستمبر ۱۹۸۹ء سے پیش کرتا ہوں جس میں ڈاکٹر اکبر حسین قریشی نے اپنے مضمون 'کلام اقبال میں تذکرہ حیوانات' میں شاہین سے متعلق تحقیق شدہ تفصیلات مہیا کی ہیں۔ ذیل میں اس کا اختصار نذر قارئین ہے: 'جرہ شاہین' "FALCON"

"نر شاہین جس تیز رفتاری سے شکار کرتا ہے وہ منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی جھپٹ کی تیزی کا اندازہ ۱۷۵ میل فی گھنٹہ ہے۔ سفید شاہین عام طور پر پسندیدہ خیال کیا جاتا ہے گویا کہ سے

خاکی رنگ میں بھی دستیاب ہے۔ شاہین رہنے کے لئے مکان نہیں بناتا۔ کھلی فضا میں رہنا پسند کرتا اور انڈے بھی کھلی فضا میں دیتا ہے۔ بالعموم کھلی فضا میں بلندی پر رہنا اسے پسند ہے۔ عام طور سے شاہین دو سے چار انڈے دیتا ہے۔ چار چھ ہفتے میں اس کے بچے پرواز کے قابل ہو جاتے ہیں بچوں کی پرورش اور تربیت کی تمام ترذمہ داری نر اور مادہ دونوں مل کر قبول کرتے ہیں۔" (صفحہ ۱۹۶)

اس کے بعد ام۔ ڈی۔ اے بھوپال آنے والے دی آئی پی حضرات سے (خواہ ان کا تعلق کسی شعبے سے ہو) "مینار شاہین" کے بارے میں مثبت آراء طلب کرکے ممکنہ ذرائع ترسیل وابلاغ سے ان کی تشہیر کی جس میں ہمیشہ وہ مہمانوں کی نفسیات سے کھیلتے رہے۔ عملاً ایسا ہے کہ میزبان اپنے مہمان کے سامنے اپنے کسی کارخانے' اپنے کسی ACHIEVEMENT کا ذکر فخریہ انداز میں کرکے اس کی رائے مانگے تو بہر حال خلاقاً مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ اس کی تائید کرے۔ اس دم یہ تمام آراء لائق اعتنا نہیں ٹھہرتیں اور ان سب سے اس حقیقت کو نہیں جھٹلایا جاسکتا جو روز وشب اقبال میدان میں سینہ تانے موجود ہے۔ ویسے مشہور فنکار مقبول فدا حسین نے واضح طور پر کہا ہے کہ یہ سوامی ناتھن کا شاہین ہے اور اس کا اقبال کے شاہین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ خود اس مجسمے کے خالق مسٹر سوامی ناتھن کا بھی کہنا ہے کہ انھوں نے اس پرندے میں "بھوپال گیس المیہ" کی تمام ہولناکیوں کو مجسم کیا ہے ظاہر ہے اس نقطہ نظر سے تخلیق کردہ سوامی ناتھن کے شاہین سے اقبال کے شاہین کا کیا تعلق ہوسکتا ہے۔

ماہِ رواں کی (نومبر ۸۶ء) ۹ر اور ۱۰ر تاریخ کو اقبال ادبی مرکز بھوپال کے زیر اہتمام "اقبال سمان" علی سردار جعفری کو پیش کیا گیا (یہ ایک علاحدہ بحث ہے کہ یہ انتخاب کس حد تک درست تھا) اس کے ساتھ ہی "تہذیب عصر حاضر میں قدروں کا بحران اور اقبال" کے موضوع پر دوروزہ سیمینار کا انعقاد بھی کیا گیا۔ جس میں بیرون بھوپال سے حضرات آل احمد سرور، جگن ناتھ آزاد' نثار احمد فاروقی' قمر رئیس' شمس الرحمٰن فاروقی اور عابد علی خاں کو مقالہ پڑھنے کی زحمت دی گئی تھی۔ ان میں سے صرف نثار احمد فاروقی تشریف لائے لیکن وہ کسی سبب سے اپنا پورا مقالہ نہیں پڑھ سکے۔ مقامی مدعو حضرات میں عبدالقوی دسنوی نے اس سیمینار میں شرکت نہیں کی پروفیسر ظہر راہی' پروفیسر حیدر عباس رضوی اور پروفیسر آغا ز احمد نے دو ڈھائی صفحات پر مشتمل اپنے سرسری مضامین سے کام چلا لیا اور اختر سعید خاں کی تقریر صرف تیسرے اجلاس میں پڑھے گئے مضامین کے تجزیئے

تک محدود رہی اور اس میں بھی وہ ناکام رہے اس لئے کہ وہ خود اس وقت تشریف لائے تھے جب نثار احمد فاروقی اپنے مقالے کا خاصہ حصہ پڑھ چکے تھے۔ نتیجتہً یہ سیمنار بھوپال کی تاریخ کا ناکام ترین سیمنار ثابت ہوا۔ لوگوں کے اس سیمنار میں شریک نہ ہونے کا واحد سبب غالباً اس کے علاوہ کچھ نہیں تھا کہ انھیں جو وقت دیا گیا تھا وہ سیمنار میں پڑھے جانے لائق مقالے کی تیاری کے لئے ناکافی تھا۔ بہرحال یہ اچھا ہوا کہ ممنون صاحب نے اپنی اختتامی تقریر میں نہایت فراخدلی سے اس ناکامی کا اعتراف کر لیا اور اسی موضوع پر دوبارہ فروری ۸۷ء میں سیمنار کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس ناکامی کا ذمہ دار آخر کسے ٹھہرایا جائے؟ براہ راست یا بالواسطہ طور پر لوگ مرکز کے صدر ممنون حسن خان صاحب اور سکریٹری فضل تابش صاحب کو ہی اس کا ذمہ دار ٹھہرائیں گے اور ایک عوامی ادارے کے سربراہ ہونے کے ناطے انھیں معترضین کو مطمئن کرنا چاہیئے۔

"اقبال سمان" (نام کے سیاسی رخ سے الگ ہٹ کر) ہندستان میں جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے اردو کا سب سے بڑا اعزاز ہے اس کے وقار کا خیال رکھتے ہوئے اقبال ادبی مرکز بھوپال کے اراکین پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ہندستان میں ان باصلاحیت لوگوں کو یہ اعزاز دیں جن کی عالمانہ صلاحیت اور مجموعی خدمات اردو ادب میں اعلیٰ معیار کی ہوں اور ساتھ ہی اقبالیات سے بھی خاص شغف رکھتے ہوں۔ اس اعزاز کو پہلے ہی صرف تخلیقی ادب تک جس میں ناول، افسانہ، شاعری وغیرہ کو شامل کر کے تحقیق اور تنقید کو واضح طور پر خارج کر دیا گیا اور محدود کر دیا گیا ہے ظاہر ہے اس کسوٹی کے لحاظ سے جس شخص کا انتخاب عمل میں آئے گا اس کا اقبال یا اقبالیات سے تعلق ہونا لازمی نہیں ہوگا بلکہ یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ 'اقبال دشمن' ہو۔ اس طرح میری ناقص عقل کے مطابق یہ اقبال کے نام پر جاری کئے گئے اعزاز کے ساتھ ایک بھونڈا اور بدترین مذاق ہوگا۔ ایسی ہی چند باتیں ہیں جنھیں اقبال سے محبت رکھنے والے ممنون حسن خان صاحب کے سامنے رکھنا چاہتے ہیں میرا خیال ہے کہ اس میں ناراض ہونے یا جھنجھلانے کی کوئی بات نہیں ہے بلکہ ضرورت سنجیدگی سے ان پر غور کرنے کی ہے، ضرورت اقبال کی عظمت کو ملحوظ رکھتے ہوئے کوئی اصلاحی قدم اٹھانے کی ہے، ضرورت ممنون صاحب سے علامہ اقبال کے تعلق کی پاکیزگی اور اہمیت کا خیال رکھتے ہوئے اقبال ادبی مرکز اور اقبال میدان میں ان تبدیلیوں کی ہے جو آنے والی نسلوں کے سامنے اقبال کے پیغام کی صحیح شبیہ اس کے تمام تر جمالیاتی رکھ رکھاؤ اور لوازمات کے ساتھ پیش کرے اور اقبال کی صالح قدروں کو منتقل کرے اس سے ممنون حسن صاحب کے وقار میں اضافہ ہوگا جو ابھی اپنے آپ کو 'علامہ اقبال کا ادنیٰ کفش بردار' سمجھتے ہیں، وہ کل علامہ اقبال کے آفاقی پیغام اور ان کی اعلیٰ اقدار کے محافظ کہے جانے میں حق بجانب ہوں گے۔ ٭ ٭ ٭

یادِ رفتگاں

آہ نواب مظفر الدین خان صاحب

نواب مظفر الدین خان صاحب حیدرآبادی دکنی تہذیب کی آخری علمبردار شخصیتوں میں سے ایک تھے۔ ان کی وضعداری، اعلیٰ اخلاق کی پاسداری اور اردو شعروادب سے ان کی محبت عرصے تک بھلائی نہ جاسکے گی۔ وہ رباعی کے دلدادہ اور عاشق تھے۔ صنفِ غزل کی نوک پلک بھی انھوں نے بڑے ریاض سے سنواری چنانچہ ان کے مجموعوں میں سے بہت سے اچھے اشعار کا انتخاب کیا جاسکتا ہے۔ ۱۹۱۸ء میں وہ دکن میں پیدا ہوئے اور جون ۱۹۸۸ء میں بمقام امریکہ ستر سال کی عمر میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ میں نے انھیں کے ایک مصرعے سے تخرجہ ۸ عدد تاریخ نکالی ہے

—— یعقوب عمر

قطعۂ تاریخ وفات

دیارِ غیر میں بے وقت رحلتِ صاحب! | دکن سے چھن گئی ایک بے مثال نگیں!
اسی خیال میں تھا کہ لکھوں میں سالِ قضا | صدا یہ کان میں آئی بہ لہجۂ غمگیں!
جھکا کے پڑھ سرِ حسرت یہ مصرعِ صاحب | "ہمارے دفن کی صورت بھی اب وطن میں نہیں"

۱۴۱۶ - ح (۸) = ۱۴۰۸ھ

صاحب کے کچھ منتخب اشعار:

لطفِ دیدار کو حسرت سے بدلنے والے | کم سے کم ذکر کی لذت سے تو محروم نہ کر
من چلے آپ چل نکلتے ہیں | کس نے آندھی کی رہنمائی کی
رہینِ بندِ شبِ غم ہیں، چھوٹ المعلوم | حیات راس نہیں، موت ہے خفا ہم سے
صاحب مشاعروں کا دیا معتبر نہیں | ہوتی ہوا زیادہ ہے اس داہ داہ میں
نہ جانے کانٹوں سے کیوں کر اُلجھ گیا دامن! | یہاں سے کاش دبے پاؤں میں گزر جاتا
وائے وارفتگیٔ شوق کے ہاتھوں ہمدم! | ہم ہی بکتے رہے یوسف کی خریداری میں
ملو تو کھل کے ملو ہر کسی سے اے صاحب | بلا سے آپ کی، کوئی ملا ملا، نہ ملا!

غزل

صبا کو زلفِ شکن در شکن سے ربط رہے
مرے جنوں کو ترے پیرہن سے ربط رہے

مری غزل کے مہکتے ہوئے بدن کے لئے
اے غنچہ لب ترے کام و دہن سے ربط رہے

مرے سبب نہ ہو افسردہ تیری بزمِ طرب
چراغِ کشتہ کو کیوں انجمن سے ربط رہے

لکھا ہے نام وطن کا جو اپنے نام کے ساتھ
وطن کا کچھ تو غریب الوطن سے ربط رہے

میں گرچہ خار و خسِ گلستاں سہی صاحب
چمن پرست ہوں میرا چمن سے ربط رہے

غزل

کون سی منزل ہے یارب اس جگہ کوئی نہیں
ہم جہاں پہنچے وہاں پر نقشِ پا کوئی نہیں

آسرا کوئی نہیں ہے سر چھپانے کے لئے
آشنا کوئی نہیں نا آشنا کوئی نہیں

یہ وہ مقتل ہے جہاں زخموں کا اک انبار ہے
بے نیازِ ظلم، محرومِ جفا کوئی نہیں

ہیں تماشاگاہ عالم کی یہی نیرنگیاں
ایک میلا سا لگا، لیکن رہا کوئی نہیں

یا الٰہی ہو ہجومِ یاس کا خانہ خراب
مُدّعا کوئی نہیں، لب پر دُعا کوئی نہیں

کہیئے صاحب آپ کو کیوں دوسروں سے ہو گلا
آپ خود اپنے نہیں ہیں، آپ کا کوئی نہیں

نواب صاحب نے دنیائے شعر و ادب کو کئی اچھے مجموعے دیئے ہیں جن میں رباعیات، اور قطعات کے چار مجموعے: سخن در سخن، اُفق در اُفق، انجمن در انجمن اور سلسلہ در سلسلہ۔ گلستاں حمد و نعت و منقبت، جوہر اندیشہ در حمد، نعت و منقبت، قطعات تاریخ پر مشتمل مجموعہ ورق در ورق اور غزل کے تین مجموعے: زبانِ شمع، آتشِ بے نام، غزل در غزل وغیرہ۔ اس کے علاوہ دیوان فیوضاتِ فدائی کو ترتیب دیکر شائع کیا۔ ایک کتاب وِلا اکیڈمی پر لکھی اور جنوبی ہند کے رباعی گو شعراء پر ایک ضخیم تذکرہ مرتب کرکے انھوں نے میدانِ تحقیق میں بھی قدم رکھا ہے۔

غزل

محمود سروش

کیا جاتا ہے مطلب دل کا لہجے سے عیاں ابتک
نہیں کہنے کے بدلے کھینچ لی جاتی ہے ہاں اب تک

تمہاری یاد میں اک ناتواں کو روتے دیکھا تھا
ہوا تم کو سناتی جا رہی ہے سسکیاں اب تک

خرابہ کہہ کے میرے گھر کو میرا دل دکھلاتے ہو
یہی جنت نہ بن جاتا جو تم رہتے یہاں ابتک

بہار اور بے سروسامانیاں اکثر خیال آیا
نشیمن پھر سے بن جاتا اگر رہتی خزاں اب تک

سروش احساس کی تصویر ہی کھینچی نہیں جاتی
نہیں تو بن چکا ہوتا میں دل کا ترجماں ابتک

رباعیات

ہوں کیسا گنہگار غزل کہتا ہوں
ماضی ہی کی بات آج کل کہتا ہوں
ھیئت سے نہ گھبرائیں جنابِ نقاد
ہر شعر میں اک بات اٹل کہتا ہوں

سرمایۂ ایمان و یقیں ہے اللہ
تسکین دل زار و حزیں ہے اللہ
کیا مانگتے ہو وجودِ باری کی دلیل
ثابت یہی کر دو کہ نہیں ہے اللہ

سیاست کی ندرت مجھے آتی ہی نہیں
الفت میں سیاست مجھے آتی ہی نہیں
اشعار میں کیونکر کر دوں نعرے بازی
پھولوں کی تجارت مجھے آتی ہی نہیں

بے کار ہے پوچھنا خدا کیسا ہے
دیکھا ہو کسی نے تو کہے ایسا ہے
بت اپنے پجاری کیلئے سنگ نہیں
ہے میرا خدا چاہے وہ اب جیسا ہے

ایم۔ ڈی۔ گوئیل
(شعبۂ کامرس۔ نظام کالج)

رِشوت

(طنزیہ)

رشوت کا لفظ سنتے ہی مختلف لوگوں کے ذہن میں مختلف خیالات کوندنے لگتے ہیں۔ رشوت خور کے لئے رشوت ایسے ہی ہے جیسے شرابی کے لئے مُرغی۔ ایماندار کے لئے گالی۔ تاجر کے لئے فاضل خرچا اور سیاستداں کے لئے مول تول۔ کچھ بھی ہو آج کل رشوت کسی کے لئے کلنک نہیں بلکہ اس سے پرہیز افسر شاہی کا بھونڈا پن ہے اپنا نقصان، اوروں کی ناراضگی۔ اس قسم کا کردار جیو اور جینے دو کے اصول کے بالکل خلاف ہے۔ گھر میں بیوی کا مُنہ پھُلانا۔ دفتر میں ماتحتوں سے عدم تعاون، اعلیٰ افسران سے کشیدگی، پھر ناراض لوگوں سے ہمیشہ نقصان کا خوف۔ آپ ہی بتایئے کیا کیا جائے۔ کاکا ہاتھرسی نے رشوت کے مُضر اثرات سے بچنے کا نہایت تیر بہدف نسخہ تجویز کیا ہے۔ کہتے ہیں ؎

کہیں کاکا کوئی، کانپ رہا کیوں رشوت لے کر ۔۔۔ رشوت پکڑی جائے، چھُوٹ جا رشوت دے کر

رشوت کے جائز یا ناجائز ہونے کا فیصلہ تو ہم آپ پر ہی چھوڑتے ہیں۔ ہاں رشوت کے بہروپیے پن اور اس کے ہر جگہ حاضر و ناظر ہونے کا ذکر بے جا نہ ہوگا۔ رشوت کا مطلب ہے اپنے فائدے کے لئے یا نقصان سے بچنے کے لئے اپنے عہدے کا جائز یا ناجائز استعمال۔ رشوت صرف زر کی شکل ہی میں نہیں بلکہ کئی روپ میں حاصل کی جاتی ہے۔ جیسے کسی قریبی رشتے دار کو نوکری دلانے کے عوض کوئی کام کر دینا اپنی ترقی کے لئے کسی افسر کو خوش کر دینا کیسے ؟ یہ آپ جانیں!! دراصل اس کا دار و مدار خوش ہونیوالے کی پسند پر ہے اسکی مرضی کسی غنڈے کے دباؤ میں آ کر کسی اصول کو توڑنا یا سمجھوتہ کرنا بھی رشوت ہی کا ایک روپ ہے۔ ویسے رشوت کوئی خاص بڑی بات نہیں ارے صاحب گھر، باہر، دکان، بس، ریل، اسکول، دفتر، کہاں نہیں ہے رشوت ؟ اسکی تاثیر سے کون واقف نہیں ہے۔ جمہوریت میں تو سرکاریں بنانے اور گرانے میں یہ کافی کارآمد ثابت ہو رہی ہے۔ اسکی عظمت لامحدود ہے۔ اس کے نام بھی بڑے دلچسپ ہیں جیسے ٹپ، معمول، انعام، بخشش، ہفتہ، بلیک پیمنٹ، انڈر اسٹینڈنگ، اپ چارجز وغیرہ۔ گویا ؎

یہ وہ بے غیرت شئے ہے جو ڈٹ جاتی ہے عزت داروں میں ●

خودکشی

از: محمد حجازی

فارسی سے ترجمہ: محمد ظہیر الدین دارثی

کچھ دن پہلے ایک دوست ملنے کے لئے آیا۔ چہرے سے اضطراب اور پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ بہت دیر تک وہ ٹکٹکی باندھے ہوئے خلا میں کسی نامعلوم نقطے کو گھورتا رہا۔ ابرو کھنچے ہوئے۔ ذہن پراگندہ، گالوں میں گڑھے پڑے ہوئے اور نچلا ہونٹ لٹکا ہوا۔ کرسی پر بیٹھے بیٹھے انتہائی بے ترتیبی سے ہاتھ پاؤں ہلا رہا تھا۔ یہ حالت دیکھکر مجھ سے صبر نہ ہو سکا۔ میں نے پوچھا آخر بات کیا ہے؟ کونسی مصیبت تمہارے سر ٹوٹ پڑی ہے؟ کچھ لمحے خوشی کے بعد اس نے نہایت عجیب انداز میں مجھے دیکھا اور کہا۔ میں تمہارے پاس اس لئے آیا ہوں کہ یہ معلوم کروں کہ خودکشی کے لئے تمہاری نگاہ میں سب سے بہتر چیز کیا ہے۔ میں نے کہا پہلے یہ تو بتاؤ تمہارے ذہن میں یہ خیال آیا کیسے؟ کیونکہ خودکشی کے جس فن میں تم مجھے تجربہ کار سمجھ کر میرے پاس آئے ہو۔ اس میں زندگی سے بیزاری کے مختلف درجات ہوتے ہیں۔ اگر ان کا علم ہوجائے تو پھر خودکشی کے ذریعہ کا صحیح انتخاب کیا جاسکتا ہے۔

اس نے بڑی ہمت سے حواس مجتمع کئے اور انتہائی تحقیر آمیز انداز میں بولا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ تم اس نازک موقعہ پر میرا مذاق اڑاؤ گے۔ کیا مجھے بچہ سمجھ رکھا ہے، افسوس ہائے افسوس! انسان اپنا درد کسے جا سنائے۔ جب عزیز دوست ہی ناقدری کریں تو انسان اپنے دکھڑے کس کے پاس روئے؟ اس کی آنکھیں یہ کہتے کہتے بھر آئیں اور گلا رندھ گیا۔ میں نے بڑی کوشش اور کاوش سے اپنے چہرے پر رنج و غم کے آثار پیدا کئے اور بولا جہاں تک تمہاری اور میری دوستی کا معاملہ ہے تم سے بہتر میرا کوئی رفیق نہیں۔ تمہاری سنجیدگی متانت اور دور اندیشی کا جس قدر میں قائل ہوں اور کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا، لیکن میں کیا کروں؟ تمہارے سوال کا جواب اس قدر آسان نہیں ہے، میں نے آج تک کبھی خودکشی کا تجربہ نہیں کیا اور نہ اس ہتھیار سے واقف ہوں جو بآسانی زندگی سے چھٹکارا دلا سکے۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ جن لوگوں نے خودکشی کر لی وہ لوٹ کر آنے سے رہے کہ انہیں سے معلوم کیا جا سکتا کہ ان پر کیا گذری۔ ہاں اتنا جانتا ہوں کہ اس سلسلے میں موت جس قدر جلد واقع ہو اتنا ہی اچھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ شاید پستول کی گولی سب سے آسان طریقہ ہے مگر شرط یہ ہے کہ بھیجے میں یا دل میں۔ میں ایسے شخص کو جانتا ہوں جس نے پستول کی نالی اپنے کان میں رکھکر گولی چلادی اور نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے دونوں کانوں کے بیچ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سوراخ پیدا ہوگیا۔ جس کی بنا پر وہ اپنی قوت سماعت سے قطعاً محروم ہو چکا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اب وہ

ہر قسم کی خرافات سننے سے بچ گیا ہے لیکن اس نے پھر دوبارہ خودکشی کرنے کی جرأت نہیں کی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عین موقعے پر ہاتھ کے ہل جانے سے نشانہ چوک جاتا ہے۔ اگر اس غلطی سے بچنے کی اچھی مشق کر لی جائے تو پھر خودکشی کرنے میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آتی۔ میرے پاس پستول ہے اگر تم چاہو تو تمہیں دے سکتا ہوں۔ اس نے جواب دیا اس کے لئے میں ہمیشہ تمہارا شکر گذار رہوں گا۔

یہ سن کر میں اپنی خوابگاہ میں گیا اور پستول لا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ اسے چلانے کا طریقہ بھی سمجھا دیا۔ پھر میں نے کہا یہ تو ہوا تمہارے سوال کا جواب' اب اگر تم مجھے سچا اور قابل اعتماد دوست سمجھتے ہو تو مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ اور جس کی بناء پر تم اتنا بڑا اقدام کرنے پر تیار ہو گئے ہو اسے مجھ سے پوشیدہ نہ رکھو۔

اس نے کہا کوئی نئی بات نہیں ہے میرا دل دنیا سے سیر ہو گیا ہے۔ روز و شب کی یکسانیت سے میں اکتا گیا ہوں جو کچھ اس دنیا میں ہے سب کچھ دیکھ چکا ہوں لہٰذا اب مزید جینے کی کوئی خواہش باقی نہیں رہی ہے۔ جب یہاں سے ایک دن جانا ہی ہے تو پہلے کیوں نہ چلا جاؤں؟ ہو سکتا ہے اس دنیا میں قدم قدم پر ان مزاحمتوں کا سامنا کرنا نہ پڑے جن سے ہم یہاں دوچار ہیں اتنا کہہ کر وہ چپ ہو گیا اور کسی گہری فکر میں کھو گیا۔

میں نے کہا تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ اس دنیا میں قدم قدم پر مزاحمت کا سامنا ہے۔ تم سے بھول ہو رہی ہے۔ جو تم کہہ رہے ہو وہ حقیقت نہیں ہے۔ تمہارا یہ خیال اور سوچنے کا انداز وقتی ہے۔ جو تم کہہ رہے ہو وہ حقیقت نہیں ہے۔ اعتدال کھو بیٹھا ہے یہی وجہ ہے کہ حقائق کا تم صحیح اندازہ کرنے سے قاصر ہو۔

اس نے نہایت بے چینی سے کرسی پر بیٹھے بیٹھے کئی مرتبہ پہلو بدلا اور پھر اسی حال میں کہنے لگا کہ اس سے بڑھ کر اور مزاحمت کیا ہو سکتی ہے کہ لوگ بغیر کسی دلیل اور وجہ کے مجھ سے دشمنی کرتے ہیں میری ترقی اور خوشحالی کی راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں۔ میں نے ان کا کچھ نہیں بگاڑا ہے پھر یہ کیوں مجھ سے عداوت رکھتے ہیں کیوں مجھے ذہنی پریشانیوں میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ کیوں انھوں نے میری زندگی دوبھر کر رکھی ہے۔ میرے دل میں بھی ان حالات کے تحت انتقامی جذبات ابھرتے ہیں جس کی بناء پر میں سخت ذہنی پریشانی میں مبتلا رہتا ہوں کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی اذیت ہو سکتی ہے۔ ان حالات میں دوستوں اور رفیقوں کے کیا کہنے! کہیں میں ان سے کوئی تمنا یا خواہش نہ کر بیٹھوں اس لئے انتہائی تیکھے انداز میں ہونٹوں پر ہنسی لا کر منہ پھیر لیتے ہیں۔ انسان اس دنیا میں تنہا اور اجنبی ہے۔ اسے تنہا دیکھ کر لوگ چاہتے ہیں کہ شہد کی مکھی کی طرح اس پر لوٹ پڑیں سارا رس چوس لیں اور ڈنک مارتے رہیں۔ کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی اذیت اور مزاحمت ہو سکتی ہے؟ میں نہیں جانتا اس دنیا میں کیا خوبی ہے۔ یہاں کیسے خوش رہا جا سکتا ہے۔ کولھو کے بیل کی طرح دن بھر کی مسافت کے بعد بھی غروب آفتاب کے وقت

ہم ذہین کے وہیں رہتے ہیں۔ کاش میرے پاس بھی وسائل ہوتے تو میں دکھا دیتا کہ کس طرح اس دنیا سے فیض اٹھایا جا سکتا ہے۔ افسوس دنیا کی خوشی صرف زر سے خریدی جا سکتی ہے میں خالی ہاتھ ہوں۔ . . . کیا کروں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا میری قسمت ایسی ہی لکھی گئی تھی ؟

ہم دونوں اٹھ کر بغل گیر ہو گئے اور ہماری آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کا پانی ایک دوسرے سے جا ملا۔ جیسے ہی وہ جانے لگا میں نے کہا۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہارے فیصلے میں مداخلت کروں لیکن مرنا تو اپنے ہاتھ میں ہے کیا مضائقہ ہے اگر دو دن کے لئے اس پر عمل ملتوی کر دو اور زندہ رہ کر دنیا کے لوگوں سے اس قسم کا انتقام لینے میں تھوڑی سی تاخیر کر دو۔ اگر تمہیں اس سے اتفاق نہ ہو تو کم از کم میری خاطر کچھ دن اور جی لو۔ اس نے انتہائی کمزور اور نحیف آواز میں کہا کہ ٹھیک ہے۔ میں تمہاری خاطر کچھ دیر اور اذیتیں سہہ لوں گا۔ میں نے کہا اب جبکہ تم نے اپنی زندگی کے دو دن مجھے بخش دیئے ہیں اگر میں تمہیں کچھ تکلیف دوں تو میری خاطر برداشت کر لو گے ؟ اس نے جواب دیا اب جبکہ میں قول دے چکا ہوں، لہٰذا بلا چون و چرا جو کچھ تم کہو گے کر دوں گا۔

میں نے کہا افسوس لعنت ہے اس دن پر جبکہ تم اس دنیا میں نہ ہو اور تمہارے دشمن تمہاری موت پر خوشی منائیں۔ سنو یہ دو دن تمہیں ہر ایک سے ملنا ہے۔ ان لوگوں سے بھی جنہوں نے تمہاری زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ اس سب سے اس طرح ملو جیسے قطع تعلقات کے خاتمے کے بعد تم از سر نو اپنے محبوب سے رشتہ استوار کر رہے ہو۔ انتہائی میل ملاپ اور یگانگت کے اظہار کے ساتھ گویا ان سب کو اپنی پیار بھری باتوں سے رام کرنے جا رہے ہو۔ تمہیں تو دو دن بعد مرنا ہی ہے لہٰذا اپنی اس محبت اور یگانگت کے اظہار کے جواب کی تمنا کئے بغیر ان سے ملو اور اگر کوئی ان میں سے بظاہر کسی خدمت کا پیشکش بھی کرے تو نہایت سلیقے سے شکریہ ادا کرتے ہوئے اسے قبول نہ کرو کیونکہ اب تمہیں ان کی خدمت یا دردمندی کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی ہے۔ مقصد صرف اتنا ہے کہ تمہاری اس خوش اخلاقی کی بنا پر وہ تمہاری جدائی کے خیال سے ہی پریشان ہو جائیں۔

اس کے بعد اپنے دوستوں اور رفیقوں سے جا کر ملو۔ ان سے دل کھول کر گفتگو کرو، خوب ہنسو بولو، اگر وہ تم سے کوئی خدمت لیں یا کسی کام کے لئے زحمت دیں تو خندہ پیشانی سے قبول کر لو اور بجا لاؤ تاکہ کل جب تم نہ رہو تو تمہاری ان زحمتوں کو یاد کر کے وہ تمہارے لئے رنجیدہ ہو جائیں۔

ایک اور زحمت بھی اگر کر سکو تو میں نہایت ممنون رہوں گا۔ اگرچہ یہ ذرا دشوار ہے لیکن جب تم نے مجھے قول دے ہی دیا ہے تو مجھے یقین ہے کہ یہ بھی کر گزرو گے۔ کل صبح سورج نکلنے سے پہلے اپنے گھر کی چھت پر جا کر صبح کی نرم و لطیف ہوا میں ٹہلنا۔ دنیا کے خلاف جو تمہارے دل میں گرد و غبار ہے اس کی طرف ذرا بھی

دھیان نہ دینا۔ مجھے یاد کرتے ہوئے صبح کو موع ہوتے ہوئے دیکھنا۔ ہو لکتنے رنگ بدلتی ہے۔ مناظر میں کیا کیا تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ پہاڑوں کی چوٹیوں، فطرت کے مناظر اور پرندوں کی چہچہاہٹ پر نظر رکھنا۔ ان کا غور سے مشاہدہ کرنا۔ میرا خیال ہے کہ صبح کی روشنی ایک ایسے نور سے تعلق رکھتی ہے جس سے دل میں عشق طلوع ہوتا ہے، دوستی کا جذبہ لہریں لینے لگتا ہے۔ صبح کی ہوا گلزار محبت و وفا کی مہک لے آتی ہے۔

جب آفتاب طلوع ہو جائے تو پھر تم اپنے کاروبار میں مصروف ہو جانا لیکن ہر روز کی طرح نہیں۔ اپنے فرائض اس طرح انجام دینا کہ اگر خدانخواستہ تمہیں کچھ ہو جائے تو تمہاری کمی بری طرح محسوس کی جائے۔ اگر تم نے صبح کچھ نہ کھایا ہو تو دوپہر میں سیر ہو کر اچھی اچھی غذائیں کھانا۔ ہاں مگر یہ خیال ضرور رکھنا کہ جس غذا کے لئے بھی تمہارا دل چاہے وہ زیادہ مہنگی نہ ہو۔

خالی وقت گذاری کے لئے بہتر ہے کہ چند صفحے مثنوی مولانا روم یا غزلیات حافظ کے مطالعہ کئے جائیں۔ الغرض دو دن تک بالکل اسی طرح کرنا جس طرح میں نے کہا ہے ہاں تیسرے دن تم مختار ہو جو جی میں آئے سو کرنا۔

میرے دوست کو ہنسی آ گئی، کہنے لگا کیوں مذاق کرتے ہو۔ میں نے چہرے پر انتہائی سنجیدگی طاری کرتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔ میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ تم نے مجھے قول دیا ہے کہ کل سے (۴۸) گھنٹے اسی طرح گذارو گے جس طرح میں چاہوں گا۔ جو میں کہوں گا وہ کرو گے۔ جب اس نے دیکھا کہ میں سنجیدہ بھی ہوں اور وہ مجھ سے وعدہ بھی کر چکا ہے لہٰذا چپ چاپ پستول اٹھا کر اس نے مجھے خدا حافظ کہا اور چلا گیا۔

تیسرے دن میں نے بہترین لباس زیب تن کیا اور اس کے گھر گیا۔ اس نے میرا استقبال کیا۔ اس کا چہرہ خوشی سے کھلا ہوا تھا۔ میں نے کہا کہ میں پرسے اور سوگواری کے مراسم ادا کرنے کے لئے آیا ہوں۔ وہ بے اختیار ہنستے ہوئے بولا۔ ابھی مرنے کے لئے مدت پڑی ہے میں چاہتا ہوں کہ تمہارے کہنے کے مطابق کچھ دن اور زندگی گذاروں۔ یہ سن کر میں نے اسے سینے سے لگا لیا اور ہم دونوں کی آنکھوں سے مسرت کے آنسو پھوٹ نکلے۔

★

ڈاکٹر یعقوب عمرؔ

رسمِ اجراء

دیکھئے جس کو وہ ہوں میں اس مرض کا ہے شکار
شاعروں کو چڑھ گیا ہے "رسمِ اجراء" کا بخار

رات دن اردو اکیڈیمی کو دیتے ہیں دعا ٭ ہو رہے ہیں جس کے دم سے صاحبِ دیوان شمار
رطب و یابس کے جو مجموعے پڑے تھے گرد میں
چھپتے ہی جن کی اشاعت کا نہ تھا کچھ اعتبار

کیا نصیب ہے کہ اُن پر ہیں سنہرے گرد پوش ٭ شومیِ قسمت سے تھے ملبوس جن کے تار تار
زرد و پارینہ صفحوں کی خستگی مت پوچھئے
گر نسیم صبح بھی چھو لے تو پرزے ہوں ہزار

داد اُس کاتب کو ملنی چاہیئے، جس نے لکھا ٭ آخریں اس پر گیا جس نے صحت سے ہم کنار
کہتے ہیں کہ ایک شاعر کی سرہانے موت پر
آخری حسرت جو پوچھی، بول اٹھا بے اختیار

بیوی بچوں کے لئے کچھ بھی نہیں مانگوں گا میں ٭ کوئی چھپوا دے اگر دیوان میرا ایک بار
کیڈمی کا جذبۂ جود و سخاوت پوچھئے
وہ تو لاتیں مارتی ہے قبرِ حاتم پر ہزار

کچھ کے کشکول میں وہ ڈال دیتی ہے، تو کچھ ٭ محض پردیسی بیٹوں کی رقم پر انحصار
جب کتابت ہو گئی تو تبصرے کی فکر تھی
جستجو تھی کہ ملے نقاد کوئی رشتے دار

روز نقادوں کے گھر دھرنا دیا جانے لگا ٭ یہ سراپا ملتجی، تو وہ سراپا اعتذار

التجا ان سے یہی تھی کہ شرافت سے لکھیں
یعنی ان کو "میرؔ و مومنؔ" کم سے کم دیدیں قرار
خود بخود اخبار میں چرچا ہو، تصویریں چھپیں ؛ ابھرا جس کی شخصیت ڈھونڈینگے ایسی باوقار
ایک درجن شاعروں کو لکھ کے دیں گے اپنی مدح
اس میں کچھ شاگرد ہوں گے، کچھ رفیق و رشتہ دار
مدح گو بھی آپ ہیں، ممدوح بھی ٹھیا آپ ہی! ؛ آپ ہی لیں گے فریم اس کا بطورِ یادگار
دھوم سے ہوگی ادا پھر پھول پہنانے کی رسم
ایک جیسے اک دُکاں سے "ہول سیل" آئینگے ہار
ہال اور مائک کا چندہ ہو گا شاگردوں کے سر ؛ نصف پیالی چائے کا احباب کی جیبوں پہ بار
رشتے داروں سے بھری جائیں گی اکثر کرسیاں
اور پردے میں براجینگی زنانِ خانہ دار
کیسے کیسے خوبصورت نام مجموعوں کے ہیں ؛ پھر بھی کوئی جیب سے ان کا نہیں امیدوار
طبع شاعر، کیڈمی کا فنڈ، یا مالِ پسر،
ان کا بوجھ ہلکا ہوا، جاتا رہا ان کا غبار،
کیڈمی آفس میں دیوانوں کے پشتے لگ گئے ؛ وہ بھی اتنے کہ لگا بیٹھے اگر کوئی قطار
"نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر"
ان کتابوں کے تلے ہوں گے سبھی شہر و دیار

ویریندر پٹواری

مینا بازار

جانے یہ کونسی صدی ہے، اور میں یہاں کیسے پہنچ گیا ہوں، مجھے کچھ یاد نہیں۔
سچ پوچھیئے تو مجھے اپنا نام بھی یاد نہیں ہے۔

یہ کونسی جگہ ہے' یہ کہہ نہیں سکتا۔ کیونکہ شناخت کے لئے نہ تو کہیں مکان نظر آ رہے ہیں اور نہ انسان۔ دنیا گول ہے اس لئے یہ کیسے بتا سکوں گا کہ مشرق میں کھڑا ہوں یا مغرب میں' شمال میں ہوں یا جنوب میں؟ میں بذات خود کس نسل سے تعلق رکھتا ہوں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کیوں کہ چہرے پر اتنے زخم کہ اپنے آپ کو بھی پہچاننے کی کوشش نہیں کر سکتا۔ منگول ہوں' چینی ہوں' حبشی ہوں' گورا ہوں یا کالا ہوں' یہ بھی یاد نہیں آ رہا ہے۔ ہاں ان دھماکوں کی آواز ابھی تک گونج رہی ہے جن سے میرے دروددیوار پھٹ کر میرے جسم پر گر گئے تھے۔ پھر بھی پچھلی صدی کی طرح یہاں اس کھلے میدان میں ایک مینا بازار لگا ہوا ہے۔ کس نے لگایا ہے معلوم نہیں' مگر ویسا ہی بازار ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پچھلی صدی میں گاہکوں کی بھیڑ ہوا کرتی تھی اور اس وقت فقط تین عدد گاہک نظر آ رہے ہیں۔ شاید یہ ایک اتفاق کی بات ہے کہ میں تب بھی ایک سیلز مین تھا اور اب بھی ایک سیلز مین ہوں۔ ہاں مگر تب میرے کئی ساتھی تھے۔ مختلف کاونٹروں پر کھڑے کوئی بچوں کے کھلونے بیچا رہتا تھا اور کوئی رنگ برنگی چوڑیاں۔

اس وقت میرے اس واحد کاونٹر پہ نہ تو کھلونے ہیں اور نہ ہی چوڑیاں۔ مگر یہ تینوں گاہک ایک دوسرے کی موجودگی کو بالکل نظرانداز کرکے میرے کاونٹر پر رکھی ہوئی چیزوں کو نہایت دلچسپی سے دیکھ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک شخص شاید ایک مصور ہے کیونکہ وہ کینوس تلاش کر رہا ہے۔ برش تلاش کر رہا ہے۔ رنگ تلاش کر رہا ہے' اور پھر گا رہا ہے بگا ہے اچھل کر میرے کاونٹر پر رکھی مختلف چیزوں کو ایک دوسرے سے جوڑ کر کچھ بڑبڑا رہا ہے۔ دیوانہ ہے' جبھی تو ہنس رہا ہے اور کبھی رو رہا ہے۔ حیران ہوں کہ یہ سر کو دھڑ سے جوڑ کر کیا کرے گا۔ شاید مجھے پریشان۔ اس مصور کے ساتھ دو قدم چل کر میں بھی بے وقوفوں کی طرح سوچنے لگا ہوں کہ پہلے مرغی تھی یا انڈہ۔ انڈے تو ہیں۔ تو کیا؟ نہیں نہیں یہ ممکن نہیں۔

دوسرا گاہک شاید کوئی جادوگر ہے۔ وہ کبھی اپنی انگلیاں ہلا رہا ہے اور کبھی وہی جانا پہچانا جادوئی ڈنڈا۔ اس کی معمولی سی معمولی حرکت سے میرے کاونٹر پہ رکھی چیزیں یوں بکھر جاتی ہیں جیسے کسی کھنڈر کے پتھر اور پھر اپنے ہاتھ میں لئے اُس فہرست کو دیکھ کر نشان لگا کر فاتحانہ قہقہے لگاتا ہوا اپنے آپ کو فاتان سمجھ کر مجھ پر بھی رعب ڈال رہا ہے گویا میں سیلز مین نہیں بلکہ اس کا خادم ہوں۔ یعنی وہ بادشاہ اور میں رعایا۔ کیا کروں میرے بازوؤں میں دم ہوتا تو اُس کے ہاتھ سے یہ جادوئی چھڑی چھین کر اس کاونٹر کو بچاتا جس کو وہ بار بار یوں ہلا رہا ہے جیسے اس منحوس دن زمین ہل رہی تھی۔ میرا کاونٹر بھی ہل گیا تھا۔ کھلونے فرش پر گر کر بچوں کے سمیت پگھل گئے تھے اور چھڑیاں بیواؤں کی مانگ کی طرح اُجڑ گئیں تھی۔

یہ تیسرا گاہک کون ہے کچھ کہہ نہیں سکتا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا چل رہا ہے اور کاونٹر پہ رکھی ہوئی چیزوں کو ویسے ہی گن رہا ہے جیسے ووٹوں کی گنتی ہو رہی ہو۔ اس نے میرے سر پر بھی اپنا نشان لگایا ہے اور اب وہ بہت خوش نظر آ رہا ہے۔ لگتا ہے وہ بھی کچھ خریدنے کی بجائے کاونٹر کا خودساختہ مالک بن گیا ہے۔

خیر ان تینوں کی بات چھوڑیئے۔ یہ فقط چاند ستاروں کی طرح میرے اردگرد نظر آ رہے ہیں۔

مجھے ایک معقول خریدار کی ضرورت ہے۔

اس دنیا میں ہے کوئی جو میرے کاونٹر پر رکھی ہوئی چیزوں کو خریدنا چاہتا ہو !!!

ارے ہاں ! یہ تو بتا دوں کہ میرے کاونٹر پہ کیا ہے۔

چند کھوپڑیاں ، چند ہڈیوں کے پنجر ، راکھ کے ڈھیر اور بموں کے خول۔

ڈاکٹر یعقوب عمر

غزل

نشانِ جبر نہ پوچھو کہاں کہاں سے ملے
کچھ آستینوں میں پائے کچھ آستاں سے ملے

لپٹ کے روتے نہ دیوار سے تو کیا کرتے
مکیں سے ملنا تو ممکن نہ تھا مکاں سے ملے

چمن میں اپنوں کی دیوالی بن گئی ہولی
ثبوت ایسے ہی کچھ خاکِ آشیاں سے ملے

ہماری آنکھ نہ کھولیں تو ان سے کیا حاصل
سبق، جو عظمتِ رفتہ کی داستاں سے ملے

تمام عمر ہٹائی تو تہمات کی دھول
حجاب جسم کو دیکھا، نہ مغزِ جاں سے ملے

وفا وصف ہے، متاعِ گراں بہا سمجھو
قبول کر لو، وہ جیسی ملے، جہاں سے ملے

ہمیشہ خاک نشینوں سے دوستی رکھی
سلام چاند کو بھیجا نہ آسماں سے ملے

افتخار بشر حیدرآبادی

"ظرفِ نظر"

غلط کہ "میں" نے
تجھے یا کسی کو دیکھا ہے
نظر کہ حسن کی ماری ہے
جذب و مستی میں
نگلوں کے روپ محل سے دلوں کی کٹیا تک
دگر نہ دشت و جبل میں گیا سے سینا تک
گذر گئی ہو گی
جہت جہت کے نظاروں میں ہو کے وارفتہ
کسی دھنک سے سراپے میں کھو گئی ہو گی
غلط کہ میں نے تجھے یا کسی کو دیکھا ہے
شہابِ حسن و تجلّی کا سارا قصہ ہے

ایلاف
مجموعۂ شعر
شاعر
رؤف خیر

سحر حلال
مجموعۂ شعر از
شہاب الدین رحمت اللہ
مرتب
وقار راشدی

میزان
تبصرہ نگار
یعقوب عمر

ذاکر صاحب
(اپنے آئینۂ لفظ و معنی میں)
مرتب
ضیاء الحسن
فاروقی

نقد و سنجش
مجموعۂ مضامین
از
طلحہ رضوی برق

شعری مجموعہ
شاعر: رؤف خیر
پتہ: 9-10-202/19
دلاور شاہ نگر رسالہ بازار، گولکنڈہ،
حیدرآباد۔ 500008.

"ایلاف"

(تبصرہ)

سرزمینِ حیدرآباد جامع الکمال ہستیوں کا گہوارہ رہی ہے۔ آج کے اس گئے گزرے دور میں بھی کچھ چنگاریاں تہہ خاکستر ایسی ہیں جو شعلہ بن کر اس ادب زار کو منور کرسکتی ہیں۔ دامنِ گلزمین کے چند گنے چنے جواں سال شعراء میں سے رؤف خیر کی شعری توانائی نے نہ صرف حیدرآباد دکن بلکہ ہندوستان کے طول و عرض کے نقادانِ سخن کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔

ایلاف میں ۵۸ ترائیلے، ۱۹ نظمیں، ۲۵ غزلیں اور سات متفرق شعر ہیں اور یہ ساری کائنات صرف ۱۰۶ صفحات پر محیط ہے مگر اس مجموعے کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اقلیت اکثریت پر حاوی ہے یعنی ان کی نظمیں ان کے ترائیلوں سے بہتر ہیں اور غزلیں بدرجہا بہتر۔

عموماً ایسا ہوتا ہے کہ نظم گو شعراء اچھی غزل نہیں کہہ سکتے یا غزل گو شعراء کی نظمیں سرسبز نہیں ہوتیں، مگر رؤف خیر کو دونوں اصنافِ سخن پر قدرت حاصل ہے۔ ان کا شعری شعور پختہ، بصیرت قوی اور قوتِ مشاہدہ غضب کی توانائی لئے ہوئے ہے۔

اس شعری مجموعے میں رؤف خیر ہمارے سامنے کئی روپ میں آتا ہے کہیں وہ ایک غصیلے نوجوان کے کردار میں ہے، کہیں زندگی کی تلخ حقیقتوں سے آمادۂ پیکار، کہیں نامساعد حالات پر برہم، کہیں اینٹ کا جواب پتھر سے دینے پر مائل اور کہیں رواداری و صلح کل کا علم بردار بن کر نمودار ہوتا ہے۔ ایک انسان، ایک باشعور دانشمند اور دوراندیش انسان تمام بشری کمزوریوں کے ساتھ جس طرح زندگی سے معاملت کرتا ہے، رؤف خیر کا مجموعۂ کلام اس کا آئینہ ہے۔ کہیں کہیں کٹر مذہبیت ضرور ہے مگر یہ بھی تعمیری انداز میں ہے۔

رؤف خیر کے پہلے مجموعے کا نام "اقرا" اور اس مجموعے کا نام "ایلاف" دیکھ کر کسی کو یہ گمان ہوسکتا ہے کہ اس میں مذہبی شاعری ہوگی لیکن ایسا نہیں ہے یہ ادبی شاعری کے مجموعے ہیں۔ شاعر کو یہ حق ہے کہ وہ اپنے مجموعوں

کا نام جو چاہے رکھے مگر اتنا ضرور ہونا چاہیئے کہ اردو شاعری کے مجموعوں کے لئے خالص عربی نام نہ رکھے جائیں اور وہ بھی ایسے نام جو آیاتِ قرآنی سے مستعار ہوں' جو مسلمان قاری کا ذہن مذہبی شاعری کی طرف اور غیر مسلم قاری کا ذہن ایسے مذہبی پرچار کی طرف منتقل کردیں جو مختلف مذہب کے ماننے والوں کے مابین غلط فہمیوں کا سبب بن جائے۔ کیا اردو کا دامن اتنا تنگ ہے کہ وہ اپنے شاعروں کے مجموعوں کو خوبصورت اور مناسب نام تک مہیا نہیں کر سکتی۔ فارسی ترکیبوں کو اردو والوں نے جس طرح اپنے دامن میں سمویا ہے اُس کی مثال تو فارسی میں بھی نہیں مل سکتی اور آج بھی اس مرحلے سے بے شمار نئی ترکیبیں وضع کی جا سکتی ہیں۔

اُردو نظم پچھلے (۷۰) سالوں میں کئی نشیب و فراز سے گزری ہے۔ ۱۹۲۵ء تک نظم انگریزی شاعری کے زیر اثر تقلیدی پیراہن میں رہی۔ اس میں تخلیقی قوت اور شعری توانائی جسے بھرپور شعریت کا نام بھی دیا جا سکتا ہے بہت کم نظر آتی ہے۔ بہت ساری نظمیں تو ایسی ہیں جن میں خوبصورت لفظوں کو یکجا کر کے ایک ایسا پیکر تراشنے کی کوشش کی گئی ہے جو ادبِ لطیف سے گہری مماثلت رکھتا ہے۔ اسی دوران انگریزی نظموں کے ترجموں سے اور اس صنف میں مختلف تجربوں سے موضوعات میں تنوع پیدا ہوا۔ اردو نظم کا کارواں کچھ دیر کے لئے ایسا محسوس ہوا کہ ارتقا کی طرف گامزن ہے مگر ترقی پسند شعرا نے ایک خاص مقصد کو پیشِ نظر رکھ کے اس صنف میں جو تخلیقات پیش کیں اس نے شعری تقدس کو نقصان بھی پہنچایا اور فائدہ بھی۔ نقصان یہ ہوا کہ آفاقی موضوعات نہ ہونے کے برابر نظم ہوئے مگر آئندہ نظم نگاروں کو نظم کا ایک ایسا سانچہ مل گیا جو ہر قسم کے مضامین اپنے دامن میں سمیٹ سکتا تھا اور اس طرح کہ تخلیق کا حق بھی ادا ہو سکے اور شعریت میں بھی کمی نہ آنے پائے۔ مگر جدید نظم اچھے شعرا اور متنوع مضامین کے باوجود وہ مقام حاصل نہ کر سکی جو اُسے غزل کا ہم پہلو بنا دے چہ جائیکہ وہ غزل سے آگے نکل جاتی۔

بہرحال جدید نظم میں آفاقیت اور شعریت دونوں کا ارتقا ہوا یہاں تک کہ مذہبی مضامین اور حمد و نعت و منقبت کے موضوعات بھی جدید نظم کے قالب میں جگہ پانے لگے۔ تعمیری مضامین اور اخلاقی اقدار کے حامل موضوعات بھی کچھ کچھ شعرا کے یہاں اس پیرائے میں اتنی خوبصورتی سے نظم ہوئے ہیں کہ کوئی بھی ان پر خطیبانہ یا واعظانہ اندازِ بیان کا لیبل نہیں لگا سکتا۔ جہاں تک جنسی تلذذ اور تخریب پسندانہ خیالات

کا معاملہ ہے اس سے جب غزل کا دامن محفوظ نہ رہ سکا تو ظاہر ہے کہ جدید نظم اس سے کیسے محفوظ رہتی نظم جدید میں فی الحال ایک خاص بات یہ پیدا ہوئی ہے کہ شعراء کی اکثریت بجائے طوالت کے اختصار پر مائل نظر آتی ہے اور مختصر نظموں میں سے اکثر نظمیں انتہائی موثر اور دلپذیر انداز میں کہی جانے لگی ہیں۔

رؤف خیر کی نظموں میں جہاں موضوعات کا تنوع ملتا ہے وہیں انفس و آفاق دونوں کے مشاہدات اور تجربات کا نچوڑ بھی، کہیں سیدھے سادے معصوم اور کہیں انتہائی بلیغ انداز میں ملتا ہے۔ اس کی مختصر نظمیں دامنِ دل اور پائے نگاہ دونوں پر اپنی گرفت مضبوط کرلیتی ہیں۔ ریگاب ۔ نئے سال کے لئے بھی ۔۔۔ ناآشنا اور شریفانہ معاہدہ ۔۔۔ تجربہ ۔۔۔ نظم ۔۔۔ اور قابیل ۔۔۔ یہ سب اچھی اور مختصر نظمیں ہیں ان میں تجربے کی سچائی، خیالات کا تقدس، حقائق کا اعتراف اور تعمیری اقدار کا جو رچاؤ ملتا ہے وہ قاری کو مطمئن ہی نہیں کرتا بلکہ اسے شاعر کے تجربات میں شریک ہونے کی ترغیب بھی دیتا ہے۔

اُنیس نظموں میں سے سات بہترین نظموں کا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ شاعر کی شعری توانائی کس قوت کی حامل ہے اور اگر وہ اسی اہتمام سے اس توانائی کو بحال کرتا رہا تو سرزمینِ دکن کا یہ جوان شاعر برصغیر کے شعری آسمان پر اتنا منور اور روشن ہو جائے گا کہ ہلالِ عید کی طرح اسے تلاش کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

نئے سال کے لئے بھی

کوئی آئے / کسی صورت / کسی ساعت بھی آئے
دستکیں لوٹا نہ دوں گا / جواباً میں بہر صورت ملوں گا۔

ناآشنا

سُنا ہے میرے ہمسائے بھی ہیں ناآشنا مجھ سے / مگر سچ پوچھیے تو
درحقیقت جاننے والے ہی کتنے ہیں؟

بڑی خوبصورت نظم ہے اگر اس کے تیسرے مصرعے سے 'درحقیقت' نکال دیا جائے تو یہ نظم اور بھی خوبصورت ہو جائے گی کیونکہ 'سچ پوچھیے' اور 'درحقیقت' یا 'واقعی' سب مترادف ہیں۔

قابیل

اُٹھا کے دیکھیے شاید ہے آج تک تاریخ / کہ زندگی کا کوئی مرحلہ ہو
بھائی کو شکست بھائی کے ہاتھوں ہوئی ہے
کہ اتنی دیدہ دلیری / پرائے خول میں کہاں!

ایک مکمل، بھرپور اور کامیاب نظم ہے۔ اس کے دونوں آخری ٹکڑے "کہ اتنی دیدہ دلیری" "پرائے خول میں کہاں!" میں شاعر کی شعری توانائی اپنے پورے شباب پر ہے۔

رؤف خیر کی غزل میں بھی بڑی تمازت ہے۔ زندگی کے اُتار چڑھاؤ، اقدار کی شکست و ریخت اور نہ جانے کتنے تازہ ترین سیاسی اور سماجی موضوعات کو رؤف خیر نے غزل کا مزاج اور زبان دونوں کو مجروح کئے بغیر نظم کر دیا ہے اور اگر شاعر نے اپنا ریاض جاری رکھا، خوب سے خوب تر پانے کی تمنا، اسی جوش اور ولولے سے قائم رہی تو بہت ممکن ہے کہ آئندہ دہے میں شاعر کا شمار برصغیر کے اچھے اور بہترین غزل گو شعراء میں ہونے لگے۔ اس سلسلے میں سب سے خوش آیند بات یہ ہے کہ رؤف خیر کے ہاں مکمل ابلاغ موجود ہے اس کی شاعری تجریدی انداز کی نہیں ہے نہ اس کے یہاں ایسا ابہام ہے جس نے بعض بہت چھپنے والے شعراء کی غزلوں کو الفاظ اور ترکیبوں کا قبرستان بنا دیا ہے۔

۲۵ غزلوں کے مختصر ترین مجموعے میں سے یقیناً دو تین غزلیں تو پوری کی پوری اثر انگیز ہیں پہلی، آٹھویں اور اٹھارویں غزل کے اکثر اشعار قاری کو جھنجھوڑ دیتے ہیں۔ غزل، اندازِ بیان، مضمون کی تازگی، لفظوں کا انتخاب، کرب اور کسک کی تیز کاٹ، تلخ حقائق کی اس طرح بندش کہ غزل کے چہرے پر خراش تک نہ آنے پائے۔ علامت (یا سمبل) نگاری کے پیراہن میں تجربات کا ایسا نچوڑ کہ ابلاغ کے ماتھے پر شکن نہ آئے یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے ۔

قاتل ہوں یا خضر ہوں کھلے گا یہ کس طرح — اے بدگمان لوگو مرے ساتھ تو رہو!

آنے تو بادِ صبا سے بھی خوف آتا تھا — چلے تو خیر ہواؤں کے سامنے بھی ہوئے

مرے ہاتھ میں وسعت آسماں   مرا پاؤں دلدل کی بانہوں میں تھا

بے گھر ہوئے ہیں دیدۂ بے خواب کے قتیل   ان جگنوؤں سے لذتِ روداد شب نہ پوچھ

نہایت خوبصورت شعر ہے۔ تجربہ انتہائی حقیقی اور تلخ ہے مگر غزل کی زبان میں دامنِ دل جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے اور اس طرح کہ اپنا ذاتی تجربہ آفاقی حیثیت اختیار کر جاتا ہے

تعارف ہی تو نا ممکن ہے میرا   بدن کافر ہے دل مومن ہے میرا

بہت سے لوگوں کا ذہن علامہ اقبال کے ہاں اس سے ملتی جلتی ترکیب کی طرف منتقل ہو جائیگا مگر رؤف خیر کا یہ شعر اپنے آپ میں بے پناہ تغزل لئے ہوئے ہے۔ مضمون کی مشابہت اور چیز ہے اور تراکیب کی مشابہت اور۔ اقبال اور رؤف خیر کے مضمون میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ منظر بدل ہی جاتا ہے   تو کیا عجب ہے کسی دن میں ... وہ بھی نہ رہوں

خود کو سنبھالنا بھی قیامت ہے ان دنوں   اب ہم ہیں اور آگ پکڑنے کے مرحلے

کیسے سمجھائیں کہ بے مائیگی کیا ہوتی ہے   شکر کیجئے کوئی سایہ جو ابھی ہے سر پر!

زیرِ سایہ ہمیں دیکھو تو بُرا مت جانو   ہم نے اک عمر کڑی دھوپ سہی ہے سر پر

نمو کا جوشِ سلامت، میں بے نشاں نہیں!   کمال یہ ہے کہ ہر خاک نم ہے میرے لئے

کیا بتائیں کس تکلف میں کٹا عہدِ بہار   کب گریباں چاک تھا دامن کے کب ٹکڑے ہوئے

کیسے کیسے ذہن ہیں اس کھیل کے پیچھے یہاں   تم اکیلے کھیلتے ہم سے تو ہم بھی کھیلتے

وہ ہاتھ تحفظ کی علامت جیسے کہئے　　محسوس یہ ہوتا ہے وہی سُن بھی بہت ہے

کچھ ہاتھوں سے کچھ ہاتھوں سے کالک نہیں جاتی　　ہر چند کہ بازار میں صابن بھی بہت ہے

مندرجہ بالا اشعار کے علاوہ بھی اچھے شعر مجموعے میں ہیں۔

جہاں رؤف خیر کی غزل میں بہت سی خوبیاں ہیں وہیں چند ایک خامیاں بھی نگاہ میں کھٹکتی ہیں۔ مثلاً ایک غزل ہے ؎

اس کا شمار آنکھوں کی ٹھنڈک میں رکھئے　　وہ پھول ہے تو کیا اُسے پُستک میں رکھئے

اس میں لفظ "رکھئے" کو رؤف خیر نے مشدد باندھا ہے جو صحیح نہیں۔ اس سے غزل کی روانی مجروح ہوگئی ہے۔ غزل بھی کمزور ہے، بندش بھی سست ہے اور کچھ الفاظ کے استعمال میں بھی کاوش سے کام نہیں لیا گیا ہے۔

اسی طرح ایک آدھ غزل اور بھی ہے۔ جس میں نظر ثانی اور ترمیم و اصلاح کی ضرورت ہے رؤف خیر سے بہت سی توقعات وابستہ ہیں لہٰذا انھیں چاہیئے کہ وہ میدانِ غزل میں اپنا ارتقائی سفر جاری رکھیں۔ انتھک ریاض ہی غزل میں مشاقی کی منزل تک پہونچاتا ہے۔ فنِ عروض اور اساتذہ، متقدمین متاخرین و معاصرین کے کلام کا غائر مطالعہ بھی ضروری ہے۔ معاصرانہ چشمکوں کے جواب میں برہمی مناسب نہیں جو شاعر کو سنگلاخ زمینوں میں اُلجھا کر اس کی توانائی کو ضائع کر دے ؎

اس زمین سخت سے کیا ہم سے شاعر بھاگ گئے　　کھود لیتے ہیں کنواں شہداب پا لیتے ہیں خیر!

اس زمین میں جو غزل کہی گئی ہے وہ مشق کے لئے تو مناسب ہے لیکن اشاعت کے لئے ٹھیک نہیں۔ ایک آدھ فنی غلطی پکڑنے والوں کے جواب میں ایسی برہمی کا اظہار ؎

ہم شعر کہا کرتے ہیں وجدان کے بل پر　　کچھ لوگوں کو زعم فعلاتن بھی بہت ہے

زود رنجی کی علامت ہے ایسی ناراضگی شعری ارتقا کو روک سکتی ہے لہٰذا کم معیار لوگوں کے جواب میں قلم فرسائی سے زیادہ تبسم زیر لب زیادہ موثر ہوتا ہے۔

جہاں تک "ترائیلے" کا سوال ہے۔ یہ ایک غیر ملکی صنف سخن ہے جس کے بارے میں خود شاعر نے یہ اعتراف

کیا ہے : " یہ آٹھ مصرعوں کی چھوٹی سی نظم بڑی خاص توجہ چاہتی ہے۔ مصرعوں کی ترتیب و آہنگ کا خیال رکھنا آج کل اذیت کوشی کے مترادف سمجھا جانے لگا ہے کیونکہ پابند نظم سے آزاد و معرّا نظم، غزل سے آزاد غزل اور پھر نثری نظم تک جو سفر ادب نے طے کیا ہے وہ پابندیوں سے آزادیوں کی طرف سفر کی علامت ہے۔ ویسے بھی آٹھ مصرعوں کا التزام اور پھر دو مصرعوں کا خاص ترتیب کے ساتھ دُہراؤ ممکن ہے اچھا نہ لگے۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ ترائیلے میں مزاجی لگ گیا۔"

اردو اور فارسی شاعری میں ایک صنف سخن " ترجیع بند" ہے جس میں ہر بند کے بعد مصرعے یا اشعار دُہرائے جاتے ہیں اس لحاظ سے جب ہمارے یہاں ایک صنف سخن ایسی موجود ہے جس میں مصرعوں کی تکرار کا التزام ہوتا ہے اور ہمارے شعری مزاج سے ہم آہنگ ہے تو ایک اسی قسم کی غیر مانوس صنف سخن میں اپنی توانائی ضائع کرنا جس میں بیشتر مصرعوں کی تکرار سے نظم بوجھل ہو جاتی ہے مناسب نہیں بلکہ قوت شعری کا زیاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو شاعری میں ' سانیٹ " بھی سر سبز نہ ہو سکا' بقول شمس الرحمٰن فاروقی :
" آخر سانیٹ ہے ہی کیا' موضوعات کے لحاظ سے اس میں کوئی تخصیص نہیں' کوئی ایسا موضوع نہیں جو سانیٹ " میں بند نہ سکتا ہو اور نظم اس سے قاصر ہو۔ لے دے کے بندوں کا التزام ہی تو ہے جو " سانیٹ " کی مخصوص صفت ہے۔ اب آپ سانیٹ کو چاہے ۸+۶ میں بانٹئے۔ ۴+۴+۴+۲ میں بانٹئے۔ ۸+۴+۲ میں بانٹیے جو بھی کیجئے ہر طرح کا بند ہمارے یہاں موجود ہے تو پھر ہم سانیٹ کا جھگڑا کاہے کو مول لیتے ؟ اب رہ گئی ترتیب قوافی تو سانیٹ کی کوئی ایسی ترتیب نہیں جو ہم نے مختلف نظموں میں پہلے ہی نہ برت لی ہو یا نہ برت سکتے ہوں .... سانیٹ ہمارے یہاں اس لئے ناکام ہوا کہ وہ ہماری شاعری کی کسی صنفی یا ہیئتی ضرورت کو پورا نہیں کرتا تھا۔" (بحوالہ شب خون' جنوری فروری ۸۷ ء صلا)

ترائیلے کی ساخت ہی کچھ ایسی ہے کہ مصرعوں کی تکرار میں تصنع یا بناوٹ ناگزیر ہو جاتا ہے یہ تکرار مقدس کتابوں یا مذہبی شاعری میں تو گوارا ہو سکتی ہے مگر ادبی شاعری میں یہ غیر فطری تکرار بار خاطر ہو جاتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ رؤف خیر نے ترائیلے کہنے میں کافی محنت کی ہے اور حتی الامکان اپنی شعری توانائی سے اس صنف سخن میں جان ڈالنے کی کوشش کی ہے مگر اکثر و بیشتر ایک غیر ملکی اور نامانوس صنف سخن ہونے کی بنا پر اُن کی یہ کوشش بار آور نہیں ہو سکی ہے۔ انھوں نے جو ترائیلے کہے ہیں اُن میں سے اکثر ایسے

ہیں جس میں سے ایک ایک شعر انتخاب کیا جاسکتا ہے جس میں پورے ترائیلے کا مفہوم اختصار کے ساتھ آجاتا ہے
مثلاً: آخری تیر میرے ترکش کا توڑ دے گا غرور سرکش کا

دیکھا نہ جائے ہے تری بے چہرگی کا دُکھ اے مرگِ ناشناخت مرا نام پیش ہے

زمیں کا ربط زمان و مکاں میں حائل ہے دگرنہ لُطفِ سفر بے گھری میں کیا کیا تھا !

ہم تو سمجھ رہے تھے کہ میٹھی ہیں گولیاں ! اتنی خبر نہ تھی ہمیں کونین ان میں ہے

جو ممکن ہو تو ہو تقسیم لیکن مری تشکیل تو ممکن نہیں ہے

مرے اندر سکوں ہے خواب جیسا مرے باہر بلا کی آندھیاں ہیں

بے گناہوں کو سزا دینی پڑی ہم بھی کن ہاتھوں کے پتھر ہو گئے

ترا خلوص، مری رُوح سے گزر نہ سکا مرا خلوص بھی اب جسم کا تقاضہ ہے

یہ تمام اشعار اپنی جگہ تقریباً مکمل مفہوم لئے ہوئے ہیں۔ خوبصورت ہیں، ان میں تاثیر بھی ہے جب یہ اپنی جگہ مکمل ہیں تو پھر چند مصرعوں کی تکرار اور کچھ زائد مصرعوں سے ایک نئی صنف "ترائیلے" کی ضرورت ہی ختم ہو جاتی ہے اور شاعری میں جو چیز ضرورت سے زیادہ ہوتی ہے اُسے حشو و زوائد یا بھرتی کا نام دیا جاتا ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ رؤف خیر جنھوں نے اس صنف میں کافی اچھے شعر نظم کئے ہیں اس صنفِ سخن کو خیرباد کہہ دیں گے اور ہمیں مزید خوبصورت اور اچھے شعروں سے محروم نہیں کریں گے۔

سحرِ حلال (مصوّر)

شاعر: شہاب الدین رحمت اللہ   مرتب: ڈاکٹر وفا راشدی
ناشر: مکتبۂ اشاعت اردو (کراچی)

برصغیر کے انتظامی امور میں آئی سی ایس افسروں کی اکثریت نے جس طرح نوکر شاہی کے ذریعہ بدعنوانیوں کو فروغ دیا تھا اس سے تقریباً سبھی واقف ہیں مگران کی مہم جوئی نے اُردو شاعری کے میدان میں جو چاندماری کی ہے اس سے بہت کم لوگ واقف ہوں گے۔ آج ایک ایسا ہی مجموعۂ کلام ہمارے سامنے ہے۔ کوئی اچھا تنقید نگار اس قسم کی کتابوں پر تبصرہ کرکے اپنا اور قارئین کا وقت ضائع نہیں کرسکتا مگر ہم نے اسے تبصرے کے لئے اس لئے چُنا ہے کہ ہمیں اپنے متعلق ایسی کوئی غلط فہمی نہیں ہے' ہم چاہتے ہیں کہ اعلیٰ عہدوں پر فائز جو افراد اپنے اثر و رسوخ کی بنا پر ہر فن مولا بننے کی کوشش میں میدانِ سخنوری میں بھی اپنی جولانیاں دکھانے لگتے ہیں انھیں بے نقاب کیا جائے اور اس سلسلے میں صفِ اول کے وہ نقاد ستیہ کے قائدے کے مستحق ہیں جو کسی اخلاقی، سیاسی یا عمرانی دباؤ کے پیشِ نظر اپنے قلم کا تقدس کھو بیٹھتے ہیں ان سے صرف نظر کرتے ہوئے ہم اس مجموعے کی شعری خامیوں کو اس لئے بیان کرنے پر مجبور ہیں کہ کہیں نئی نسل کے شعرا ایسے خوبصورت اور دیدہ زیب مجموعوں اور صفِ اول کے نقادوں کی تعریف و توصیف جیسی صوری خوبیوں میں اُلجھ کر اردو شاعری کے میدان میں گھس آنے والے سامریوں کے گورکھ دھندوں سے گمراہ نہ ہوجائیں۔ مزے کی بات تو یہ ہے کہ شہاب صاحب اپنی شاعری کے بارے میں فرماتے ہیں ؎

نقشِ لازوال ہے ہر غزل' مرا کلام لاکلام
سحرِ حلال ہے شہاب جادوئے سامری نہیں

کچھ صفِ اول کے ناقدین نے شہاب صاحب کی شاعری پر رائے دیتے ہوئے انتہائی چابکدستی سے وہ راستہ اختیار کیا ہے جس سے سانپ بھی مرجاتا ہے اور لاٹھی (یعنی قلم) کے پرخچے بھی نہیں اُڑتے۔ تین

انتہائی مشہور صاحبِ قلم ہستیوں نے اُن کے پہلے مجموعے " مرقعِ شہاب " کے متعلق یوں اظہارِ خیال کیا ہے
لاہور کے چیف جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں :

" کتاب کی " طباعت " نہایت محنت سے کی گئی ہے اور تصاویر نے اس کی زیبائش کو بڑھا دیا ہے ۔ شاعری سمجھنے کی نہیں محسوس کرنے کی چیز ہے ! (یہ انتہائی ذو معنی جملہ ہے اور اس کے پیچھے ڈاکٹر صاحب کی جو قانونی بصیرت پوشیدہ ہے وہ یقیناً داد کی مستحق ہے) آپ کی غزلیات میں غالب کے ساتھ ساتھ دیگر اساتذہ کا اثر نمایاں ہے ۔ (یہ جملہ بھی ایک جہانِ معنی اپنے اندر لئے ہوئے ہے ۔ بین السطور سے ظاہر ہے کہ اس شاعری کی خانہ برانداز ی نے کتنے مشاہیر شعراء کے چمن اُجاڑے ہوں گے ۔)

شہاب صاحب کے ہم وطن پروفیسر عطا الرحمٰن عطا کاکوی جو اُردو اور فارسی کے مشہور محقق اور نقاد ہیں بڑی خوبصورتی سے پہلو بچا گئے ہیں ۔ دو پیراگراف " مُرقعِ شہاب " پر انھوں نے سپردِ قلم کئے لیکن ان کی شاعری کے متعلق کچھ نہ کہا ۔ آخری جملہ بہت معنی خیز ہے لکھتے ہیں :

" طباعت " اور " کتابت " کا ایسا " دیدہ زیب " مجموعہ کم ہی دیکھنے میں آیا ہے " ۔

ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب نے سب سے زیادہ صاف گوئی سے کام لیا ہے ۔ " مرقعِ شہاب " میں اگر کوئی چیز انھیں قابلِ تعریف نظر آئی بھی تو صرف اتنی کہ :

" کتاب خوب ہے ۔ آپ نے سلیقے سے مرتب کی ہے اور خوبصورتی سے شائع کی ہے " ۔

شہاب صاحب نے اس مجموعے میں " پس منظر " کے عنوان سے کچھ اپنے متعلق بھی تحریر کیا ہے کہ انھیں صرف دو شوق تھے ایک شاعری کا اور دوسرے شکار کا ۔ انگلستان میں وہ لومڑیوں کا ۔ دریائے گنگا کے کنارے مگرمچھ کا اور آسام میں بارہ فٹ ۲ اینچ لانبے ٹائیگر کا شکار کر چکے ہیں ۔ پاکستان میں انھوں نے کتنے شکار کئے اس کی تفصیلات انھوں نے نہیں دیں ۔ کہتے ہیں ؎

بزمِ شعراء میں شعر خوانی کیا ! جب نیستاں میں شیر مارا ہے !

اس شعر میں اُنھوں نے حقیقت بیانی سے کام لیا ہے ۔

ان کے موجودہ مجموعے " سحرِ حلال " کے ورق پر ورق اُلٹتے جائیے جس میں ' انھوں نے معانی نے حُسنِ بیان کے ' زبان کے اور دوسرے شعراء کے مضامین کے کشتوں کے پشتے لگا دیئے ہیں ۔ کہیں مضامین

تڑپ رہے ہیں۔ کہیں خیالات نیم بسمل ہیں اور کہیں دوسرے شعراء کے اشعار حالت جاں کنی میں ہیں۔ پورا مجموعہ نگار خانے کے بجائے شکار خانہ بنا ہوا ہے۔ جہاں تک اشعار پر بنائی گئی تصاویر کا معاملہ ہے ہم کوئی رائے دینے سے قاصر ہیں۔ یہ تو کوئی اعلیٰ درجہ کا مصور ہی بتا سکتا ہے کہ اشعار پر انھوں نے جو تصویری مرقعے بنائے ہیں اس میں اُن کے ذوقِ شکار و شغلِ کُشتار نے کیا کرشمے دکھائے ہیں۔

اُردو شاعری اور اصنافِ سخن پر جو مہارت اُنھیں حاصل ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے نوح ناروی کے اس شعر کو ؎

اللہ رے دیکھو کشش حضرتِ بدر ! ۔ نارے سے چلے نوح تو آرے پہونچے

بجائے رُباعی کے قطعے کا شعر بنایا ہے۔ مندرجہ ذیل رباعی کو انھوں نے ذوقؔ سے منسوب کیا ہے ؎

کیا فائدہ فکرِ بیش و کم سے ہوگا ۔ ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہوگا

جو کچھ کہ ہُوا ہوا کرم سے تیرے ۔ جو کچھ ہوگا ترے کرم سے ہوگا

رئیسؔ امروہوی جیسے بیباک نقاد اور جری سخنور و ادیب جب شہاب صاحب کے دستِ کرم اور احسانات کے شکار ہو جائیں تو ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ شہاب صاحب شاعر سے زیادہ ایک کامیاب شکاری ہیں ورنہ رئیس امروہوی ان کے کلام کے بارے میں نثر میں قصیدہ گوئی نہ کرتے۔ وہ لکھتے ہیں کہ :

"اس مجموعہ کی غزلیات، نئی غزل اور نئے تغزل کی خوبصورت ترجمانی کرتی ہیں۔"

عہدِ جدید کے بعض شعراء کے ہاں فکری ابہام اور اشکال کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ :

"بعض شعراء کا کلام عام فہم و فکر کی رسائی سے ماورا ہو گیا اور ان کا یہ عالم ہو گیا ہے کہ یہ اپنا کہا آپ سمجھیں یا خُدا سمجھے . . . مگر . . . شہاب صاحب کا ذہن صاف اور تخیل شفاف ہے وہ جن مضامین کو جس وضاحت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں انھیں اتنی ہی سادگی، برجستگی اور بے ساختگی سے بیان کرنے پر بھی قادر ہیں۔"

اس مجموعے کے شروع میں جو مضامین ہیں ان میں ڈاکٹر وفا راشدی اور شہاب صاحب کے مابین "من ترا حاجی بگویم تو مرا ملا بگو" والی کیفیت ملتی ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ دونوں میں گہرا دوستانہ ہے وفا راشدی صاحب نے فارسی میں بھی ان کی مدح گوئی کر کے حقِ دوستی بدرجۂ احسن ادا کیا ہے۔ وہی اس کتاب کے مرتب بھی ہیں۔ اس کی انتہائی دیدہ زیب کتابت اور خوبصورت طباعت کے سلسلے میں جس قدر شہاب صاحب

کی جیب و دربار کو سبک بار کیا گیا ہے کاش اسی پیمانے پر کتابت کی بے شمار غلطیوں کا بوجھ بھی ہلکا کر دیا جاتا۔

پروفیسر عطاالرحمٰن کاکوی، جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال اور ڈاکٹر جمیل جالبی کی داد دینی پڑتی ہے جو اس مشاق شکاری کے جال سے، زیر لب مسکراتے ہوئے اور زبانِ حال سے یہ شعر کہتے ہوئے نکل گئے کہ ــ

برو این دام بر مرغ دگر نہ　　　کہ عنقا را بلند است آشیانہ

اس مجموعے میں شہاب صاحب کی (۶۸) غزلیں اور چھ متفرق شعر شامل ہیں۔ کئی غزلیں انھوں نے جگر مرادآبادی، فیض احمد فیض، خمار بارہ بنکوی اور جگن ناتھ آزاد کے علاوہ دیگر مشاہیر شعراء کے رنگ میں نظم کرنے کا دعویٰ کیا ہے جو صحیح نہیں بلکہ شہاب صاحب نے تو ان تمام شعراء کے چمنستانِ سخنوری میں انتہائی بے ترتیبی سے جارحانہ براندازی کی ہے اور ان کے اچھے اچھے مضامین کو بری طرح پامال کیا ہے۔

شہاب صاحب کے کلام میں جو چار عناصر پائے جاتے ہیں، وہ ہیں (۱) لطافت شکن اشعار (۲) فہم شکن اشعار۔ ان اشعار کو ابلاغ شکن بھی کہا جا سکتا تھا مگر ہم نے یہ اصطلاح ان شعراء کے لئے محفوظ رکھی ہے جو تجریدی شاعری کرتے ہیں۔ (۳) سلیقہ شکن اشعار (۴) بحر شکن اشعار۔

لطافت شکن اشعار:

اس ضمن میں وہ اشعار آتے ہیں جنھیں سن کر طبع لطیف کراہت محسوس کرے۔ ہم نے ان کے ڈھیر سارے ایسے شعروں میں سے صرف ۹ شعر انتخاب کئے ہیں، جس میں یہ وصف بدرجۂ اتم موجود ہے۔

۱۔ ہم کسی سے کیا گل و گلزار کی باتیں کریں　　آؤ بھی اے قاتلو! تلوار کی باتیں کریں

۲۔ میکدے میں غیر بدأطوار کی باتیں کریں　　آیئے مے خوار کی سرشار کی باتیں کریں

۳۔ گلستانوں میں نقارے بجیں گے　　گل و بلبل کا اب ماتم نہ ہو گا

۴۔ پاس گل رو کے آنا جانا تھا　　نکہتِ گل سے لطف اٹھانا تھا

۵۔ کیوں نہ چبائے ظالم بات　　بات ہے اُس کی شاخِ نبات

۶۔ میکدے میں تیرے ساقی تشنہ لب　　واعظ حرمت مقام آ ہی گیا

شاعری میں لطف زبان کی جو اہمیت ہے اس سے سبھی واقف ہیں مگر غزل کا مزاج تمام اصنافِ سخن سے زیادہ لطافت چاہتا ہے اس سلسلے میں غزل ذرا سی بھی بے راہ روی کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ مندرجہ بالا اشعار

میں زبان و بیان پر جو ٹھکی کی کیفیت ہے وہ ظاہر ہے مگر مندرجہ ذیل تین شعروں میں تو ان دونوں کی بڑے اہتمام کے ساتھ تجہیز و تکفین ہوئی ہے۔

۷۔ وہ چتون کی اپنی چلائے ہے تیر ! مرے گھر وہ کب آئے ہے جائے ہے
۸۔ چلے چمن سے جو ہم تو' مری بلا سے صبا ہزار بار چلے اب کہ لاکھ بار چلے
۹۔ میرے لب کی تشنگی کو دیکھ کر! چاہیئے تو کر بلا ہو جائیے

آٹھویں شعر میں جو خط کشیدہ الفاظ ہیں ان سے طبع لطیف پر جو حالت استفراغ طاری ہے اُس کا اندازہ کوئی بھی آسانی سے لگا سکتا ہے مگر ہمارے آئی سی ایس آفیسر یہی جواب دیں گے کہ: "میری بلا سے"۔

فہم شکن اشعار :

اس ضمن میں وہ اشعار آتے ہیں جنھیں پڑھ کر ذہن رسا تک مفلوج ہو جاتا ہے اور فہم و ادراک کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے۔

۱۔ عشق میں کیا غم تھا میں کھاتا رہا پر نہ کچھ آتا نہ کچھ جاتا رہا !
۲۔ جلوتوں میں خلوتوں میں وہ جوانی رات کی دلربائی جانفشانی بے حجابی رات کی
۳۔ ساتھ حسنِ یار کے دیکھا شہاب دلستانی کی کُمک آتی رہی
۴۔ ہزاروں دل ہیں لیکن دل نہیں ہے وہ کیا قاتل ہے جو بسمل نہیں ہے
۵۔ میں دُنیا سے بہت ہی جواں ہوں زمیں پر ہوں مگر میں آسماں ہوں
۶۔ یہ مقتل ہے ترا قاتل کہ محفل! ہزاروں دل ہیں کوئی بسمل نہیں ہے
۷۔ شامِ غم کی تیرگی مٹ جائے گی! صبح ہو سے شیر لاتا چاہیئے!
۸۔ آسیئے بھی دل میں میرے آیئے دل کی دھڑکن لا دوا ہو جائیے

سلیقہ شکن اشعار :

اس ضمن میں وہ اشعار آتے ہیں جن میں تک بند کا بھی ڈھنگ کو نہیں ہے۔ ایسے بے تکلانہ اشعار کی تعداد جو اس مجموعے میں شریک ہیں کافی حیرت انگیز ہے۔ ہم نے بطور نمونہ لیے (۹) شعر چنے ہیں جن میں سے تین یہ ہیں

۱۔ چاند کا انتظار کون کرے ۔۔۔ ماہ پاروں سے پیار کون کرے

۲۔ پاس کھانے کو جو میرے کچھ نہ تھا ۔۔۔ جو بھی غم مجھ کو ملا کھاتا رہا

۳۔ ہے چمن میں وہ تو بے تُک انتخاب ۔۔۔ پھول کلیوں میں جو اپنا سب سے گلاب

۴۔ ماہ کو اور ماہ پاروں کو ! ۔۔۔ داغ دل کو کبھی دکھاتا تھا

۵۔ تو فضا نہیں کہ جو انہیں تو کہاں ہے تو کیا نہیں ۔۔۔ کوئی بات اس کے سوا نہیں کہ تو فضا نہیں تو کیا نہیں

۶۔ چاند تاروں کی بات کرتا ہوں ۔۔۔ ماہ پاروں کی بات کرتا ہوں

۷۔ چاند تارے وہ کہکشاں کیا ہیں ۔۔۔ ماہ پارے وہ مہ وشاں کیا ہیں!

۸۔ بسمل ہے خود بسمل اپنا ۔۔۔ رقصاں کیوں تلوار کرو ہو

۹۔ ایسے گا گا کر غزل برسات میں ۔۔۔ آسماں کو پھر رُلایا جائے گا

بحر شکن اشعار :

اس ضمن میں وہ اشعار بطور مثال دیئے جا رہے ہیں، جن میں عروض و بحور کی غلطیاں ہیں اور خاص طور پر ایسے ہی اشعار چُنے گئے ہیں جن کے متعلق کوئی یہ گمان نہ کر سکے کہ کاتب کی غلطی سے ایسا ہوا ہو۔

۱۔ دید نی قفس میں ہے حالتِ زارِ عندلیب ۔۔۔ غیر کے بس کی زندگی تو کوئی زندگی نہیں !

پہلے مصرعے میں جب تک "دیدنی" کو "دید دنی" نہ پڑھا جائے شعر موزوں نہیں ہوتا۔

۲۔ چاند تارے ہیں ماہ پارے ہیں ۔۔۔ اپنے خیالوں میں کیا نظارے ہیں

دوسرے مصرعے میں جب تک "خیالوں" کو "خالوں" نہ پڑھا جائے شعر موزوں نہیں ہوتا۔

۳۔ اس چمن میں بلا کوئی ہمدم تو کیا ۔۔۔ کوئی ہم زباں بھی ہمارا نہیں !

پہلے مصرعے کی بحر الگ ہے دوسرے مصرعے کی بحر الگ ہے اس طرح شعر "دو بحرا" ہو گیا ہے۔

۴۔ مسجد میں میکدے میں یہاں تک کہ بتکدے میں ۔۔۔ دیکھا اُسی کو چار سو جا ہے جدھر گئے

یہ شعر بھی دو بحرا ہے۔ پہلے اور دوسرے مصرعے کی بحریں الگ الگ ہیں۔

۵۔ میں اد ہی کے واسطے پھول کو کیا کروں ۔۔۔ پیرِ مغاں کو دیکھ کر طبیعت بدل گئی

کا شعر میں "طبیعت" کو جب تک "طب یت" نہ پڑھا جائے، شعر موزوں نہیں ہوتا۔ حالاں کہ اس کا

تلفظ "طبی عت" ہے۔

۴۔ میں دکھادوں جشنِ گُل کیسے منایا جاتا ہے   اُس کا دامن ہاتھ کو میرے ہاتھ کبھی آجائے تو

یہ بھی "دو بحرا" ہے، دونوں مصرعوں کی بحر الگ ہے۔

اسی طرح اور کئی اشعار ہیں جو ساقط الوزن ہو گئے ہیں یا چند غزلوں میں ایسے مصرعے بھی نظم ہو گئے ہیں جن کی بحر غزل کی بحر سے مختلف ہے۔

اس تجزیے کے بعد ملاحظہ فرمائیے کہ وفا راشدی صاحب کے قلم سے تعریف و توصیف کے کیسے ڈونگرے برس رہے ہیں

۱۔ "انگریزی۔ اردو اور فارسی میں شعر کہتے ہیں۔ شہاب تخلص کرتے ہیں۔ تخلیقی ذہن، تعمیری رجحانات اور عصری میلانات رکھتے ہیں انھوں نے ان تینوں زبانوں میں جو شعر کہا ہے کہ وہ اعلیٰ اور ارفع ہے۔ کمالِ فن کا عمدہ نمونہ ہے۔"

ہمیں ڈاکٹر وفا راشدی صاحب سے جو حُسن ظن اور ان کی صلاحیتوں پر جو اعتماد ہے اس کی بنا پر ہم شعر فہمی پر فیضی کا مشہور مقولہ دُہرانے کے موقف میں کسی بھی طرح نہیں ہیں اور نہ ہم اپنی رائے قارئین پر لادنا چاہتے ہیں اس لئے اس کا فیصلہ ہم اُن ہی کے وجدان پر چھوڑ دیتے ہیں۔

۲۔ "شہاب صاحب کے تخلیقی اسلوب کی رعنائی و دلکشی، سخن فہمی و سخن سنجی پر ان کا ملکہ، زبان و بیان پر اُن کی قدرت، ایسی خصوصیات ہیں جن کی بنا پر بجا طور پر یہ کہنے کا حق رکھتے ہیں ؎

میں بھی شہاب مست نوائے سروش ہوں   زندہ مری غزل سے ہے غالب کا فن ہنوز"

یہاں بھی ہم فیصلہ قارئین پر چھوڑتے ہیں۔

۳۔ "انھوں نے غالب کی طرح مرزا داغ دہلوی کی زبان دانی، بے باکی، شوخی و بانکپن کو اپنایا اور جولانیٔ طبع کا خوب خوب اظہار کیا۔ بانکپن سے غزل میں دوہے کا جادو بھر دیا۔"

۴۔ "اُن کا منفرد آہنگ ہر رنگ میں نمایاں ہے اور تقاضائے وقت سے ہم آہنگ بھی۔"

۵۔ "فیض کی طرح شہاب صاحب اپنے اسلوب میں منفرد ہیں۔"

۶۔ "اُنھوں نے جس مستعدی اور فہم و فراست کے ساتھ افکارِ جمیل کی شمعیں روشن کی ہیں، ان سے ایک

کے جدید دوشن اور ایک جہانِ فکر آباد ہے۔"

۷۔ "شہاب صاحب کی شاعری عصری شاعری ہے۔"

یہ ساتوں نکتے جو دفا راشدی صاحب نے شہاب صاحب کی شاعری کے بارے میں بیان فرمائے ہیں وہ ان کے زورِ فکر سے زیادہ شہاب صاحب سے ان کی وفاداری پر دلالت کرتے ہیں اس کے باوجود بھی ہم قارئین سے چشم پوشی کی سفارش کریں گے کہ بعض ناگزیر حالات میں ایسا بھی کبھی کبھی ہو جاتا ہے۔

آخر میں ہم اس کتاب کے کاتب کو بیحد خوبصورت کتابت کے لئے اور طابع کو بہترین طباعت کیلئے مبارکباد پیش کرتے ہوئے کاتب صاحب سے ہمدردی کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ ان کے فن کو پروف ریڈر کی عدم موجودگی نے گہنا دیا ہے آخر میں جو ایک صحت نامہ لگایا گیا ہے جس میں ۱۴ غلطیوں کی اصلاح موجود ہے کہیں قارئین کو مغالطے میں نہ ڈال دے کہ اس کتاب کی باقاعدہ پروف ریڈنگ ہوئی ہے لہٰذا ہم کتابت کی غلطیوں پر مشتمل سرسری اعداد و شمار پیش کرتے ہیں جو اس صحت نامے کے باوجود اس کتاب میں موجود ہیں بلکہ صحت نامے کی فہرست سے دہ چند ہیں۔ ان غلطیوں کو ہم نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ کتابت کی عام غلطیاں۔ صفحہ (۵۱) سے صفحہ (۱۹۹) تک تقریباً (۱۵) صفحات پر محیط ہیں۔ اور یہ غلطیاں (۱۵) سے زیادہ بھی ہو سکتی ہیں کیونکہ بعض صفحات پر ایک سے زیادہ غلطیاں موجود ہیں۔

۲۔ نقطوں کی غلطیاں۔ صفحہ (۵۵) سے (۱۶۷) تک تقریباً دس صفحات پر محیط ہیں۔

۳۔ پورے الفاظ غائب۔ صفحہ (۱۰۸) سے صفحہ (۲۰۸) تک تقریباً دس صفحات پر اور ان میں بعض صفحات پر کئی الفاظ غائب ہیں۔

شروع کے (۵۰) صفحات پر تین مضامین ہیں ان میں بھی کئی کتابت کی غلطیاں موجود ہیں۔ پہلے دو مضامین میں اِکّا دُکّا اور آخری مضمون میں کئی جگہ غلطیاں رہ گئی ہیں۔

یہ کتاب نوجوان اور اُبھرتے ہوئے شعراء کے لئے بے حد کارآمد ہے۔ اُنھیں اس کا مطالعہ کرکے ان غلطیوں سے بچنے کا سنہرا موقعہ ہاتھ آئے گا جن کا ارتکاب اس کتاب میں فراخ دلی سے کیا گیا ہے۔

ذاکر صاحبؒ

(اپنے آئینۂ لفظ و معنی میں)
مرتب : پروفیسر ضیاءالحسن فاروقی

ناشر، ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز ۔ نئی دہلی ۔
تقسیم کار: مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر نئی دہلی 110025 ۔ قیمت 45 روپے

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی ۹۰ ویں سالگرہ کے موقع پر انکی بعض اہم انگریزی تحریروں کے اردو ترجموں بعض کی اردو تحریروں اور تقریروں اور چند نہایت ہی اہم غیر مطبوعہ خطوط پر مشتمل یہ مجموعہ ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کیطرف سے بطور خراج عقیدت شائع کیا گیا ہے ۔ بقول مرتب اس میں ــــــ "...... مرحوم کی فکر نورانی دردمندی ودلسوزی انصاف پسندی و حق آگاہی، صبر و ضبط، وسعت نظر، کشادہ دلی، عزت نفس اور غیرت و حمیّت کی بجلی کی چمک کی سی جو جھلکیاں ملتی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب کتنی عظیم شخصیت کے حامل تھے ــــــ "

اس مجموعے میں ذاکر صاحب کے چار اردو مضامین (مشرق و مغرب ۔ جامعہ ملیہ کیا ہے ۔ سیرت کی تعمیر اور ہم کیا کریں) ایک انگریزی مضمون کا اردو ترجمہ ــ "ابدیت یا کھلونا" چسٹرٹن کے انگریزی مضمون کا "بزم ہستی میں فرودی ہے کوئی ردیف رواں" عنوان سے فی البدیہہ ترجمہ ۔ عابد حسین صاحب کے نام ایک مکتوب "نور امید" کے عنوان سے ۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی کے نام ایک تاریخی خط "جالندھر اسٹیشن پر کیا گزری" کے عنوان سے اور انہی کے نام چند اہم مکتوبات "الفت موج و کنار" کے عنوان سے تاریخی ترتیب کا جابجا پروفیسر ضیاءالحسن فاروقی کے توضیحی نوٹس کے ہمراہ ۔ علاوہ ازیں تین انگریزی تقریروں کے ترجمے جو انہوں نے ایک سیمینار، سمپوزیم اور کنونشن میں کی تھیں ۔ پانچ اردو تقریریں ــ (قرار یا فرار ۔ شہادت حسینؓ ۔ علی گڑھ سے خطاب ۔ ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیئے ــ اور ۔ محبت خدمت اور اقتدار روحانی کی چاکری) کے عنوانات سے دو خطبات صدارت، اردو کانفرنس لکھنؤ اور آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے موقع پر (قومی تعلیم کے مسائل) کے عنوان سے ۔ اسکے علاوہ گجرات ودیا پیٹھ کے جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر "گاندھی جی کا راستہ" اور پٹیالہ یونیورسٹی میں "گرو گوبند سنگھ" کے عنوان سے دو ہندی تقریریں شامل ہیں ۔

ذاکر صاحب کی یہ نگارشات ۱۹۲۰ء سے ۱۹۶۷ء تک تقریباً ۴۷ سال کے طویل عرصے پر محیط ہیں ۔ اس نصف صدی کے عرصہ میں انکے خیالات و کردار میں تبدیلیاں باعتبار زماں بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں ۔ ۱۹۲۰ء میں "ابدیت یا کھلونا" کے عنوان

تھوں نے یہ مضمون تحریر کیا تھا اسمیں ہوش کیساتھ ساتھ نوجوانی کا جوش اور ولولہ بھی بہت نمایاں ہے خصوصاً سر سید، علی گڑھ تحریک اور مسلم یونیورسٹی میں پائے جانے والے ماحول سے ذاکر صاحب بعض اندیشوں کی بناء پر اختلاف رکھتے تھے اور یہی جداگانہ طرز فکر تھا جس نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تشکیل کی اور قوم پرستانہ بنیاد پر اُسے استوار کیا۔ اس مضمون میں ذاکر صاحب کا جو لب و لہجہ ہے وہ بعد کی کسی تحریر میں نہیں ملتا اور اس مضمون میں بھی جس شدت کا اختلاف انہیں سر سید اور اہلِ علی گڑھ کی مخصوص ذہنیت سے تھا اس شدت کے غم و غصے کا اظہار نہیں ہے ایسا لگتا ہے کہ شدید تناؤ کے باوجود جا بجا انہوں نے راہوارِ قلم کو تھام تھام لیا ہے۔

اس مضمون میں انہوں نے سر سید اور ان کے متبعین کی کوششوں کو نامردانہ کمزوری سے تعبیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ . . . . . "ملازمتوں اور روزگار کا حاصل کرنا دشوار تھا اس لئے قومی نشاۃ ثانیہ کی عظیم کوشش کو لائق ماتحت منظمین کے پیدا کرنے کی کوشش میں تبدیل کر دینا کتنا مضحکہ خیز تھا ـــــــــــ" ۳۲ سال بعد بھی اُنکے خیالات اُنکے سوچنے کا ڈھنگ نہ بدلا اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ سنہ ۱۹۲۰ میں انکی ذہنی صلاحیتیں اس قدر جلا پا چکی تھیں کہ ۳۲ سالوں کا اُتار چڑھاؤ بھی انکے نظریات کی صحت میں کوئی رخنہ پیدا نہ کر سکا چنانچہ سنہ ۱۹۵۲ میں علی گڑھ میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں ان کا جو خطبۂ صدارت پڑھا گیا اس میں بھی کچھ اسی قسم کے خیالات کا اظہار انہوں نے کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔ " . . . . صرف کتابیں پڑھا پڑھا کر اور اس طرح پڑھا کر کہ نرے منشی پیدا ہوں کھیت اُجاڑ ہو جائیں اور کارخانے ویران، دیوانگی نہیں تو کیا ہے ؟ ـــــــــــ"

وہ درس گاہوں سے فارغ ہونے والوں کی ایسی ٹیم چاہتے ہیں جو ـــــــــــ "حقائق سے بھاگتے نہ ہوں جو ہماری حیاتِ قومی کے گہرے تقاضوں کو سمجھتے ہوں اور انہیں پورا کرنے میں دل و جان سے لگ جانے کو آمادہ ہوں لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ہمارا علم کتابوں تک اور درس گاہوں کی چہار دیواری تک محدود ہوتا ہے ـــــــــــ"

ذاکر صاحب بنیادی طور پر ایک سماجی مصلح، معلم اور ماہر تعلیم تھے۔ جرمنی میں کافی طویل عرصہ گذارنے کی بنا پر وہ مغرب، مغربی تعلیم اور وہاں کی مادی ترقیوں سے کما حقہٗ واقفیت رکھتے تھے مگر علامہ اقبال کی طرح انکا ربط مشرق، مشرقی اقدار اور یہاں کی روحانی اخلاقیات سے کبھی نہ ٹوٹ سکا، وہ اس شعر کی عملی تفسیر تھے ؎

خرد افزود مرا درسِ حکیمانِ فرنگ

سینہ افروخت مرا صحبتِ صاحب نظراں ـــــــــــ اقبالؔ

"خذ ما صفا و دع ما کدر" کی جو تعلیم ہمارے بزرگوں نے دی تھی ذاکر صاحب اُس پر شدت سے عمل پیرا تھے لکھتے ہیں ـــــــــــ "اچھی بات کہیں سے آئے، مشرق سے کہ مغرب سے کسی سے ملے، اپنے سے کہ غیر سے، ہماری اپنی ہی کھوئی ہوئی پونجی ہے اُسے اٹھا لینا چاہیئے ـ" (صفحہ ۱۳۹)

ایک قوم پرست مسلمان ہونے کی حیثیت سے وہ تقسیم ہند کے مخالف تھے اور آج چالیس سال گذر جانے کے بعد ہندوستانی مسلمانوں نے اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ ذاکر صاحب اور انکے ہم خیال مسلمان زعما کی فکر کتنی صداقت سے قریب تھی۔ علی گڑھ کا جو ماحول سنہ ۱۹۴۷ء سے پہلے تھا وہ آزادئ ہند کے خلاف تھا اور ذاکر صاحب کو اسی کا خدشہ تھا کہ جس نہج پر دانش گاہ علی گڑھ اپنے غیر ملکی آقاؤں کے چشم و ابرو

کی پاسداری کا علم اُٹھائے جا رہی تھی اس کے نتائج اچھے نہیں نکلیں گے چنانچہ "ابدیت یا کھلونا" کے عنوان سے جو مضمون انہوں نے ۱۹۴۰ء میں لکھا تھا اسی خدشے کے تحت لکھا گیا تھا۔ جب تقسیم ہوگئی اور مذہبی جنون نے فرقین کو آپسی خانہ جنگی میں مبتلا کر دیا تو ہر دردمند دل اس صورت پر جس طرح تڑپا اسکے اثرات ذاکر صاحب کے ایک نجی خط "جالندھر اسٹیشن پر کیا گذری" (بنام مولانا عبدالماجد دریا بادی) میں تفصیل سے ملتے ہیں۔ ایسے حالات میں انہوں نے جو توازن برقرار رکھا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس طرح مسلمانوں کے وطن چھوڑ دینے کے مسئلے پر ۱۹۴۷ء میں انہوں نے اپنی تقریر "قرار یا فرار" میں نہایت دردمندی سے ثابت قدمی کا درس دیا ہے ——— "قوموں کی زندگی میں کبھی کبھی ایسے نازک موقع آتے ہیں۔ یہ قدرت کی طرف سے آزمائش کا وقت ہوتا ہے۔ اب آپ کے سامنے یہ سوال ہے کہ آپ اس آزمائش سے گذرنا چاہتے ہیں یا اس سے بچ کر بھاگ نکلنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ کا فیصلہ بھاگنے کا ہے تو بسم اللہ .... پاکستان کا راستہ کھلا ہوا ہے۔ جو چاہے شوق سے جائے مگر یاد رکھیئے موت آپ کا پیچھا وہاں بھی نہ چھوڑے گی۔ ..... جو لوگ موت کے استقبال کے لئے تیار رہتے ہیں ان کے لیے زندہ رہنے کی راہیں بھی نکل آتی ہیں۔ کیا عجب ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی کشتی جسکو "غلط رہنمائی" نے اس بھنور میں ڈال دیا ہے آپ کے کمزور ہاتھوں سے پار لگ جائے۔ (صفحہ ۱۱۲)

یہی "غلط رہنمائی" تھی جس نے ذاکر صاحب اور دیگر قوم پرست مسلمانوں کو خوفزدہ کر دیا تھا اور آج جو نتائج و عواقب ہمارے سامنے ہیں ان سے صاف ظاہر ہے کہ ان لوگوں کا خوف بالکل صحیح تھا۔

دانشگاہ علی گڑھ کی تعلیم و تربیت سے انہیں اختلاف نہیں تھا۔ وہ اس بات کے خلاف تھے کہ یہ دانشگاہ صرف سرکاری ملازمت کے لئے مسلمانوں کو تیار کرنے والا کارخانہ بن گئی تھی۔ اسی سرکاری ملازمت کے متعلق ذاکر صاحب نے لکھا ہے کہ اسے "تعلیم یافتہ" مسلمانوں نے اپنا کعبۂ مقصود بنا لیا تھا —" (صفحہ ۱۲۸) اس عہد کی مسلم قیادت سے ذاکر صاحب کبھی مطمئن نہ ہو سکے جبکی قومی جدوجہد کا مخصوص مشغلہ ذاکر صاحب کے الفاظ میں یہ تھا کہ ——— "اپنے اچھوں بُروں سب کو سرکاری ملازمت میں کھپائیں۔ اچھی سے اچھی علمی صلاحیت کے نوجوانوں کو ڈپٹی کلکٹری کی معراج تک پہنچانے پر ہمارے "رہنما" علی الاعلان فخر کیا کرتے تھے — (صفحہ ۱۲۸)

اُنہیں ان غلط رہنماؤں سے یہ شکایت تھی کہ انہوں نے ذہین سے ذہین اور قابل سے قابل نوجوانوں کے ہوتے ہوئے بھی ——— "کبھی یہ نہ چاہا کہ ان میں سے علمی صلاحیت والوں کو علمی کاموں کے لئے روکا جائے۔ کچھ کو تجارت کی ترغیب دلائی جائے کچھ کو صنعت میں بھیجا جائے۔

بس ڈپٹی کلکٹر، تحصیل دار، نائب تحصیلدار!"

علی گڑھ میں ایسے مخصوص ذہن کے نوجوان عہدے داروں کی تیاری کے پس پشت انہیں انگریزوں کی حکمت عملی اچھی طرح سمجھ میں آگئی تھی۔ یہ مانا کہ سرسید اور اُنکے رفقاء نے مسلمانوں کی جہالت اور پسماندگی دور کرنے کے لئے انتہائی نیک نیتی سے یہ کام کیا تھا مگر اُنکے بعد آنے والے انگریزوں کی حکمت عملی کا شکار ہو گئے اور اسی مرحلے پر قوم پرست مسلمانوں کو یہ احساس ہوا کہ علی گڑھ میں جو ہوا چل رہی ہے وہ ہندوستان کی تحریک آزادی کی موافقت میں نہیں ہے۔ چنانچہ ذاکر صاحب نے لکھا ہے ——— "ہم نے اپنے بہترین دماغوں کو ایک ایسے کاروبار میں لگا دیا جس میں ذاتی انہیں کوئی اختیار نہ تھا۔ ایک پردیسی مشین کے پرزے تھے جو ہم وطنوں کی حق تلفی

انھیں غلام رکھنے اُنکے جبریت خواہ رجحان کو دبانے میں کام آتے تھے۔ انعام تھا تنخواہ، حکومت اجد؟ بالاقی یافت (صفحہ ۱۲۸)

علی گڑھ کی متضاد ذہنیت والی سیاست سے ناراض ہونے کے باوجود وہ دانش گاہ علی گڑھ کے محبت دل سے دل لگائے رکھتے تھے یہاں تک کہ ۱۹۵۷ء کے جلسۂ تقسیم اسناد میں انہوں نے انتہائی جذباتی انداز میں دانش گاہ علی گڑھ کو جو خراج تحسین پیش کیا ہے اس کے ایک ایک لفظ سے محبت ٹپکتی پڑتی ہے۔

"...... اس دانشگاہ سے برابر دل کو تعلق رہا، گہرا تعلق، نہ ٹوٹ سکنے والا تعلق! یہاں بہت کچھ سیکھا، یہاں دوست پائے، دوستی کی قدر پہچانی، مل جل کر کام کرنا سیکھا، اختلاف کے باوجود نباہ کے ڈھنگ سیکھے۔ اپنی قومی زندگی کے سامنے عیب یہاں پر ملاحظہ کیجئے، پھر اس کے پچھتاوے کے آنسوؤں سے اپنی آنکھیں نم بھی پائیں۔ اپنی خام تند مزاجیوں اور عاجلانہ پھرتیوں پر نادم ہونا سیکھا۔ سو پتھل کی طرح ایک چنگاری سے شعلے کی طرح بھڑک اٹھے، مگر سچے کوئلے کی طرح سلگتے رہنے کا سبق بھی یہیں سے ملا...... یہاں فرماں برداری سیکھی، اطاعت شعاری سیکھی، ادب سیکھا۔ بڑوں کا ادب، ہم چشموں کا ادب، چھوٹوں کا ادب اور خود اپنا ادب۔ سعادت مندی اور وقاسقاحت کے ساتھ خود اختیار اور اس علمی بستی کے نظام کی پابندی کو عین آزادی جانا، پر جب اس نظام کو ضمیر کے مطالبوں سے ٹکراتا پایا تو اس سے بغاوت کی طاقت بھی اسی چشمۂ حیات سے ارزانی ہوئی! باغی بنے، نکالے گئے۔ دوسری بستی بسانے میں ایک ربع صدی کاٹ دی، مگر اس مادر علمی کی طرف سے دل میں کبھی تنگی محسوس نہ کی۔ بن باس میں بھی دل اسی میں اٹکا رہا۔

حالات بدلے، ملک آزاد ہوا، یہاں کا نظام بھی بدلا، ذمہ دارانہ حیثیت سے اسکی خدمت کا موقع میسر آیا۔ بری بھلی جو بن خدمت کی اور امید تھی کہ عمر بھر کی سرگشتگی کے بعد سر شوریدہ کو یہیں بالینِ آسائش نصیب ہو جائے گی مگر یہ مقدر نہ تھا۔

آج کاسۂ دل کہ جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا بھی ہے، اس سب پر جو یہاں سے پایا شکر گذاری سے بھرا ہے اور ان تمام کوتاہیوں پر جو اس دانش گاہ عزیز کی خدمت میں رہ گئیں۔ شرمساری سے بھی چھلک رہا ہے۔ میرے لئے تو اس دانش گاہ سے وابستگی کی یاد ہی نہ سا بڑا انعام ہے آپ اس پر نئے اعزاز کا اضافہ کر رہے ہیں ؎

من ہوئے مست و ساقی پُر دہد پیمانہ را"

جلسۂ تقسیم اسناد کی اس تقریر میں مادر علمی سے بے پناہ انس کے اظہار کے علاوہ جو ادبی چاشنی ہے وہ بھی دامن دل اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے طالب علموں سے جو خطاب کیا ہے اس میں طنز و مزاح کی کیفیت اپنے پورے شباب پر ہے۔

"—— نوجوان دوستو تم جو آج سندیں لے کر عرف عام میں زندگی میں قدم رکھ رہے ہو، تم سے بھی کچھ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ کہنا الکشن کا موسم ہے اگر سیاست کے میدان میں انتخاب کا امیدوار ہوتا تو میرا کام آسان ہوتا۔ تمہاری تعریف کرتا، تمہارے کے ساتھ نعرہ خوش قسمت کا جامع پیشے پڑے گا لوگوں پر چلی جاتا ہے، تم ایسے کہاں کے دانا ہو کہ اس سے متاثر نہ ہوتے، تم خوش ہو جاتے، مجھے ووٹ مل جاتے، کہہ سکتا تھا کہ تمہارے ہاتھوں میں قوم کا مستقبل محفوظ ہے جیسا دنیا کا مستقبل، تم ہمارے مستقبل کی امید ہو" (صفحہ ۸۴)

وہ علی گڑھ کے فلسفۂ تعلیم و تدریس سے مطمئن نہ تھے جہاں کی تعلیم نے بیوروکریسی کو فروغ دینے میں بہت بڑا کردار ادا کیا تھا۔ وہ ایسے فلسفۂ تعلیم کے خواہاں تھے جو شخصیت اور کردار کی تعمیر صحت مند بنیادوں پر کر سکے جس سے اعلیٰ شخص کی بازیافت ہو۔

اور جو فرد و قوم دونوں میں اعلیٰ انسانی اقدار کو فروغ دے سکے۔ وہ اس سلسلہ میں صرف نظریات ہی نہیں رکھتے تھے بلکہ جامعہ ملیہ اسلامیہ جیسے ادارے میں انہی اقدار پر عمل آوری کا حقیقی تجربہ بھی انکے پیشِ نظر تھا جو تہذیب کی روایتی اقدار کے بغیر صرف کتابی تعلیم کے خلاف تھے۔ انکا خیال تھا کہ اگر ———— "ہم معلومات پر اکتفا کریں اور تجربے اور دیانت کو نظر انداز کر دیں تو یہ اندیشہ ہے کہ تعلیم میں ناقابل برداشت سطحیت اور ریاکاری پیدا ہو جائے گی (صفحہ ۲۰۷)

انکے نزدیک یہ ضروری تھا کہ ———— "درسگاہ ان اقدار کا تجربہ کر سکے جو اسکی اپنی ذہنی اور روحانی زندگی سے مطابقت رکھتی ہوں۔" (صفحہ ۲۰۷) اسکے لئے وہ معلموں کی ایسی ٹیم چاہتے تھے جن میں بقول انکے ————

"———— ابدی اقدار کے جیتے جاگتے مظہر موجود ہوں ماضی اور حال کی حقیقی شخصیتوں میں اخلاقی عظمت کے نمونے دکھائے جائیں مشکل اور پیچیدہ حالات میں حق پسندانہ فیصلے کرنے کے قصے سنائے جائیں۔ ہندوستان کی تاریخی روایات ایسی شخصیتوں کے تذکرے سے منور ہیں ————" (صفحہ ۲۰۸)

وہ چاہتے تھے کہ ہمارا سماج اخلاقیات کی بنیادوں پر مستحکم ہو اور جب انہیں یہ نظر آتا تھا کہ ایسا نہیں ہو رہا ہے تو بڑی دردمندی سے اسکی طرف آنے کی دعوت دیتے تھے اور یہ سوال کرتے تھے کہ کیا ہمارا سماج اخلاقی سربلندی خود بخود حاصل کریگا؟ کیا یہ ضروری نہیں کہ ہم اس کے لئے کوشش کریں؟ وہ کہتے ہیں ————

"— اقبالؔ نے اپنے ہم عصروں کو یقین دلایا تھا کہ مردِ مومن کی نگاہ سے تقدیریں بدل جاتی ہیں کیا خدا اور بندے کے درمیان اب بھی وہ رشتہ باقی ہے؟" (صفحہ ۲۱۵)

"الف سوچ و گفتار" کے عنوان سے مضمون پر وفیسر ضیاء الحسن فاروقی نے ذاکر صاحب کے ان خطوط سے مرتب کیا ہے جو مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام لکھے گئے تھے اس مجموعے کا موثر ترین مضمون ہے جس نے ذاکر صاحب کے اعلیٰ ترین اخلاقی معیار کو آئینہ کر دیا ہے۔ جامعہ ملیہ کے معمولی معلم کے عہدے سے لے کر صدر جمہوریہ ہند کے اعلیٰ ترین عہدے پر فائز ہونے کے اس طویل ارتقائی سفر میں ذرا الو لب و لہجے میں فرق آیا ہو۔ وہی انکساری وہی نیازمندی اعلیٰ اخلاقی اقدار اور مشرقی تہذیب کا وہی پاس ملیگا۔ ایک با اخلاق معلم میں وہ جو خوبیاں دیکھنا چاہتے تھے اس کا مکمل عملی اظہار انکی ذات اور شخصیت میں نظر آتا ہے۔

جہاں تک اردو نثر کا معاملہ ہے سیدھی سادی اور سلیس عبارت لکھتے تھے۔ جملے چھوٹے چھوٹے اور مفید مطلب وہ مجیب صاحب کی طرح انگریزی میں سوچ کر اردو میں نہیں لکھتے تھے اسکے باوجود بھی انکی عبارت میں لیدوپار باتوں کی سی سادگی ملتی ہے انکا طرزِ تحریر شاعرانہ اور عالمانہ اندازِ بیان سے یکسر عاری ہونے کے باوجود اپنی سادگی اور بے ساختگی کی بنا پر بیحد موثر ہوتا ہے . . .

نقد و تبصرہ

نقد و سنجش

مصنف: ڈاکٹر طلحہ رضوی برق

ناشر: دانش اکیڈمی۔ آرا۔ ملنے کا پتہ: دانش کدہ۔ ملکی محلہ۔ آرہ۔ بہار قیمت: ۳۰ روپے

ڈاکٹر طلحہ رضوی برق ایچ ڈی جین کالج آرہ میں اُردو اور فارسی کے پروفیسر ہیں اور اردو فارسی کے ادبی حلقوں میں ان کا نام محتاجِ تعارف نہیں۔ کُل ہند اور بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کرکے مقالے پڑھنا ان کا مشغلہ ہے اور مقالے بھی نہایت محنت سے ترتیب دیتے ہیں۔ اُردو اور فارسی کے اچھے شاعر بھی ہیں اور اس ذوق میں نجیب الطرفین واقع ہوئے ہیں کیونکہ ان کی والدہ اور والد دونوں فن شعر میں مہارت رکھتے تھے۔

"نقد و سنجش" ان کے چودہ مضامین کا مجموعہ ہے جو تقریباً ۱۷۰ صفحات پر محیط ہے۔ یہ مختلف سیمیناروں میں پڑھے گئے یا مختلف رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ دو صفحوں پر مشتمل پیش گفتار میں جو کچھ انھوں نے لکھا ہے اس سے اُردو کے لئے ان کی دلسوزی صاف ظاہر ہے کہ بہار میں سرکاری سرپرستی کے باوجود "جدید تر نسل سے اردو کا واسطہ و رشتہ ایک بڑا سوالیہ نشان بن گیا ہے۔" اس کا علاج جو انھوں نے تجویز کیا ہے وہ اگرچہ کہ تیر بہدف ہے مگر اب مریض میں اتنی استطاعت ہی نہیں رہی کہ وہ اتنے مہنگے علاج کا متحمل ہو سکے۔ وہ لکھتے ہیں کہ: "اردو کو مادری زبان کی حیثیت سے بچائے رکھنے اور روز مرہ کی زندگی میں استعمال کے لئے فارسی کی تعلیم بیحد ضروری ہے۔"

یہ علاج اسی وقت ممکن ہے جب کہ اہلِ اُردو اتنے فارغ البال ہو جائیں کہ ان کی اُردو پرستی میں معاشی دشواریاں حائل نہ ہو سکیں۔

پہلے سات مضامین فارسی شاعری سے متعلق ہیں:

۱۔ اقبال کی شاعری میں زنِ کامل کا تصور ۲۔ اقبال اور علامت نگاری ۳۔ اقبال اور رُباعی ۴۔ ہرج و مرج عروضی ۵۔ کبریائے سعدی ۶۔ نقیب حرکت و زندگی۔ عبدالقادر بیدل

۷۔ شاہ باقر آروی۔ تلمیذ غالب۔

پہلے تین مضامین میں ذرا طوالت سے کام لیا گیا ہے۔ اگر انھیں مختصر کر دیا جائے تو ان کی تاثیر میں اضافہ ہو جائے گا۔ انداز بیان صاف اور سلجھا ہوا ہے۔ چوتھے مضمون میں اُردو شاعری کے ایک تازہ ترین موضوع نثری نظم کا ذکر بھی آ گیا ہے ویسے اس میں فارسی شاعر نیمایوشیج کی اُن کوششوں کا ذکر کیا گیا ہے جو اوزانِ شعر کے بارے میں نیما نے کی تھیں۔ نیما نے اس سلسلے میں ایک جدید پہلو سے روشناس کروایا ہے۔ مضمون دلچسپ ہے۔ پانچواں مضمون بھی کافی دلچسپ ہے اور اس ضمن میں کربلائے سعدی کے جواب میں پرمانند صبر کی تخلیق 'رحیما' کا ایک تقابلی مطالعہ بھی مضمون نگار نے پیش کیا ہے جو اہمیت کا حامل ہے البتہ وہ کوئی ایسی مضبوط اور مسکت دلیل پیش نہیں کر سکا ہے جس سے یہ بلا چون و چرا مان لیا جائے کہ 'کربلا' سعدی کی تخلیق ہے۔ چھٹا مضمون عبدالقادر بیدل پر تشنہ ہے اور نظرِ ثانی کا طلب گار ہے۔ ساتواں مضمون تحقیقی اہمیت کا حامل ہے اور اس سے بہت سارے نئے گوشے قاری کے سامنے آتے ہیں دیگر سات مضامین اُردو شعر و ادب پر سُپردِ قلم کئے گئے ہیں۔

۱۔ جمیل مظہری بحیثیت غزل گو ۲۔ طنز و مزاح اور واہی ۳۔ وحید الٰہ بادی اور ان کے بہاری تلامذہ ۴۔ حبیب آروی کا فن ۵۔ سہیل عظیم آبادی اور سیکولرازم ۶۔ سید سلیمان اشرف بہاری ۷۔ کھوٹا سکہ ۔ ناول جس میں زندگی دھڑکتی ہے۔

جمیل مظہری پر جو مضمون طلحہ صاحب نے سُپردِ قلم کیا ہے وہ انتہائی متوازن اور نپا تلا ہے۔ ان کے انفرادی اسلوب کے اظہار کے ساتھ ساتھ طلحہ صاحب نے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ جمیل مظہری صاحب کی شمع وجدان نے کہاں کہاں سے روشنی حاصل کی ہے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اس استفادہ پر بھی جمیل صاحب کی چھاپ گہری ہے۔

دوسرا مضمون واہی پر شعلۂ مستعجل کی سی کیفیت لئے ہوئے ہے کاش وہ اس لذیذ حکایت کو دراز تر لکھتے۔

تیسرا مضمون تحقیقی ہے۔ چوتھا مضمون حبیب آروی پر خاصے کی چیز ہے۔ ایک بہت ہی اچھے شاعر کو انھوں نے بے نقاب کیا ہے جس کے کلام کی تپش سے قلب و نظر کو حرارت حاصل ہوتی ہے

پانچواں مضمون سہیل عظیم آبادی کے سیکولرازم پر ہے جس میں اُن کی ذہنی اُٹھان کا تجزیہ کرتے ہوئے
ان کے ناولٹ "بے جڑ کے پودے" سے معاشرے میں جس فساد کا اندیشہ ہو سکتا ہے اس پر تعمیری انداز
سے گفتگو کی ہے۔ مؤلف نے ناولٹ کے بجائے "ناولچہ" کی ترکیب وضع کی ہے اس سے "بوئے کچھ
آتی ہے۔ چھٹا مضمون سوانحی ہے۔ ساتواں مضمون میں شین مظفر پوری کے ناول "کھوٹا سکہ" کا ایسا
بھرپور تجزیہ کیا گیا ہے کہ وہ "خاصے کی چیز" بن گیا ہے۔

ہمیں اُمید ہے کہ یہ کتاب دلچسپی سے پڑھی جائے گی اور مؤلف کی خوب سے خوب تر کی تلاش
فطرت آئندہ بھی دانش مند اور اہلِ نظر قارئین کی ضیافتِ طبع کے سامان فراہم کرتی رہے گی۔

کچھ میزان کے بارے میں

میزان میں جو تبصرے کئے گئے ہیں ان میں ایک چیز کا بطورِ خاص خیال رکھا گیا ہے
اور وہ ہے توازن۔ نہ یہ خشک ہیں اور نہ انھیں خواہ مخواہ بوجھل بنایا گیا ہے۔ اندازِ بیاں
میں شگفتگی برقرار ہے اس لئے جہاں موقع ملا ہے وہاں ہلکی سی ظرافت بھی بروئے کار
لائی گئی ہے مگر ان تبصروں کا اصلی ہدف ایک تعمیری نقطۂ نظر کی تشکیل کے علاوہ نئی نسل
کے لکھنے والوں کو مرعوبیت اور معقولیت کے حجابات اٹھا کر اصل حقیقت دکھانے کی کوشش
کی گئی ہے۔ مبصر اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوا ہے اس کا فیصلہ تو ذوقِ نظر
باذوق قارئین ہی کر سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں صلائے عام ہے کہ زیادہ سے زیادہ ترکتہ داں اپنی رائے
بھیجیں جنھیں شکریہ کے ساتھ ذوقِ نظر کے صفحات پر پیش کیا جائے گا۔

ZAUQ-E-NAZAR

22-8-613, CHATTA BAZAR, HYDERAB

Phone : 525117